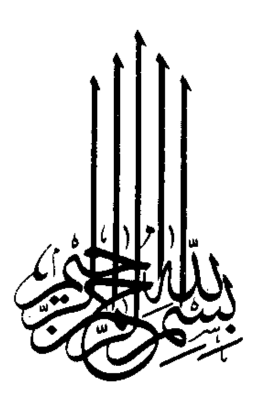

محاضراتِ
معیشت وتجارت
www.KitaboSunnat.com
ڈاکٹر محمود احمد غازی



محاضرات معیشت وتجارت

ڈاکٹر محمود احمد غازی



297.19785 Mehmood Ahmad Ghazi, Dr.
Mahazraat-e-Maeshat-o-Tajarat / Dr.
Mehmood Ahmad Ghazi.- Lahore: Al-Faisal
Nashran, 2010.
P

I. Ahadees - Mahazraat I. Title.

ISBN 969-503-787-9

اپریل 2010ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/500 روپے

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست

تقدیم

ہزار ہا شکر ہے اس ذات بے ہمتا کا جس کی توفیق اور فضل و کرم سے اس سلسلۂ محاضرات کی یہ چھٹی جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اس جلد کا موضوع معیشت وتجارت کے بارے میں شریعت کے احکام کا ایک عمومی اور اجمالی تعارف ہے۔ آج کی دنیا میں معیشت وتجارت اور مالیات کے مسائل نے وہی اہمیت حاصل کر لی ہے جو آج سے ساٹھ ستر سال قبل سیاست اور ریاست کے مسائل کو حاصل تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل سے صدی کے تقریباً نصف تک کا زمانہ ریاست اور سیاست کے مسائل وافکار کی بحث کا زمانہ تھا۔ دنیا بھر میں مختلف قسم کے سیاسی تصورات، ریاست کے بارے میں مختلف نظریات اور انسانی زندگی میں ریاست کے کردار پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ابھرنے والے مسلم مفکرین کی توجہ کا خاصا بڑا حصہ سیاست وریاست ہی سے متعلق مسائل پر مرکوز رہا۔

بیسویں صدی کے وسط سے صورتِ حال بدلنا شروع ہوئی اور سیاست کی جگہ اقتصادیات ومعیشت نے لینا شروع کر دی۔ بیسویں صدی کے اواخر تک افکار کی دنیا میں معیشت کے مسائل اہل علم کی توجہ کا مرکز رہے۔ اب گزشتہ دو عشروں سے عالمگیریت، گلوبائزیشن اور بین الاقوامی تجارت کے مسائل کی اہمیت روز افزوں محسوس ہوتی ہے۔

عالمگیریت اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں بھی بین الاقوامی تجارت اور عالمی اقتصادی نظام کے مسائل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مغرب کے دونوں بڑے معاشی نظام دنیائے اسلام کے مسائل حل نہیں کر سکے۔ کمیونزم اپنی موت آپ مر چکا۔ سرمایہ داری پر کمزوری اور بڑھاپے کے آثار طاری ہونے لگے ہیں۔ اب پہلی بار دنیائے مغرب میں اسلام کی معاشی تعلیمات سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے مغربی معیشت مشکلات کا شکار ہو رہی ہے ویسے ویسے اسلامی معیشت

کے مطالعہ کی اہمیت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ بعض مغربی یونیورسٹیوں میں اسلامی معیشت اور بینکاری کی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے پروگرام شروع ہو رہے ہیں۔

ان حالات میں ہم اہل پاکستان کا یہ فرض ہے کہ ہم اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس وادراک پیدا کریں۔ اسلامی معیشت وتجارت کے احکام سے آگاہی ہی حاصل کریں اور وطن عزیز میں ان احکام پر عملدرآمد کے عمل کو تیز کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ زیرِ نظر محاضرات اسی ضرورت کے احساس کا ایک مظہر ہیں۔ ان محاضرات کے مخاطبین ماہرینِ معاشیات اور فقہاء کرام نہیں، بلکہ عام تعلیم یافتہ حضرات بالخصوص تجارتی اور کاروباری حلقہ سے وابستہ حضرات ہیں۔

یہ محاضرات یہاں دوحہ (قطر) کی مختلف علمی مجالس میں 2009ء کے دوران دیے گئے۔ ان محاضرات کا اہتمام برادر مکرم جناب مولانا عبدالغفار صاحب نوشکی اور برادر عزیز ومحترم مولانا رحمۃ اللّٰہ صاحب ندوی نے کیا تھا۔ ان دونوں حضرات کی دعوت پر سامعین کی بڑی تعداد نے شرکت فرما کر ناچیز مقرر کو عزت بخشی۔ اللّٰہ تعالیٰ ان سب حضرات کو، بالخصوص مولانا عبدالغفار صاحب اور مولانا رحمۃ اللّٰہ صاحب ندوی کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

ان میں سے بیشتر خطبات کا اہتمام قطر کی معروف اور انتہائی قابلِ احترام دینی شخصیت شیخ علی ابن حجر مرحوم کے وقف کردہ کتب خانہ میں کیا گیا تھا۔ شیخ مرحوم نے اپنا مکان اور کتب خانہ دونوں دینی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیے تھے۔ اب اس مکان میں بہت سے دینی اور علمی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ اللّٰہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ شیخ ابن حجر کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کے اس کام کو صدقۂ جاریہ بنائے۔

یہ محاضرات بھی ان خامیوں اور کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں جن کی طرف اشارہ پچھلی جلدوں کی تمہیدی گزارشات میں کیا گیا ہے۔ تکرار کے عیب سے یہ جلد بھی پاک نہ رہ سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محاضرات میں وقفے کئی بار خاصے طویل آئے اور ایک دو بار حاضرین وسامعین بھی مختلف رہے۔ ان سب خامیوں اور کمزوریوں کے اعتراف کے ساتھ یہ اعتراف بھی کھلے دل سے کرنا چاہیے کہ ان سطور کا راقم نہ معاشیات میں کسی مہارت کا مدّعی ہے اور نہ کبھی اس فن کا باقاعدہ یا بے قاعدہ طالب علم رہا ہے۔ دورِ جدید کے فنی معاشی مسائل سے اس کی واقفیت انتہائی سرسری اور جزوی ہے۔ ماہرین اقتصاد ومعیشت سے درخواست ہے کہ ان محاضرات کی فنی خامیوں اور

کمزوریوں سے درگزر بھی فرمائیں اور ان کی نشاندہی کر کے راقم الحروف کی راہنمائی بھی فرمائیں۔

پچھلے محاضرات کی طرح زیرِ نظر محاضرات بھی مختصر نوٹس اور یادداشتوں کی مدد سے زبانی دیے گئے تھے۔ ان کو صوتی تسجیل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام میری پیاری بیٹی حافظہ حفصہ زینب غازی سلمہا اللہ نے کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس محنت کی جزائے خیر عطا فرمائیں اور اس کو شریعت کا عالم باعمل بنائیں۔ ان محاضرات کو بار بار سننے سے اس کے دل میں اسلامی معیشت کے باقاعدہ مطالعہ کا شدید اشتیاق پیدا ہوا ہے اور اب وہ اس فن کی باقاعدہ تحصیل کا ارادہ رکھتی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ عزیزہ حفصہ زینب غازی کی اس خواہش کی تعمیل کے لیے دعا فرمائیں۔

اس سلسلہ کا آغاز میری مرحومہ بہن عذرا نسیم فاروقی کی تجویز اور اصرار پر ہوا تھا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ناچیز مؤلف، اس کی مرحومہ بہن اور عزیزہ حفصہ کو اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں۔ میں برادر عزیز جناب محمد فیصل صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس سلسلہ کو اپنی مطبوعات کے پروگرام میں جگہ دی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر سے نوازیں اور اس سلسلہ کو قارئین کے لیے مفید اور نافع اور ناچیز اور کم علم مؤلف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں۔

محمود احمد غازی

دوحہ-قطر

۲ ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ

پہلا خطبہ

مالیات و معیشت کی بنیادیں
قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں

پہلا خطبہ

مالیات ومعیشت کی بنیادیں
قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلى على رسوله الكريم و علىٰ اله و اصحابه اجمعين

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی اس پہلی گفتگو کا عنوان ہے: ''مالیات ومعیشت کی بنیادیں: قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں''۔ یہ گفتگو آئندہ آنے والی گیارہ گفتگوؤں کے لیے ایک تمہید اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کی گفتگو میں ان بنیادی قواعد وضوابط اور احکام کا تذکرہ کیا جائے گا جو قرآن کریم اور سنت رسول میں بیان ہوئے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ائمہ اسلام نے قوانین مرتب کیے اور امت مسلمہ کی قانونی، تہذیبی، عدالتی اور ریاستی ضروریات کو پورا کیا۔

قرآن مجید کا یہ ہدایت نامہ زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہدایات اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس رہنمائی میں جہاں روحانی اور اخلاقی معاملات کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، وہاں اجتماعی زندگی کے بارے میں بھی بنیادی رہنمائی فراہم کر دی گئی ہے۔ اجتماعی زندگی کا ایک بہت اہم شعبہ انسان کی معاشی اور اقتصادی زندگی ہے، جس پر اس کی مادی زندگی کی کامیابی کا بہت بڑا دارومدار ہے۔ اگر معاشی زندگی ناکام ہو، اگر انسان فقر و فاقہ کا شکار ہو، اگر انسان کو مادی

وسائل دستیاب نہ ہوں تو اس کے لیے اپنے دینی تقاضوں کی انجام دہی بھی بعض حالات میں انتہائی مشکل اور کبھی کبھی بالکل ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے جہاں خالص دینی اور روحانی ذمہ داریوں کی بات کی ہے، وہاں انسان کی معاشی ضروریات اور معاشی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس لیے کہ انسان اپنے روحانی معاملات میں، دینی ذمہ داریوں اور اخلاقی تقاضوں کی کماحقہ تکمیل اسی وقت کر سکتا ہے، جب اس کو بقدر ضرورت مادی وسائل اور اسباب میسر ہوں۔

مادی وسائل اور اسباب کا حصول معاشی سرگرمیوں پر موقوف ہے۔ معاشی سرگرمی اگر قانون اور اخلاق کی حدود کے اندر ہو، اگر اس میں تعاون اور برادری کی فضا موجود ہو، اخلاق اور کردار کا ماحول قائم ہو تو پھر معاشی سرگرمی بہت جلد ان نتائج تک پہنچا دیتی ہے جو انسانوں کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں۔

جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اور سنت رسول میں انسان کی معاشی زندگی کی بنیادی ہدایات موجود ہیں تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ قرآن کریم کوئی معاشیات کی کتاب ہے۔ یا قرآن مجید نے اس طرح کوئی معاشی نظام دیا ہے جس طرح معاشیات کی کتابیں معاشی نظام سے بحث کرتی ہیں۔ قرآن مجید دراصل ایک کتاب ہدایت ہے۔ ہدایت ہی اس کی اصلی صفت ہے۔ اس کا نام ہی ہدی یا کتاب ہدایت ہے جو زندگی کے مختلف معاملات میں ہدایات اور رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب نہیں ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے فنی اسلوب میں بحث کرے، قانون دانوں سے قانون دانوں کی زبان میں، معاشیات کے ماہرین سے معاشیات کی زبان میں، مؤرخین سے مؤرخین کے اسلوب میں، مفکرین سے فلسفہ کی اصطلاحات میں بات کرے۔

قرآن مجید نے یہ اسلوب اختیار نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید ہر انسان کے لیے یکساں کتاب ہدایت ہے۔ جہاں وہ بڑے بڑے فلسفیوں اور ماہرین فن کے لیے ہدایت کا سامان رکھتی ہے، وہاں وہ ایک عام انسان کے لیے بھی راہنمائی فراہم کرتی ہے۔ ایک بدوی، ایک کوہستانی اور ایک صحرائی جو کسی خاص فن سے واقفیت نہیں رکھتا، وہ بھی قرآن مجید سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے اور اپنی سطح، اپنی اہلیت اور اپنی سکت کے مطابق قرآن مجید کی رہنمائی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید عمدہ ترین دماغوں اور اعلیٰ ترین سطح کے مفکرین کے لیے

بھی کتاب ہدایت ہے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ انسانی تاریخ کے بہترین دماغوں نے، اعلیٰ ترین بصیرت رکھنے والے انسانوں نے، اور اپنے اپنے زمانے کے ائمہ فن نے قرآن مجید پر غور کیا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف اور ایک ایک شوشے پر سینکڑوں، ہزاروں سال، ہزاروں بار گفتگو ہوئی ہے۔ مصنفین نے اپنی تصنیفات میں، مدرسین نے اپنے درسوں میں، مبلغین نے اپنی دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں میں، محققین نے اپنی تحقیقات میں، مفسرین نے اپنی تفسیروں میں، فقہاء نے فقہی مباحث میں، متکلمین نے اپنے کلامی مناقشات میں۔ غرض ہر فن کے ماہرین نے قرآن مجید کی آیات سے مکمل اعتنا کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات اور نصوص سے وہ رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے۔

یہ بھی اس کتاب کا ایک معجزہ ہے کہ یہ بیک وقت ایک عام انسان سے جو کسی خاص فن میں مہارت تو کیا، ابتدائی واقفیت بھی نہیں رکھتا اور ایک اعلیٰ ترین مفکر و متخصص سے بیک وقت خطاب کرتی ہے۔ اور دونوں بیک وقت اپنی اپنی سطح کے مطابق اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

دوسری اہم بات قرآن مجید کے طالب علم کو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن مجید اجتماعی، اقتصادی، اور مادی معاملات کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے زیادہ اعتناء کرتا ہے معاملات کے خالص انتظامی اور دنیاوی پہلوؤں کے مقابلہ میں قرآن پاک کی زیادہ دلچسپی ان امور کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے ہے۔ یقیناً معاملات کے دنیاوی اور مادی پہلو قرآن کریم نے نظر انداز نہیں کیے، لیکن ان سے قرآن کریم کی دلچسپی جزوی ہے۔ قرآن کریم کی اصل دلچسپی معاملات کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے ہے۔ خاص طور پر ان پہلوؤں پر قرآن کریم زیادہ زور دیتا ہے جہاں انسانوں سے کسی قسم کی غلطی یا بھول چوک کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ جہاں انسانوں سے ماضی میں غلطیاں ہوئی ہوں یا آج غلطیاں ہو رہی ہوں یا آئندہ غلطی ہونے کا امکان ہو، ان معاملات پر قرآن کریم نے خصوصی زور دیا ہے اور انسانوں کی رہنمائی کا پورا پورا بندوبست کیا ہے۔ جو معاملات انسان اپنی عقل اور تجربے سے دریافت کر سکتا ہے، وہ قرآن کریم نے بیان نہیں کیے۔ قرآن کریم یہ بیان کرنے کے لیے نہیں آیا کہ سڑکیں کیسی بنائی جائیں۔

بیماریوں کا علاج کیسے کیا جائے، عمارتیں کیسے بنائی جائیں۔ یہ وہ معاملات ہیں جو انسان اپنے تجربے سے، مشاہدے سے اور غور وفکر سے خود معلوم کر سکتا ہے۔ معاشیات کے باب میں بھی یہ دونوں پہلو بیک وقت موجود ہیں۔ معاشیات کا سب سے بنیادی، اہم اور اساسی پہلو وہ ہے جس کو ہم معیاراتی یعنی normative پہلو کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس کا تعلق اخلاقی معیارات اور اخلاقی اصولوں سے انتہائی گہرا ہے۔ جس کا تعلق روحانی اور دینی معاملات سے ہمیشہ سے قائم رہا ہے اور قائم رہنا چاہیے۔

دوسری طرف معاشیات کے بعض معاملات وہ ہیں جو خالص تجربے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کپڑے کا کاروبار کیسے کیا جائے؟ زرعی پیداواروں کی تجارت کو کیسے فروغ دیا جائے، کسی خاص زمانہ یا علاقہ میں تجارت کو کامیاب بنانے کے لیے وہ کیا کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو جائز ہوں، جو اخلاق اور کردار کے تقاضوں کے مطابق ہوں، بازار کہاں اور کیسے بنائے جائیں۔ یہ معاشیات کے وہ پہلو ہیں جو خالص تجربی اور مشاہداتی ہیں۔ انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے، مطالعہ اور غور وفکر سے اس طرح کی انتظامی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے اور ان کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے اور قرآن مجید کی شرح اور تفسیر، سنت نبوی، نے ان معاملات کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔

قرآن مجید اور سنت کی توجہ کا مرکز وہ معاشی معاملات ہیں جن میں nornative پہلو بہت نمایاں ہیں۔ دولت کو کیسے حاصل کیا جائے، کہاں خرچ کیا جائے، کیسے خرچ کیا جائے، کون کون سے معاملات جائز ہیں، کون کون سے معاملات نا جائز ہیں۔ کاروبار وتجارت کے بنیادی اخلاق واصول کیا ہونے چاہئیں۔ انسانوں کا آپس کا لین دین، تجارت اور مالی تعاون کس نہج پر استوار ہونا چاہیے۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے بنیادی ہدایات دی ہیں۔

قرآن کریم کا ایک اسلوب اور بھی پیش نظر رہنا چاہیے، وہ یہ کہ یہ کتاب دنیا کی دوسری کتابوں کی طرح انسانوں کی تصنیفات کے انداز پر موضوعات کے حساب سے مرتب نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی سورۃ الاقتصاد ہو، یا سورہ معاشیات ہو، سورہ مالیات ہو، سورہ تجارت ہو۔ یہ قرآن کریم کا اسلوب نہیں ہے۔ یہ اسلوب انسانوں کی تصنیفات میں اور انسانوں

کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب انسانی کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔قرآن کریم میں مختلف مضامین کو اس طرح سے جا بجا، نئے نئے انداز میں، نئے نئے طریقوں سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف پہلو پڑھنے والوں کے، سننے والوں کے اور قرآن کریم کے طلبہ کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ چنانچہ بعض اوقات سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے ضمن میں، کہیں عبادات کے سیاق وسباق میں، کہیں روز قیامت کی باز پرس کے سیاق وسباق میں، کہیں عبادات اور دوسرے احکام پر بات کرتے ہوئے قرآن مجید میں جا بجا ایسی ہدایات رکھ دی گئی ہیں جو معاشی نوعیت کی ہیں۔

جس طرح کسی بڑی عمارت میں جا بجا حسب موقعہ خوبصورت پتھر جڑ دیے جاتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ ہدایات کے یہ موتی رکھ دیے گئے ہیں۔ جب قرآن مجید کا ایک قاری کسی بھی سورت کی تلاوت کرتا ہے، چاہے اس میں براہ راست احکام بیان نہ ہوئے ہوں، لیکن جب وہ پڑھتا ہے تو پڑھتے پڑھتے ایسی بہت سی چیزیں اس کے ذہن نشین ہوتی جاتی ہیں جو انسان کے رویے کی تشکیل میں مدومعاون ثابت ہوتی ہیں۔

انسان کے رویے کی تشکیل، انسان کی ذہن سازی، کردار سازی اور اخلاق کی تعمیر، یہ اہداف قرآن مجید کا سب سے بڑا مقصود ہیں۔ ایک مرتبہ یہ کردار سازی ہو جائے، ایک مرتبہ مناسب رویے کی تشکیل ہو جائے تو پھر یہ رویہ معاشیات میں بھی جھلکتا ہے، سیاسیات میں بھی جھلکتا ہے اور زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں میں بھی نظر آتا ہے۔ اسی لیے جہاں جہاں قرآن مجید اس طرح کے مضامین کو بیان کرتا ہے، وہاں جگہ جگہ کہیں کوئی معاشی انداز کی ہدایت ہے، کہیں کوئی ثقافتی رہنمائی ہے، کہیں اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی ہدایات ہیں۔ کہیں انسانوں کے درمیان آپس کے میل جول اور تعاون کا تذکرہ ہے۔ اس طرح سے قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا جب بار بار اس کی تلاوت کرتا ہے، تو جہاں اور بہت سے حقائق اس کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں، وہاں اسلام کی معاشی تعلیم کی اساس اور بنیاد بھی اس کے ذہن میں پوری طرح سے راسخ اور مرتسم ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی یہ ہدایات اگر یکجا کی جائیں، ان کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی فہرست

بنائی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جزوی معاشیات سے متعلق ہدایات بھی ہیں اور کلی معاشیات سے متعلق ہدایات بھی ہیں۔ یعنی قرآن مجید نے Micro-Economics کے مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے اور Macro-Economics کے مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک فرد کا معاشی رویہ کیا ہونا چاہیے، معاشرے اور ریاست کی ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں۔ بحثیت مجموعی عامۃ الناس کی معاشی بھلائی کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ ان تصورات کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے اپنے اپنے زمانوں میں، اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے، اپنے اپنے تہذیبی تقاضوں کے لحاظ سے اس معاشی نظام کی تشکیل کی ہے جس کو ہم اسلام کا نظام معیشت یا نظام تجارت قرار دے سکتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں ایک طویل زمانہ ایسا گزرا ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ دنیا کی ہر قوم کی تاریخ میں ایسا زمانہ گزرا ہے جب معاشی سرگرمی کے بڑے بڑے میدان صرف دو تھے، زراعت اور تجارت۔ ان دونوں کے مقابلہ میں صنعت کاری کا معاملہ بہت بعد میں سامنے آیا ہے، دست کاری نے ترقی بہت بعد میں کی ہے۔ اجتماعی تجارت یعنی Carporate trade or finance بہت حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔

جس زمانے میں قرآن کریم نازل ہوا، اس زمانے میں پوری دنیا میں جو تجارت ہو رہی تھی، اس کا بڑا حصہ زراعت پر اور زرعی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ بہت تھوڑا حصہ تھا جس کا تعلق غیر زرعی مصنوعات سے رہا ہو۔ اس لیے جب فقہائے اسلام نے پہلی صدی ہجری کے اواخر سے لے کر اور دوسری صدی ہجری کے اواخر تک کے زمانہ میں فقہی احکام کی ترتیب کا آغاز کیا اور بعد میں ان کے تلامذہ نے پورے فقہی مکاتب مرتب کر دیے۔ تو انہوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اسلام کی معاشی تعلیمات کو بھی مرتب کیا، اپنے اجتہادات سے اس زمانے میں پیش آئندہ مسائل کا جواب دینے کی کوشش کی۔

جس زمانے میں امام محمد بن حسن الشیبانی فقہ حنفی کے وہ ابواب مرتب کر رہے تھے جن کا تعلق معاملات سے ہے تو وہ بازار میں جا کر بیٹھا کرتے تھے، دوکانداروں کو کاروبار کرتے دیکھا کرتے تھے، خریداروں کے انداز خریداری کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کاروبار اور تجارت کی کون کون سے شکلیں ہیں جو کوفہ کے بازار میں رائج ہیں یا بغداد کے بازار میں رائج

ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں بزنس ایڈمنسٹریشن Business Administration کا علم حاصل کر رہے تھے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کا علم حاصل کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ان کے زمانے میں، ان کے علاقے میں، ان کی قوم میں تجارت اور کاروبار، معیشت و تجارت کی کتنی شکلیں رائج ہیں۔ کون کون سی صورتیں ہیں جن کے ذریعہ لوگ آپس میں لین دین کر رہے ہیں، تاکہ ان صورتوں کے جائز اور ناجائز ہونے کے بارے میں وہ قرآن کریم اور سنت کے احکام کی روشنی میں کوئی فتویٰ دے سکیں۔

اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک قرآن کریم اور سنت رسول ؐ کی تعلیم کا تعلق ہے تو وہ ایک دائمی اساس ہے، جو ہمیشہ رہے گی۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر ہمیشہ عمارت کی تعمیر ہوتی رہے گی۔ ان دو بنیادوں کے ساتھ ساتھ ائمہ اسلام کے وہ اجتہادات بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جس پر اتفاق رائے رہا ہے۔ جن پر اسلامی تاریخ میں تسلسل کے ساتھ عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ ان کی حیثیت بھی اسی طرح دائمی ہے جس طرح قرآن کریم اور سنت ثابتہ کی حیثیت دائمی ہے۔ لیکن وہ اجتہادات جو ائمہ فقہ نے اپنے زمانے کے لحاظ سے کیے ہیں، چاہے وہ دوسری صدی ہجری کے ائمہ فقہ ہوں یا تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے ائمہ فقہ ہوں۔ ان اجتہادات میں ایسے تمام امور جن کا تعلق خاص ان کے زمانے یا ان کے علاقے سے ہے، یا ایسے رواج سے ہے جو اس علاقے میں یا اس زمانے میں پایا جاتا تھا، اور آج وہ رواج ختم ہو گیا۔ ایسے تمام احکام پر نظر ثانی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے نظام معیشت و تجارت کی عملی تفصیلات ہر زمانے میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ یہ تفصیلات مختلف زمانوں کے لحاظ سے مختلف انداز سے مرتب کی جا سکتی ہیں۔ مختلف علاقوں کے لحاظ مختلف ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ماضی کے کسی ایسے رواج یا طریقہ کار کو جس کی بنیاد محض اجتہاد یا عرف و عادت پر ہو لازمی طور پر باقی رکھنا اور اس کے باقی رہنے پر اصرار کرنا درست نہیں ہے۔ یہ قرآن کریم اور سنت رسول کا منشا نہیں ہے۔ جس تعلیم کو بقا ہے، جس حکم کو دوام ہے وہ قرآن مجید کے احکام ہیں، وہ سنت رسول ؐ کے احکام ہیں اور ائمہ اسلام کے متفقہ اجتہادات ہیں۔ اس لیے اس پہلی گفتگو میں یہ بات انتہائی مناسب اور ناگزیر ہے کہ قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں ان بنیادی احکام اور تصورات کو یکجا کر دیا جائے جن کا تعلق انسان کی معاشی

زندگی اور تجارت سے ہے۔

قرآن کریم نے کئی بار یہ بات واضح کی ہے کہ انسانی زندگی کے بارے میں بنیادی ہدایات فراہم کرنا، صرف اللہ کا کام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ انسان کو خود انسان سے زیادہ جانتا ہے وہ اس کی کمزوریوں، اس کی ضرورتوں اور اس کی خوبیوں سے خود انسان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ واقف ہے اور کہیں زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اس لیے وہ انسانوں کو نظام دینے کا بھی مستحق ہے۔ وہ اس بات کا بھی حق دار ہے کہ انسانوں کے لیے قوانین وضع کرے۔ وہ اس کا بھی حقدار ہے کہ انسانوں کے برے اور بھلے کا تعین کرے۔ ''ألا یعلم من خلق'' کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ نہیں جانتا کہ انسان کیا ہے اور اس کی ضروریات کیا ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں فسق وفجور اور تقویٰ اور للٰہیت دونوں کے دواعی رکھے ہیں۔

انسان کے اندر جہاں اچھائیاں موجود ہیں، جہاں مثبت اور تعمیری رجحانات ہیں، وہاں انسان کے مزاج میں بعض منفی رجحانات بھی موجود ہیں، بعض تخریبی تقاضے بھی انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان دونوں تقاضوں اور دونوں رجحانات کے درمیان ایک کشمکش انسان کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہی ہے۔ یہ کشمکش اگر حدود کی پابند نہ بنائی جائے، تو پھر انسان کے اندر جو منفی رجحانات ہیں وہ غالب آ جاتے ہیں۔ مثبت رجحانات دب جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو پھر انسان کی زندگی کے سارے پہلو مختل ہو جاتے ہیں۔ معاشی زندگی بھی اس اختلال سے محفوظ نہیں رہتی۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہوس اور زر پرستی اور حرص ولالچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ لالچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ کبھی کبھی اس پر شہوات کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ بہت سے حقائق اور نازک ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ بعض اوقات لالچ اور ہوس اتنی شدت سے انسان پر مسلط ہوتے ہیں کہ اس میں اپنے اور پرائے کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس لیے اخلاقیات اور روحانیات کا، انسان کی معاشی زندگی سے انتہائی گہرا تعلق ہے۔

لوگوں کے معاشی حقوق کا تحفظ، انسانوں کے جان ومال کا تقدس اور انسانوں کے لیے ایک ایسے ماحول کی فراہمی جہاں ہر شخص جائز طریقے سے اپنی صلاحیتوں کے مطابق روزی کما سکے۔ یہ سب انتہائی ناگزیر امور ہیں۔ ان سب امور کا تعلق اخلاقیات سے بہت گہرا ہے۔ اگر

انسان اخلاقی اصولوں پر کاربند نہ ہوں، معاشرے میں روحانی اقدار جاری اور ساری نہ ہوں تو یہ سب کام سکون اور اطمینان کی فضا میں انجام نہیں دیے جا سکتے۔

قرآن مجید نے انسان کی جو بنیادی ذمہ داریاں بتائی ہیں وہ تین طرح کی ہیں۔ ایک ذمہ داری تو وہ ہے جس کا تعلق انسان اور پوری کائنات سے ہے۔ ایک ذمہ داری وہ ہے جس کا تعلق انسان اور اس روئے زمین سے ہے جہاں وہ آباد ہے۔ تیسری ذمہ داری وہ ہے جس کا تعلق صرف خالق کائنات سے ہے۔ یوں تو ساری ذمہ داریوں کا تعلق خالق کائنات سے ہے، اس لیے کہ اسی نے پیدا کیا ہے، ذمہ داریاں بھی اسی نے دی ہیں۔ لیکن ایک خاص پہلو سے دیکھا جائے تو یہ تین ذمہ داریاں سامنے آتی ہیں۔ جب اللّٰہ نے انسان کو پیدا کیا اور فرشتوں کے سامنے پیدائش آدم کا ذکر کیا، تخلیق آدم کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ وہاں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ایک جانشین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اللّٰہ کا جانشین گویا اللّٰہ کی تمام مخلوقات سے افضل ہوگا۔ بقیہ مخلوقات کو تو جانشینی عطا نہیں ہوئی۔ اس لیے جس مخلوق کو جانشینی عطا ہوئی ہے وہ ان تمام مخلوقات سے افضل ہوگی جن کو جانشینی کی ذمہ داری عطا نہیں فرمائی گئی۔ گویا خلافت وہ ذمہ داری ہے، جس کا تعلق پوری کائنات سے ہے، جس کا اثر پوری کائنات پر پڑتا ہے۔

دوسری ذمہ داری وہ ہے جس کا تعلق صرف ذات الٰہی سے ہے۔ ''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون''۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ یہ ذمہ داری صرف اللّٰہ کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ انسان اور اللّٰہ کے درمیان براہ راست ربط اسی ذمہ داری کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔

تیسری ذمہ داری وہ ہے جس کا تعلق اس روئے زمین سے ہے۔ اس ذمہ داری کا کئی آیات میں مختلف انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ ''واستعمر کم فیھا''۔ اللّٰہ تعالیٰ نے تم سے یہ بات طلب کی ہے کہ تم اس روئے زمین کو آباد کرو۔ تعمیر ارض یا عمارت ارض، عمارت زمین یا تعمیر زمین کو انسان کا فریضہ بنایا گیا ہے۔ اسی لیے زمین کو انسانوں کے لیے متاع کہا گیا۔ کہ اس زمین میں تمہارے لیے متاع ہے۔ یعنی ایک ایسا وقفہ ہے جس میں تم اس زمین کی نعمتوں سے متمتع ہو سکتے ہو۔ لذت اندوز ہو سکتے ہو۔ زمین سے لذت اندوز ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کو آباد کیا جائے۔

اگر کوئی انسان کسی ریگستان میں پہنچ جائے، وہاں وہ تمتع حاصل نہیں کر سکتا۔ تمتع کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ریگستان کو گل وگلزار میں تبدیل کیا جائے۔ جب وہ ریگستان گل وگلزار میں تبدیل ہو جائے گا تو پھر وہ انسان اس سے متمتع ہو سکے گا۔ لہٰذا متاع کا لفظ اس بات کا واضح طور پر غماز ہے کہ انسان کو اس روئے زمین کو آباد کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ زمین کی آبادکاری کے بارے میں قرآن کریم نے اور احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے متعدد ہدایات دی ہیں۔

عمارۃ الارض سے متعلق جو یہ آیت کریمہ ہے "**واستعمركم فيها**" اس کی تفسیر میں مشہور مفسر قرآن اور محدث ومؤرخ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس زمین کا آبادکار بنایا ہے۔ تم اس کو آباد کرو گے، اس سے رزق حاصل کرو گے، اس میں کاشت کرو گے اور اس سے وہ تمام فوائد اٹھاؤ گے جو تمھیں اٹھانے چاہئیں۔

علامہ قرطبی جو قرآن کریم کے ایک بہت مشہور مفسر ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین کی آبادی کاری اور تعمیر زمین، انسانوں کے ذمے فریضہ ہے، یہ کام دینی طور پر فرض اور واجب ہے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا حکم دیتا ہے یا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے تو وہ مطالبہ یا حکم فرضیت یا وجوب کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے یہاں یہ بات ماننے کے مضبوط قرائن موجود ہیں، کہ تعمیر زمین کی ذمہ داری انسان کے ذمے ایک فریضے کی حیثیت رکھتی ہے، اور انسان کا یہ کام ہے کہ اس زمین کو آباد کرے۔

آبادی زمین یا تعمیر ارض وہ چیز ہے جس کو مزید وضاحت کی خاطر ترقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جب زمین کو آباد کیا جائے گا تو زمین ترقی کرے گی، زمین کی پیداوار ترقی کرے گی۔ یہ بات مفسرین اسلام نے صراحت سے ارشاد فرمائی ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص الرازی، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے حنفی فقیہ اور مشہور مفسر قرآن ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اس لفظ سے، یعنی "واستعمركم فيها" کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعمیر زمین کا کام واجب ہے۔ تعمیر زمین زراعت کے ذریعے ہو۔ شجرکاری کے ذریعے ہو، باغات کے ذریعے ہو، تعمیرات کے ذریعے ہو، عمارتیں بنا کر ہو، جس انداز سے بھی جس زمین کی آبادکاری کی جائے گی، وہ قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل ہو گی جس میں انسانوں کو اس زمین کو آباد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

زمین کی آبادکاری، زراعت، شجرکاری، تعمیرات، ان سب کا تعلق ایک اعتبار سے عمل

صالح سے ہے۔ قرآن مجید نے عمل صالح کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں سینکڑوں مقامات پر ایمان کے ساتھ عمل صالح، اور دوسری نیکیوں کے ساتھ بھی عمل صالح کا تذکرہ کیا گیا۔ عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو خود انسان کے لیے یا انسانیت کے لیے مفید اور فائدہ مند ہو۔ چاہے وہ اِس دنیا میں فائدہ مند ہو یا اُس دنیا میں فائدہ مند ہو۔

صالح کا لفظ اسی مادے سے نکلا ہے جس سے مصلحت کا لفظ نکلا ہے، جس سے صلاح کا لفظ نکلا ہے۔ انسانوں کی اس دنیا میں صلاح اور اصلاح قرآن کریم کا مقصود اولین ہے۔ مجتہدین اسلام نے لکھا ہے کہ قرآن کریم اور سنت کے ہر حکم کی پشت پر لازماً کوئی نہ کوئی مصلحت اور حکمت موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا مصلحت، صلاح اور اصلاح ان سب کا قرآن مجید اور اسلامی شریعت سے گہرا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو شریعت الٰہی کے مطابق ہو، جس کا مقصد آخرت میں انسانوں کی کامیابی، اِس دنیا میں انسان کی کامیابی، آخرت میں انسانوں کی فلاح و بہبود یا اِس دنیا میں انسانوں کی فلاح و بہبود ہو۔ معاشی ثمرات اور اہمیت کے اعتبار سے عمل صالح کے مقام و مرتبہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جب قرآن کریم عمل صالح پر زور دیتا ہے، انسانوں کو عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے تو اس میں معاشی سرگرمی اور پیداواری سرگرمی بھی شامل ہوتی ہے۔ یقیناً عمل صالح کے بہت سے درجات ہیں۔ عمل صالح کے بہت سے مدارج اور مراحل ہیں۔ عمل صالح کا سب سے اونچا درجہ وہ ہے جس کے نتیجے میں انسان کا براہ راست اللہ سے تعلق مضبوط ہو جائے۔ خالص عبادات مثلاً خالص ذکر الٰہی ہے، نماز اور روزہ ہے، یہ عمل صالح کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ ایسے اعمال آتے ہیں جو اپنی سطح پر، اصلاح، صلاح اور مصلحت کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ طلب رزق بھی عمل صالح کی ایک قسم اور ایک درجے میں شامل ہے۔ ایک روایت جس سے اکثر پاکستانی واقف ہیں، اس لیے کہ پاکستان میں کرنسی نوٹوں پر یہ چھپی ہوتی تھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ طلب رزق حلال عبادت ہے۔ اگر یہ سرگرمی عبادت ہے تو وہ عمل صالح میں بھی شامل ہے۔

اللہ کی شریعت نے جہاں انسانوں کو عمل صالح اور معاشی سرگرمی میں حصہ لینے کا حکم دیا ہے، وہاں یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ انسانوں کے رزق کا بندوبست اس پوری زمین میں اور زمین کے قرب و جوار میں پائی جانے والی مخلوقات میں کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ یہ مضمون

مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ احادیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ جس میں رزق کی دستیابی، وسائل رزق کی فراہمی اور حصول رزق کے لیے کوشش کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آیا ہے کہ ''وفی السماء رزقکم و ما توعدون'' اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں تمھارا رزق پیدا کر دیا ہے، اور جن جن چیزوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ان سب کا بندوبست اور سامان موجود ہے۔ ایک جگہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے، ایک روایت میں جس کو طبرانی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے، حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ ''جس طرح انسان کی موت اس کا پیچھا کرتی ہے اور مقررہ وقت پر اس کو آلیتی ہے، جس سے بچنا انسان کے بس میں نہیں ہے، اس طرح سے انسان کا رزق بھی انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ جو رزق اللہ نے انسان کے لیے لکھ دیا ہے، وہ اس کو ہر صورت ملے گا۔ ابن ماجہ کی ایک روایت ہے ''ان النفس لن تموت حتی تستکمل رزقھا''۔ کسی ذی روح کو موت نہیں آئے گی، کسی انسانی جان کو موت نہیں آئے گی، جب تک وہ اپنا لکھا ہوا رزق پورا کا پورا حاصل نہ کر لے۔ چونکہ رزق اور وسائل رزق سب کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے، اور ہر انسان کا حصہ اللہ نے اپنے علم میں مقرر کر دیا ہے، اس لیے انسان کو طلب رزق میں اعتدال اور اجمال سے کام لینا چاہیے۔ آپ نے جمعہ کے خطبوں میں یہ حدیث بارہا سنی ہوگی ''واجملوا فی الطلب و توکلوا علیہ''۔ دنیا کی طلب میں، مال و دولت کے حصول میں، روزی کی تلاش میں، اجمال یعنی اعتدال سے کام لو، آپے سے باہر نہ ہو، اپنی تمام دینی مصروفیات کو نظر انداز نہ کرو، اپنے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کو نہ بھولو۔ زندگی کی اعلیٰ تر، اہم تر اور برتر ذمہ داریوں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ حصول رزق کے لیے اعتدال اور اجمال کے ساتھ کوشش کی جائے تو یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ لیکن تمام جسمانی تقاضوں کو ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے، مادی وسائل ہی پر سارا دارو مدار ہو اور انسان رزق کی تلاش میں اپنے روحانی منصب کو بھول جائے، دینی ذمہ داریوں کو فراموش کر دے، اخلاقی تقاضوں کو پس پشت ڈال دے تو یہ رویہ معیاری اور مثالی اسلامی رویہ نہیں ہے۔

اس رویے کا توکل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ اسی حدیث حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''واجملو فی الطلب و توکلوا علیہ''۔ جہاں مادی وسائل کے حصول میں، مال و دولت کی تلاش میں اجمال سے کام لو، وہاں اللہ پر توکل بھی کرو۔ توکل کے معنی ہیں ان تمام جائز

اسباب اور جائز وسائل و ذرائع کو شریعت کی حدود کے اندر استعمال کرنا جو حصول رزق کے لیے نا گزیر ہیں اور پھر نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ دینا۔ ہر دور کے وسائل اور اسباب بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دور کے ذرائع رزق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ نئے نئے وسائل، نئے نئے اسباب سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان نئے نئے اسباب اور وسائل میں کچھ جائز ہوتے ہیں، کچھ ناجائز ہوتے ہیں۔ جائز وسائل کو اختیار کرنا، اعتدال اور اجمال کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، دینی ذمہ داریوں کو نباہتے ہوئے، اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، اور اپنے اعلیٰ روحانی اور ملکوتی منصب کا خیال رکھتے ہوئے، یہ سب کام بیک وقت کیے جائیں تو یہ اللہ کی شریعت کے مطابق عبادت سے کم نہیں ہے۔

قرآن مجید نے جا بجا انسانوں کو یہ یاد دلایا ہے کہ اخروی مناصب اور روحانی مقامات کا حصول دنیوی زندگی کے تقاضوں سے متعارض نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہو سکتے ہیں اگر دونوں کو شریعت کے مطابق انجام دیا جائے۔ مثال کے طور پر، مشہور آیت جو اکثر بیان کی جاتی ہے، اس کی صحیح تفسیر یہی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ولا تنس نصيبك من الدنيا و احسن كما احسن الله اليك" اس دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو، اور جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے یعنی تمھیں دیا ہے، تم بھی لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ یعنی اپنے رزق میں اللہ کی مخلوق کا حصہ نکالنا مت بھولو۔ اللہ نے ہر ایک کے رزق میں دوسرے انسانوں کا حصہ رکھا ہے۔ جس طرح تمھیں اللہ نے دیا ہے، تم دوسروں کو دینے کا ذریعہ بنو۔

اسی آیت مبارکہ میں اس کے ساتھ ساتھ ارشاد ہوا ہے "ولا تبغ الفساد في الارض"۔ زمین میں فساد اور سرکشی کی کوشش نہ کرو۔ مال و دولت کی اگر زیادتی ہو، اسباب رزق کی فراوانی ہو، وسائل دنیا کی جب بہتات ہو تو انسان اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے۔ جب انسان اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے، اپنے اعلیٰ روحانی منصب کو فراموش کر دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے فساد سے بچتے رہنا، یہ مال و دولت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح ایک دوسری مشہور آیت جس میں قرآن کریم نے ایک دعا سکھائی ہے جو ہم میں سے اکثر لوگ نماز میں پڑھتے ہیں۔ "ربنا اتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة

وقنا عذاب النار"۔ یہاں اللہ سے دنیا میں بھی اچھائی مانگنے کی تلقین کی گئی، آخرت میں بھی اچھائی مانگنے کی تلقین کی گئی اور جہنم کے عذاب سے بچانے کی اور محفوظ رکھنے کی دعا بھی سکھائی گئی۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ جب دنیا میں انسان کو حسنات، یعنی اچھائیاں ملتی ہیں، دنیا کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو فساد کا داعیہ بعض اوقات مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس داعیے کو حدود میں رکھنے کے لیے اور نیکی کی قوتوں کے تابع بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ سے رہنمائی اور مدد طلب کی جائے۔

یہ مال و دولت، یہ وسائل جو اللہ نے روئے زمین پر پیدا کیے ہیں۔ یہ انسانی معاشرے کے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انسانی جسم کے لیے خون کی ہے۔ قرآن کریم نے مال و دولت کو قیام للناس کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ یعنی مال انسانوں کے لیے زندگی کا سبب ہے، زندگی کو برقرار رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ اور ایک اہم وسیلہ مال و دولت ہے۔ جس طرح انسانی زندگی خون کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی معاشرتی یا اجتماعی زندگی، معاشی سرگرمی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اور معاشی سرگرمی کے لیے مال و دولت کا ہونا وسائل رزق اور اسباب پیداوار کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے اسباب رزق اور وسائل پیداوار کی حیثیت قیام للناس کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مال کی محبت فطری طور پر انسان میں پیدا کر دی ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے: "وانہ لحب الخیر لشدید"۔ انسان مال کی محبت میں انتہائی شدید ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: "وتحبون المال حبا جما"، تم مال سے بہت ٹوٹ کر محبت کرتے ہو۔ ایک جگہ آیا ہے کہ انسانوں کے لیے جو چیزیں مزین اور خوبصورت بنا دی گئیں وہ ساری دنیوی نعمتیں اور شہوات ہیں۔ جن میں دوسری نعمتوں کے ساتھ ساتھ سونے چاندی کے ڈھیروں کا بھی ذکر ہے۔ "والقناطیر المقنطرۃ من الذھب و الفضۃ"۔

یہ سب وہ متاع دنیا ہے جو اللہ نے سب کے لیے اس دنیا میں رکھا ہے، اور اس کی محبت فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ محبت اگر حدود کے اندر رہے، انسان کی بڑی ذمہ داریوں کو فراموش کرنے کا ذریعہ نہ بنے تو اس محبت کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر مال کی محبت بڑھ جائے اور حدود سے نکل جائے تو پھر یہ ناپسندیدہ ہے۔ جو لوگ مال و

دولت کو سینت سینت کر رکھتے ہیں ان کی اس حرکت کو اللہ نے سخت ناپسند کیا ہے۔قرآن کریم میں کئی جگہ دولت جمع کرنے والوں کو، دولت کے خزانے اکھٹے کرنے والوں کو، دولت کو خرچ نہ کرنے والوں کو سخت ناپسندیدگی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو زر و جواہر کو جمع کر کے رکھیں، بار بار گن گن کر دیکھتے رہیں، اور یہ سمجھیں کہ یہ دولت ان کو دنیا کی ہر کامیابی اور آخرت کی نجات عطا کر دے گی، وہ غلط خیالات میں مبتلا ہیں۔

خاص طور پر قرآن کریم میں شدید وعیدیں ان دولت جمع کرنے والوں کے لیے آئی ہیں جو اپنی دولت پر عائد دینی ذمہ داریاں انجام نہ دیں۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی جہاں جہاں تلقین ہے وہاں خرچ نہ کریں، دولت کی زکوٰۃ ادا نہ کریں، نفقات واجبہ کے تقاضے پورے نہ کریں، صدقات واجبہ ادا نہ کریں اور جہاں جہاں ایک صاحب دولت سے دولت کو خرچ کرنے کی امید کی جانی چاہیے، وہاں خرچ نہ کریں تو یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے اور ایسے لوگوں کو قرآن کریم نے عذاب الیم یعنی دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

دولت کی اس محبت کے باوجود معاشی حالت میں فرق ایک فطری بات ہے۔ جس طرح دولت کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ کسی کے دل میں بہت ہوتی ہے، کسی کے دل میں برائے نام ہوتی ہے، کسی کے دل میں بالکل نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اپنے اخلاق اور تربیت سے، اپنے دینی شعور سے کام لے کر دولت کی محبت کو دل سے نکال دیتے ہیں، بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے دل سے کبھی یہ محبت نہیں نکلتی۔ جس طرح یہ فرق فطری ہے، اسی طرح انسانوں کی معاشی حالت میں فرق بھی فطری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتوں میں فرق بھی فطری طور پر رکھا ہے۔ انسانوں میں محنت اور عزائم میں کمی بیشی ہوتی ہے، علاقوں اور زمانوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ بعض علاقے ایسے ہیں کہ جو معاشی سرگرمی کے لیے بہت سازگار ہوتے ہیں۔ بعض علاقے کم سازگار ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمانوں کا اختلاف ہوتا ہے۔

ان سب اسباب کی بنا پر انسانوں کی معاشی حالت میں فرق بھی ایک فطری بات ہے، اور اگر یہ فرق اپنی معقول حدود سے تجاوز نہ کرے تو یہ ناپسندیدہ بات نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا کہ "و رفعنا بعضکم فوق بعض درجات"۔ ہم نے مال و دولت اور رزق کے معاملے میں کچھ لوگوں کا درجہ کچھ اور لوگوں سے اونچا رکھا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ انسانوں کے کام آپس

کے تعاون اور لین دین سے چلتے ہیں۔اس آپس کے تعاون میں خرید وفروخت بھی شامل ہے، لین دین بھی شامل ہے، مزدوری بھی شامل ہے، تجارتیں اور بڑے بڑے کاروبار بھی شامل ہیں۔اس پورے عمل میں کسی کی حیثیت ایک عامل کارکن کی ہوگی، کسی کی حیثیت کارکنوں کے درمیان ربط پیدا کرنے والے کی ہوگی، تنسیق پیدا کرنے والے کی ہوگی۔کسی کی حیثیت پالیسی بنانے والے کی ہوگی۔

اس لیے اگر لوگوں کی صلاحیتوں میں اور معاشی حالت میں فرق نہ ہوتو یہ سارے کام نہیں ہوسکتے۔اگر سب کی معاشی کیفیت وہ ہو جو مزدور کی ہوتی ہے تو پھر پورا ملک مزدوروں سے بھرا ہوگا، مزدوروں سے کام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔اگر پوری آبادی کی معاشی حالت اور صلاحیت وہ ہو جو ایک بڑی کارخانہ دار کی ہوتی ہے تو پھر سب اپنے دفتروں میں اور گھروں میں انتظار ہی کرتے رہیں گے کہ کام کرنے والے آئیں اور کام کریں۔اس لیے کام کو آگے بڑھانے کے لیے منظم انداز میں وسائل رزق کو استعمال کرنے کے لیے، ترقی اور تعمیر کی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے محنتوں میں، صلاحیتوں میں، آمدنیوں میں یہ تفاوت ناگزیر ہے۔قرآن مجید میں اس تفاوت کو کئی جگہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ایک جگہ کہا ہے کہ کیا اللّٰہ کی معیشت یا رحمت کو تم تقسیم کرتے ہو؟ کیا یہ لوگ لوگوں کی معیشتوں کو تقسیم کرتے ہیں، ہم نے اسباب معیشت کو تقسیم کیا ہے اور بعض کے درجات بعض سے بلند کیے ہیں۔ایک جگہ کہا ہے کہ آپ اعلان کر دیجیے کہ میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کھول دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر اللّٰہ تعالیٰ نے کسی کو صلاحیتیں زیادہ عطا فرمائی ہیں، کچھ وسائل زیادہ عطا فرمائے ہیں تو تم اس کی تمنا مت کرو۔تم تمنا اسی کی کرو جو تمہارے لیے لکھا ہے، اسی کی کوشش کرو۔اس لیے کہ جو چیز تمہارے لیے نہیں لکھی اس کے حصول کی کوشش کرنا وقت کا ضیاع ہے۔پاکستان کے سولہ کروڑ انسانوں میں سے ایک ہی صدر پاکستان ہوسکتا ہے۔اس لیے اگر سب لوگ اس بات کا اعتراف کرلیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ صدر کا منصب ایک ہی کو مل سکتا ہے، سولہ کروڑ کو نہیں مل سکتا تو کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔لیکن اگر سولہ کروڑ انسانوں میں سولہ سو انسان بھی ملک کا صدر بننے کی اس کوشش میں لگ جائیں تو ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس لیے اللّٰہ کی اس حکمت اور مشیت بالغہ پر غور کیا جائے تو اس کی حکمت واضح طور پر

سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انسانوں کے نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے ناگزیر ہے کہ اسباب رزق اور وسائل معیشت میں تفاوت رکھا جائے۔ یہ تفاوت فطری طور پر ہونا چاہیے۔ اللہ کی بیان کردہ حدود کے درمیان رہنا چاہیے۔ مصنوعی طور پر یہ تفاوت پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اس تفاوت کو معقول حدود سے نکلنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اگر کچھ لوگ بہت غریب ہوں، کچھ بہت دولت مند ہوں تو یہ ناپسندیدہ صورت حال ہے۔ دولت کا ارتکاز جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے معاشرے کے ایک طبقے میں محدود ہو جائے تو یہ ناپسندیدہ صورت حال ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

عام طور پر معاشی قوتوں کے اور بازار کے رجحانات کے آزادانہ عمل اور تعامل کے نتیجے میں جو تقسیم دولت کا عمل ہو، جس میں انسان کے تقاضے مجروح نہ کیے گئے ہوں، وہ ایک فطری صورتحال ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ طبقات جو معاشرے میں معاشی اعتبار سے کمزور ہیں، ان کی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ ریاست اسلامی کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جس کی تفصیل ہم آگے چل کر ایک خطبے میں بیان کریں گے۔

چونکہ قرآن مجید کی رو سے ہر چیز کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے، اور اس نے انسانوں کو تمام چیزوں کے استعمال کرنے کی اجازت بطور امین اور اپنے جانشین کے دی ہے، اس لیے تمام انسان اللہ کے پیدا کیے ہوئے تمام وسائل رزق پر یکساں حق رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے کسی شخص کو نہ ذخیرہ اندوزی کی اجازت ہے، نہ عامۃ الناس کو ناجائز طریقے سے کسی روزی سے محروم کرنے کی اجازت ہے، نہ وسائل رزق پر پابندی لگانے کی اجازت ہے، نہ وسائل رزق کو جو سب کے لیے اللہ نے پیدا کیے ہیں ایک طبقے کے لیے محدود کر دینے کی اجازت ہے۔

قرآن مجید نے واضح طور پر کئی بار اعلان کیا ''**خلق لکم ما فی السماوات وما فی الارض جمیعا**''۔ زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب اللہ نے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان آیات سے فقہائے کرام نے ایک اور اصول بھی نکالا ہے، وہ یہ ہے کہ معاملات میں، تجارت اور لین دین میں، انسانوں کے آپس کے تعلقات اور طور طریقوں میں، اصل یہ ہے کہ ہر چیز جائز ہے، الا یہ کہ کسی چیز کو یا کسی معاملے یا طریقہ کار کو شریعت الٰہی میں واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہو۔ **الاصل فی المعاملات الا باحۃ** انسانوں کے معاملات میں اگر کوئی چیز واضح طور پر ناجائز اور ممنوع قرار نہیں دی گئی تو وہ جائز ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے ممنوعات اور محرمات بہت محدود ہیں۔ شریعت کے بہت محدود احکام ہیں جن میں کاروبار کی بعض قسموں کو ناجائز قرار دیا گیا۔ چند محدود محرمات اور ممنوعات کے علاوہ، مباح اور جائز کاروباروں کا لامتناہی میدان پھیلا ہوا ہے۔ تجارت اور کاروبار کی جتنی قسمیں انسان سوچ سکتا ہے، جتنی پروڈکٹس انسان تیار کرنا چاہے، تیار کرسکتا ہے، وہ سب جائز ہیں۔ بشرطیکہ وہ سب شریعت کے حرام کردہ امور سے پاک ہوں۔ جن کی تفصیل آگے چل کر ان محاضرات میں سامنے آئے گی۔ مثال کے طور پر ان میں ربا نہ پایا جاتا ہو، دھوکا نہ پایا جاتا ہو، غرر نہ پایا جاتا ہو، جوا نہ پایا جاتا ہو۔ اس طرح کے جو محدود احکام ہین، جن کے بموجب بعض معاملات کو حرام اور ناجائز قرار دیا گیا ہو، وہ امور جس کاروبار میں نہ پائے جائیں، وہ کاروبار اور تجارت کی وہ سب قسمیں جائز ہیں۔

دراصل انسانوں کے معاشی رویے کی اصلاح، انسانوں کے تجارت کے طور طریقوں کی اصلاح اور لین دین اور معاملات میں بہتری، آسمانی شریعتوں اور کتابوں کا ایک اہم ہدف رہا ہے۔ اور قرآن کریم کے بہت اہم اہداف میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں مختلف پیغمبروں کی تعلیم کا خلاصہ بیان کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ معاشی رویہ کی اصلاح اور تجارت اور معیشت کی پاکیزگی اور تطہیر آسمانی شریعتوں کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ سورہ انبیاء میں متعدد انبیاء کا ذکر کر کے کہا گیا ہے کہ ہم نے ان تمام پیغمبروں کو اپنے اپنے زمانے میں ائمہ ہدایت بنایا تھا جو نیکیوں کی تلقین کرتے تھے۔ پھر ان نیکیوں کی فہرست میں وایتاء الزکوۃ کا لفظ بھی آیا ہے۔ گویا زکوۃ کی ادائیگی، کسی نہ کسی انداز میں صدقہ واجبہ، کسی نہ کسی انداز میں غربت اور فقر کا خاتمہ، کسی نہ کسی انداز میں غریبوں اور ناداروں کی مدد، ہر پیغمبر کی تعلیم کا حصہ رہا ہے۔

سیدنا شعیب علیہ السلام تو خاص طور پر ایک ایسی قوم میں بھیجے گئے تھے جو ناپ تول میں کمی کی وجہ سے بہت بدنام تھی، اور سیدنا شعیب علیہ السلام نے جو باتیں بہت تاکید کے ساتھ ان کو بتائیں، ان میں یہ بھی تھا کہ ناپ تول میں کمی کی عادت کو چھوڑ دو، لوگوں کے مال پر ڈاکہ ڈالنا چھوڑ دو۔ جب سیدنا شعیب یہ تعلیمات اپنے مخاطبین کو فراہم کررہے تھے، تو وہ اسی طرح حیرت سے پوچھتے تھے جیسے آج بعض لوگ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ مذہب کا معاشیات سے کیا تعلق ہے؟ مذہبی تعلیم کا تجارت اور کاروبار کے معاملات میں کیا دخل ہے؟ یہ دینی شخصیتوں کا، علمائے دین کا،

شریعت کا مطالعہ کرنے والوں کا مالیات اور معاشیات سے کیا واسطہ ہے؟ یہ اعتراض نیا نہیں ہے۔ یہ اعتراض پہلے پہل سیدنا شعیب علیہ السلام کی قوم نے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا تمھاری نماز ہمیں اس سے روکتی ہے کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں کریں۔ ''اصلاتك تأمرك ان نترك ما يعبد اباؤنا او ان نفعل في اموالنا مانشاء ''۔

گویا قوم شعیب کو وہی غلط فہمی تھی جو آج کے مغربی یا مغرب زدہ انسان کو ہوگئی ہے کہ مذہبی تعلیم کا تجارت اور کاروبار اور معیشت سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ ان تمام صورتوں کا تذکرہ کرکے ان کی ممانعت کی گئی ہے، ان پر وعید نازل کی گئی ہے، ان کی قباحت اور شناعت کو نئے نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے، جو جائز اور عادلانہ کاروبار اور تجارت کے راستے میں رکاوٹ ہوں۔ ناپ تول میں کمی بیشی، لینے اور دینے کے پیمانوں کا فرق قرآن مجید کی رو سے سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے معاملات کاروبار کے ایسے ہیں کہ اس میں لینے کی قیمت اور ہے، دینے کی قیمت اور ہے۔ آج آپ ایک چیز جا کر دوکاندار کو فروخت کریں گے وہ آپ کو اس کی کم قیمت دے گا۔ لیکن اگر وہی چیز تھوڑی ہی دیر کے بعد آپ اس سے لینا چاہیں تو وہ آپ کو زیادہ قیمت میں دے گا۔ یہ رویہ قرآن کریم کی رو سے غیر عادلانہ رویہ ہے۔

قرآن کریم نے ربا کی حرمت کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس پر ایک تفصیلی گفتگو میں بات ہوگی۔ مال کو جمع کرنے اور سینت سینت کر رکھنے کی برائی بیان کی گئی ہے۔ مال کو خرچ کرنے کی جا بجا تلقین کی گئی ہے۔ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی مدد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلانا، نادار کی مدد کرنا، کمزوروں کا بوجھ اٹھانے میں مدد دینا۔ یہ وہ اخلاقی رویے ہیں جو قرآن مجید مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ اخلاقی رویہ محض اجتماعی یا ثقافتی میدان سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا تعلق انسانوں کے معاشی رویے سے بھی ہے۔ جب انسانوں کے اخلاق و کردار میں بہتری آئے گی، جب انسان مال و دولت کے بارے میں اخلاقی ہدایات کے پابند ہوں گے تو معاشی رویے میں اصلاح خود بخود پیدا ہوگی۔

معاشی رویہ میں اصلاح کا ایک مظہر، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بھی ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ جو مال و دولت میرے تصرف یا قبضے میں ہے، میں اس کا حقیقی مالک نہیں ہوں۔ ''المال مال الله ''۔ یہ سارا مال اللہ کا ہے۔ اور میری حیثیت اس مال میں اللہ کے جانشین کی

ہے۔"مستخلفین فیه"۔تم لوگوں کو اس مال میں اللہ کا جانشین بنایا گیا ہے۔اس لیے یہ رویہ کہ "ان نفعل فی اموالنا مانشاء"۔ہم اپنے مال میں جو چاہیں کریں، یہ رویہ درست نہیں ہے۔

گویا جس رویے کو مغربی معاشیات کی تاریخ میں Laissez Faire کہا جاتا ہے یہ رویہ اسلامی شریعت سے متعارض ہے۔اسلامی شریعت، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ریگولیٹڈ معیشت کی علم بردار ہے۔

عدل اور قسط کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔قرآن مجید کی رو سے یہ ریاست کا فریضہ ہے کہ حقیقی انصاف قائم کرنے میں عامۃ الناس کی مدد کرے اور ریاست اپنے وسائل کی حد تک، اپنے مقدور کی حد تک عدل وانصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے۔قرآن مجید کی رو سے شریعتوں کا، آسمانی کتابوں کا، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی بعثت کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ تھا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔اسی لیے اللہ نے اپنے تمام پیغمبروں کو، خاص طور پر ان انبیا علیہم السلام کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اقتدار بھی عطا فرمایا، حکومت بھی عطا فرمائی، یہ واضح طور پر حکم دیا کہ وہ عدل وانصاف کو اپنا فریضہ سمجھیں۔"وامرت لا عدل بینکم"۔مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، بطور ایک نبی کے میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔

جس طرح یہ ذمہ داری ایک نبی کی ہے کہ وہ عدل کی فراہمی کو یقینی بنائے اسی طرح یہ ذمہ داری نبی کے جانشینوں کی بھی ہے۔ہر مسلمان حکمران، جائز مسلمان حکمران، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کا جانشین ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں انسانوں کے دنیاوی معاملات کی حد تک رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائیں، وہ ساری ذمہ داریاں مسلمان حکمرانوں اور فرمانرواؤں کو پوری کرنی ہیں اور انجام دینی ہیں۔اگر وہ عدل سے کام نہیں لیں گے تو ان کی حکومت قائم نہیں رہے گی۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ جملہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حکومت اور مملکتیں کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہیں، ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتیں۔اس لیے کہ ظلم اس دنیا میں بھی تباہی کا موجب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی تاریکیوں کا اور ظلمتوں کا سبب ہے۔"الظلم ظلمات یوم القیامة"۔

عدل وانصاف کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے، معاملات میں، لین دین میں عدل و انصاف کیا جائے۔عدل وانصاف کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی زبان سے جو کہے

اپنے قول اور عمل سے اس کی پابندی کرے۔قول کا پکا ہو"اوفوا بالعقود"۔ جو معاملہ کسی سے کرو، لین دین کا ہو، خرید وفروخت کا ہو، کسی بھی قسم کا تجارتی یا دیوانی لین دین اور معاملہ ہو، اس کی مکمل پابندی، اس کی شرائط کی مکمل پیروی، یہ قرآن کریم کا واضح طور پر حکم ہے۔قرآن کریم کی ایک دو نہیں درجنوں آیات میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اہل ایمان کو قول کا پکا ہونا چاہیے۔ ایک حدیث میں آیا ہے، امام بخاری نے اس کو بطور تعلیق کے بیان کیا ہے۔"المسلمون عند شروطهم"، مسلمانوں کو اپنی شرائط کی پابندی کرنی چاہیے۔جو شرائط ایک دفعہ مسلمان آپس میں طے کرلیں، ان کی پابندی، ان کی دینی ذمہ داری بھی ہے، اخلاقی ذمہ داری بھی ہے اور ملکی قانون کی رو سے بھی ذمہ داری ہے۔

لین دین میں قول کی پابندی اور شرائط کی پاسداری اتنی اہم ہے کہ قرآن مجید نے ان شرائط کو اچھی طرح سے یادرکھنے کی تلقین کی ہے۔قرآن کریم نے ہدایت دی ہے کہ بہتر یہی ہے کہ اس طرح کے لین دین کو لکھ لیا جائے۔ جب تم آپس میں کوئی ایسا معاملہ کرو جس میں کسی کے ذمے کوئی رقم یا کوئی مال واجب الادا ہو تو اس کو لکھ لینا چاہیے۔عدل وانصاف کے ساتھ لکھو۔ جسے لکھنے کے لیے کہا جائے وہ بلا وجہ انکار نہ کرے۔جس پر حق عائد ہوتا ہے اس کی طرف سے یہ اعتراف ہو کہ یہ ذمہ داری اس پر عائد ہورہی ہے۔بغیر کسی کمی بیشی کے، تقویٰ کی مکمل روح کے ساتھ دستاویز تیار کی جائے۔اگر کوئی ایک فریق، کمزور نا اہل یا کم عقل ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی دستاویز لکھوائے۔ دستاویز کے لیے قانون کے مطابق گواہ بھی فراہم کیے جائیں۔اگر کسی کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ گواہ بننے سے انکار نہ کرے، اور جب گواہ بن جائے تو گواہی دینے سے انکار نہ کرے۔ دستاویز تحریر کرنے سے اکتانا نہیں چاہیے۔اس کو بوجھ نہیں سمجھنا چاہیے۔اس لیے کہ یہ عدل وانصاف کی فراہمی میں زیادہ مدد ومعاون ہے اور راہ راست کے زیادہ قریب ہے اور انسانوں کو شکوک وشبہات سے بچانے میں اس سے مدد ملتی ہے۔اس تفصیلی حکم نامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں انسانوں کے کاروبار کو بہتر بنانے اور معاملات کی صفائی کو یقینی بنانے پر کتنا زور دیا گیا ہے۔

جہاں قرآن کریم نے دیوانی حقوق وفرائض اور واجبات کا تحفظ کرنے پر زور دیا ہے، جہاں ہر شخص کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ اپنے ذمے واجب الادا تمام حقوق کو ادا کرے۔

وہاں شریعت نے ساتھ ساتھ انسانوں کے ساتھ نرمی اور ہمدردی کے رویے کو بھی یاد لایا ہے۔ ایک مسلمان تاجر، یا ایک مسلمان کاروباری سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ یہودیوں جیسا روایتی رویہ اختیار کرے۔ شرلک یہودی جو انگریزی ادبیات میں ضرب المثل ہے، اس سے مسلمانوں کا رویہ مختلف ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید نے کئی جگہ ہدایت دی کی ہے کہ نادار اور مالی اعتبار سے کمزور انسان کے ساتھ رویہ تعاون اور ہمدردی کا ہونا چاہیے۔

سورۂ بقرہ کی اس مشہور آیت میں جس کو آیۃ المداینہ کہا جاتا ہے۔ یعنی جس میں قرضوں کے لین دین کو ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں یہ بات قرآن کریم نے واضح طور پر یاد دلائی ہے کہ اگر کوئی شخص تمھارا قرض ادا نہ کر سکے تو پھر اس کو مہلت دینی چاہیے۔ جہاں سود کی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی یہ بات بیان کی گئی: "**وان کان ذوعسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ**": اگر کوئی شخص تنگدستی کا شکار ہو، نادار ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت دینی چاہیے جب تک اس کی تنگدستی دور نہ ہو جائے، اس کا ہاتھ کھل نہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی شخص کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہوا ور وہ انسانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے، اپنے حق کی حصولی میں ان سے سختی نہ کرے، نادار اور تنگدست آدمی کے ساتھ رعایت کا رویہ اختیار کرے تو روز قیامت اللہ تعالیٰ اس سے یہ ارشاد فرمائے گا: کہ تو نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بہت اچھا تھا، میرا پسندیدہ رویہ تھا، میں اس کا زیادہ حق دار ہوں کہ یہ رویہ اختیار کروں، لہٰذا میں تیرے ساتھ وہی رویہ اختیار کرتے ہوئے آج تجھے تمام لغزشوں سے معاف کرتا ہوں۔ پھر حکم دیا جائے گا کہ "**تجاوزوا عن عبدی**" میرے اس بندے کے تمام گناہوں کو نظر انداز کر دو اور تمام کمزوریوں سے درگزر کرو۔

اسی کی ایک ضمنی بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے فقر و فاقے کے معاملے سے بہت زیادہ اعتنا کیا ہے۔ قرآن مجید نے ان تمام اسباب کو ختم کرنے کی تعلیم دی ہے، ان تمام راستوں کو بند کرنے کی تلقین کی ہے، جن کے نتیجے میں فقر و فاقہ پیدا ہوتا ہے؟ معاشرے میں فقر کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو سب کے لیے وسائل رزق یکساں پیدا کیے ہیں۔ ہر انسان کو دو ہاتھ دے کر بھیجا ہے، ہر انسان کو سوچنے والی عقل عطا فرمائی ہے۔ ہر انسان کو دو آنکھیں اور کان عطا فرمائے ہیں۔ جو صلاحیتیں اور وسائل ہیں وہ سب انسان یکساں طور پر لے کر پیدا ہوئے

ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت تکوینی سے انسانوں کے درمیان بعض پہلوؤں سے تفاوت رکھا ہے۔ لیکن جو بنیادی اسباب ہیں وہ سب کے لیے یکساں طور پر فراہم کیے گئے ہیں۔ ان اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ معاشرے میں فقر وفاقہ نہ پیدا ہو۔ معاشرے میں معاشی تفاوت ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔

جب یہ تفاوت حد سے بڑھنے لگتا ہے اور غریب اور امیر، اور فقیر اور دولت مند میں تفاوت بہت بڑھ جاتا ہے تو اس کے کچھ خارجی اور غیر فطری اسباب ہوتے ہیں۔ یا تو کہیں تقسیم دولت میں عدم مساوات سے کام لیا گیا ہے، یا مواقع کی فراہمی غیر یکساں کر دی گئی ہے، یا کہیں اور بے انصافی جنم لے رہی ہے یا دولت کا ارتکاز ہو رہا ہے یا کچھ لوگ جہالت کا شکار ہیں، جس کی وجہ سے وہ کاروبار اور تجارت کے تازہ ترین طریقوں سے ناواقف رہتے ہیں، یا کسی علاقہ میں امراض پھیل گئے ہیں کہ کچھ لوگ ان امراض کی وجہ سے اپنے وسائل کا صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ یا حلال وحرام میں تمیز ختم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آمدنی بھی ناجائز ہے، اخراجات بھی ناجائز ہیں۔

یہ وہ بڑے بڑے اسباب ہیں جن کے نتیجے میں فقر وفاقہ جنم لیتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک یا متعدد اسباب جب پیدا ہوں گے تو معاشرے میں دولت کی تقسیم متاثر ہوگی، وسائل کی تقسیم میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔ غریب غریب تر ہو جائے گا، دولت مند مزید دولت مند ہو جائے گا۔ قرآن مجید نے ان تمام مسائل کا بہت جامع حل تجویز کیا ہے۔ سب سے پہلا حل قرآن کریم نے یہ دیا کہ تقسیم دولت کا ایک نیا نظام عطا فرمایا۔ تقسیم دولت کے اس نئے نظام کے بے شمار مظاہر اور احکام ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ان گزارشات میں کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں مواقع کی فراہمی میں مساوات کا حکم دیا گیا ہے۔ بنیادی ضروریات ہر شخص کے لیے یکساں ہونی چاہئیں۔ جس کو فقہاء کی اصلاح میں کفاف کہتے ہیں، اس پر آگے چل کر بات ہوگی، وہ سطح یکساں طور پر سب کو فراہم ہونی چاہیے۔ کفاف سے مراد وہ کم سے کم آمدنی یا رزق ہے جو ہر انسان کے لیے ناگزیر ہے، جس کے بغیر انسان نہ زندہ رہ سکتا ہے، نہ بطور ایک باعزت، ذمہ دار اور مکلّف مخلوق کے اپنے کم سے کم تقاضے اور ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہے۔ اس کم سے کم روزی کی فراہمی کو کفاف کہا جاتا ہے۔ یہ ہر شہری کا حق ہے، ہر انسان کو کفاف کے بقدر

روزی حاصل ہونی چاہیے۔

پھر قرآن مجید نے عدل وانصاف کے قیام پر اتنا زور دیا ہے کہ شاید کسی اور آسمانی کتاب نے اتنا زور نہیں دیا۔ جب معاشرے میں عدل وانصاف قائم ہوگا تو بہت سے ایسے اسباب ختم ہو جائیں گے جو دولت کے ارتکاز کا ذریعہ بنتے ہیں۔ تقسیم دولت میں ناہمواری کو جنم دیتے ہیں۔ پھر خود ارتکاز دولت بھی شریعت کی نظر میں ایک بہت بڑی برائی ہے اور اس کا خاتمہ قرآن کریم کی معاشی پالیسی کا ایک اہم نکتہ ہے۔''کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم''یہ سب احکام اس لیے دیے گئے ہیں کہ دولت صرف دولت مندوں میں گردش نہ کرے۔ بلکہ معاشرے کے ہر طبقے میں گردش کرے۔

پھر قرآن مجید نے علم کی اشاعت کی اتنی تلقین کی ہے کہ کسی اور کتاب نے نہیں کی۔ اسلامی تہذیب کی اٹھان اور اساس جن دو بنیادوں پر ہے، ان میں عدل وانصاف کا قیام اور علم کی نشر واشاعت بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے علم کی اشاعت اسلامی تہذیب، اسلامی شریعت اور اسلامی معاشرے کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ جیسے جیسے علم کی اشاعت ہوتی جائے گی، اسی رفتار سے معاشرے میں فقر کا بھی خاتمہ ہوتا جائے گا۔ یہاں علم سے مراد علوم دین کی اشاعت بھی ہے اور ان دنیاوی مہارتوں کی اشاعت بھی شامل ہے جن کی مسلمانوں کو اور اسلامی ریاست کو ضرورت ہے۔ فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں ان تمام مہارتوں کے حامل افراد پائے جانے چاہئیں جن مہارتوں کی ملت اسلامیہ کو ضرورت ہے۔ ان مہارتوں کی فراہمی مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

پھر حلال وحرام کی پابندی جب کی جائے گی تو نہ دولت کا ارتکاز ہو سکے گا اور نہ نادار طبقوں تک دولت کے بہاؤ کو روکا جا سکے گا۔ شریعت نے مال و دولت کے حصول پر بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں، خرچ کرنے پر بھی پابندیاں عائد کی ہیں۔ گویا جس راستے سے مال ودولت آپ کی ملکیت میں داخل ہو رہا ہے اس پر بھی کنٹرول ہے اور جہاں سے آپ کی ملکیت سے نکل رہا ہے اس پر بھی کنٹرول ہے، اور جب تک آپ کی ملکیت میں ہے اس پر بھی شریعت کے احکام کا کنٹرول ہے گویا اللہ تعالیٰ کی شریعت نے ایک ایسا طریقہ کار عطا فرمایا ہے جو دولت کو جائز طریقے سے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ پھر وہ طریقۂ کار اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ یہ دولت

جائز طریقے سے ان کی ملکیت میں موجود رہے، باقی رہے اور جائز طریقے سے خرچ ہو۔ حلال و حرام کی ان شرائط وتفصیلات میں اسراف اور تبذیر کی ممانعت بھی شامل ہے۔ اسراف اور تبذیر کا دولت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب دولت بہت بہتات کے ساتھ کسی فرد یا طبقے کے پاس آتی ہے تو اسراف اور تبذیر کے رویے پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

اسراف سے مراد یہ ہے کہ جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے۔ مثال کے طور پر بچے کی شادی کرنی ہے، جتنی رقم میں اس زمانے، اس دور یا اس علاقے کے لحاظ سے شادی کے اخراجات پورے کیے جا سکتے ہوں اس سے زیادہ رقم آپ خرچ کریں، دولت کا مظاہرہ کرنے کے لیے، اپنی سخاوت کا ڈنکا بجوانے کے لیے، ایک کی جگہ دو، دو کی جگہ چار خرچ کریں، یہ اسراف ہے۔ تبذیر یہ ہے کہ ناجائز کام میں دولت کو خرچ کیا جائے۔ ناجائز کام میں ایک پیسہ بھی خرچ کیا جائے گا تو وہ تبذیر ہوگا۔ جائز کام میں حدود کے مطابق ایک لاکھ روپیہ بھی خرچ کریں گے تو شاید اسراف کی حدود میں نہیں آئے گا۔ اسراف کا تعلق بہت حد تک زمانے کے معیار اور عرف سے ہوتا ہے۔ جس زمانے کا جو عرف ہے، جس علاقے کا جو معاشی معیار ہے، جس علاقے کی جو سطح ہے اس سطح کے حساب سے اسراف کا تعین ہوگا۔ پیچھے رہ جانے والے طبقے یا علاقے میں اسراف کا معیار اور ہوگا۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں اگر مسلمان ہوں، ان کے لیے اسراف کا معیار اور ہوگا۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں لوگ ائر کنڈیشنگ کے عادی ہوں، پورے گھر کو ائر کنڈیشنڈ کر لینا اسراف نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن برصغیر کے کسی ایسے گاؤں یا دیہات میں جہاں موسم معتدل رہتا ہو اور بجلی بھی مشکل سے پہنچتی ہو۔ ائر کنڈیشن کا اہتمام کرنا اور پورے گھر کو ٹھنڈا کر لینا اسراف سمجھا جائے گا۔

شریعت نے فقر و فاقے کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے یوں تو بہت سے احکام اور ہدایات عطا فرمائی ہیں لیکن سب سے نمایاں حکم جو شریعت نے دیا ہے وہ زکوۃ ہے۔ جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ **"تؤخذ من أغنيائهم و ترد الى فقرائهم"** کہ زکوۃ مسلمانوں کے دولت مندوں سے لی جائے اور مسلمانوں کے فقراء کو لوٹا دی جائے۔

ترد، یعنی لوٹا دی جائے کا لفظ بڑا اہم ہے۔ گویا زکوۃ کی جو رقم دولت مندوں سے لی گئی وہ فقراء ہی کا حق تھی۔ ریاست کی حیثیت محض امین اور متولی کی تھی۔ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ

وہ زکوٰۃ کی یہ رقم اس کے اصل مالک کو لوٹا دے۔اس لیے **تـرد عـلـى فقرائهم** کی ترکیب اختیار فرمائی گئی۔ کہ زکوٰۃ اغنیاء سے وصول کر کے فقراء کو لوٹا دی جائے۔قرآن مجید نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اور ہدایت بھی کی ہے جس میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حسب ضرورت دولت مندوں کے مال میں غرباء اور فقراء کے مطالبات ہو سکتے ہیں۔ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ "**وفـي امـوالهـم حـق لـلسـائـل والمحروم**" مسلمانوں کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ یہ حق دائمی بھی ہو سکتا ہے، جیسے زکوٰۃ اور صدقات واجبہ، وقتی بھی ہو سکتا ہے۔ بہ وقت ضرورت ریاست کو اختیار ہے کہ دولت مند طبقے سے ایسے مالی مطالبات کرے جو ریاست کے لیے ناگزیر ہوں۔ ریاست کے دفاع کے لیے، فقر و فاقے کو دور کرنے کے لیے، معاشرے سے بیماری اور جہالت کو دور کرنے کے لیے، عامۃ الناس کو لازمی اور ضروری سہولتیں پہنچانے کے لیے۔ یہ مالی مطالبات وہ ہیں جن کے لیے نوازل کی اصطلاح یا نوائب کی اصطلاح فقہاء نے استعمال کی ہے، اور یہ ہمیشہ سے ریاست کی پالیسی کا حصہ رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کفالت عامہ کی بنیاد بھی یہی یا اس طرح کی آیات ہیں۔

اسلامی شریعت میں کفالت عامہ کا جو نظام ہے، عامۃ الناس کی کفالت کا اور نادار اور فقیر طبقے کی ضروریات کا جو سامان ہے اس کی بنیاد یہ اور اس مضمون کی دوسری آیات ہیں۔ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شروع ہوا تھا، اور چند سالوں کے اندر اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی کہ زکوٰۃ دینے والے تو تھے، زکوٰۃ لینے والے نہیں تھے۔سیدنا عمر فاروق ؓ نے اپنے آخری سالوں میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ بہت جلد الگ ایسا نظام شروع کریں گے جس کے نتیجے میں نادار طبقے کی ناداری ختم ہو جائے گی۔آپ نے فرمایا تھا کہ "**حتـى نستـوى فـي الكفـاف**" جہاں تک کفاف یعنی کم سے کم ضروریات کا تعلق ہے وہ ہم سب کی پوری کر دیں گے۔لیکن سیدنا عمر فاروق ؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا، اس لیے وہ اپنی زندگی میں یہ کام نہیں کر پائے۔لیکن یہ کام ہو گیا اور بہت جلد ہو گیا، ابھی ایک صدی پوری نہیں ہوئی تھی کہ دنیائے اسلام میں ہر بستی میں زکوٰۃ دینے والے تو تھے، لینے والے خال خال ہی ہوتے تھے۔

قرآن مجید نے زکوٰۃ کے متعین مصارف بیان کیے ہیں، جو مصارف ثمانیہ کہلاتے ہیں، اور سورۃ توبہ میں بیان ہوئے ہیں۔ان مصارف ثمانیہ میں فقراء اور مساکین کے ساتھ ساتھ

بعض اور مدات بھی رکھی گئی ہیں جن پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاتی رہی ہے اور کامیابی سے ان تمام مدات کے تقاضے اور ضروریات کی تکمیل کرتی رہی ہے۔ آج بھی اگر زکوٰۃ کی رقم پورے طور پر ادا کی جائے، جس کے ذمے جو زکوٰۃ واجب الادا ہے وہ پوری ادا کرے اور حکومتی نظام جو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے قائم ہے، وہ بھی دیانتداری کے ساتھ زکوٰۃ وصول کرے اور دیانتداری کے ساتھ تقسیم کرے، تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چند سال کے اندر اندر پاکستان سے غربت اور فقر و فاقے کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اگرچہ پچھلے پچیس تیس سال سے زکوٰۃ کا نظام رائج ہے لیکن اس کی برکات و ثمرات ابھی کوسوں دور ہیں۔ میں خود بھی ایک زمانے میں اس کے انتظامی امور سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے براہ راست اس کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں جتنی زکوٰۃ وصول ہونی چاہیے اس کا شاید پانچ فیصد بھی وصول نہیں ہوتی، عشر تو ایک فیصد بھی وصول نہیں ہوتا۔ عشر وصول کرنے کی تو کوشش ہی حکومت نے نہیں کی۔ ان حالات میں زکوٰۃ کے نظام کی برکات کیسے سامنے آ سکتی ہیں۔ پھر زکوٰۃ کے نام پر جو تھوڑا بہت وصول ہوتا ہے اس کی تقسیم میں بھی اتنی قباحتیں پیدا ہو گئی ہیں، اتنے منفی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں کہ اس کے نتائج و برکات عام آدمی تک پہنچتے پہنچتے بہت محدود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پچیس سال میں، بلکہ پچھلے اٹھائیس تیس سال میں زکوٰۃ کی متوقع برکات سامنے نہیں آ سکیں۔

قرآن کریم نے تجارت اور کاروبار کے بارے میں ایک بڑی اہم ہدایت فرمائی اور یہ مضمون ایک سے زائد جگہ ارشاد ہوا ہے۔ اس میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھائیں۔ اہل ایمان کو منع کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔ ایک دوسرے کے مال سے مستفید ہونے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ باہمی تجارت اور لین دین ہو۔ ''الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم''۔ بعض دوسری احادیث اور آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کے علاوہ اگر انسان از خود کسی اور کو ہدیہ دینا چاہے، تحفہ دینا چاہے، صدقہ دینا چاہے تو وہ ایک الگ بات ہے۔ اس کے علاوہ آپس کے لین دین کے جتنے بھی معاملات ہیں، ان کی بنیاد باہمی رضامندی اور تجارت پر ہونی چاہیے، باطل پر نہ ہونی چاہیے۔ باطل سے کیا مراد ہے؟ قرآن کریم کی متعلقہ آیات کا جائزہ

لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ باطل سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جن کی بنیاد حق پر نہ ہو، جن کی بنیاد عدل وانصاف پر نہ ہو، جن کی بنیاد آپس کی مکمل اور آزادانہ رضامندی پر نہ ہو، جس میں دھوکا، دھونس اور غبن فاحش یعنی غیر معمولی ناجائز منافع اندوزی پائی جاتی ہو یا جن میں ربا پایا جاتا ہو۔

یہ وہ محرمات ہیں جن میں سے چند کا میں نے ذکر کیا ہے۔ بقیہ محرّمات کی تفصیل آگے ان محاضرات میں آپ کے سامنے آئے گی۔ جس لین دین میں یہ محرمات کلی یا جزوی طور پر پائے جائیں گے وہ باطل کہلائے گا۔ جو لین دین ان تمام محرمات سے پاک ہوگا وہ ایک قسم کی تجارت ہو گی، وہ جائز تجارت ہوگی اور اگر آپس کی رضامندی سے کی جائے گی تو اس کے نتیجے میں جو خیر و برکت اور رزق میں پاکیزگی حاصل ہوگی وہی قرآن کریم کا مقصد ومنشا ہے۔ قرآن کریم نے تجارت کو، لین دین اور خرید وفروخت کو انسانوں کے درمیان کاروبار کی اصل قرار دیا ہے۔ جہاں ربا کی حرمت بیان فرمائی گئی ہے، وہاں پہلے تجارت اور کاروبار کو جائز طریقہ بتایا گیا، پھر ربا کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ "واحل اللّٰہ البیع و حرم الربا"۔ جس اللّٰہ نے تجارت اور خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے اسی نے ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی آیت میں ربا کا متبادل بھی موجود ہے، جس کی تفصیل آگے چل کر ایک خطبے میں آئے گی۔

اگر ربا حرام ہے تو پھر بیع یعنی تجارت اور کاروبار یعنی Trade جس میں نفع نقصان میں یکساں شرکت ہوتی ہے۔ تجارتی تعلقات کی اساس ہونی چاہیے۔ جو فوائد تجارت اور خرید و فروخت میں ہیں، وہ ربا اور سود میں نہیں ہیں۔ خرید وفروخت کے ذریعے انسانوں کی ضروریات بہت آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اس میں تجارت کرنے والوں کے ساتھ ایک نرمی کا رویہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو کسی سے مانگنا نہیں پڑتا۔ کسی کی منت سماجت نہیں کرنی پڑتی۔ غیر ضروری طور پر اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا، جیسے اوقات بعض بارٹر سیل میں کرنا پڑتا تھا۔ بارٹر سیل میں ہوتا یہ تھا کہ آپ کے پاس مثلاً گھوڑا ہے اور آپ کو گندم درکار ہے۔ اب آپ بازار میں بیٹھے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ اگر کوئی گندم والا ایسا آئے جس کو گھوڑا درکار ہو تو پھر آپ کو گندم ملے گا ورنہ نہیں ملے گا۔ ممکن ہے گندم بیچنے والے بازار میں اور بھی بیٹھے ہوں، لیکن کسی کو جوتا چاہیے، کسی کو کپڑا چاہیے، کسی کو گندم کے بجائے جانور چاہیے، دودھ چاہیے۔ اس لیے ہر شخص کو طویل عرصہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔

یہ کیفیت اس وقت تک تھی جب تک خرید وفروخت کا وہ طریقہ کار سامنے نہیں آیا تھا جو بعد میں انسانوں کے سامنے آیا اور جس کو شریعت اسلامی نے نہ صرف پسند کیا ہے، بلکہ اس کو ترقی دینے کی تلقین بھی کی ہے۔ متعدد احادیث میں ایسی ہدایات دی گئی ہیں جس کا واضح منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا مزاج مونٹری معیشت کو فروغ دینے کا ہے۔ بارٹر معیشت کو فروغ دینے کا نہیں ہے۔ شریعت نے بارٹر اکانومی پر بعض ایسی بندشیں عائد کی ہیں جس کے نتیجے میں وہ خود بخود کم ہو جائے گی اور زرعی معیشت کی بعض جگہ شریعت نے ترغیب دلائی ہے۔

اس لیے تجارت کا اصل فطری اور کامیاب ترین طریقہ یہی ہے کہ وہ زر کی بنیاد پر ہو۔ اور زر کی حیثیت ایک ایسے معیاری ذریعہ تبادلہ کی ہو جس پر سارے انسان متفق ہوں۔

قرآن مجید نے جس آیت میں ربا کو حرام قرار دیا ہے، اس میں ربا کی کسی ایک خاص قسم کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ ہر قسم کے ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ جب قرآن کریم نے اعلان کیا کہ ''واحل اللّٰہ البیع و حرم الربٰو'' اس میں الربا کا لفظ الف لام کے ساتھ آیا ہے: الربا میں جو الف لام ہے، یہ استغراق کے لیے ہے۔ استغراق سے مراد یہ ہے کہ جس چیز پر الف لام عائد ہو اس ضمن میں جتنے افراد آتے ہوں گے، جتنی قسمیں اور انواع اس میں شامل ہوں گے، سب پر اس حکم کا اطلاق ہوگا۔ لہٰذا حرمت ربا میں ربا کی ہر قسم شامل ہے۔ سابقہ ہو، موجودہ ہو، آئندہ ربا کی قسمیں پیدا ہونے والی ہوں، وہ سب حرمت کے اس حکم میں شامل ہیں۔

قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک میسر بھی ہے۔ میسر کا ترجمہ عام طور پر جوا کیا جاتا ہے جو ایک اعتبار سے درست ہے۔ لیکن میسر کی اصطلاح نسبتاً عام ہے، اور قمار کی اصطلاح نسبتاً خاص ہے۔ قرآن کریم نے جن آیات میں میسر کو حرام قرار دیا ہے، انھی آیات میں شراب کا بھی ذکر ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور میسر دونوں کو ایک سیاق وسباق میں حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ ان میں بعض باتیں ایسی ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ یہ دونوں ذکر الٰہی سے غافل کرتے ہیں۔ یہ دونوں انسانوں کے درمیان دشمنی اور نفرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ دونوں سرگرمیاں یاد الٰہی سے انسانوں کو روکتی ہیں۔ نمازوں سے غافل کرتی ہیں۔ انسانوں کا مال باطل اور ناجائز طریقے سے کھانا ان دونوں کے نتیجے میں آسان ہو جاتا ہے۔

فقہائے اسلام کی اصطلاح میں میسر کا لفظ عام ہے اور قمار کا لفظ خاص ہے۔ قمار سے مراد ایسا معاملہ یا لین دین ہے جس کے نتیجے میں ایک انسان کا فائدہ لازمی طور پر دوسرے انسان کے نقصان پر منتج ہو رہا ہو۔ اگر دوسرے کا نقصان لازمی اور یقینی ہے تو یہ یقیناً قمار ہے۔ لیکن اگر دوسرے کا نقصان لازمی اور یقینی نہیں ہے، بلکہ اس کا محض امکان ہے تو بھی یہ جائز نہیں ہوگا اور یہ میسر ہے۔ مثال کے طور پر دس آدمی سوسو روپے دے کر کسی چیز میں شریک ہوں اور اس سوسو روپے کے نتیجے میں جو رقم جمع ہو، مثلاً ایک ہزار روپے، وہ کسی ایک انسان کو دے دیے جائیں اور باقی سب لوگ اپنی رقم سے محروم ہو جائیں، یہ قمار ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا وہ ساری انعامی اسکیمیں جو پرائز بونڈ کے نام سے ہوں یا کسی اور نام سے ہوں، جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ بہت سے انسان مل کر کوئی رقم جمع کریں یا اس کے جمع ہونے میں حصہ لیں، لیکن اس رقم کا جو فائدہ یا منافع ہو وہ یکساں سب کو دینے کے بجائے کچھ متعین افراد کو یا ایک فرد کو دے دیا جائے۔ یہ سب میسر ہی کی اقسام ہیں۔

قران کریم نے تجارت اور مالیات کو پسندیدہ چیز قرار دیا ہے، اس کو اللّٰہ کا فضل بنایا ہے۔ مال کو خیر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ فی نفسہ نہ مال برا ہے، نہ تجارت بری ہے۔ نہ مالیات اور تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لینا برا ہے۔ بشرطیکہ یہ تمام چیزیں یادالٰہی میں رکاوٹ نہ ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز یادالٰہی میں رکاوٹ نہیں ہے، دینی ذمہ داریوں کے راستے میں آڑے نہیں آتی تو پھر یہ سب چیزیں قابل قبول ہیں، اللّٰہ کا فضل ہیں اور خیر محض ہیں۔ "**رجال لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله**" صحابہ کرام کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ کہا گیا ہے کہ یہ ایسے حضرات ہیں جنھیں کوئی تجارت یا کوئی خرید وفروخت اللّٰہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ ایک جگہ رسول اللّٰہ ﷺ نے یہ دعا سکھائی ہے "**اللهم اعنى على دينى بالدنيا**" اے اللہ! دنیاوی وسائل اور اسباب کے ذریعے میرے دین کی مدد فرما۔ قرآن کریم میں جہاں نماز جمعہ کا ذکر ہے، وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ جمعے کے دن سب کاروبار بند کر دو۔ کوئی شخص جمعہ کے دن اپنا کاروبار بند کرنا چاہے تو ضرور کرے۔ لیکن شریعت نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ شریعت نے صرف یہ کہا ہے کہ جب اذان دے دی جائے تو کاروبار بند کر دو۔ "**اذا نودی للصلاة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر اللّٰه وذروا البیع**"۔ اذان کے وقت خرید وفروخت اور تجارت کو بند کر دو۔ اس لیے

کہ اس وقت اگر خرید وفروخت جاری رہے گی تو وہ یادالٰہی سے غافل کر دے گی، یادالٰہی میں رکاوٹ بنے گی اور اس اہم دینی ذمہ داری کی انجام دہی میں تعویق کا سبب ہوگی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید نے اپنی معاشی پالیسی کا ایک اہم اصول یہ عطا فرمایا ہے کہ دولت کی گردش صرف دولت مندوں میں نہ ہو بلکہ معاشرے کے ہر طبقے میں ہو۔ "کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم"۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے جو احکام دیے ہیں ان میں سب سے پہلا حکم زکوٰۃ کا ہے۔ ایک شخص اگر جائز طریقے سے دولت حاصل کرتا ہے اور جائز طریقے سے خرچ کرتا ہے، اس کے بعد اس کی بچت ایک سال تک اس کے پاس رہتی ہے، وہ زکوٰۃ ادا کرے۔ جب زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی تو وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اس کو کاروبار میں لگائے گا۔ اس سے معاشی سرگرمی جنم لے گی۔ جب معاشی سرگرمی جنم لے گی تو پورا معاشرہ اس ترقی سے استفادہ کرے گا، معاشی ترقی میں اضافہ ہوگا۔ جب معاشی ترقی میں اضافہ ہوگا تو دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملے گی۔ اور یوں قرآن کریم کا یہ مقصد پورا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ زکوٰۃ بھی ادا کرتا رہے گا تو ہر سال ڈھائی فیصد کے حساب سے اس کے قبضے سے رقم نکلتی جائے گی۔ زکوٰۃ کے علاوہ قرآن کریم نے صدقات واجبہ کا حکم دیا ہے۔ بعض صدقات ہیں جو لازماً ادا کرنے ہیں۔ مثلاً صدقۃ الفطر ہے، یہ لازماً ہر وہ شخص کرے گا جس کے پاس عید الفطر کے دن بقدر نصاب رقم موجود ہوگی۔ قرآن مجید نے بعض گناہوں کے کفارے ادا کرنے کا حکم دیا ہے، جن میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے۔ جب کوئی شخص ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا، اس سے کم از کم اس دن ساٹھ مسکینوں کی ضروریات تو پوری ہوں گی۔ پھر جب وہ دولت کو خرچ کرے گا، پیسہ نکالے گا، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست کرے گا تو دولت کے ارتکاز پر یقیناً فرق پڑے گا۔ پھر شریعت نے وصیتیں کرنے کی تلقین کی ہے۔ نیک کام کے لیے وصیت کرنا پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے۔

وصیت کے علاوہ میراث کے احکام سے بھی یہ مقصد پورا ہوتا ہے۔ میراث کے احکام یہ ہیں کہ لازماً ایک شخص کی وفات کے بعد اس کی جائداد تقسیم ہو جائے۔ اگر ارتکاز ہو بھی اور تمام جائز اقدامات کرنے کے باوجود دولت جمع ہو جائے تو وہ ایک نسل کے بعد تقسیم ہو جائے گی۔ بیٹے

کو ملے گا، بیٹیوں کو ملے گا، ماں باپ کو ملے گا، بہن بھائیوں کو ملے گا، رشتہ داروں کو ملے گا اور جو بڑا ارتکاز ہوا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کر بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جائے گا اور دو تین پشتوں کے بعد بڑے بڑے ارتکاز ختم ہو جائیں گے۔

شریعت نے وقف قائم کرنے کی تلقین کی ہے، اسلام میں پہلا وقف خود رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا۔ حضور علیہ السلام کے بعد سب سے پہلا وقف قائم کرنے کا شرف سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد صحابہ کرام کے زمانے سے یہ طریقہ چلا آرہا تھا، ماضی قریب تک یہ طریقہ رائج تھا کہ بڑے پیمانے پر لوگ اپنی جائدادیں وقف کیا کرتے تھے، غرباء کے لیے فقراء کے لیے، طلبہ کے لیے، تعلیمی، دینی کاموں کے لیے، اجتماعی کاموں کے لیے، معاشی کاموں کے لیے بے شمار وقف ہوتے تھے۔ بعض قدیم اسلامی شہر تو ایسے تھے، مثلاً استنبول، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قاہرہ، بغداد، جن کی جائدادوں کا بیشتر حصہ وقف پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقف کا ادارہ اسلامی تاریخ میں کتنا اہم تھا۔

میں ابھی نوازل کا کر چکا ہوں۔ یعنی ایسے ٹیکس جو حکومت کو لگانے کی ضرورت پیش آئے اور جو عامۃ الناس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہوں۔ اس کے لیے نوازل یا نوائب کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ پھر ایک مشہور روایت میں آتا ہے جو امام ترمذی نے بیان کی ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ "ان فی المال حقا سوی الزکاۃ" کہ لوگوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ یہ سمجھنا کہ زکوٰۃ دے کر شریعت کے سارے مالی واجبات پورے ہو گئے، یہ درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالی ذمہ داری نے شریعت نے رکھی ہے۔ اور قرآن کریم کی ایک نص قطعی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ میں جہاں یہ فرمایا گیا کہ "لیس البر ان تولوا وجوھکم"۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ تم فلاں فلاں کام کرو، بلکہ یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرو، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ "واتی المال علی حبہ ذوی القربی و الیتامی و المساکین"۔ یعنی زکوٰۃ دینے کے بعد بھی ایتائے مال کا تذکرہ ہے جو یقیناً زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔

پھر شریعت نے نفقات واجبہ کا حکم دیا ہے جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا۔ دیت کے طور پر بہت بڑی رقم ادا کی جاتی ہے۔ انسانی جان کے خلاف جتنے جرائم ہیں سب میں یا تو اصل سزائیں

ہی دیت یا ارش اور ضمان ہیں یا بقیہ سزاؤں کے ساتھ ساتھ ادا کی جاتی ہیں یا کسی بڑی سزا کے متبادل کے طور پر ہیں۔ انسانی جان کے خلاف تمام جرائم میں دیت یا اس کے اجزاء کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ جرائم ہر معاشرے میں ہوتے ہیں، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ جب یہ جرائم معاشرے میں ہوں گے، اور ان کے نتیجے میں دیت بھی ادا کی جائے گی، ضمان بھی ادا کیا جائے گا، ارش بھی ادا کیا جائے گا۔ تو اس کے نتیجے میں خود بخود دولت کے ارتکاز کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

ان بالواسطہ اقدامات کے ساتھ ساتھ شریعت نے دولت کی وسیع پیمانے پر تقسیم کے لیے کچھ مثبت اور براہ راست ہدایات بھی دی ہیں۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کی ہے۔ مثلاً غیر ضروری طور پر بڑے بڑے رقبہ جات کی ملکیت اور ان کو غیر آباد چھوڑنے کو ناپسند قرار دیا ہے۔ کسی کی زمین کی تین سال تک بغیر آبادی اور کاشت کے ملکیت شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ اگر سرکاری زمین کسی شخص کو آباد کرنے کے لیے الاٹ کی گئی ہے اور وہ تین سال تک آباد نہ کر سکے تو وہ زمین اس سے واپس لے لی جائے گی۔ اسی طرح سے سرکاری چراگاہوں کے علاوہ ذاتی چراگاہیں یا گھوڑی پال مربعے قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی بڑے پیمانے پر لوگ رقبوں کو روک کر لیں اور اپنے جانوروں کے چرنے کے لیے اس کو خالی چھوڑ دیں، دوسروں کو استعمال نہ کرنے دیں، اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ صرف سرکاری یا فوجی جانوروں کے چرنے کے لیے جو جہاد میں کام آتے ہوں۔ حکومت کو اجازت ہے کہ وہ سرکاری چراگاہیں قائم کرے اور وہاں جانوروں کی نسل کشی کا انتظام کرے۔

ان تمام اقدامات کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے جگہ جگہ مال کو جمع کرنے کی برائی اور خرچ کرنے کی اچھائی بیان کی ہے۔ مال کو جمع کرنا برا بتایا ہے، خرچ کرنا اچھا بتایا ہے۔ خرچ کرنا اللہ کے راستے میں ہو تو بلاشبہ، یہ ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق نہ ہو، وہ اپنی ذات پر خرچ کرے، اپنے خاندان پر، اپنے گھر والوں پر خرچ کرے تو مجرد خرچ کرنا بھی مال کو روک کر رکھنے سے بہتر ہے۔

جب مال کو انسان روک کر رکھتا ہے تو وہ نہ اس کے کام کا نہ کسی اور کے کام کا۔ گھر میں سونے چاندی کے انبار رکھے ہوں تو وہ کس کام کے۔ پرانے زمانے میں لوگ گھروں میں گڑھے

کھود کر سونے چاندی کی اینٹیں جمع کر لیتے تھے اور بعض صورتوں میں ایسا ہوتا تھا، بار ہا ایسا ہوا کہ کسی شخص نے خاموشی سے دولت جمع کی، اپنے گھر میں دفن کر دی اور بعد میں مر گیا۔ کسی کو بتایا نہیں، دولت ضائع ہوگئی۔ بعد میں کبھی کسی کے ہاتھ لگ گئی تو لگ گئی ورنہ ضائع ہوگئی۔

آج کل پاکستان میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ بعض بڑے بااثر لوگ ناجائز دولت پاکستان سے حاصل کرتے ہیں اور مختلف فرضی ناموں سے مغربی بنکوں میں جمع کرا دیتے ہیں۔ وہ ان کے مرنے کے بعد ضائع ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی داستانیں وقتاً فوقتاً اخباروں میں آتی رہتی ہیں کہ فلاں گورنر صاحب نے، فلاں وزیر صاحب نے، فلاں بااثر آدمی نے، فلاں ملک کے بنک میں اکاؤنٹ کھولا ہوا تھا، اس میں اتنی رقم تھی اور فلاں نام سے تھی، ان کے مرنے کے بعد وہ ضائع ہوگئی۔ ظاہر ہے کوئی والی وارث نہیں ہے، کوئی ثبوت نہیں ہے، کوئی عدالت نہیں ہے۔

یہ ناجائز دولت کے وہ نتائج ہیں جن کی وجہ سے شریعت نے ارتکاز دولت کو منع کیا ہے۔ قرآن مجید سے یہی پتا چلتا ہے کہ دولت کے حد سے زیادہ پھیلاؤ اور فراوانی کے بہت منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن کی قباحتیں اخلاقی اعتبار سے بہت بری ہیں۔ مترفین کے کرتوت معاشرے کو تباہی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ مترفین سے مراد وہ طبقہ ہے جس کے پاس دولت کی ریل پیل ہو، جو دولت کے انبار اپنے پاس رکھتا ہو، دولت کے بڑے بڑے تالابوں پر قابو اس کو حاصل ہو گیا ہو اور وہ ان سے کھیلتا ہو۔ جب کسی طبقے میں مترفین کی کثرت ہوتی ہے تو وہاں کثرت سے ایسے فارغ البال اور دولت سے کھیلنے والے وجود میں آ جاتے ہیں جن کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، جن کو بے تحاشا دولت بغیر محنت کے مل گئی ہو۔

جب ایسے طبقے کی کثرت ہوتی ہے تو اس سے معاشرے میں بے شمار اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں جو نظم اور توازن قائم ہوتا ہے وہ بگڑ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ کے حکم تکوینی کی رو سے کوئی بستی تباہ ہوتی ہے تو اس کی فوری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس بستی یا آبادی میں مترفین کی کثرت ہو جاتی ہے۔ مترفین اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ ان کا فسق و فجور اور ان کے کرتوت اور گناہ پوری بستی کو لے ڈوبتے ہیں۔

مفکرین اسلام میں سے بہت سے حضرات نے اس پر گفتگو کی ہے۔ علامہ ابن خلدون

، جو اسلامی تاریخ کے سب سے نمایاں مؤرخین میں سے ہیں اور اسلامی تاریخ کے پہلے ماہر اجتماعیات ہیں۔ انھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ مترفین کے کرتوتوں اور اخلاقی قباحتوں کے نتائج پر گفتگو کی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

چونکہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ مال و دولت ضائع نہ ہو، مال و دولت کا غلط استعمال نہ ہو، مال و دولت کا ارتکاز نہ ہو، ذخیرہ اندوزی نہ ہو، بلکہ اس کا تقسیم اور پھیلاؤ جتنا وسیع ہو سکے اس کو یقینی بنایا جائے اور اس کا استعمال صحیح طریقے کے مطابق ہو۔ عقل اور شریعت، قانون اور منطق کے مطابق دولت کا استعمال ہو۔ اس لیے قرآن مجید نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ اگر کسی وقت کوئی ایسا شخص کسی بڑی دولت کا یکا یک وارث ہو جائے جو بہت بے وقوف اور بے عقل ہو، جو دولت کے استعمال کا طریقہ نہ جانتا ہو تو اس کو اپنی دولت پر کنٹرول حاصل کرنے کی پورے طور پر اجازت نہ دی جائے۔

سورۂ نساء کی آیت نمبر پانچ میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے مال سفہاء یعنی بے وقوفوں کو مت دو۔ یہ مال تو دراصل خدا ہی کا ہے، لیکن اسے اموالکم یعنی تمھارا مال کہا گیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انفرادی طور پر جو مال و دولت لوگوں کے پاس ہے، وہ بھی دراصل اپنے نتائج کے اعتبار سے پوری ریاست اور پورے معاشرے کا مال ہے۔ ایک فرد کے پاس جو وسائل ہیں وہ اس اعتبار سے تو فرد کے ہیں کہ اس وقت وہی ان کا امین اور متولی ہے۔ لیکن ان وسائل اور اسباب کو جب وہ فرد استعمال کرے گا تو اس استعمال کے اثرات اور نتائج اور فوائد کے اعتبار سے وہ مال دراصل پورے معاشرے کا مال ہے۔ یہ مال بے وقوف اور بے عقل لوگوں کے تصرف میں نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے اس مال کو تمہارے لیے ذریعہ قیام بنایا ہے، زندگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے یہ مال معاشرے کی عمومی نگرانی میں رہنا چاہیے۔

عدالت و ریاست یا خاندان اور معاشرہ جو بندوبست کرنا چاہیں، وہ اس مال کے نظم و نسق کا بندوبست کریں۔ اصل مالک کو اس میں سے بقدر ضرورت جیب خرچ دیا جائے گا، تاوقتیکہ کہ وہ شخص اتنی سمجھ اور اتنی ذہنی پختگی حاصل کر لے کہ اپنے مال کا بندوبست خود کر سکے۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللّٰہ علیہ کے نزدیک پچیس سال کی عمر کے بعد بے وقوف یتیم کا مال یتیم کو دے دینا چاہیے، یا موصیٰ کا مال موصیٰ کو دے دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں جو لفظ آیا ہے رشد، اس کی

وضاحت کرتے ہوئے بہت سے فقہاء کرام یہ لکھتے ہیں کہ عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ جس کا مال عدالت یا وصی یا ولی کے تصرف میں تھا، اس میں اتنی عقل اور فہم پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اس کا بندوبست کر سکے۔ اگر ہوگئی ہے تو وہ مال اس کے تصرف میں دے دیا جائے، اگر اس میں ابھی تک بھی اتنی عقل وفہم نہیں پیدا ہوئی تو پھر عدالت اپنی صوابدید کے مطابق اس کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کرے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "**ولا تبخسوا الناس اشياء هم**"، بعض مفسرین نے اشیاءھم کی تفسیر میں لکھا ہے اموالہم۔ یعنی لوگوں کے مال یا لوگوں کی چیزوں اور ملکیتوں کی قیمت کم نہ کرو۔ ان کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ بخس کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بخس کے دراصل معنی ہیں کسی شخص کو اس جائز ملکیت کے فائدے سے محروم رکھنا یا اس کے مال و دولت سے اس کو محروم کر دینا۔ یا کسی کی چیز اونے پونے داموں خرید لینا، یہ بھی بخس میں شامل ہے۔ کسی شخص کو دھوکا دے کر اس کی قیمتی چیز کم قیمت میں لے لینا۔ یہ بھی اس میں شامل ہے۔ ایسی ہر صورت بخس میں شامل ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمائی کہ مجبور آدمی کو من مانی قیمت پر کوئی چیز بیچنے پر مجبور نہ کرو۔ ایک شخص مجبوری میں اپنی کوئی قیمتی چیز بیچنا چاہتا ہے۔ آپ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کہیں کہ میں پانچ سو روپے کی چیز سو روپے میں لونگا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ "**لاتبخسوا الناس اشياء هم**" کی مد میں آتا ہے۔ اسی طرح سے اور بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک شخص ناواقف ہے، اس کے پاس کوئی قیمتی چیز ہے، پرانی قیمتی دستاویز ہے، باپ دادا کے زمانے سے چلی آرہی ہے، آپ اس سے اونے پونے خرید لیں۔ یہ بھی بخس کی تعریف میں شامل ہے۔

ہمارے ایک عزیز تھے، ان کے پاس قدیم خاندانی دستاویزات اور کتب خانے کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس میں برصغیر کے بعض مشاہیر، مثلاً سید احمد شہید، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مرزا غالب، سرسید احمد خان اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کے خطوط، ہمارے خاندانی بزرگوں کے نام موجود تھے۔ انھیں ان خطوط کی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کو جب رقم کی ضرورت ہوتی تھی وہ ایک آدھ خط نکال کر پچاس روپے میں، دس روپے میں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ جس کے ہاتھ

فروخت کرتے تھے وہ بہت خوش ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں کی چیز کوڑیوں کے مول مل گئی۔ لیکن یہ اپنی ضرورت سے مجبور تھے اور ایک ایک کرکے انھوں نے سارہ ذخیرہ یا اس کا بیشتر حصہ اونے پونے بیچ دیا۔ اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے ہیں۔ یہ سب "لا تبخسوا الناس اشیاء هم" کی ذیل میں آتا ہے۔

قرآن مجید کے معاشی احکام کا یا مالی احکام کا یہ ایک بہت مختصر اور سرسری جائزہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اب میں اختصار کے ساتھ چند ایسی احادیث نبوی بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں معاشی نوعیت کے احکام اور مسائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

احادیث میں قرآن کریم میں بیان کردہ انھی بنیادی اصولوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور بعض ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جو قرآن کریم کے ان اصولوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن کریم کلیات کی کتاب ہے اور احادیث رسول اور سنت رسول میں ان کلیات کی تشریح کی گئی ہے، ان کی عملی تطبیق کی مثالیں دی گئی ہیں اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے کون سے کلیات، کن کن مزید اصولوں پر یا قواعد پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی وہ آیات جن کا تعلق معیشت وتجارت اور انسان کی معاشی زندگی سے ہے، ان کی تفسیر اور وضاحت مختلف احادیث میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

احادیث میں ایک مضمون بہت کثرت سے ملتا ہے جو دراصل قرآن مجید ہی کی ایک آیت کی تشریح ہے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ محنت کرنے کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اللہ کے رزق کو اللہ کا فضل قرار دیتے ہوئے اس کی تلاش کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس بات کو پسندیدہ بتایا گیا ہے کہ انسان جائز روزی کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے، جہاں سورہ ملک میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمہارے لیے مسخر اور آسان بنایا ہے، وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ "فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه"۔ زمین کے ان راستوں پر چلو۔ روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو۔ "وكلوا من رزقه" جو رزق اللہ نے رکھا ہے اس کو حاصل کرو اور کھاؤ۔ اسی طرح ایک اور جگہ ہے "فانتشروا في الارض وابتغوا من فضل الله"۔ اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو یعنی رزق کو تلاش کرو۔

قرآن کریم میں بیان کردہ اس بنیادی اصول کی مزید تفصیلات احادیث میں بیان

ہوئی ہیں۔ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صاحب ایمان بندے کو پسند کرتا ہے جس کے پاس کوئی ہنر بھی ہو۔"ان اللہ یحب المؤ من المحترف"۔بے ہنر آدمی بھی اگر صاحب ایمان ہوتو وہ یقیناً قابل احترام اور پسندیدہ ہے۔لیکن صاحب ایمان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب ہنر بھی ہو، کوئی مہارت رکھتا ہو، کسی خاص میدان میں کوئی تخصص رکھتا ہوتو وہ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے طلب معیشت کو اور روزگار کی تلاش کو بعض گناہوں کا کفارہ قرار دیا ہے۔امام طبرانی نے ایک حدیث روایت کی ہے۔حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بعض گناہ بندے سے ایسے سرزد ہوتے ہیں جس کا کوئی اور کفارہ نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ وہ جائز روزی کے حصول میں کوشاں ہو۔جائز روزی کے حصول کی کوشش اللہ کو اتنی پسند ہے کہ وہ بعض اوقات گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔اس لیے اگر کوئی شخص روزی کے حصول میں اس اجر وثواب کی نیت بھی رکھے اور شریعت کے قواعد کی پیروی کرے تو نہ معلوم کتنی غلطیوں، کتنے گناہوں اور کتنی بھول چوک کا یہ سب چیزیں کفارہ آپ سے آپ ہوتی جائیں گی۔

جب انسان محنت کا کوئی کام کرتا ہے، تو اس کا ایک طریقہ تو ہے کہ اترے جی سے ڈال پھینک کر کرے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت محنت سے، بہترین انداز سے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق اس کو انجام دے۔ایک حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند کرتا ہے کہ جب کوئی کام کرے تو اس کو کمال کے ساتھ کرے اور بہترین انداز سے پایہ تکمیل تک پہنچائے۔یعنی جس کو انگریزی میں پرفیکشن Perfection کہتے ہیں، اس کا حصول اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدگی اور مقبولیت کا ذریعہ ہے۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ فی نفسہ حب مال کوئی بری بات نہیں ہے۔مال کا ہونا اچھی چیز ہے، مال اللہ کا فضل ہے۔مشہور صحابی سیدنا ابو ہریرہ کے شاگرد رشید اور تابعین میں صف اوّل کی شخصیت حضرت سعید بن المسیب کا ارشاد علامہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو مال کی محبت نہیں ہے تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔مال کے بغیر خالی ہاتھ انسان کیا کر لے گا، مال ہوگا تو اللہ کی عبادت میں اس سے مدد ملے گی۔امانتوں کی انجام دہی اور ادائیگی میں مدد ملے گی۔اپنی عزت وآبرو کے تحفظ میں مال کی ضرورت پڑتی ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ

کہ انسان تمام مخلوقات سے مستغنی ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کی بارگاہ میں حاضری اور عبادت ہی اس کا سب سے بڑا کام یا سب سے بڑی مصروفیت رہ جاتی ہے۔ مال نہ ہو تو پھر اس کے حصول میں انسان کی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔

انسان کے پاس مال ودولت ہو اور وہ محنت کی اہمیت سے واقف ہو تو اس سے خود بخود اقتصادی سرگرمی پیدا ہوتی ہے، جس کی احادیث میں تلقین بھی کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس زمین ہو، کسی کے پاس زمین ہے، یا تو اس میں خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو کاشت کرنے کے لیے دے دے۔ یعنی وسائل کو بغیر استعمال کے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص پودا لگانے کے لیے بیٹھا ہو، ہاتھ میں اس کا بیج یا قلم ہو، اور ابھی لگانے کے لیے بیٹھا ہوا ہے، قیامت کا صور پھنک گیا تو حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر ہو سکے تو اس پورے کو لگا کر پھر اٹھو اور پھر دیکھو کہ قیامت آئی ہے تو اب کیا کریں۔ فان استطاع ان لا یقوم حتی یغرسها فلیفعل[4] اگر اس کو اتنی مہلت مل جائے کہ قیامت کا صور پھونکے جانے کے بعد بھی وہ پودا لگا سکے اور پودے کو لگانے کے بعد کھڑا ہو تو اس کو ایسا کر گزرنا چاہیے۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو محنت اور پیداواری سرگرمی میں اپنی مصروفیت ہر صورتحال میں اور آخری فرصت تک جاری رکھنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ قیامت کا صور پھکنے کے بعد پھر پودے کی یا کاشت کی یا پیداوار کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ لیکن یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ اگر تم کو جو فرصت میسر ہے وہ بالکل آخری فرصت ہو، اس میں کوئی پیداواری کام جو تم نے شروع کیا ہو وہ مکمل کر سکتے ہو تو اس کو نامکمل نہ چھوڑو۔ اس لیے کہ ذرائع پیداوار کو نامکمل چھوڑنا، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ اور اس مقصد کے بھی خلاف ہے جو میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ پرفیکشن کو پسند فرماتا ہے۔ پرفیکشن میں ایک تو کسی چیز کا مکمل طور پر انجام دینا، شامل ہے۔ دوسرے بہترین طریقے سے انجام دینا بھی پرفیکشن کا ایک تقاضا ہے۔ دوسرے جب کوئی کام کیا جائے تو اس میں لیاقت، خوبصورتی، حسن و جمال کے پہلوؤں کو، جمالیات کے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ جمالیات سے فرار دینی زندگی کا لازمی

تقاضا ہے۔ یا روحانی کمالات ذوق جمال اور جمالیات کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ اسی طرح کی غلط فہمی ہے جو ہندوؤں میں، عیسائیوں میں عام ہے کہ دنیا کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ روحانی تقاضے انجام نہیں پا سکتے۔ یہ تفریق رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں نہیں ہے۔ یہاں تو ہدایت یہ ہے کہ ''ان اللّٰہ جمیل یحب الجمال''۔ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے، صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یہاں جمال سے مراد محض جسمانی یا ظاہری جمال نہیں ہے، بلکہ کردار کا جمال، کارکردگی کا جمال، خدمات کا جمال، اخلاق کا جمال ہے۔ ہر وہ چیز جس میں کمال اور جمال حاصل کیا جا سکتا ہو، اس میں کمال اور جمال حاصل کیا جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق ہے۔

ایک دوسری جگہ زیادہ وضاحت سے ارشاد فرمایا ہے کہ ''من صنع منکم شیئا فلیحسنہ''۔ تم میں سے اگر کوئی شخص کوئی چیز بنائے، یاد رکھیے کہ یہاں صنعت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں پوری صنعت اور انڈسٹری شامل ہے۔ ''فلیحسنہ'' تو اس کو بہت خوبصورت اور بہتر انداز سے مکمل کرے، بہتر انداز سے بنائے۔ یہ صنعت کاروں کے لیے ایک ہدایت ہے کہ تم جو بھی صنعت تیار کرو، جو چیز بھی پیداوار کرنے کے لیے اختیار کرو، اس کو جتنا خوبصورت بنا سکتے ہو بناؤ۔

اب خوبصورتی پیدا کرنے یا پرفیکشن حاصل کرنے کا ایک محرک تو یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے دوسرے صنعت کاروں کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ جاپان اور یورپ اور جرمنی کے مقابلے میں اپنی صنعت بہتر بنا کر بیچنی ہے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر اس جذبے کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی ہو کہ اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے کہ صنعت کو بہتر سے بہتر بناؤ، تو وہ ساری کاوشیں، وہ ساری مہارتیں، ماہرین سے مشورہ، ڈیزائننگ کے کام، یہ سب کے سب عبادت میں شامل ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ آپ کی نیت یہ ہے کہ آپ اپنی صنعت کو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق خوبصورت سے خوبصورت بنائیں۔ یہ تو وہ عمومی ہدایات ہیں جو کاروبار اور تجارت کے بارے میں احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔

تجارت اور معیشت سے متعلق احادیث میں جو سب سے اہم اور بنیادی مضمون بیان ہوا ہے، وہ خرید وفروخت، تجارت، اور لین دین کے قواعد ہیں۔ خرید وفروخت اور تجارت انسانی معاشرے میں شروع سے جاری ہے۔ انسان جب سے روئے زمین پر اجتماعی زندگی گزار رہا ہے،

اس وقت سے اس میں کسی نہ کسی قسم کا لین دین اور تجارت بھی جاری ہے۔ وہ بہت ابتدائی نوعیت کی تجارت ہو یا بہت ترقی یافتہ نوعیت کی تجارت ہو۔ انسانوں کا کوئی معاشرہ اس سے خالی نہیں رہا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی جو پہلے سے انسانی معاشرے میں جاری ہیں۔ نہ یہ چیزیں قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، نہ قرآن و سنت کا یہ منشا ہے کہ جو کام انسانوں میں روز اوّل سے ہو رہا ہے اسی پر دوبارہ زور دیں۔

قرآن کریم اور احادیث کا اسلوب یہ ہے کہ اگر کوئی مفید، مثبت اور جائز کام ہو رہا ہے، اس کو باقی رکھا جائے، اس کو منع نہ کیا جائے، اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اگر اس جائز کام میں کہیں کہیں کوئی ناجائز عنصر شامل ہو گیا ہے تو اس ناجائز عنصر کی نشاندہی کر کے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اگر کسی جائز کام کو مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا تو اس کو مزید بہتر بنانے کے لیے جہاں جہاں ضروری محسوس ہوا ہدایات دی گئیں۔ اور اگر کوئی چیز بالکل ناجائز یا حرام ہے تو پھر شریعت نے وضاحت سے اس کی حرمت کو بھی بیان کیا ہے، اس کے اسباب بھی بیان کیے ہیں، اس کی حکمت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اس حرام فعل کے ارتکاب کے جتنے ممکنہ راستے ہو سکتے ہیں، ان سب کو بند کرنے کی ہدایت کی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسانوں کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ فلاں کام جس کو وہ جائز سمجھ رہے ہیں، جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ تو بہت بے ضرر سا کام ہے، لیکن وہ بظاہر بے ضرر سا کام دراصل کسی بڑے ناجائز کام کا راستہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اُس ناجائز کام کے راستے کھل جاتے ہیں جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اس لیے احادیث میں کاروبار کے ایسے بہت سے طریقوں کی ممانعت کی گئی ہے جو عرب میں رائج تھے اور بظاہر ان میں کوئی بڑی قباحت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن غور کر کے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس طرح کا کاروبار اگر جاری رہے اور انسان اس میں مصروف ہوں، بڑی تعداد میں اس کو اختیار کر لیں تو اس سے کسی بڑی برائی کا راستہ کھلنے کا قوی امکان رہتا ہے۔ اس لیے اللہ کی شریعت نے ان راستوں کو بند کر دیا اور ایسے تمام کاروباری طور طریقے حرام قرار دے دیے جن سے کسی بڑے حرام کا راستہ کھل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر احادیث میں ربا کی حرمت کی مزید تاکید آئی ہے۔ قرآن کریم میں تو یقیناً ربا کی حرمت کے احکام آئے ہیں۔ احادیث میں مزید تفصیل اور تاکید آئی ہے۔

یہ تاکید ربا کے ان ضمنی راستوں کے بارے میں بھی ہے جن کو شریعت نے بند کیا ہے۔ آگے چل کر ایک مفصل خطبے میں ربا پر بات ہوگی تو ان احادیث کا حوالہ بھی تفصیل سے آئے گا۔ لیکن یہ احادیث چھپن قسم کے مضامین یا عنوانات پر مشتمل ہیں۔ جن میں رسول اللہ ﷺ نے ربا کا ذریعہ بننے والے یا ربا کا راستہ بننے والے مختلف انداز کے کاروباروں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ جانور کا دودھ دوہنے سے پہلے فروخت نہ کیا جائے، یہ جائز نہیں ہے۔

جانور کا جو بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا، اس کی فروخت جائز نہیں ہے مثلاً گائے ہے، بکری ہے، اونٹنی ہے، وہ بچہ دینے والی ہے۔ اس بچہ کی خرید وفروخت کی اجازت نہیں ہے۔ بچہ پیدا نہیں ہوا آپ نے فروخت کر دیا۔ دریا میں یا سمندر میں آپ مچھلی شکار کرنے کے لیے جا رہے ہیں، مچھلی شکار نہیں کی، لیکن شکار کرنے سے پہلے اس کو فروخت کر دیا، یہ بھی جائز نہیں ہے۔ پرندوں کا شکار کرنے جا رہے ہیں، ابھی کوئی پرندہ شکار نہیں کیا، لیکن وہ شکار جو آپ حاصل کریں گے یا جس کے حاصل کرنے کی امید ہے، اس کو آپ پیشگی فروخت کر دیں، اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اسی طرح سے کوئی جانور یہ کہہ کر فروخت کیا جائے کہ اس جانور کا جب بچہ پیدا ہوگا یا اس بچے کا جب بچہ پیدا ہوگا تو اس کو اتنی قیمت میں خرید لیں گے، عرب میں اس کا رواج تھا۔ خاص طور پر اچھی نسل کے گھوڑوں، اچھی نسل کے اونٹوں کا اہتمام چونکہ عرب میں بہت تھا۔ اس لیے اچھی نسل کی اونٹنیوں کی اولاد کی ہر جگہ مانگ تھی۔ اس لیے بعض لوگ پہلے سے قیمت لگا دیا کرتے تھے کہ اگلے سال یا اس سے اگلے سال جب اس اونٹنی کے یہاں بچہ پیدا ہوگا تو ہم اس کو فروخت کر دیں گے اور قیمت پیشگی لے لیا کرتے تھے۔ اس طرح کے کاروباروں کا رسول اللہ ﷺ نے راستہ بند کر دیا۔ اس لیے کہ ان معاملات کے نتیجے میں یا غرر پیدا ہوتا ہے یا ربا ہوتا ہے، یا قمار ہوتا ہے۔

ربا سے مراد جیسا کہ ابھی آگے چل کر آئے گا، کسی ایسی چیز کی جو مثلیات سے تعلق رکھتی ہو، یعنی اس جیسی چیز، اسی قیمت کی بازار میں عام دستیاب ہو، اس چیز کی ویسی ہی چیز سے خرید و فروخت کرتے ہوئے مقدار میں کمی بیشی کرنا بھی ربا ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایک من گندم کے بدلے دو من گندم خرید لے۔ اچھی قسم کی گندم کم

مقدار میں دے کر گھٹیا قسم کی گندم زیادہ مقدار میں لے لے، یہ درست نہیں ہے۔ گندم گندم ہے چاہے وہ اچھی ہو یا بری ہو۔ اگر کوئی شخص گندم کا گندم سے لین دین کرنا چاہے تو وہ برابری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنی قیمتی گندم فروخت کر کے ذرا معمولی قسم کی گندم زیادہ مقدار میں حاصل کر لے تو اس کو چاہیے کہ وہ مونٹری ایکانومی کی طرف جائے، یعنی وہ پہلے سکہ رائج الوقت کے حساب سے اپنی گندم فروخت کرے، پھر اس نقد رقم سے جو حاصل ہو، بازار میں جتنی اور جیسی چاہے گندم خریدے۔

اب چونکہ یہ ربا کی ایک قسم ہے، مثلیات میں کمی بیشی سے ربا اور استحصال کا راستہ کھلتا ہے اس لیے جہاں جہاں انسانوں سے غلطی ہوسکتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا راستہ روکا۔ غرر کی چونکہ ممانعت ہے اس لیے غرر پر مبنی سب کاروباروں کو منع فرمایا ہے۔ غرر کہتے ہیں کسی ایسی چیز کی خرید وفروخت کو جو اس وقت معلوم اور متعین نہ ہو۔ یا جس کی فراہمی فروخت کنندہ کے، بائع کے اختیار میں نہ ہو۔ جیسے شکاری مچھلی کا شکار کرنے جا رہا ہے، ابھی اس کو معلوم نہیں ہے کہ جو مچھلی حاصل ہوگی وہ کیسی ہوگی، اچھی ہوگی یا بری ہوگی۔ بڑی مچھلیاں ہونگی یا چھوٹی مچھلیاں ہونگی۔ اس لیے جو چیز ابھی متعین نہیں ہے، جس کی تفصیلات اور صفات واضح نہیں ہیں، اس کی خرید وفروخت درست نہیں ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں یہ ہدایت فرمائی کہ بازار کے معاملات کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے اور بازار کے معاملات میں غیر فطری مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ غیر فطری مداخلت سے مراد وہ مداخلت ہے، جس میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر کوئی شخص مصنوعی طریقوں سے اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ مثلاً بازار کا سارا مال اکٹھا خرید کے کوئی شخص اپنے گھر میں رکھ لے۔ ذخیرہ اندوزی کرے اور جب قیمت بڑھ جائے تو اسے فروخت کر دے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرہ اندوزی کے نتیجے میں بازار میں جو قیمتیں چڑھیں گی وہ مصنوعی ہونگی۔ قیمتوں میں حقیقی اضافہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح سے اس زمانے میں رواج تھا کہ جب گاؤں یا دیہات یا صحرا کے لوگ اپنی پیداوار لے کر شہر میں آیا کرتے تھے تو شہر میں بڑے کاروباری یا بڑے دوکانداروں کے کارندے شہر سے باہر ہی جا کر ایسے لوگوں سے سستے داموں ان کی پیداوار خرید لیا کرتے تھے۔ مثال کے طور

پر ایک بدوی اونی چادر لے کر آ رہا ہے جو اونٹ کے ریشے سے بنائی گئی ہیں۔ اب اس نے تو ظاہر ہے اپنے ریگستان میں بیٹھ کر یہ چادریں بنائی ہیں، اس کو نہ کسی ریشے کی قیمت دینی پڑی، نہ کسی کارندے کو پیسے دینے پڑے۔ اس نے اپنے گھر کے اونٹوں سے کام لیا، گھر کی عورتوں نے چادر بنائی ہے۔ اب اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ بازار میں، طائف میں، مکہ مکرمہ میں یا مدینہ منورہ میں اس اونی چادر کی کیا قیمت ہے۔ سو درہم ہے یا پچاس درہم ہے یا پچیس درہم ہے کہ دوسو ہے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ بڑے بڑے کارندے باہر جا کر اس شخص سے بازار کی قیمت سے بہت کم پر اس کا مال خرید لیا کرتے تھے۔ غریب بدوی مزدور کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بازار میں چادر کی قیمت سو درہم لگے گی۔ کارندے نے کہا کہ دس درہم میں فروخت کرو گے۔ اب بدوی نے سوچا کہ ٹھیک ہے دس درہم بھی ہمارے لیے بہت ہیں اور بلاوجہ شہر تک جانے سے بازار میں بیٹھنے سے بچ جائیں گے، اور اگر مال نہ بکا تو رات کو ٹھہرنے کے اخراجات بچ جائیں گے۔ اس نے کہا کہ ہاں لاؤ! دس درہم دیتے ہو؟ دس دس درہم میں جتنی چادریں لائے تھے سب فروخت کیں اور چلے گئے۔

اس نوعیت کے کاروبار کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں دوہرا نقصان ہے۔ ایک نقصان تو اس غریب بدوی کا ہے اور ان کارندوں کا ہے جنھوں نے وہ چادریں بنائی ہیں۔ ان گھر کی خواتین کا ہے جنہوں نے محنت کی، پہلے جانور کے اون کو کاٹا، اس کا دھاگہ بنایا، پھر چادریں بنیں، ظاہر ہے دستکاری کا کام بڑا مشکل ہوتا تھا۔ ان کو اپنی محنت کی پوری قیمت نہ ملے، یہ ان کے ساتھ ظلم ہے۔ پھر یہ غیر ضروری طور پر منافع خوری بھی ہے کہ بازار میں فروخت کرتے وقت آپ اس کی قیمت سو درہم لیں گے، اس غریب سے آپ نے دس درہم میں خرید لی تو گویا دس درہم کے مقابلے میں آپ نوے درہم منافع لینا چاہتے ہیں۔ یہ منافع خوری کی بدترین قسم ہے۔ اس لیے ان سب قباحتوں سے بچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں ان سب معاملات کی ممانعت فرما دی۔ یہ احادیث بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ جیسی بڑی بڑی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں۔ صحابہ کرام میں سے متعدد صحابہ نے ان کو روایت کیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ تلقی جلب کی اجازت نہیں ہے۔ تلقی جلب یعنی تجارتی قافلے کو شہر میں آنے سے پہلے ہی باہر جا کر وصول کر لینا اور اس کا مال خرید لینا! یہ درست نہیں ہے۔ اسی کو تلقی رکبان بھی کہتے ہیں۔ اسی کو بیع الحاضر للبادی کی اصطلاح سے بھی یاد کیا گیا کہ شہری کی خرید و فروخت صحراوی اور بدوی

کے ساتھ اگر اس نوعیت کی ہو جیسا کہ میں نے بیان کیا تو یہ درست نہیں ہے۔

اسی طرح سے عربوں میں بعض خاص انداز کے کھیل رائج تھے، جس میں تجارت بھی ہوتی تھی اور کھیل بھی ہوتا تھا۔ اس طرح کا کھیل ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ایک طرح سے کھیل ہی کھیل میں تجارت ہوتی ہے۔ یہ Game of Chance کہلاتے ہیں۔ آج کل یہ بہت ہوتا ہے، جیسے ایک شخص نے پھرکی چلائی اور پھرکی کی سوئی جس چیز پر جا کر رکے گی وہ آپ کو مل جائے گی اور آپ کو اس کے بدلے میں سو روپے، پچاس روپے، دس روپے دینے پڑیں گے۔ اب خریدنے والے کو معلوم نہیں کہ وہ دس روپے جو دے رہا ہے وہ کس چیز کے لیے دے رہا ہے۔ کیا واقعتاً اس کو اس کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اس کو ان دس میں سے کسی ایک چیز کی ضرورت ہے، اور پھرکی جا کر اس چیز پر رک گئی جس کی اس کو ضرورت نہیں تو یہ لین دین دل کی صفائی کے ساتھ نہیں ہے۔ مکمل رضا مندی کے ساتھ نہیں ہے جو ضروری ہے۔ تراضی جس کو قرآن کریم نے کہا ہے، یا طیب نفس کی اصطلاح حدیث میں استعمال ہوئی ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔ اس کو عربی میں بیع الحصاۃ کہتے ہیں۔ ایک شخص نے کنکری پھینکی اور سامان اس بساط میں رکھا ہوا ہے، جس چیز پر جا کر کنکری لگ گئی، اس کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ اس کی خرید و فروخت مکمل ہوگئی یا بیع ملامسہ جس کو کہا جاتا تھا، یا منابذہ۔ یہ اسی کی مختلف صورتیں تھیں جن کی احادیث میں ممانعت کی گئی ہے۔

بیع الملامسہ کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ ملامسہ سے مراد اس سودے کی خرید و فروخت تھی جس کو ابھی نہ خریدار نے دیکھا اور نہ خریدار کو اس کا علم ہے۔ مثلاً یا کپڑوں کے تھان لپیٹے ہوئے رکھے ہیں، اس میں سے مشتری نے ایک کو ہاتھ لگا دیا، اس کی قیمت ابہام کے ساتھ طے ہوگئی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ تھان کتنا لمبا ہے، چونکہ کپڑوں کے تھان دستی بنے جاتے تھے تو اس کے مختلف اجزاء مختلف معیار کے ہو سکتے تھے، کوئی جزو اچھا بنا ہوا ہو کوئی کم بنا ہوا ہو۔ کسی میں اچھا سوت لگا ہوا ہے، کسی میں گھٹیا سوت لگا ہوا ہے۔ تو جب تک پورا تھان پھیلا کر دیکھا نہ جائے، یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ خریدنے والا کیا چیز خرید رہا ہے اور بیچنے والا کیا چیز بیچ رہا ہے، وہ چیز کتنی مالیت کی ہے، کس کیفیت کی ہے۔ اس لیے اس ابہام کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

بیع منابذہ کے بارے میں امام زہری کے حوالہ سے بعض فقہا نے لکھا ہے کہ بیع منابذہ کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ بہت سے لوگ یہ جانے بغیر کہ وہ کیا خرید رہے ہیں اور اس کو دیکھے بغیر کہ وہ کیا چیز ہے، کسی سے معلوم کیے بغیر رقم ادا کر دیا کرتے تھے اور بیچنے والا ان کے سامنے کوئی ایک آئیٹم پھینک دیا کرتا تھا، اس کے مختلف طریقے ہوتے تھے کہ وہ کیسے پھینکے گا، کیسے اس کا انتخاب ہوگا۔ یہ جوئے کی ایک قسم تھی۔ گویا اگر دس درہم آپ نے ادا کیے ہیں تو بعض اوقات تو اتفاق سے سو درہم کی ایک چیز ہاتھ آ گئی، بعض اوقات دو ہی درہم کی چیز ملی۔ یہ محض بخت و اتفاق کا معاملہ تھا کہ کس کو کیا ملے گا اور کیا اور کیا نہیں ملے گا۔ اسی لیے علامہ ابن عبدالبر نے ایک جگہ لکھا ہے اور یہ امام ربیعہ الرائے کی رائے ہے کہ ملامسہ اور منابذہ یہ دونوں جوئے کی بڑی قسمیں تھیں اور ان دونوں قسم کے کاروباروں میں جوا پایا جاتا تھا۔

جوا یعنی قمار اور ربا محرّمات تجارت میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں سے بچانے کے لیے احادیث میں جن مزید کاروباروں کی ممانعت ہے ان میں ایک غیر مملوکہ اشیاء کی فروخت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا عن ربح مالم یضمن، اس چیز کا نفع لینے سے روکا جس کا تاوان یا جس کا ضمان تمہارے ذمے نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی چیز آپ کے قبضے میں ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ اگر وہ ٹوٹ جائے، ضائع ہو جائے یا نقصان ہو جائے تو آپ اس نقصان کے ذمہ دار نہیں ہیں، کوئی اور ذمہ دار ہے۔ اگر کوئی اور ذمہ دار ہے تو اس کا نفع لینے کا آپ کو اختیار نہیں ہے۔ جو نقصان اٹھانے کا ذمہ دار ہے وہ نفع لینے کا بھی حق دار ہے، جو تاوان برداشت کرنے کا پابند ہے وہی نفع لینے کا بھی حق دار ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں ایک ساتھ ہیں اور ان دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ "الخراج بالضمان" ایک مشہور حدیث ہے جس میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جس چیز کے ٹوٹ پھوٹ کے، نقصانات کے آپ ذمے دار ہیں اور آپ اس کے اخراجات برداشت کرنے کے پابند ہیں اسی چیز کا نفع بھی آپ لے سکتے ہیں۔

اسی طرح سے ایک جگہ فرمایا کہ "لا تبع مالیس عندك" جو چیز ابھی تمہارے قبضے میں نہیں ہے، یا تمہارے بس اور استطاعت میں نہیں ہے اس کو تم فروخت نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ میں نے ابھی پرندے کی اور مچھلی کی مثال دی۔ لیکن اس ممانعت میں ان چیزوں کی خرید و فروخت شامل نہیں ہے جن کی فراہمی آپ کے بس میں تو ہو لیکن سردست وہ چیز آپ کے قبضے میں نہ ہو۔

یعنی وہ اس وقت تو آپ کے قبضے میں نہیں ہے، لیکن اس کا بروقت فراہم کر دینا آپ کے بس میں ہے۔ جیسے آپ کا ایک کارخانہ ہے، فرنیچر بنانے کا انتظام ہے، ایک شخص آپ سے سو کرسیاں خریدتا ہے، آپ اس سے پیسے پیشگی لے لیتے ہیں، کرسیاں سردست آپ کے پاس موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی بروقت فراہمی آپ کے بس میں ہے، آپ مطلوبہ تعداد میں کرسیاں بنا کر دے سکتے ہیں، اس صورت میں خریدار آپ کو اپنی شرائط سے آگاہ کر دے گا کہ اس کو کس نوعیت کی، کس حجم کی، کس شکل وصورت کی کرسیاں درکار ہیں، اس شکل وصورت کی، اس حجم کی اور اس کے شرائط کے مطابق آپ سو کرسیاں بنا کر اس کو ادا کر دیں گے، یہ جائز ہے اور "لا تبع ما ليس عندك" میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ یہ آپ کے بس اور استطاعت میں ہے اور آپ اس کو مطلوبہ انداز اور تعداد کی کرسیاں بنا کر دے سکتے ہیں۔

اسی طرح سے ایسا کاروبار جائز نہیں ہے جس میں کوئی ایسی شرط رکھ دی گئی ہو جو اس کاروبار کی بنیادی حقیقت سے متعارض ہو اور اس کے اصل مقصد سے ہم آہنگ نہ ہو۔ مثلاً آپ کو کوئی چیز فروخت کرنی ہے، آپ کہیں کہ میں یہ چیز فروخت تو کر رہا ہوں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ مجھے اس کے بدلہ میں کوئی چیز کرایہ پر دے دو۔ میں یہ چیز کرایے پر دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تم میری فلاں چیز مجھ سے خرید لو۔ میں تمھیں ایک لاکھ روپے قرضہ دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ کہ تم میری یہ گاڑی خرید لو۔ اس نوعیت کے جو معاملات ہیں یہ جائز نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان سے بھی ربا کا دروازہ کھلتا ہے۔ میں ایک لاکھ روپیہ قرض تو دینے کے لیے تیار ہوں، اس پر سود بھی نہیں لوں گا، لیکن اپنی پرانی گاڑی جس کی قیمت بازار میں پچاس ہزار بھی نہیں ہے، ایک لاکھ میں دینے کی شرط رکھتا ہوں، تو گویا میں اس ایک لاکھ قرض کے مقابلے میں پچاس ہزار ناجائز کمانا چاہتا ہوں۔ اس طرح کی شرائط سے بالواسطہ سودی آمدنی کا ایک راستہ کھلتا ہے۔ چاہے کسی کی نیت سودی کاروبار کی نہ ہو، اس وقت تو بیشک سودخوری کی نیت نہیں ہے لیکن اگر یہ کاروبار جائز قرار دے دیا جاتا اور یہ راستہ کھل جاتا تو سود کھانے والے اس راستے کو اختیار کرتے۔

عرب میں یہ جو ناجائز کاروبار تھے یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی جگہ سارے کے سارے ہوتے ہوں، بلکہ مختلف قبائل میں، مختلف علاقوں میں ان میں سے ایک نہ ایک رائج تھا مثلاً منابذہ کا ابھی ذکر آیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دومۃ الجندل کا ایک میلہ لگتا تھا، جس میں بازار

بھی لگتا تھا، وہاں یہ نوعیت رائج تھی۔ اسی طرح سے مشقر کا ایک بازار تھا جس کا ذکر ادب کی کتابوں میں، تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے، وہاں بھی میلہ لگتا تھا، وہاں ملامسہ کا طریقہ رائج تھا۔ اسی طرح سے ایک معاومہ کا طریقہ تھا، یعنی چند متعین سالوں کے لیے کوئی چیز فروخت کر دی جاتی تھی۔ اب یہ بیع کے حقیقی تصور سے متعارض ہے۔ بیع کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنی چیز بیچ دی اور اس کی ملکیت خریدار کو منتقل ہو گئی، اب آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ آپ اس کی قیمت کے مالک ہیں۔ معاومہ میں ایسا نہیں تھا۔ کوئی چیز فروخت تو ہو گئی، لیکن دس سال کے لیے ہوئی یا پانچ سال کے لیے ہوئی۔ پانچ سال کے بعد وہ لازماً آپ کو واپس کرے گا۔ اب ایک شخص کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ اپنی ملکیت اپنی مرضی کے بغیر طے کی گئی شرائط پر فروخت کر دے، یہ درست نہیں ہے۔ آپ آج شرائط طے کر رہے ہیں اور جو اصل بیع ہے وہ پانچ سال کے بعد ہوگی، اس وقت کیا قیمتیں ہوں گی۔ اس وقت اس چیز کی مالیت کیا ہوگی۔ یہ ابھی متعین نہیں ہے اور ان تمام شرائط کو مبہم رکھتے ہوئے، نامعلوم رکھتے ہوئے، کوئی خرید و فروخت کرنا یہ تراضی کے اس بنیادی اصول کے بھی خلاف ہے جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔

اس طرح احادیث میں جن چھپن معاملات کی ممانعت آئی ہے، ان سب کی مثالیں دی جائیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ لیکن ان میں سے بہت سے معاملات کا تذکرہ آئندہ گفتگوؤں میں آتا جائے گا۔ ان معاملات کو علمائے اسلام نے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ان معاملات کا بڑا حصہ تو وہ امور ہیں جو ربا کے راستے کو بند کرنے کے لیے حرام قرار دیے گئے ہیں، یا تو ان میں براہ راست ربا پایا جاتا تھا یا ان سے ربا کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ کچھ معاملات وہ ہیں جو یا تو خود غرر تھے یا ان کے ذریعے غرر کا راستہ کھلتا تھا۔ غرر سے مراد یہی ہے کہ کسی ایسی چیز کی خرید و فروخت جو اس وقت موجود نہ ہو اور آئندہ طے شدہ شرائط کے مطابق اس کی فراہمی بیچنے والے کے بس میں نہ ہو۔ اس چیز کے بارے میں بیچنے والے کو یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ اس کو فراہم کر سکتا ہے یا نہیں کر سکتا۔ یہ سب چیزیں غرر ہیں۔ تیسری چیز قمار یا میسر تھی، جو جوا کی مختلف صورتوں کے نام ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے کسی ایسی چیز کی فروخت کی بھی ممانعت فرمائی ہے جو آپ نے خرید تو لی ہے لیکن ابھی آپ کے قبضے میں نہیں آئی۔ آج کل Future Sale کی بہت سی قسمیں

ہیں وہ اسی حرمت کے تحت آتی ہیں۔آپ نے کوئی چیز خریدی، قیمت ادا کر دی، نظری طور پر آپ مالک ہو گئے، لیکن ابھی آپ کے کنٹرول یا قبضے میں نہیں آئی۔آپ نے آگے بیچ دی، اپنا نفع رکھ لیا، جس نے خریدی ہے اس نے مزید نفع رکھ کر اور آگے بیچ دی، تیسرے شخص نے چوتھے کو بیچ دی، قبضے میں ابھی کسی کے بھی نہیں آئی، یہ خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔صحیح بخاری میں کتاب البیوع میں حضرت عبداللّٰہ بن عباس سے، حضرت عبداللّٰہ بن عمر سے یہ احادیث بیان ہوئی ہیں۔جس حدیث کو حضرت عباس نے روایت کیا، اس میں کھانے پینے کی چیزوں کا، خاص طور پر گندم کا ذکر ہے کہ جب تک گندم خریدنے کے بعد خریدار کے قبضے میں نہ آ جائے، اس کو آگے فروخت نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ یہاں گندم کا ذکر بطور مثال کے ہے۔صرف گندم کے ساتھ یہ شرط ہو، بقیہ چیزوں کے ساتھ یہ شرط نہ ہو، یہ بے معنی سی بات ہے۔حضرت عبداللّٰہ بن عباس نے اس کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھا، اگرچہ واضح ہے کہ یہ حرمت ہر چیز کے لیے ہے لیکن ان کو خیال ہوا کہ شاید کوئی آگے چل کر یہ کہے کہ اس نوعیت کے خرید وفروخت کی یہ ممانعت صرف گندم تک محدود ہے، یا کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رکھی جا سکتی ہے۔اس ممکنہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے حضرت عبداللّٰہ بن عباس نے وضاحت کی کہ ''ولا احسب کل شیء الا مثلہ'' میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر چیز کا یہی حکم ہے اور اس کو گندم ہی کی طرح سمجھا جائے گا۔

جن چیزوں میں غرر پایا جاتا ہے، ان سب کو رسول اللّٰہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ غرر کی حرمت کی روایات متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں۔حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللّٰہ ابن عمر، حضرت عبداللّٰہ بن عباس، حضرت انس، حضرت سہل ابن سعد، حضرت عمران حصین، حضرت کعب بن اسید، حضرت عبداللّٰہ بن مسعود۔حضرت جابر ابن عبداللّٰہ یہ وہ صحابہ کرام ہیں جنھوں نے غرر کی روایات بیان کی ہیں۔اور محدثین میں سے تقریباً تمام بڑے محدثین نے، صحاح ستہ میں چھ کی چھ کتابوں کے مرتبین نے ان احادیث کو بیان کیا ہے، جن میں رسول اللّٰہ ﷺ نے واضح طور پر غرر کا نام لے کر بھی کہ غرر پر مبنی خرید وفروخت کی جتنی قسمیں ہیں، وہ سب ناجائز ہیں۔غرر کی جو صورتیں اس وقت رائج تھیں، ان میں بھی ایک ایک کا نام لے کر آپ نے بیان فرمایا۔مثال کے طور پر غرر کی ایک صورت یہ بھی رائج تھی اور آج بھی بعض جگہ رائج ہے کہ لوگ اپنے باغات اور کھیت بہت پہلے فروخت کر دیتے ہیں۔ایک شخص کا آم کا باغ ہے۔ابھی

اس پر پھول بھی نہیں آیا، پھول آئے گا آگے چل کر اگلے سال کے فروری میں، اس سے پہلے سال کے اکتوبر میں ہی فروخت کر دیا اور کہا کہ جتنا پھل میرے باغ میں آئے گا اتنے لاکھ کا آپ لے لیں اور اتنی رقم مجھے پیشگی ہی ادا کر دیں، یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ "نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع الثمر قبل ان یبدو صلاحھا" یا "قبل ان ینضج"۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے پھل کی فروخت سے منع کیا ہے اس وقت تک جب وہ واضح طور پر کوئی پختہ شکل اختیار نہ کر لے، جب تک وہ پک نہ جائے، جب تک آم نکل نہ آئے، اس وقت تک اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ نکل آیا تو کچھ دن میں بڑا ہوگا، پکے گا، وہ الگ مسئلہ ہے۔ لیکن ابھی آم نکلا ہی نہیں ہے، ابھی پھول ہی نہیں آیا اور آپ نے فروخت کر دیا۔ اس لیے یہ واضح قسم کا غرر ہے، جس کی حضور ﷺ نے واضح طور پر ممانعت فرمائی ہے۔

ان ممانعتوں کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کی ممانعت بھی کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور عام انسانوں کا ان پر حق یکساں ہے۔ جیسے ایک دریا ہے جس کا پانی بہہ رہا ہے مثلاً دریائے سندھ ہے، ہمارے ملک میں الحمدللہ سب کے لیے بہہ رہا ہے، دریائے چناب اور جہلم ہیں۔ ان کا پانی ہر پاکستانی کے لیے ہے، یہ ہر انسان کے لیے ہے، ہر جانور کے لیے ہے، اب کوئی شخص دریا کے کنارے ہتھیار لے کر بیٹھ جائے اور کہے کہ جب تک پیسے نہیں دو گے پانی نہیں دیں گے۔ یہ جائز نہیں ہے۔ جو پانی کھلے دریاؤں میں، سمندروں میں اور کھلے چشموں میں اور آبشاروں میں آ رہا ہے، وہ تمام لوگوں کی اور اس ملک اور علاقہ کے تمام باشندوں کی ملکیت ہے، اس پر کسی ایک شخص کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک کہ اگر کچھ لوگ سفر پر جا رہے ہوں، ایک شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی موجود ہے اور دوسرا محتاج ہے تو حضور نے ممانعت فرمائی ہے کہ جو زائد از ضرورت پانی ہے یہ دوسرے کو ویسے ہی دے دو، فروخت نہ کرو۔ بعض فقہاء کے نزدیک یہ حرمت قانونی انداز کی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے پاس پانی زائد رکھتا ہو اور اس کو بیچے تو ان فقہا کی رائے میں یہ بیع منعقد نہیں ہوگی بلکہ بیچنے کی کوشش کرنے والے کو سزا ملے گی۔ اس رائے کے برعکس بیشتر فقہاء کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک اخلاقی نوعیت کی ہدایت ہے اور یہ فرمایا گیا کہ یہ انتہائی بری اور مکروہ حرکت ہے کہ تم زائد پانی فروخت کرو اور اخلاقی طور پر دوسرے کو اس سے محروم رکھو۔

خرید وفروخت میں ایک بڑی اہم اور بنیادی بات یہ ہے، جس کا بہت سے لوگ خیال نہیں رکھتے، کہ جس چیز کا کھانا پینا یا دوسرا استعمال جائز نہیں ہے، اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں ہے اور اس کی قیمت وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر شراب پینا مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ تو شراب کو بیچنا بھی جائز نہیں ہوگا اور اگر کوئی بیچ دے تو اس کی قیمت استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ یہ ایک طرح کا حیلہ ہے، جس کی قرآن کریم میں ممانعت بھی کی گئی ہے اور یہودیوں کو اس میں شدید وعید کا مستحق قرار دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت فرمائے، جب ان کو چربی کھانے سے منع کیا گیا، چربی کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، اللہ نے چربی کھانے سے منع کیا ہے، چربی بیچنے سے تو منع نہیں کیا۔ یوں انھوں نے چربی کا کاروبار شروع کر دیا، بیچتے تھے اور اس کی قیمت وصول کر کے کھایا کرتے تھے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے اس طرز عمل کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے واضح طور پر یہ بات بیان فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔ لہٰذا جو اپنی ذات میں چیز حرام ہے اور اس سے استفادہ بھی حرام ہے، جیسے شراب ہے، خنزیر ہے، بت پرستی کے آلات ہیں، ان کی قیمت لینا بھی حرام ہے، جیسے بھی ملے۔ لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہے کہ اس سے اور طرح سے انتفاع یا فائدہ اٹھانا جائز ہے، یعنی اس کے محض کھانے کی ممانعت ہے لیکن اس سے دوسرے فائدے اٹھانا جائز ہے، جیسے مثلاً گدھے اور خچر، شکاری کتا، شکاری کتا وغیرہ رکھنے کی قرآن میں اجازت ہے۔ گدھے اور خچر کا قرآن کریم میں ذکر ہے۔ اس کو سواری کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔ اس طرح کے جانوروں کی خرید وفروخت بھی جائز ہے اور ان کے جسم کے تمام اجزاء کا کاروبار کرنا بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ حرام العین یعنی اپنی ذات میں حرام نہیں ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی ناجائز نہیں ہے۔

اس مضمون کی، ان تمام مضامین کی احادیث بہت بڑی تعداد میں کتب حدیث میں روایت ہوئی ہیں۔ صحابہ کرام میں سے درجنوں نے ان احادیث کو روایت کیا ہے جن کا خلاصہ ان احادیث میں آ گیا ہے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ اس مختصر ترین خلاصے سے یہ اندازہ آسانی سے ہو جاتا ہے کہ تجارت اور کاروبار کے بارے میں شریعت کے احکام کی نوعیت کیا ہے۔ شریعت کس چیز کو حرام قرار دیتی ہے اور کیوں حرام قرار دیتی ہے۔

ان احادیث سے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلامی شریعت نے جہاں جن جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے متبادل صورتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، اس حرام کا ارتکاب کرنے کے اگر کوئی ممکنہ راستے ہو سکتے تھے، ان راستوں کو بھی احادیث میں منع کیا گیا ہے، ایسے تمام ممکنہ دروازوں اور سوراخوں کو ایک ایک کر کے بند کیا گیا ہے۔ اس لیے ان احادیث کا بنیادی سبق یہ ہے کہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام راستوں کی نشاندہی کی جائے جو آج ربا، قمار تک پہنچاتے ہیں۔

احادیث میں جن کاروباروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں ایک بیع العینہ کہلاتی ہے، یہ دراصل حرمت کی وہ قسم ہے جو سود کا راستہ روکنے کے لیے ہے۔ بیع العینہ ربا کا ایک حیلہ تھا جس کے ذریعے بالواسطہ سودخوری کا راستہ کھولا جا سکتا تھا۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کوئی چیز ایک ہزار روپے میں ادھار خرید کر پھر اسی بائع کے ہاتھ نوسو روپے نقد میں فروخت کر دی جائے۔ مثال کے طور پر کسی نے ایک شخص سے گاڑی پانچ لاکھ روپے میں ادھار خریدی اور پھر اسی بائع کے ہاتھ چار لاکھ روپے نقد میں فروخت کر دی۔ تو گویا اس شخص کو عملاً چار لاکھ روپے ملے۔ لیکن جو رقم اس کے ذمے واجب الادا قرار پائی وہ پانچ لاکھ ہے۔ گویا چار لاکھ روپے لے کر اس نے پانچ لاکھ روپے ادا کیے۔ گاڑی درمیان میں محض بطور ایک حیلے کے استعمال ہوئی۔ یہ بیع العینہ کہلاتا ہے۔ اور احادیث میں اس کی واضح طور پر ممانعت کی گئی ہے۔

اسی طرح ان چیزوں کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں ہے جو عیب دار ہوں اور جن کے عیب سے مشتری کو باخبر نہ کیا گیا ہو۔ یہ بات کہ آپ نے مشتری ہوشیار باش کہنے پر اکتفا کیا اور اس کے بعد اس چیز میں جتنی بھی خرابیاں تھیں ان کو آپ نے چھپایا، یہ درست نہیں ہے۔ کسی چیز کی خرابی کو چھپا کر فروخت کرنا، مشتری کو دھوکے میں رکھنا، تاریکی میں رکھنا۔ یہ درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس کی عملی شکل کیا ہونی چاہیے۔ بعض فقہاء کے نزدیک یہ قانونی حکم ہے، اور ریاست اور عدالت کا فریضہ ہے کہ اس طرح کے معاملات یا عقود کو کالعدم قرار دے اور متعلقہ لوگوں کو سزا دے۔ کچھ اور فقہاء کا خیال ہے کہ یہ عدالتی یا قانونی معاملہ نہیں ہے بلکہ متعلقہ افراد کو ہدایت ہے کہ وہ اس طرح کی خرید وفروخت سے خود بچیں اور ان کو بچنا چاہیے۔

شریعت کا منشا یہ ہے کہ جیسا کہ بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے، بعض احادیث میں صراحت بھی ہے، اور بہت سے احکام اسی اصول کو سامنے رکھ کر دیے گئے ہیں کہ بازار کی قوتوں میں بیرونی مداخلت یا غیر حقیقی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اس لیے بازار میں مال کی آمد ورفت، اس کی آزادانہ خرید وفروخت، یہ چیز بازار کی قوتوں کے اپنے آزادانہ عمل پر چھوڑ دینی چاہیے۔ نہ کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے، نہ پیداوار کرنے والوں کو بازار میں آکر، بازار میں قیمت پر فروخت کرنے سے روکے۔ اور نہ کسی کی سادگی سے اور ناواقفی سے ایسا فائدہ اٹھائے جس سے اس کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ جب کوئی سپلائی باہر سے آرہی ہو تو جب تک وہ بازار میں متعلقہ تاجروں کے پاس نہ پہنچ جائے، اس وقت تک اس کو خرید لینا اور اس کے اثر اور نفع سے مستحقین کو محروم رکھنا جائز نہیں ہے۔

حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے یہ بھی فرمایا کہ کوئی شخص مصنوعی طور پر قیمتوں میں اضافے کی خاطر بولیاں نہ لگائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوکاندار کے کارندے بازار میں موجود ہوتے ہیں، یا بیچنے والے کے اپنے مقررہ کارندے ہوتے ہیں جو خریداروں کو گمراہ کرنے کے لیے مصنوعی طور پر اونچی قیمتیں لگاتے رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض اوقات جب قربانی کے دنوں میں منڈی لگتی ہے جانوروں کی بڑے پیمانے پر خرید وفروخت ہوتی ہے تو وہاں سے ایسے کارندے پہنچ جاتے ہیں۔ ایک جانور کی کوئی خاص قیمت بازار میں چل رہی ہے، آپ کو اندازہ ہے کہ وہ دس ہزار کا ہے۔ آپ نے جا کر دس ہزار روپے لگا دیے۔ وہیں بیچنے والے کے تین چار کارندے کھڑے ہو گئے، کسی نے پندرہ ہزار لگائے، کوئی سولہ ہزار لگائے گا۔ اب یا تو آپ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ جائیں گے، یا اس سے متاثر ہو کر آپ اپنے دل میں کہیں گے کہ چلو پندرہ نہیں تو کم سے بارہ تو لگا دیں۔ یوں آپ کو جانور کی قیمت بڑھانے پر مصنوعی طریقے سے مجبور کرنے کے لیے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔

جہاں کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے وہاں کسی کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔ ناواقفیت سے فائدہ اٹھانے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ قیمت کے بارہ میں دھوکہ دینا اور اصل قیمت سے واقف نہ کرنا، سودے کے بارہ میں دھوکا دینا۔ اپنی چیز کی ایسی صفت بتانا جو اس میں موجود نہیں ہے۔ بازار سے زیادہ قیمت دینا اور یہ تاثر دینا کہ ہم بازار کی

قیمت پر بیچ رہے ہیں۔ یہ سب کام احادیث کی رو سے ناجائز کام ہیں۔ بلکہ ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے، سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز بیچی جو عیب دار تھی، اور اس کا عیب بیان نہیں کیا تو جب تک وہ شخص خریدار سے معافی نہیں مانگے گا یا اس کے نقصان کو پورا نہیں کرے گا۔ اللہ کی ناپسندیدگی اور غضب اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ اللہ کے فرشتے اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔

جو لوگ خریداروں کو گمراہ کرنے کے لیے مصنوعی خریدار پیدا کرتے ہیں اور مصنوعی طور پر سودے کی قیمت بڑھاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو دھوکے باز بھی قرار دیا ہے، خائن بھی بتایا ہے اور بالواسطہ سود خور بھی قرار دیا ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک یہ خرید و فروخت منعقد ہی نہیں ہوتی۔ اگر کسی دھوکے کے نتیجے میں خریدار نے زیادہ قیمت لگا دی اور بازار سے زیادہ قیمت میں کوئی چیز خرید لی، ایسے کسی گمراہ کن خریدار کے قیمت بڑھانے کی وجہ سے یہ بیع بعض فقہاء کے نزدیک منعقد ہی نہیں ہوتی۔ یہ باطل ہے۔ بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک یہ Voidable ہے۔ اگر متعلقہ فریق چاہے تو اس کو منسوخ قرار دلوا سکتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو حدیث میں نجش کہا گیا ہے۔

احادیث میں ایک اور ہدایت بھی کی گئی ہے جو آج کل کی بین الاقوامی تجارت کو منضبط کرنے میں ایک بڑا اصول بیان کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دشمن کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت نہ کی جائے جس سے کام لے کر وہ مسلمانوں کے خلاف قوت حاصل کر سکے۔ مسلمانوں کے دشمن اسلحہ تیار کریں، یا ایسے ہی دیگر وسائل پیدا کریں جو جنگ میں کام آسکتے ہوں۔ لہٰذا غیر مسلموں کو کوئی ایسے ہی دیگر چیز نہ دی جائے جس سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمانوں کے خلاف قوت حاصل کر سکیں اور اس کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں۔

آج بین الاقوامی تجارت میں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ وہ سامان یا پیداوار جو مسلم ممالک غیر مسلم ممالک کو یا دشمنوں کو دے رہے ہیں، ان میں کون سی چیز ایسی ہے جو وہ خود مسلمانوں کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، اور ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ فقہائے اسلام نے اپنی فہم اور اُس زمانہ کی صنعت کی رو سے اسلحے کی خرید و فروخت کی ممانعت کی تھی کہ محارب دشمن کے لوگوں کو اسلحہ فروخت نہ کیا جائے۔ کچھ اور فقہاء نے کہا کہ اسلحہ سازی کا جو خام مال مثلاً لوہا ہے

وہ بھی فروخت نہ کیا جائے۔ جنگ کے زمانے میں گھوڑے فروخت نہ کیے جائیں۔ ڈھالیں، تیر، غرض وہ چیزیں جو جنگ میں مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوسکیں وہ دشمن کو فروخت نہ کی جائیں۔ آج کل کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دھاتوں کی بعض قسمیں نہ فروخت کی جائیں۔ بعض ایسی مہارتیں نہ منتقل کی جائیں جس کے بارے میں یہ خطرہ ہو کہ وہ انسانیت کے خلاف یا مسلمانوں کے خلاف استعمال کی جائیں گی۔ یورانیم نہ فروخت کیا جائے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔ آئندہ مزید ایسی چیزیں دریافت ہوسکتی ہیں کہ جو حربی سامان کے طور پر استعمال ہوتی ہوں۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو غلط کار اور خطا کار بھی کہا گیا ہے، ان کو روز قیامت سزا کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے اور ناجائز قتل کرنے والے، ان دونوں کو روز قیامت ایک ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس لیے کہ جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ وسائل رزق سے لوگوں کو محروم کرتا ہے۔ وسائل رزق سے محرومی موت کا سبب ہے۔ اور قاتل بھی موت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لیے بالآخر نتیجے کے اعتبار سے دونوں کی نوعیت ایک ہی ہے۔ اس لیے ان دونوں کو قیامت میں ایک ساتھ اٹھایا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے مصنوعی طریقے سے قیمتیں زیادہ کردیں اور کوئی چیز گراں کر دی تو اللہ تعالیٰ اس کو روز قیامت بڑے عذاب میں مبتلا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ "**کان حقا علی اللّٰہ ان یعذبہ فی معظم النار یوم القیامۃ**"۔ ایک حدیث میں ذخیرہ اندوز کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا گیا۔ کہا گیا کہ بہت ہی بری مخلوق ہے ذخیرہ اندوزی کرنے والا۔ جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے قیمتیں کم ہوجاتی ہیں تو اس کو دکھ ہوتا ہے۔ اور کہیں کسی غلط حرکت کی وجہ سے، انسانوں کی غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے، قیمتیں چڑھ جائیں تو یہ خوش ہوتا ہے۔ یعنی جہاں اس کو خوش ہونا چاہیے وہاں اس کو دکھ ہوتا ہے اور جہاں دکھ ہونا چاہیے وہاں خوشی ہوتی ہے۔ یوں ایک غیر انسانی رویہ اور استحصالی مزاج پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے عمومی بات حدیث میں یہ فرمائی گئی کہ "**الجالب مرزوق والمحتکر ملعون**"۔ وہ شخص جو بازار میں پیداوار لے کر آتا ہے اور نیا نیا مال سپلائی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کا مستحق ہے۔ اس کو رزق عطا کیا جائے گا۔ اس کے رزق میں برکت دی جائے گی۔ اور جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، خلق خدا کو محروم رکھتا ہے، اس پر

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کی ضروریات کی چیزیں، خاص طور پر کھانے پینے کی چیزوں کی، ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو افلاس یا جذام میں مبتلا کر دیتا ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وسائل پیداوار کو بیکار رکھنا شریعت نے پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ وسائل پیداوار کو مسلسل استعمال میں رکھنا چاہیے۔ مال و دولت ہو تو یا تو اس کو تجارت میں لگایا جائے یا جائز طریقے سے خود خرچ کیا جائے، یا صدقہ کر دیا جائے۔ مال و دولت کے ذخیرے گھر میں بیکار پڑے ہوں تو یہ درست نہیں ہے۔اسی طرح اگر زمین کسی کے پاس ہے اور وہ بیکار پڑی ہوئی ہے تو یہ ناپسندیدہ ہے۔ یا تو وہ خود اس کو آباد کرے یا اپنے کسی دوسرے بھائی کو دے دے، تاکہ وہ اس کو آباد کرے۔اور اگر وہ زمین ریاست کی ملکیت ہو تو ریاست تین سال کی مہلت دینے کے بعد اس کو واپس لے لے۔

اس لیے کہ زمین کی آبادکاری، زمین کی ترقی یا وسائل رزق کو استعمال میں لانے کا معاملہ بہت سے پہلو رکھتا ہے۔خود انسان کو جائز روزی حاصل ہوتی ہے۔انسان محنت کا عادی ہوتا ہے۔انسان پیداواری سرگرمی میں تیزی کا ذریعہ بنتا ہے۔معاشرے کی ترقی کا وسیلہ اس کے ہاتھ میں آتا ہے۔ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ خدمت خلق بھی ہے۔خدمت خلق میں صرف وہ چیزیں شامل نہیں ہیں کہ آپ جا کر کسی کی مدد کر دیں، اس کے گھر میں پانی بھر دیں۔خدمت خلق میں علم کی نشر و اشاعت بھی شامل ہے۔آپ نے نہر کہیں بنوادی، کنواں کھدوا دیا۔کہیں پودے لگا دیے، کہیں باغ لگا دیا۔ یہ ساری چیزیں خدمت خلق میں شامل ہیں۔اور ان چیزوں کا اجر انسان کے نامہ اعمال میں قبر کے زمانے تک لکھا جاتا رہے گا۔گویا دوسروں کے لیے جو آدمی پیداوار کرتا ہے، وہ پیداوار یا وہ پیداواری سرگرمی جس کا فائدہ دوسرے انسانوں تک پہنچتا ہو وہ بھی خدمت خلق ہے اور صدقہ جاریہ ہے۔

تجارت کے باب میں ایک بنیادی بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جو معاملات ناجائز ہیں یا حرام ہیں جن کی حرمت کی صراحت کر دی گئی ہے۔ ان سے تو بچنا ہی چاہیے۔لیکن جو معاملات مشکوک ہوں، جس کے بارے میں یقین نہ ہو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے، اس سے احتراز کرنا بھی ایک مسلمان کے لیے پسندیدہ بات ہے۔مسلمان کو چاہیے کہ مشکوک معاملات سے

بھی احتراز کرے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا ہے۔ کچھ چیزوں کو جائز قرار دیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ معاملات ایسے ہیں جو مشتبہ ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔ اور ان کی حدود سے بھی دور رہنا چاہیے۔

ان محرّمات الٰہی کی نوعیت وہ ہے جو پرانے زمانے میں بادشاہوں کی سرکاری چراگاہوں کی ہوا کرتی تھی۔ سرکاری چراگاہ میں عام انسانوں کو داخلے کی ممانعت ہوتی تھی۔ اگر کسی کے جانور چراگاہ کے قریب چر رہے ہوں تو اس کا امکان تھا کہ جانور چراگاہ کے اندر بھی داخل ہو جائیں اور بادشاہ کے اس قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس لیے بہتر یہ ہوتا تھا، جو لوگ اس کی احتیاط رکھتے تھے، وہ اپنے جانوروں کو چراگاہ کی حدود سے دور چرایا کرتے تھے۔ یہ مثال دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو معاملات مشکوک ہوں، ان سے اسی طرح دور رہنا چاہیے جیسے سرکاری چراگاہ سے لوگ اپنے جانوروں کو دور رکھتے تھے۔ اس لیے کہ اگر آپ مشکوک چیز کے قریب جائیں گے تو ہوسکتا ہے کہ غلطی سے آپ کسی حرام کام کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس لیے ایک مسلمان تاجر کا رویہ یہی ہونا چاہیے اور اسی کی توقع ایک مسلمان تاجر سے کی جاتی ہے کہ وہ جہاں محرّمات سے بچے، وہاں مشکوک اور مشتبہ امور سے بھی اسی طرح احتراز کرے جیسے ناجائز چیزوں سے احتراز کرتا ہے۔

یہی خلاصہ ہے قرآن کریم کی آیات اور احادیث میں بیان کیے جانے والے احکام تجارت ومعیشت کا۔ یہی وہ احکام ہیں جن کی بنیاد پر فقہائے کرام نے اسلام کی معاشی اور تجارتی تعلیمات کو مدون کیا، جن کی بنیاد پر حسب ضرورت تفصیلات تیار کیں۔ وہ تفصیلات جن پر دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں اسلامی تاریخ میں عمل درآمد ہوتا رہا اور وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ، ضرورتوں کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ فقہائے اسلام ان تفصیلات پر مزید غور وخوض کرتے رہے۔ ان احکام میں اضافہ بھی کرتے گئے۔ سابقہ اجتہادات پر نظر ثانی بھی کرتے رہے اور جیسے جیسے معاملات اور تجارت کی نئی نئی صورتیں آتی گئیں، ان نئی نئی صورتوں کے احکام بھی ان بنیادی ہدایات کی روشنی میں اس حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے مدوّن کرتے گئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ان حرمتوں کا یا ان احکام کا منشا اور مقصود کیا ہے، وہ نئے نئے اجتہادات بھی کرتے گئے۔

آج ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم قرآن کریم اور سنت کے ان معاشی احکام کو سامنے

رکھتے ہوئے فقہائے اسلام کے کیے ہوئے کام سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے آج کل کی مشکلات اور آج کل کی کاروباری صورتوں کے احکام مرتب کریں۔ ان نئے احکام کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ یہ عصری زبانوں میں مرتب کیے گئے ہوں۔ آج کل کی اصطلاحات میں ان کو بیان کیا گیا ہو۔ اور وہ راستے بھی تجویز کیے گئے ہوں جن پر آج کے دور میں عمل درآمد کیا جائے۔ آج کے دور میں کاروبار کی جو صورتیں رائج ہیں، ان صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آج کے دور میں مثال کے طور پر ''الخراج بالضمان'' کی کیا صورت ہوگی۔ مثال کے طور پر آج غرر اور قمار کی کیا کیا صورتیں رائج ہیں۔ وہ سادہ زمانہ تھا، سادہ معاشرہ تھا، لوگ بھی سادہ انداز سے کاروبار کرتے تھے۔ سود بھی سادہ انداز سے کھایا کرتے تھے۔ قمار بازی کرنے والا سادہ انداز سے قمار بازی کیا کرتا تھا۔ آج ہر کام پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جہاں حرام کام پیچیدہ انداز سے ہو رہے ہیں۔ ان کا اسلامی متبادل بھی کسی نہ کسی حد تک پیچیدہ ہوگا۔ اس لیے یہ ایک انتہائی ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ایک بھاری فریضہ ہے جو امت کے اہل علم کے ذمے ہے۔ یقیناً مسلمان علمائے کرام نے پچھلے تیس چالیس سالوں میں اس میدان میں بہت کام کیا ہے۔ ان احکام وقواعد کی روشنی میں جن کا ایک انتہائی مختصر خلاصہ میں نے آپ کے سامنے رکھا۔ معاشیات اور بینکاری کے اصول سے متعلق بہت بڑا وسیع لٹریچر پیدا کیا ہے۔ اس کا خلاصہ آئندہ کے گیارہ خطبوں میں آپ کے سامنے آ جائے گا۔

دوسرا خطبہ

اسلام کا نظام مالیات ومعیشت:
بنیادی تصورات اور اہم خصائص واہداف

دوسرا خطبہ

اسلام کا نظامِ مالیات ومعیشت:
بنیادی تصورات اور اہم خصائص واہداف

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلي على رسوله الكريم و علىٰ اله و اصحابه اجمعين

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے "اسلام کا نظامِ مالیات ومعیشت، بنیادی تصورات، اہم خصائص اور اہداف"۔ اسلامی نظام معیشت پر بات کرنے سے پہلے ایک بنیادی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ اسلام اور معیشت کے مابین روز اول سے ایک گہرا اور قریبی تعلق چلا آ رہا ہے۔ یوں تو اللہ کے ہر پیغمبر نے، اللہ کی بھیجی ہوئی ہر شریعت نے انسان کی معاشی زندگی اور معاشی سرگرمی کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ معاشی زندگی کو بہتر، منضبط اور عادلانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اسلام کا ان معاملات سے نسبتاً زیادہ قریبی، زیادہ گہرا اور زیادہ بھرپور تعلق رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جس علاقے میں اللہ نے پیدا فرمایا، جس خاندان میں پیدا فرمایا، جس قبیلے سے آپ کے خاندان کا تعلق رکھا۔ یہ پورا علاقہ، یہ پورا قبیلہ اور آپ کے خاندان کا بیشتر حصہ تجارت اور معیشت سے تعلق رکھتا تھا۔

مکہ مکرمہ، جزیرہ عرب میں تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ قریش اپنی بین الاقوامی تجارت کی وجہ سے مشہور تھے۔ صحابہ کرام میں سے بہت سے حضرات وہ تھے۔ خاص طور پر صف اوّل کے صحابہ کرام۔ جن کا تعلق تجارت کے پیشے سے تھا۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ رسول اللہ

ﷺ کے ساتھ ساتھ عشرہ مبشرہ میں سے سب کا تعلق پیشہ تجارت سے تھا۔ اس مفہوم میں کہ ان میں سے سب حضرات نے کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر تجارتی سرگرمیوں میں ضرور حصہ لیا۔ سیدنا صدیق اکبر عرب کے معروف تاجروں میں سے تھے۔ سیدنا عثمان غنی اور عبدالرحمٰن ابن عوف کی تجارتیں مشہور ہیں۔ سیدنا زبیر بن عوام کی وسیع تجارت مشہور و معروف ہے۔

بقیہ صحابہ کرام جن کی تجارتی سرگرمیاں زیادہ مشہور نہیں ہیں، ان کا تعلق بھی پیشہ تجارت سے تھا۔ پھر اسلام کے فروغ میں تاجروں نے جو حصہ لیا وہ اپنی جگہ اسلامی دعوت کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللّٰہ عنہ نے اپنی تجارت اور آمدنی کا بیشتر حصہ اسلام کی دعوتی سرگرمیوں پر نچھاور کر دیا۔ خود رسول اللّٰہ ﷺ نے نبوت سے پہلے بہت بڑی تجارت قائم فرمائی تھی، جس کی آپ نے انتہائی کامیاب نگرانی فرمائی۔ اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں پر خرچ ہوا۔

صحابہ کرام اور تابعین کی ان قربانیوں کے ساتھ ساتھ، اگر اسلام کی ابتدائی تین سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جزیرہ عرب سے باہر کے بہت سے ممالک میں، یورپ، ہندوستان، مشرق بعید، سری لنکا، افریقہ کے متعدد ممالک، بحر متوسط کے جزائر اور بحر ہند کے بہت سے جزائر، ان سب علاقوں میں اسلامی دعوت کا نام اور پیغام اول اول تاجروں کے ذریعے پہنچا۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں جو صرف تاجروں کی دعوتی کوششوں کی وجہ سے اسلام کا مرکز بن گئے۔ مشرق بعید میں جنوبی فلپین اور منڈاناؤ کا علاقہ، جزائر انڈونیشیا کی بہت بڑی مسلم آبادی، ملایا کے جزائر میں بسنے والے سارے مسلمان، یہ سب کے سب ان مخلص تاجروں کی محنت کا نتیجہ ہیں جنھوں نے صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے سے اس علاقے میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ ان حضرات نے دعوت و تبلیغ کو بھی تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داری سمجھا۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اسلام اور تجارت، اور اسلام اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ عرب کا قدیم معاشی نظام جس سے صحابہ کرام کی بڑی تعداد کا تعلق رہا ہے۔ وہ مکہ مکرمہ کی تجارتی سرگرمیاں ہوں یا مدینہ منورہ کی زراعتی سرگرمیاں، صحابہ کرام کا تعلق دونوں سے تھا۔ ان تمام تفصیلات کو جاننا، اسلام کی معاشی اصلاحات کا پس منظر

جاننے کے لیے ناگزیر ہے۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر آویزش اور کشاکش کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں میں جو طور طریقے رائج ہیں، اگر وہ شریعت سے متعارض نہ ہوں، اگر وہ بحیثیت مجموعی عدل و انصاف اور مساوات آدم کے تصورات پر کاربند ہوں تو اسلام ان کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ان میں جزوی اصلاح کے ذریعے تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ ان تجارتی طریقوں کی تبدیل شدہ صورتوں اور کو اصلاح کے طریقہ کار کو اپنے نظام میں سمو لیتا ہے۔

عربوں کی معاشی سرگرمیوں کو اسلام نے اسی انداز سے اصلاح و ترمیم کے ذریعے ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جو کامیابی سے ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک جاری رہا، جس کی باقیات آج بھی دنیائے اسلام میں ہر جگہ موجود ہیں، جس کی تعلیم کے کسی نہ کسی حصے پر مسلمان آج بھی عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ اس نظام کی اٹھان عرب کے قدیم معاشی نظاموں ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وہاں جو طریقہ کار چلا آتا تھا اس کی رسول اللہ ﷺ نے اصلاح کر دی۔ جو طریقے بالکلیہ غلط تھے، ظالمانہ تھے، عدل و انصاف سے متعارض تھے، یا استحصالی روح رکھتے تھے، ان کو اسلام نے کلی طور پر حرام قرار دے دیا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عرب کے متمدن مقامات کے تین اہم شہر مشہور تھے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف۔ اور یہ تینوں کسی نہ کسی اعتبار سے اہم تجارتی اور زراعتی سرگرمیوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے۔ بقیہ علاقے یا تو صحرائی تھے، جن میں کوئی قابل ذکر تجارتی سرگرمی نہیں تھی، یا وہ شہر تھے جو دوسری بڑی طاقتوں کے زیر اثر یا ان کے باجگزار تھے اور وہاں خالص عربی ماحول اس طرح کا موجود نہیں تھا جس طرح کا خالص عربی ماحول مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف کے بڑے شہروں میں پایا جاتا تھا۔

انھی تین شہروں کے باشندے ملت ابراہیمی کے بقایا جات پر بھی نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ کاربند تھے۔ انھی تینوں شہروں میں ملت ابراہیمی سے وابستگی کا شعور بھی نسبتاً زیادہ گہرا تھا۔ ان تین شہروں کے علاوہ جو متمدن علاقے تھے، ان میں یمن، عمان، بحرین، حجر، حیرہ اور عمان کی سلطنتیں شامل تھیں۔ یہ وہ علاقے یا شہر تھے جو سلطنت فارس، سلطنت حبشہ یا سلطنت روم کے باجگزار اور زیر اثر تھے۔ لیکن ان سب علاقوں میں بعض امور و مسائل مشترک تھے اور کچھ امور و مسائل مختلف تھے۔ اسلام کی معاشی تعلیم کی اہمیت اور معاشی اصلاحات کی معنویت کو سمجھنے کے یہ ضروری ہے کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف میں رائج سرگرمیوں کو سمجھا جائے اور یہ دیکھا جائے

کہ ان میں کون سی چیزیں وہ تھیں جو اسلام نے باقی رکھیں، کون سی چیزیں وہ تھیں جن میں جزوی ترمیم پر اکتفا کیا گیا اور کون سے پہلو وہ تھے جن کو اسلام نے بالکلیہ ممنوع قرار دے دیا۔

یہ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ آج اگر کسی ملک میں اسلام کی معاشی تعلیم کا مکمل طور پر نفاذ کیا جائے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ آج اس علاقے میں جو تجارتی طریقے رائج ہیں۔ کاروبار اور معیشت کی جو سرگرمیاں روبہ عمل آ رہی ہیں، ان میں سے کون سی چیزیں وہ ہیں جو اسی طرح باقی رکھی جائیں گی جیسا کہ وہ چلی آ رہی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں ہوگی۔ اسی طرح ان تجارتی روایات میں ان پہلوؤں کی نشاندہی کرنی پڑے گی جن میں جزوی ترامیم سے کام چل سکتا ہے اور وہ جزوی ترامیم کیا ہیں، کیا ہونی چاہئیں۔ اس پر اتفاق رائے حاصل کرنا پڑے گا۔ اور سب سے آخر میں یہ تعین کرنا پڑے گا کہ آج جو رائج الوقت کاروبار اور تجارتی شکلیں ہیں ان میں کون کون سی باتیں وہ ہیں جو شریعت کے احکام سے کلی طور پر متعارض ہیں۔ کون سے پہلو وہ ہیں جو شریعت کے اعتبار سے بالکلیہ حرام ہیں اور جن کو جلد یا بدیر ختم کر دینا چاہیے۔

جب ہم قریش کی تجارتی سرگرمیوں کی بات کرتے ہیں، تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قبیلہ قریش مکہ مکرمہ اور اس کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ قریش کے کچھ قبائل وہ تھے جو مکہ مکرمہ کے اندر حرم کے قریبی علاقوں یا بطحاء کی سرزمین میں آباد تھے۔ کچھ قبائل وہ تھے جو مکہ مکرمہ سے باہر بطحاء کی سرزمین سے نکل کر ذرا دور جا بسے تھے۔ اس تقسیم کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ لیکن اس تقسیم سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ قبائل قریش مکہ مکرمہ کے اندر ہی نہیں بلکہ مکہ مکرمہ کے قرب و جوار کے علاقے میں بھی آباد تھے۔ اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کا دائرہ مکہ مکرمہ سے باہر بھی پھیلا ہوا تھا۔ مکہ کے تاجروں کا کاروبار عموماً کپڑا، عطر، چمڑا، سونا چاندی، ریشم، ہتھیار اور بعض زرعی صنعتوں پر مشتمل تھا۔

یہ لوگ سود کی بنیاد پر بھی کاروبار کرتے تھے اور مضاربہ کی بنیاد پر بھی کاروبار کرتے تھے۔ عربوں میں جو سود رائج تھا، وہ عموماً تجارتی سود ہوتا تھا۔ جس کے بموجب لوگ تجارت کے لیے قرض دیا کرتے تھے اور یہ رقم سود پر دی جاتی تھی۔ تجارت کرنے والا یا قرض لینے والا اس قرض کی رقم سے تجارت کرتا تھا۔ کاروبار کرتا تھا اور مقررہ شرح کے حساب سے اصل سرمایہ دار کو سود

ملا کرتا تھا۔

قریش اور طائف کے بڑے بڑے تاجروں میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جنھوں نے اپنا سرمایہ سودی کاروبار میں لگایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جن کی تعداد نسبتاً کم تھی، جو اپنا کاروبار یا اپنا سرمایہ مضاربت میں لگایا کرتے تھے۔ مضاربہ کرنے والا تاجر رقم لے کر باہر جایا کرتا تھا اور گرمی یا سردی کے حساب سے جو قافلے جایا کرتے تھے، ان کے ساتھ تجارتی مقاصد کے لیے سفر کیا کرتا تھا۔ گرمیوں میں قافلہ شام اور سلطنت روما میں جایا کرتا تھا، سردیوں میں یمن اور اس کے قرب جوار میں جایا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں تاجر سامان لے کر جایا کرتا تھا۔ تجارت کر کے جب واپس آتا تھا تو نفع کا مقررہ حصہ اور اصل رقم مالک کو واپس کر دیا کرتا تھا اور نفع میں سے اپنا حصہ خود رکھ لیا کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے مضاربہ ہی کی بنیاد پر کاروبار کا آغاز فرمایا تھا اور سیدہ خدیجہ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سامان لے کر پہلی مرتبہ آپ مضاربہ ہی کی غرض سے سفر پر تشریف لے گئے تھے اور یہ سارا کاروبار مضاربت کی بنیاد پر ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا مضاربت کا یہ کاروبار تقریباً بیس سال کی عمر سے شروع ہوا اور نبوت سے پہلے بھی کوئی بیس سال جاری رہا۔ ان میں پندرہ سال ایسے گزرے کہ حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور آپ ﷺ کا کاروبار عملاً ایک ہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ ہی اس کی دیکھ بھال فرماتے تھے، اور آپ کی دیانت، امانت اور سچائی کی برکت سے اس کاروبار میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔

عرب کے سرمایہ دار بالعموم اور مکہ مکرمہ کے سرمایہ دار بالخصوص کس وسیع پیمانے پر سودی کاروبار میں رقم لگایا کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت ابو سفیان کا جو قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا، اس کا کل سرمایہ پچاس ہزار دینار تھا۔ دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا جس کا وزن آج کل کے حساب سے ساڑھے چار ماشہ کے قریب یا پانچ ساڑھے پانچ گرام کے قریب ہوتا تھا۔ اس حساب سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک دینار کی قیمت آج کل کے کئی ہزار روپے کے برابر تھی۔ پچاس ہزار دینار کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانے کے لحاظ سے بھی یہ قافلہ غیر معمولی مال و دولت پر مشتمل تھا۔

جب تجارتی کارواں تجارت کے لیے شمال یا جنوب کی طرف جایا کرتے تھے تو

چھوٹے کارواں میں سو اور درمیانے کارواں میں ڈھائی سو سے تین سو کے قریب افراد ہوتے تھے۔ بڑا کارواں اس سے بھی بڑا ہوتا تھا۔ وہ پانچ سو سے ایک ہزار افراد کے درمیان نفری پر مشتمل ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ایک کارواں میں، ایک ایک تجارتی قافلے میں جو سامان تجارت ہوتا تھا، وہ ڈھائی ڈھائی ہزار اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے تاجروں کا کاروبار کتنا بڑا اور کتنا وسیع تھا۔ یعنی کاروبار کے حجم کا اندازہ ان اعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔

مکہ مکرمہ کے برعکس طائف میں بڑے بڑے باغات تھے۔ وہاں زمین زرخیز، اور موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ یہ علاقہ سطح زمین سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ عرب کے بالعموم اور حجاز کے بالخصوص زیادہ دولت مند لوگ طائف ہی کے تھے۔ مکہ مکرمہ کے مقابلے میں طائف میں نسبتاً دولت مندی زیادہ تھی۔ وہاں زمین داروں اور کاشتکاروں میں، غلاموں اور آقاؤں میں، دولت مندوں اور ناداروں میں، کسی حد تک کشمکش بھی رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے مقابلے میں طائف میں یہ فرق زیادہ تھا۔ وہاں کا دولت مند مکہ کے دولت مند سے زیادہ مالدار اور وہاں کا غریب اور فقیر مکہ کے غریب اور فقیر سے زیادہ نادار تھا۔ وہاں کی زرعی زمینوں پر زیادہ تر زمینداری اور بٹائی کا نظام رائج تھا۔ صنعت میں وہاں چمڑے کی صنعت خاص طور پر اہم تھی۔ اس بستی کا نام ہی بلد الدباغ تھا۔ یعنی چمڑے تیار کرنے والی بستی۔ طائف میں لوہے کا سامان بھی تیار ہوتا تھا۔ دوائیں بھی بنتی تھی، وہاں اطباء بھی موجود تھے۔ چونکہ انگوروں کی کثرت تھی اس لیے بڑے بڑے شراب خانے بھی تھے اور قرب جوار کی بستیوں میں طائف سے ہی شراب فراہم کی جاتی تھی۔ اور ان تمام اسباب کی بنا پر سودخوری کا بھی سب سے بڑا مرکز طائف ہی تھا۔ جتنی سودخوری طائف میں ہوتی تھی وہ پورے جزیرہ عرب میں یہودیوں کے علاوہ کسی اور قبیلے میں نہیں ہوتی تھی۔

طائف، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ ان سب علاقوں میں جو پیشے رائج تھے ان میں زراعت اور تجارت تو خیر تھی ہی، لیکن قرب و جوار کے علاقوں میں گلہ بانی بھی تھی۔ بہت سے لوگ جانور رکھا کرتے تھے، باقاعدہ جانوروں کی پرورش کا بندوبست تھا۔ چرواہوں کو ملازمت پر، یا غلاموں کو معاوضے پر رکھ لیا جاتا تھا جو بکریاں چرایا کرتے تھے۔ اپنے بچپن میں ایک آدھ بار رسول اللہ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ اسی طرح سے اونٹ چرانے کا انتظام بھی تھا۔ بقیہ پالتو جانور چرانے کا

رواج بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ جانوروں کی نسل کشی کا بندوبست بھی تھا۔ خوانچہ فروشی، غلہ فروشی، شراب سازی، نجاری، لوہاری پھر اسلحہ سازی، یہ تو بڑے بڑے پیشے تھے جن کی ہر انسانی معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عربوں میں بھی بڑے پیشے سمجھے جاتے تھے۔

پھر طائف اور مکہ مکرمہ میں خاص طور پر اور مدینہ منورہ میں عام طور پر عطر فروشی بھی ایک نمایاں کاروبار تھا۔ جناب ابو طالب، رسول اللہ ﷺ کے عم محترم، کا عطر فروشی کا کاروبار تھا۔ بظاہر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ جناب ابو طالب کا خاندان بڑا تھا۔ ذمہ داریاں وسیع تھیں، لیکن عطر فروشی کا کام نسبتاً محدود تھا۔ اس لیے اس چھوٹی سی تجارت سے اتنے بڑے خاندان کی دیکھ بھال مشکل ہوتی تھی۔ بہرحال یہ وہ بڑے بڑے پیشے تھے جو عرب میں رائج تھے، جن کی وجہ سے اس پورے علاقے کی معیشت اور تجارت کا مرکز یہ تین شہر بنے ہوئے تھے۔

قرآن کریم نے بالعموم اور احادیث نے بالخصوص ان پیشوں کے بارے میں بنیادی ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ کل کی گفتگو میں کیا جا چکا ہے۔ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عموماً مکی سورتوں میں کلیات اور بنیادی تصورات کو بیان کرتا ہے۔ وہ کلیات جن کا تعلق اسلام کے اخلاق سے ہے، جن کی اساس اسلام کی دینی تعلیم پر ہے۔ ان کلیات کی تاسیس کا بنیادی کام مکہ مکرمہ میں انجام پایا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کی سورتوں میں اسلام کا تصور مال، مال کا امانت ہونا، تمام چیزوں کا انسانوں کے لیے مسخر کیا جانا۔ انفاق کی تلقین، عدل وانصاف کی تعلیم۔ مال ودولت میں ایک دوسرے کی کفالت اور تکافل اور ان جیسے متعدد تصورات بہت کثرت سے اور وضاحت کے ساتھ مکہ مکرمہ کی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ پھر مدینہ منورہ میں انھی قواعد اور اساسات کی بنیاد پر تفصیلی احکام دیے گئے ہیں۔ وہ تفصیلی احکام جن کو اسلامی معاشیات کی اساس کا درجہ حاصل ہوا۔ جن کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے مختلف اوقات میں اجتہاد سے کام لیا۔ اور اپنے اپنے زمانے کے معاشی مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں مدد دی۔ ان تصورات کی بنیاد پر معیشت کا جو نظام بھی ترتیب دیا جائے گا وہ دور جدید میں رائج معیشت کے نظاموں سے کئی اعتبار سے مختلف ہوگا۔

قرآن کریم کی دلچسپی معیشت کے normative پہلو سے ہے۔ یعنی اس پہلو سے ہے جس کا تعلق انسان کے رویے، اخلاقی طرز عمل اور اس پہلو سے ہے کہ کیا کام ہونا چاہیے اور کیسے ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس مغربی معاشیات کا بڑا حصہ اس سے بحث کرتا ہے کہ دراصل

انسان کا معاشی رویہ کیا ہے۔ مغربی معاشیات کو اس سے بحث نہیں کہ انسانوں کا معاشی رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کو اس سے دلچسپی ہے کہ انسان کا معاشی رویہ فی الواقع کیا ہے اور اس معاشی رویہ کی بنیاد پر بہتر سے بہتر مادی فوائد کے حصول کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

جہاں تک اسلام کے normative پہلو کا تعلق ہے، یہ خود معاشی ترقی کے لیے انتہائی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جب ایک مرتبہ یہ رویہ پیدا ہو جائے کہ معاشی زندگی کی اساس اخلاق اور روحانی اصولوں پر ہونی چاہیے تو وہاں رفاہی کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں عامتہ الناس کو متحرک کرنا اور ترغیبی مہم کے ذریعے ان کو تعمیری کام پر متوجہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر رویہ یہ ہو۔ جیسا کہ مغربی روایتی معاشیات میں پایا جاتا ہے کہ ماہر معیشت کی دلچسپی صرف اس سے ہو کہ انسان معاشی رویہ کی تشکیل کیسے کرتا ہے۔ امر واقع میں اس کی سرگرمی کی اساس کیا ہے۔ تو اس سے لازماً مادہ پرستی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاقیات سے توجہ ختم ہوتی جاتی ہے۔ اور بالآخر ایک ایسا تصور جڑ پکڑ لیتا ہے جس کی دلچسپی صرف معاشی فائدے اور ذاتی منفعت تک محدود ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جدید معیشت ''جو ہے'' کی بنیاد پر بحث کرتی ہے اور اپنے اصول طے کرتی ہے، اس کے مقابلے میں اسلامی شریعت ''جو ہونا چاہیے'' کی بنیاد پر ہدایات دیتی ہے۔ اور ان ساری ہدایات کا منشا یہ ہے کہ جو ہونا چاہیے وہ واقعتاً ہو جائے۔ جن اخلاقی ہدایات اور روحانی اصولوں کی قرآن کریم بات کرتا ہے۔ جن سے ہر مسلمان کا گہرا تعلق ہے۔ ان کی بنیاد پر عملاً ایک نظام معیشت قائم ہو جائے، یہی قرآن کریم کا منشا ہے۔

جس چیز کو ہم آج کی گفتگو میں اسلام کا نظام معیشت کہہ رہے ہیں، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی ایسی تیار شدہ کتاب یا خاکہ موجود ہے۔ جس کو کہیں سے اٹھایا جائے اور آج کے پاکستان میں اس کو جوں کا توں نافذ کر دیا جائے۔ ہماری گفتگو میں اسلامی نظام معیشت سے مراد وہ بنیادی احکام اور قواعد ہیں جو قرآن کریم اور احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ جن کی تشریح صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے سے لے کر ائمہ مجتہدین وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے وہ تشریحات اور تفصیلات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں جن پر پوری امت کا اتفاق ہے، اگر پوری امت کا اتفاق نہیں تو خاص طور پر ائمہ اربعہ اور دوسرے اکابر مجتہدین جن تفصیلات پر متفق ہیں۔

یہ تینوں چیزیں وہ بنیاد اور اساس فراہم کرتی ہیں جو نا قابل تغیر اور نا قابل تبدیل ہے۔

ان بنیادی قواعد اور اساسات کی روشنی میں فقہائے اسلام نے وقتاً فوقتاً معاملات، بیوع، عقود، مال، ملکیت، حق، تجارت، کاروبار، مضاربہ، مشارکہ، حسبہ اور اس طرح کے بہت سے عنوانات کے تحت جو احکام مرتب فرمائے ہیں وہ شریعت کے اسی بنیادی اصول اور انداز کو سامنے رکھ کر مرتب فرمائے ہیں۔ جس فقیہ نے جو احکام مرتب کیے اس نے اپنے علاقے اور اپنے زمانے میں رائج الوقت تجارت کے طور طریقوں کو دیکھا۔ ان میں سے جو طور طریقے شریعت کے مطابق تھے، ان کو جوں کا توں برقرار رکھا اور ان کے احکام کی مزید تفصیل مرتب کر دی۔ جو کاروبار جزوی طور پر ناجائز تھے یا ان کے بعض پہلو منفی تھے، اس زمانے کے فقیہ اور مجتہد نے ان ناجائز پہلوؤں کی نشاندہی کر دی، ان سے بچنے کے طریقے تجویز کر دیے اور اپنے اجتہاد اور فہم و بصیرت سے کام لے کر ان ناجائز باتوں کے جائز متبادل بھی تجویز کر دیے۔ جو چیزیں کلی طور پر ناجائز یا حرام دیکھیں ان کی کلی طور پر ممانعت کر دی۔

آج کے فقیہ اور مجتہد کو بھی یہی کرنا ہے۔ قرآن کریم کی اساسات، احادیث کی تعلیمات، فقہاء اور مجتہدین کے متفقہ اور اجماعی فیصلے، اور ائمہ مجتہدین کے اجتہادات۔ ان کو سامنے رکھ کر آج بینکاری میں، تجارت میں، صنعت میں، بین الاقوامی لین دین میں، مالیات میں، زرعی پالیسیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔ ان سب سرگرمیوں کا ایک حصہ جائز ہوگا۔ ایک حصہ جزوی طور پر ناجائز باتوں پر مشتمل ہوگا۔ اور ایک حصہ ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جو شریعت کے احکام سے کلی طور پر متعارض ہو۔ ان تینوں حصوں کی الگ الگ نشاندہی کرنے کے بعد ہی آج کا فقیہ ان تمام طور طریقوں کے تفصیلی احکام مرتب کر سکے گا۔

یہ سارے کام بڑی حد تک آج کے فقہاء نے کر دیے ہیں۔ آج کے طور طریقوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ ان میں جائز اور ناجائز عناصر کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ ان سب کے نتیجے میں اسلام کی معاشی تعلیم کا جو نقشہ بنتا ہے وہی آج کے لحاظ سے اور ہمارے دور کے لحاظ سے اسلام کا نظام معیشت ہے۔ اس نظام معیشت کی تفصیلات میں مزید رنگ بھرنے کے لیے ہم آج کل کے تجربات سے پورا پورا استفادہ کریں گے اور دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے انتظامی معاملات و تجربات کو سامنے رکھیں گے۔ جو ذرائع اور وسائل انھوں نے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے کس کو

ہم اختیار کر سکتے ہیں اور کس کو نہیں کر سکتے۔ اس کا فیصلہ شریعت کے احکام کی روشنی میں کریں گے۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ہم اخلاق اور سلوک پر جو جید اور اکابر علمائے کرام نے لکھا ہے اس کا بھی جائزہ لیں گے۔ مثلاً امام غزالی نے احیائے علوم الدین میں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ میں اور دوسرے بہت سے اکابر اسلام نے اپنی اپنی کتابوں میں چاہے وہ تصوف اور اخلاق کے موضوع پر ہوں۔ بہت قابل قدر بحثیں کی ہیں۔ انھوں نے انسانوں کے معاشی رویہ سے بھی بحث کی ہے۔ اس بحث میں انھوں نے جہاں قرآن کریم اور سنت کے احکام کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہاں انسانوں کے مزاج اور نفسیات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ اور اس گہری مزاج شناسی اور نفسیات دانی نے ان کی تحریروں میں وہ گہرائی اور نظر میں وہ وسعت پیدا کی جس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کتابیں جو اکابر اسلام نے حکمت تشریع پر لکھی ہیں ان کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔

اسلامی شریعت کی حکمت کیا ہے۔ اسلامی شریعت کن حکیمانہ قواعد اور اصولوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ان اصولوں سے استفادہ کرنا اس دور میں ناگزیر ہے۔ امام شاطبی کی الموافقات ہو، علامہ عزالدین السلمی کی القواعد الکبریٰ ہو، ہمارے برصغیر کے شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغۃ ہو، امام قرافی کی الفروق ہو، یا اس طرح کی اور بہت سی کتابیں ہوں۔ ان سب کا اس دور کے لحاظ سے مطالعہ کرنا اور ان کتابوں میں موجود رہنمائی سے کام لیتے ہوئے دور جدید کے مسائل کو حل کرنا، اسلامی نظام معیشت کی تدوین نو کے لیے ناگزیر ہے۔

ان کے ساتھ ساتھ ہمیں تاریخ اور ماضی کے تجربے کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ماضی کا تجربہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اسلام کی ان معاشی تعلیمات نے تقریباً بارہ سو سال تک دنیائے اسلام کے ایک بہت بڑے حصے کی معاشی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ بین الاقوامی تجارت جو تینوں براعظموں کے درمیان رائج تھی، وہ انھی قواعد وضوابط کی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ وہ مسلمان تاجر جو چین کی مشرقی بندرگاہوں سے لے کر، انڈونیشیا اور ملایا سے ہوتے ہوئے، مغربی ہندوستان کی بندرگاہوں سے گزرتے ہوئے، بحر احمر کی بندرگاہوں تک جایا کرتے تھے۔ جن کے ہاتھوں مختلف ملکوں میں تیار ہونے والا سامان دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچتا تھا۔ ان کی ساری تجارتی سرگرمی انھی احکام کے تحت مرتب ہو رہی تھی۔ اس لیے اس پورے تجربے کی تاریخ سے واقف ہونا اور اس

کا جائزہ لینا، مستقبل کی نقشہ کشی کے لیے ناگزیر ہے۔

قوموں کی تاریخ ان کا حافظہ ہوتی ہے۔ مستقبل کی نقشہ کشی ماضی کے تجربے کی روشنی میں ہی ہوتی ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی سے کٹ کر نہ اپنا حال بنا سکتی ہے اور نہ اپنے مستقبل کی نقشہ کشی کر سکتی ہے۔ غیروں کے ماضی سے کسی کا مستقبل نہیں بنا کرتا۔ کسی اور کے حافظے سے آپ اپنا راستہ نہیں تلاش کر سکتے۔ لہٰذا انگلستان کا ماضی ہو یا امریکہ کا ماضی یا کسی اور ملک کا ماضی ہو۔ وہ ایک دلچسپ تاریخی روداد تو ہوسکتا ہے۔ اس سے جزوی استفادہ تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے ماضی کو نظر انداز کر کے، اپنے ماضی کو جھٹلا کر محض دوسروں کے ماضی کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تعمیر کا خواب دیکھنا خام خیالی ہے۔

فرانس کے فاضل پروفیسر لوی ماسینیوں نے لکھا ہے کہ اسلام کمیونزم اور سرمایہ کاری کے درمیان ایک متوازن اور معتدل موقف کا حامل ہے۔ اسلام میں اقتصادی سرگرمی کی اساس تعاون، تکافل اور تراحم پر ہے۔ جب کہ سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کی اساس مقابلہ، کشمکش اور مختلف طبقات کے درمیان کشاکش پر ہے۔ اس مقابلے اور کشاکش کی فضا میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور اصول ضائع ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر ماسینیوں کے اس نقطہ نظر کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ واقعتاً اسلام سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان ایک منفرد، متوازن اور معتدل نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ سرمایہ داری کی نظر میں انسان یا تو ایک خریدار ہے یا مال تجارت ہے۔ سرمایہ داری کی نظر میں ایک عام آدمی کی حیثیت ایک خریدار یا مال تجارت سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اس کے برعکس کمیونزم کی نظر میں انسان پیداوار کا محض ایک آلہ یا وسیلہ سمجھا گیا ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان اور اس کی فلاح و بہبود ہی دراصل مقصود ہے۔ سامان تجارت اور آلات پیداوار انسان ہی کے فائدے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ مقصود کل انسان ہے، انسان سے ماوراء کچھ نہیں ہے۔

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماوراء کیا ہے؟

میرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہاء کیا ہے؟

انسان سے ماوراء صرف ذات الٰہی ہے اور انسان کے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہاء ان اعلیٰ ترین روحانی اقدار اور تصورات پر ہے جو انسان کو صفات الٰہی سے متصف کرنے میں ممد

معاون ہوں اور انسان کی ملکوتیت کو اس کی بہیمیت پر حاوی قرار دیں۔

اسلامی معاشیات کا جب ہم تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی معاشیات کے تین بڑے بڑے پہلو ہیں۔ سب سے اہم اور بنیادی پہلو تو وہ نظریاتی بنیاد ہے جو زندگی کے بارے میں اسلام کے تصورات کا تعین کرتی ہے۔ اسلام کی تعلیم زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کیا ہے؟ اور خاص طور پر معاشی زندگی کے بارے میں اسلامی تعلیم کی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اساسات کیا ہیں؟ دوسرا پہلو وہ قواعد وضوابط اور شریعت کے عام اصول ہیں جن پر پوری شریعت اسلامیہ کی اساس ہے۔ کوئی معاشی نظام شریعت کے ان بنیادی تصورات اور احکام کو نظر انداز کر کے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کیا جائے گا تو وہ اسلام کا معاشی نظام نہیں ہو گا۔ وہ اسلام کی نمائندگی نہیں، البتہ اسلام سے انحراف کی نمائندگی ضرور کرتا ہوگا۔ تیسرا پہلو خالص معاشی اور اقتصادی معاملات سے متعلق ہے۔ یعنی اسلام کی تعلیم کی روشنی میں انسانوں کے معاشی مسائل کا تجزیہ، اقتصادی مشکلات کا حل اور روز مرہ زندگی کے تفصیلی احکام مذکورہ بالا دونوں بنیادوں پر مرتب کیے جائیں۔

پہلے دو پہلوؤں کو نظر انداز کر کے جب صرف تیسرے پہلو پر زور دیا جائے گا تو اس سے وہ توازن بگڑ جائے گا جو اسلام کا مطمح نظر ہے۔ اسلام معاشی ترقی برائے معاشی ترقی کا قائل نہیں ہے۔ اسلام معاشی ترقی کا اس لیے قائل ہے کہ معاشی ترقی انسانوں کو ایک بہتر تہذیبی اور روحانی سرگرمی کے لیے تیار کر سکتی ہے۔ معاشی ترقی انسانوں کے وسائل میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ وہ وسائل جن سے کام لے کر مسلمان اپنی دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو بہتر انداز میں پورا کر سکیں۔ اس لیے معاشی زندگی بھی دراصل مقصود نہیں ہے۔ مقصود پہلے دو پہلو ہی ہیں، جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے جب بھی کوئی معاشی مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس میں کسی نہ کسی غلطی یا ناکامی کا امکان ہمیشہ موجود رہے گا۔

اسلامی معاشیات کے بہت سے ابواب یا میدان ہیں۔ ان میں سے ایک بلکہ شاید سب سے اہم وہ ہے جس کو بعض فقہائے اسلام نے فقہ المعاملات کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کو فقہ المعاملات المالیۃ بھی کہا جا سکتا ہے۔ آج کل اسلامی معاشیات کے نام سے جو تحقیقات ہوئی ہیں، جو کتابیں لکھی گئی ہیں اور دور جدید یعنی چودھویں اور پندرہویں صدی کے اہل علم نے اسلام

کی معاشی تعلیم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان تمام پہلوؤں کو محیط ہے جن سے انسان کی معاشی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ فقہ المعاملات المالیۃ اس کا ایک حصہ ہے۔ فقہ المعاملات المالیۃ سے مراد وہ فقہی احکام ہیں جن کا تعلق مالیات سے ہے اور فقہائے اسلام نے اپنے اپنے زمانے میں اجتہاد اور بصیرت سے کام لے کر ان کو مرتب کیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فقہاء اسلام کا مرتب کردہ یہ ذخیرہ وہ خام مال ہے جس کی بنیاد پر ایک جدید اسلامی اقتصادیات کی تشکیل ہونی ہے اور اقتصادی نظریات کی اس کشمکش میں متبادل مواد اور بنیادی نظریہ اسی خام مال کی بنیاد پر پیش کیا جانا ہے۔

دراصل فقہ المعاملات المالیۃ وہ ابتدائی فارمولیشن ہے یا وہ ابتدائی کاوش ہے جو فقہائے اسلام نے اپنے اپنے زمانے میں اسلامی معیشت کی تشکیل وتہذیب کے لیے کی۔ یہ ان صدیوں کی عملی ضروریات کے لیے انتہائی کافی ذخیرہ تھا جن صدیوں میں اس کو مرتب کیا گیا۔ ہر صدی اور ہر دور میں نئے معاشی مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں اور فقہائے اسلام اسی سرمایے کی بنیاد پر ان معاشی مسائل کا جواب تلاش کرتے رہے ہیں۔ لیکن عام طور پر فقہائے اسلام جب فقہ المعاملات المالیۃ سے بحث کرتے ہیں تو چونکہ وہ بطور فقیہ کے لکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا بنیادی کردار بطور قانون داں، بطور قاضی، بطور مفتی یا بطور مشیر قانون کے ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی دلچسپی کا دائرہ بالعموم معاشیات کے خالص قانونی پہلوؤں تک محدود رہتا ہے۔ جب کہ آج جس کو معاشیات کہا جا رہا ہے اس میں قانون کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے پہلو بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اسلامی معاشیات کا دائرہ بہ نسبت فقہ المعاملات المالیۃ کے وسیع تر ہے۔ منطق کی اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ ایک اعتبار سے فقہ المعاملات المالیۃ کا دائرہ وسیع ہے۔ اور اقتصاد اسلامی کا دائرہ اس کے مقابلے میں محدود ہے۔ ایک دوسرے اعتبار سے اقتصاد اسلامی کا دائرہ وسیع ہے اور فقہ المعاملات المالیۃ کا دائرہ نسبتاً محدود ہے۔

فقہ المعاملات المالیۃ میں جو معاملات زیر بحث آتے ہیں اور جس انداز سے زیر بحث آتے ہیں وہ عموماً normative انداز سے زیر بحث آتے ہیں۔ کسی معاملے میں کیا ہونا چاہیے، کسی فعل کو کیسے انجام دیا جانا چاہیے، یہ دائرہ فقہ کا ہے۔ اسی لیے فقہ المعاملات المالیۃ میں مسائل سے بحث کرنے کا اندازہ normative انداز کا ہے۔ اس کے مقابلے میں جس کو آج ہم

اسلامی معاشیات یا اسلامی اقتصاد کہتے ہیں اس میں دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ یقیناً اور بلاشک وشبہ اس کا ایک normative انداز بھی ہے۔ اس لیے کہ شریعت کا کوئی کام شریعت کے norms اور اسلامی اخلاقیات کے اصولوں سے الگ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں ایک اہم پہلو empirical بھی ہے۔

جن حضرات نے بہت تفصیل سے اسلامی معاشیات پر لکھا ہے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ابن خلدون، امام غزالی، ابن تیمیہ اور خود امام محمد بن حسن الشیبانی، ان حضرات نے اپنے اپنے زمانے کی معاشی سرگرمیوں کا پورا جائزہ لے کر اور اس کا مطالعہ کر کے یہ احکام مرتب کیے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں پہلے پورا empirical survey کیا۔ اس سروے یا جائزے کے نتیجے میں اپنے زمانے کے معاشی مسائل اور حالات کا پتا لگایا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے یہ احکام مرتب کیے۔ فقہاء اسلام کے اس طرز عمل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی فقہ معیشت و مالیت کو اسلامی معاشیات کے نام سے جب بھی مرتب کیا جائے گا اس میں وہ دونوں پہلو سامنے رکھے جائیں گے جن سے اسلامی معیشت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی normative پہلو بھی اور واقعاتی پہلو بھی۔

یہ جو اصطلاحات ہم استعمال کر رہے ہیں، normative اور empirical معیاراتی اور واقعاتی اور دوسری اصطلاحات۔ یہ صرف معاملے کی فہم کے لیے ہیں۔ یہ مغربی اصطلاحات ہیں اور فقہ و شریعت کے سیاق وسباق ان کا استعمال صرف عارضی طور پر وقتی تفہیم کے لیے ہی کیا جانا چاہیے۔ اصطلاحات کا مسئلہ یوں تو ہر باب میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، لیکن خاص طور پر social sciences یعنی اجتماعی علوم میں اور انسانیات میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مغربی اقتصادیات کی اصطلاحات کو شرعی احکام کی توضیح کے لیے استعمال کرنا اس اعتبار سے تو مفید بلکہ شاید ضروری ہے کہ اس سے جدید معیشت کے ماہرین کو فقہ اسلامی کے تصورات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ اسلامی تصورات کو آسانی اور جلدی سے سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ان اصطلاحات کے استعمال کرنے کے نقصانات بھی ہیں۔ ان میں سے ہر مغربی اصطلاح کسی نہ کسی مغربی ملک میں پیدا ہوئی اور اس ملک کے خاص پس منظر، جس میں مسیحیت کے عقائد بھی ہیں، جس میں خالص مادہ پرستانہ محرکات بھی شامل ہیں، جس میں ان مغربی طاقتوں کے استعماری مفادات کا

طویل دور بھی شامل ہے۔ یہ سارا پس منظر مغربی اقتصادیات کی اصطلاحات میں شامل ہوتا ہے۔ جب وہ مغربی اصطلاح اسلام کے سیاق وسباق میں استعمال کی جاتی ہے تو وہ پس منظر خواہی نہ خواہی، دانستہ یا نادانستہ اسلامی تصورات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جو حضرات اسلامی تصورات، اسلامی تاریخ اور شریعت کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ ہوں ان کے لیے اس پس منظر سے متاثر ہو جانا بعید از امکان نہیں ہے۔

دوسری طرف مغربی اصطلاحات کو استعمال نہ کرنے کے نقصانات بھی ہیں۔ مغربی اصطلاحات کو استعمال نہ کرنے کے نقصانات تفہیم، تعلیم اور تسہیل کے نقطہ نظر سے خاصے سنجیدہ ہیں۔ جو حضرات آج معاشیات کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں دنیائے اسلام کی مالیات و معیشت کی لگامیں ہیں وہ قدیم اسلامی اور فقہی اصطلاحات سے عموماً واقف نہیں ہیں۔ وہ صرف مغربی اصطلاحات سے واقف ہیں۔ پھر بعض معاملات آج کل ایسے نمایاں ہو گئے ہیں، خاص طور پر نئے تصورات، نئے طور طریقے اور نئے رواجات، جن کے لیے واحد اصطلاح صرف جدید اصطلاح ہے۔ قدیم اسلامی ادب میں ان کے لیے کوئی اصطلاح نہیں ملتی۔ اس لیے آج کا مسلم ماہر معیشت مجبور ہے کہ ان نئی اصطلاحات کو استعمال کرے۔ اگر وہ ان اصطلاحات کو استعمال نہیں کرے گا تو اس تصور کو بیان نہیں کر سکے گا جو آج کا رائج الوقت تصور ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم اور ضروری پہلو یہ بھی ہے کہ اسلامی اصطلاحات قدیم ہیں اور کئی سو سال بلکہ کم از کم ہزار بارہ سو سال سے چلی آ رہی ہیں۔ ان میں سے بعض متروک ہو چکی ہیں بعض آج قابل فہم نہیں ہیں۔ اس لیے جو قدیم اور روایتی اصطلاحات آج رائج ہیں، قابل فہم ہیں اور اسلامی احکام اور شریعت کے تصورات کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے ناگزیر ہیں ان کو تو جوں کا توں برقرار رکھا جائے گا۔ خاص طور پر وہ اصطلاحات جو شریعت نے خود وضع کی ہیں۔ قرآن کریم یا سنت میں آئی ہیں یا صحابہ کرام نے جو اصطلاحات وضع کی ہیں۔ ان کو تو باقی رکھا جانا ناگزیر ہے، اس لیے کہ وہ اسلام کا شعار اور طرہ امتیاز ہیں اور شریعت کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں۔

البتہ وہ اصطلاحات جو بعد میں فقہائے کرام کے اجتہادات اور حالات و زمانے کی ضرورت سے ابھر کر آئی ہیں ان میں سے اگر کچھ اصطلاحات متروک ہو گئی ہیں یا آج ناقابل فہم ہو

گئی ہیں تو ان کی جگہ نئی اصطلاحات وضع کرنا انسب ہے۔ نئے معاملات کے لیے نئی اصطلاحات ناگزیر ہیں۔لیکن قدیم معاملات کی قدیم اصطلاح اگر متروک ہوگئی ہے۔ یا آج نا قابل فہم ہے تو اس کے لیے نئی اصطلاح وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اصطلاحات کو وضع کرنے کے لیے ایک اجتہادی بصیرت ناگزیر ہے۔ اصطلاح وضع کرنا دراصل اس پورے تصور کو اور اس پورے نظریے کو جس پر وہ اصطلاح دلالت کرتی ہے ایک لفظ یا ایک عبارت میں سمو لینے کے مترادف ہے۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو اس پورے تصور سے ماہرانہ اور مجتہدانہ طور پر واقف ہو۔

اصطلاحات کے سلسلے میں ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی چاہیے، وہ یہ کہ بعض مغربی اصطلاحات ایسی ہیں جن سے دور دور بھی ان کا لغوی مفہوم مراد نہیں ہوتا۔ بعض سادہ لوح حضرات کسی لغت کی کتاب میں اصطلاح کا مفہوم دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تصور بہت اعلیٰ اور بہت ارفع ہے اور مسلمانوں کو یہ تصور اختیار کر لینا چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک زمانے میں یوٹیلٹی Utility اور افادیت کی اصطلاحات بہت عام تھیں۔ افادیت یا افادیت پسندی کا بہت چرچا تھا۔ اس اصطلاح کا لغت کی رو سے مفہوم قرار دیا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز جو انسانوں کے لیے مفید ہو یا انسانوں کے لیے اس میں فوائد ہوں۔ بظاہر اس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی۔ بیسویں صدی کے شروع کی دہائیوں میں بعض اہل علم ان اصطلاحات سے بہت متاثر ہوئے۔ بعض حضرات نے اپنے نام کے ساتھ افادی کا لاحقہ بھی شامل کرلیا۔ اپنے نام کے ساتھ افادی لکھنے لگے، فلاں افادی۔ پروفیسر فلاں افادی۔ انھوں نے غالباً یہ سمجھا کہ انھیں انسانوں کے فائدے کے لیے کام کرنا چاہیے اور انسانوں کے فائدے اور خدمت کا کام ایک اعلیٰ اور ارفع تصور ہے۔

لیکن مغربی معاشیات میں افادیت یا یوٹیلٹی کے وہ معنی نہیں ہیں جو ان حضرات نے سمجھے۔ وہاں یوٹیلٹی کا تصور بہت گہرا ہے، جس کا تعلق فلسفۂ اخلاق اور مابعد الطبعیات سے ہے۔ پھر مغرب میں معاشی تصورات اور نظریات کے بدلنے سے افادیت کا مفہوم بدلتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں کچھ تھا، اس کے بعد کچھ اور تھا۔ اب اس کا مفہوم خالص انفرادی مفاد کے قریب قریب ہے۔ جس چیز کو کوئی فرد اپنے خالص ذاتی مفاد کے لیے ناگزیر سمجھتا ہو وہ اس کے لیے افادیت کی حامل ہے۔ چاہے وہ اخلاقی اعتبار سے یا کسی اور پہلو سے ضرر رساں ہو۔ اسی طرح سے معقول

رویہ یا rational behaviour کی اصطلاح ہے۔ rational behaviour یا معقول رویہ کا مفہوم لغت کی مدد سے معلوم کیا جائے گا تو اس میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں معلوم ہوگی۔لیکن معاشیات کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ فرد کو اپنی ذاتی مصلحت کا زیادہ سے زیادہ حصول کرنا چاہیے اور نفع کی زیادہ سے زیادہ فراہمی کے رویے کو اپنانا چاہیے۔ یہ رویہ rational رویہ یا معقول رویہ کہلاتا ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جدید مسلم ماہر معیشت کو جب اسلامی معاشیات کے احکام مرتب کرنا ہوں تو اس کو اصطلاحات کے استعمال میں بہت احتیاط اور چھان پھٹک سے کام لینا چاہیے۔مغربی اصطلاحات کو اسلامی احکام کے سیاق وسباق میں جوں کا توں اختیار کرنا بعض حالات میں قطعاً نا مناسب اور نقصان دہ ہے۔ اسی طرح سے قدیم اسلامی اصطلاحات کو، وہ اصطلاحات جو بعد کی صدیوں میں انتظامی یا اجتہادی ضروریات سے سامنے آئیں جوں کا توں اختیار کر لینا بھی بعض حالات میں نامناسب ہوسکتا ہے۔

اسلامی فقہ خاص طور پر فقہ المعاملات، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسلامی معاشیات کا مصدر وماخذ ہے۔فقہ المعاملات المالیۃ یا فقہ المعاملات اور اسلامی معاشیات میں جو نسبت ہے وہ مطابقت کی نہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، وہ عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔فقہ المعاملات المالیۃ اسلامی معاشیات کے مصادر اور مآخذ میں سے ایک ہے۔ یقیناً وہ اہم مصدر ہے، یقیناً وہ بہت بڑا اور اہم ماخذ ہے۔لیکن بہر حال متعدد مآخذ ومصادر میں سے ایک مأخذ ومصدر ہے۔

اسلامی معاشیات پر بیسویں صدی میں وسیع پیمانہ پر جو کتابیں لکھی گئیں یہ دراصل وہ مصالحہ ہیں جن کی مدد سے اسلامی معاشیات کی عمارت تعمیر کی جانی چاہیے۔ابھی تک ایسے معیشت دان فقہاء تیار نہیں ہو سکے جو بیک وقت بالغ نظر فقیہ بھی ہوں اور ماہر معیشت بھی ہوں۔ابھی تک دنیائے اسلام ایسے جامع حضرات کی منتظر ہے۔ دور جدید کے فقہاء جنھوں نے معاشی مسائل پر لکھا ہے، ان کی خدمات بلاشبہ غیر معمولی ہیں۔انھوں نے امت اسلامیہ کی اس خاص مرحلے میں رہنمائی کا فریضہ بطریقہ احسن انجام دیا ہے۔لیکن وہ ماہر معاشیات نہیں ہیں۔اسی طرح سے بہت سے ایسے جدید مسلم ماہرین معیشت ہیں جنھوں نے اسلامی معاشیات پر لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے، وہ ماہر معیشت تو ہیں لیکن فقہاء نہیں ہیں۔

ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ کچھ فقہاء اس بات کا عزم کریں کہ وہ علم معیشت کو بہت تفصیل، گہرائی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ حاصل کریں گے اور یوں بیک وقت ماہر معیشت اور فقیہ اسلام کے طور پر اس خدمت کو انجام دیں گے جس کی مسلم امت منتظر ہے۔ اسی طرح اگر کچھ ماہرین معیشت اس عزم کے ساتھ سامنے آئیں کہ وہ فقہ اسلامی اور شریعت کی باقاعدہ مربوط اور منظم تعلیم حاصل کر کے بیک وقت فقیہ اسلام بھی ہوں گے اور جید ماہرین معیشت بھی ہوں گے تو پھر وہ اس قابل ہوسکیں گے کہ مستقبل کے لیے ایک ایسے نظام معیشت کی تشکیل کرسکیں جو آئندہ آنے والے کئی سو سال کے دوران امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ابتدائی دو تین صدیوں کے فقہائے اسلام کی مجتہدانہ بصیرت سے امت آج تک کام لے رہی ہے۔

دوسری صدی ہجری کے فقہائے اسلام اور ائمہ مجتہدین جن کے اجتہادات مرتب اور مدون شکل میں ہم تک پہنچے ہیں امت اسلامیہ آج تک ان کے احسان سے گراں بار ہے اور ان کے اجتہادات سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ آج ہمیں اسی طرح کی صورتحال درپیش ہے جو امت مسلمہ کو دوسری صدی ہجری میں درپیش تھی۔ آج امت مسلمہ اسی طرح ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے جس طرح وہ دوسری صدی ہجری کے اوائل سے ایک نئے دور میں داخل ہونا شروع ہوئی تھی۔

آج دنیا نے مذہب اور معاشیات کا دائرہ الگ الگ کر دیا ہے۔ آج معاشیات کے مباحث میں مذہب کو داخل کرنے کی روایت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ختم ہوگئی ہے۔ اور جب مسلمان علماء معاشیات کے احکام کو مذہبی تعلیم سے وابستہ کرتے ہیں، معاشیات کے مسائل کو مذہبی تصورات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت سے مغربی اور جدید ذہن کے بعض مشرقی فضلاء اس پر معترض ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشیات کے مباحث میں مذہب کو داخل کرنے کی روایت خود مغرب میں بھی موجود رہی ہے اور مغربی معیشت کے ماہرین اس روایت سے نامانوس نہیں ہیں۔

آدم اسمتھ جو کلاسیکی اسکول کا بانی مانا جاتا ہے۔ وہ اخلاقی محرکات کا صراحت سے ذکر کرتا ہے۔ اس کے یہاں مذہب اور معاشیات میں ربط کے یہ تصورات موجود ہیں۔ یہی بات

میکس ویبر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو اپنے زمانے میں اجتماعیات اور اجتماعی علوم میں امامت کے درجے کا حامل تھا۔ لیکن جب سے مغرب میں نوکلاسیکی مکتب فکر نے جنم لیا ہے۔ اور اس نئے مکتب فکر کو غلبہ حاصل ہوا ہے اس نے مذہب واخلاق کو معاشی سرگرمی سے بالکل نکال دیا ہے۔ اور انسان کو محض ایک آلہ پیداوار کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس مکتب فکر کی رائے میں انسان محض ایک کماؤ جانور ہے، جس کا کوئی اعلیٰ اور ارفع اخلاقی یا روحانی مقصد نہیں ہے۔ اس مکتب فکر کے بہت سے بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ اسلامی اور شرعی نقطہ نظر سے سخت قابل اعتراض ہیں۔

اسلام میں معیشت اور مادی ضروریات کی تکمیل زندگی کا اصل اور واحد مقصد نہیں ہے۔ یہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک پہلو مادی ضروریات کی تکمیل اور خالص معاشی تقاضوں کا بھی ہے۔ یہ پہلو دین واخلاق سے مکمل طور پر مربوط اور متناسق ہونا چاہیے جیسا کہ شریعت کا تقاضا ہے۔ فقہائے اسلام نے ہمیشہ اس ربط اور تناسق کو نہایت لطیف، جامع اور مکمل انداز میں پیش کیا۔ فقہ اسلامی کا عمومی نقشہ جب سامنے رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کے سارے پہلوؤں کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ بیک وقت تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کا سامان کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ معیشت اور آنجہانی کمیونسٹ معیشت میں معیشت کو مذہب واخلاق سے دور رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی تھی اور آج بھی کی جارہی ہے۔

امام شاطبی کے الفاظ میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی معیشت کا ہدف یہ ہے کہ اخراج المکلف عن داعیۃ الھوی۔ یہ امام شاطبی کی نزدیک شریعت کے بنیادی اہداف میں سے ہے کہ انسان کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ اپنی مادی خواہشات کی بندش سے آزاد ہو جائے۔ جب وہ مادی خواہشات کی بندش سے آزاد ہو جائے گا تبھی وہ اخلاق، اعتدال اور توازن کی صفات سے بہتر انداز میں متصف ہو سکے گا اور زیادہ بہتر انداز میں دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اس کے برعکس جدید معاشیات کا ہدف جو بظاہر نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کی خواہشات اور اہواء اور شہوات کی بقدر امکان بلا روک ٹوک تکمیل کا بندوبست کیا جائے۔ وہاں انسان کو خواہشات نفس کے دائرے سے نکالنا اور آزاد کرنا مقصود ہے۔ یہاں خواہشات نفس کی حتی الامکان تکمیل اور بہتر سے بہتر اور مکمل سے مکمل انداز میں تکمیل ہی اصل ہدف ہے۔ بلکہ نئی نئی

خواہشات اور اہواء کو پیدا کرنا بھی اس معاشی نظام کے بنیادی اہداف میں سے ہے۔

مغرب کی پوری معیشت دن رات اسی بات کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ انسانوں کے دل و دماغ کو نت نئی مادی اور شہوانی خواہشات کی آماج گاہ بنایا جائے۔ ان کی کمپنیاں، ان کی تجارتیں، ان کے بینک، ان کے تجارتی دفاتر، ان کے اشتہارات غرض ہر چیز کا ہدف یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے نئی نئی ضروریات تراشیں۔ پھر لوگوں کو ان ضروریات کی تکمیل پر آمادہ کریں اور ایسی ایسی چیزیں ان کی بنیادی ضروریات کا حصہ بنا دیں جس کے بغیر وہ انتہائی خوشی اور آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ تصور اسلام کی تعلیم کی رو سے نا قابل قبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے بنیادی احکام دراصل اس دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی حقیقی مصلحت کی تکمیل کے لیے دیے گئے ہیں۔ انسان کا حقیقی مفاد اور حقیقی مصلحت کیا ہے؟ یہ وہ ہے جو شریعت نے بیان کی ہے، یعنی اس دنیا میں بھی کامیابی اور آخرت میں بھی کامیابی کا حصول۔ یہ فقہ کے، شریعت کے تمام احکام کا بنیادی ہدف اور بنیادی مقصد ہے۔ اس لیے شریعت کا کوئی پہلو چاہے وہ فقہ المعاملات سے تعلق رکھتا ہو، فقہ مالیات سے تعلق رکھتا ہو۔ معیشت و تجارت سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ اخروی مقاصد اور اہداف کو سرے سے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی شریعت اس مغربی تصور کو قبول نہیں کرتی کہ معاشی انسان سے مراد وہ زندہ وجود ہے جس کی زندگی کا مقصد وجود صرف یہ ہو کہ وہ مادی زندگی کا بہتر سے بہتر ہدف اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح حاصل کرے، اور حصول مال، حصول زر اور حصول مادیات کے علاوہ اس کا کوئی محرک نہ ہو۔

مغربی سرمایہ داری میں اوّل تو اخلاقی اقدار اور اخلاقی اصول سرے سے غیر متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں اخلاقی اقدار اور اصولوں کا تذکرہ ملتا بھی ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک وہ نفع میں مدد و معاون اور مادیات کے حصول میں کارآمد معلوم ہوں۔ سچ بولنا اس لیے اچھا ہے کہ سچ بولنے سے خریدار کا اعتماد قائم ہو جاتا ہے۔ وعدے کی پاسداری اس لیے اچھی ہے کہ اگر نہ کی گئی تو گاہک فرار ہو جائیں گے، اور خریدار بھاگ جائیں گے۔ وعدے کے مطابق مال فراہم کرنا اس لیے اچھا ہے کہ کاروباری حلقے میں اعتماد اور ساکھ بن جائے۔ انگریزی کی ضرب المثل جو بچپن سے پڑھتے آرہے ہیں اس میں پڑھا تھا Honesty is the best policy۔ دیانت داری بہترین پالیسی ہے۔ یعنی دیانت داری فی نفسہ بطور ایک اخلاقی قدر کے کوئی اچھی

چیز نہیں ہے، نہ فی نفسہ دیانت داری مطلوب ہے، بلکہ بطور پالیسی کے اختیار کی جائے تو بہت اچھی چیز ہے۔ اس سے مغرب کا تصور واضح ہو جاتا ہے اور مغربی ذہن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی اور معاشی زندگی میں اخلاقی اقدار کی اہمیت کیا ہے۔ وہ بطور پالیسی کے اگر مفید ہیں تو ان کو اختیار کرنا چاہیے اور اگر غیر مفید ہیں تو ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔

سرمایہ دارانہ نظام آزاد اور کھلی معیشت کا نظام ہے۔ اس کو آج کل کھلی منڈی کی معیشت بھی کہا جانے لگا ہے۔ Free Market Economy۔ وہاں ریاست نہ ملکیت میں مداخلت کرتی ہے اور نہ وسائل پیداوار اور ملکیت کو کنٹرول کرتی ہے۔ جس کا جتنا جی چاہے کمائے اور جہاں جی چاہے خرچ کرے۔ نہ کمانے پر پابندی ہے نہ خرچ کرنے پر پابندی ہے، وہاں انفرادی کوشش ہی معاشی اور معاشرتی ترقی کی ضامن ہے۔ وہاں صارف کے کردار کی اہمیت بڑھ رہی ہے، اس لیے کہ جب تک صارف کو نئی نئی اشیاء کی خریداری اور استعمال پر آمادہ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک وہ لاتعداد کارخانے، اپنی لامحدود پیداوار فروخت نہیں کر سکیں گے جو وہ دن رات پیدا کر رہے ہیں۔ اس لیے صارف کے کردار کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

چونکہ صارف کے کردار کی اہمیت بڑھ رہی ہے اس لیے پبلسٹی اور اشتہار کی اہمیت بھی روز افزوں ہے۔ اشتہار بازی اور پبلسٹی اب نہ صرف ایک فن ہے بلکہ ایک ایسا ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہر وہ چیز جو کوئی کارخانہ تیار کرے، لوگوں کے گھروں تک پہنچانا آسان ہو جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت خالص مقابلے اور Competition کی معیشت ہے۔ یہاں پیداوار کی مکمل چھوٹ ہے، ذاتی ملکیتوں کو مکمل تحفظ حاصل ہے۔ ارتکاز دولت کو حتی الامکان قائم کیا گیا ہے اور اس کا تحفظ بھی کیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں اصل ہدف ہر چیز کی بہتات اور کثرت ہے۔ پیداوار کی بہتات اور maximization، دولت کی بہتات اور maximization، منڈیوں کی وسعت اور بہتات۔ روزانہ نت نئی ضروریات پیدا کرنا اور غیر ضروری ضروریات کو لوگوں کے لیے ناگزیر بنا دینا، یہ مغربی سرمایہ دارانہ معیشت کا ایک اہم پہلو ہے۔ صارفین کی تعداد بڑھانے کے لیے دن رات کوشش جاری رہتی ہے۔ بچتیں بڑھانے کی اہمیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بچتوں کو

سود پر چلانا اس پورے عمل کی روح ہے۔ سودی کاروبار کی بہتات اور maximization دن رات ہو رہی ہے۔ پھر سود در سود ادا کرنے کے لیے پیداوار کو مزید بڑھانا ناگزیر ہے۔ جب پیداوار بڑھے گی تو پھر دولت بھی مزید بڑھے گی۔ پھر منڈیوں میں وسعت پیدا ہوگی۔ اس طرح سے یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سرکل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس کی انتہاء صرف یہ ہے کہ ناجائز ذرائع، ظلم اور اقتدار کی پشت پناہی سے کچھ لوگ اپنی دولت میں لامتناہی اضافہ کرتے چلے جائیں جیسا کہ ہو رہا ہے۔ آج مغربی دنیا میں چند سو یا زیادہ سے زیادہ چند ہزار افراد پر مشتمل ایک اقلیتی طبقہ ہے جو پوری دنیا کی معیشت کو کنٹرول کرتا ہے۔

ابھی چند سال پہلے ہم نے دیکھا کہ کس طرح ایک بڑے مغربی ملک کے چند تیل کے بڑے تاجروں نے پوری دنیا کو ایک شدید افراتفری اور تباہی کا نشانہ بنایا۔ مسلم ممالک کو تباہ و برباد کیا۔ لاکھوں انسانوں کو تہہ تیغ کیا۔ اربوں کھربوں کی جائیدادیں مسلمانوں کی تباہ کر دیں۔ ملکوں کے ملک تلپٹ کر دیے۔ اس لیے کہ وہ اپنے تجارتی مفاد کو یقینی بنانا چاہتے تھے۔ ان چند افراد نے اپنے تجارتی مفاد کو محفوظ کر لیا، لیکن اس کی قیمت انسانوں کو کیا ادا کرنی پڑی؟ وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس تصور کا جس کی وجہ سے ہر چیز کی بہتات اور کثرت دراصل معیشت کا ہدف ہے۔ یہی maximization اگر حدود سے نکل جائے اور اخلاقی دائرے سے باہر ہو جائے تو اسی کو قرآن کریم کی اصطلاح میں تکاثر کہا گیا ہے۔ ”الهكم التكاثر حتى زرتم المقابر“ ۔ تکاثر یعنی مال و دولت کی کثرت اور بہتات میں ایک دوسرے سے مقابلہ! ایسا مقابلہ جس کی انتہاء صرف قبرستان جا کر ہی ہو سکتی ہو! ہر ایک شخص آخری لمحہ تک اس مقابلے میں شریک رہتا ہے اور اس وقت تک باز نہیں آتا ہے جب تک وہ قبر میں نہ پہنچ جائے۔

اس صورتحال کے ردعمل کے طور اشتراکی معیشت سامنے آئی تھی۔ کمیونزم سامنے آیا تھا جس نے انفرادی ملکیت کے خاتمے کو ہی مزدوروں اور مظلوم طبقوں کے جملہ مسائل و مشکلات کا حل سمجھا۔ اس نظام کی نظر میں دولت اور وسائل پیداوار پر ریاست کا مکمل کنٹرول عدل و انصاف کا واحد ذریعہ اور طریقہ تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ نظام میں انفرادی ملکیتوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ وسائل پیداوار پر ریاست کا مکمل کنٹرول قائم ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مظالم جو مغربی دنیا میں سرمایہ دارانہ معیشت میں کئی ہزار افراد مل کر الگ الگ کرتے تھے۔ جن میں اس اعتبار سے تفاوت بھی ہو سکتا تھا

اور عملاً بھی پایا جاتا تھا کہ کوئی کم ظالم تھا کوئی بڑا ظالم تھا۔ پھر ایک مظلوم کو اس کا اختیار تھا کہ وہ چھوٹے ظالم اور بڑے ظالم میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکے۔ اس پورے نظام کو ختم کر کے چند ریاستی کارندوں کے ہاتھ میں ملکی معیشت کا پورا کنٹرول دے دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ چند ہزار مظالم کرنے والے افراد جن میں بہت تفاوت پایا جاتا تھا ان سب کا ظلم یکجا ہو گیا اور جو تھوڑی بہت سانس لینے کی آزادی غریب آدمیوں کو میسر تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ وہاں قانون رسد اور طلب کا بھی فقدان تھا اس لیے کہ ریاست ہی طلب کی ذمہ دار تھی اور ریاست ہی رسد کی ذمہ دار بھی تھی۔

یہ تصور بعض مشرقی ممالک میں اور کچھ مسلم ممالک میں بہت مقبول ہوا۔ کمیونزم تو مسلم ممالک میں زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ لیکن سوشلزم کو بعض مسلم حکمرانوں نے بہت پسند کیا۔ کسی معاشی بہبود کی خاطر کم، اقتدار اور استبداد کی خاطر زیادہ۔ انھوں نے دیکھا کہ جن جن ملکوں میں کمیونزم آیا ہے اور وسائل پیداوار پر وہاں ریاست مسلط ہو گئی ہے ان ملکوں میں حکمران طبقہ کی مخالفت میں کوئی بولنے والا نہیں رہا اور حکمران مطلق العنان اور مستبد ہو گئے ہیں۔ یہ منظر بعض مسلمان ڈکٹیٹروں کو بہت پسند آیا اور انھوں نے سوشلزم کے حق میں پروپیگنڈے سے فائدہ اٹھا کر کلی اقتدار اور استبداد کا رویہ اپنایا۔ وسائل پیداوار پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ قوم کی معاشی بہبود کے لیے تو وہ کچھ نہ کر سکے۔ کسی سوشلسٹ مسلم ملک نے اپنے عوام کو وہ عدل وانصاف نہیں دیا۔ وہ وسائل اور سہولتیں فراہم نہیں کیں جن کی فراہمی کا دعویٰ کر کے وہ اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ ہاں استبداد اور ڈکٹیٹرشپ کے ایک سے ایک بڑھ کر نمونے ان مسلم ممالک میں سامنے آئے جہاں سوشلزم کے نام پر کچھ افراد اقتدار پر قابض ہوئے۔

مغربی معاشی تصورات میں، وہ کمیونزم کے تصورات ہوں، یا سرمایہ داری کے تصورات ہوں، بعض تصورات ایسے تھے جن سے اسلامی شریعت اور فقہائے اسلام اتفاق نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ایک عام بات جو معاشیات کی کتابوں میں کہی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا میں اشیائے ضرورت کی انتہائی کمی اور شدید قلت ہے۔ اور ضروریات لامتناہی ہیں۔ اس لیے اس صورتحال میں انتہائی محدود اشیائے ضرورت سے لامحدود ضروریات کو پورا کرنا، یہی علم معاشیات کا بنیادی فریضہ ہے۔

اسلامی معاشیات کے بنیادی عناصر کیا ہیں۔ بالفاظ دیگر اسلامی نظام معیشت وتجارت

کن عناصر سے مرکب ہے۔ اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بنیادی عناصر پانچ ہیں۔

سب سے اہم اور سب سے پہلے تو نصوص شریعت ہیں۔ قرآن مجید اور سنت کے وہ بنیادی احکام جن کا تفصیلی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ان کی حیثیت تو اس بنیاد اور اساس کی ہے جس پر یہ عمارت قائم ہوتی ہے۔

اس کی بعد وہ بنیادی قواعد اور احکام اور اصول وضوابط ہیں جو شریعت کے احکام سے ماخوذ ہیں۔ جن پر فقہائے اسلام کا صحابہ کرام کے زمانے سے اور ائمہ مجتہدین کے دور سے اتفاق رہا ہے۔ ان کی حیثیت ان بنیادی ستونوں کی ہے جو عمارت کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہیں۔

پھر مسلمانوں کے وہ تاریخی تجربات ہیں جو انھوں نے معاشیات اور تجارت کے باب میں کیے ہیں۔ ان تاریخی تجربات کے نتیجے میں بہت سے احکام بھی مرتب ہوئے ہیں۔ ان احکام میں سے بعض پر فقہائے کرام کا اتفاق ہے۔ بعض پر اتفاق نہیں ہوا اور ان کے اجتہادات مختلف رہے۔ ان تاریخی تجربات میں سے وہ تمام چیزیں جو آج قابل عمل ہیں اور آج کل کے حالات کے لحاظ سے ناگزیر ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رہنا چاہیے اور اس تاریخی تسلسل کو یقینی بنانا چاہیے جو مسلمانوں کے حال کا رشتہ مسلمانوں کے آغاز اور ابتداء سے برقرار رکھ سکے۔

اس کے بعد چوتھی چیز وہ مصلحت وقت ہے جو ہر دور اور ہر علاقے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ یہ مصلحت وقت اگر نصوص شریعت، قواعد شریعت اور اجتہادات فقہاء کے حدود کے اندر ہے تو قابل قبول ہے۔ اور اگر ان حدود سے متجاوز ہے تو اس تجاوز کی حد تک اس پر نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ اور جو مصلحت وقت حقیقی اور واقعی ہو اس کے پیش نظر نئے احکام اور نئے اجتہادات سے بھی کام لینا پڑے گا۔

ان سب کے بعد مقاصد شریعت کے وہ تقاضے ہیں جو آج کل کے لحاظ سے ناگزیر ہیں۔ ان کی تحدید اور نشاندہی اور ان کی بنیاد پر ایسے معاشی اور اقتصادی رویوں کی تشکیل جو اسلامی شریعت کے تصورات کے عین مطابق ہوں۔ مسلمانوں کی آرزوؤں کے غماز ہوں اور دنیائے اسلام کے مستقبل کی نقشہ کشی کے لیے ناگزیر ہوں۔

ان پانچ عناصر کی بنیاد پر جو بھی عمارت تعمیر کی جائے گی، جس کی بنیادیں موجود ہیں۔ جس کے ستون قائم ہیں۔ جس کی مضبوط دیواریں بڑی حد تک ابھی تک موجود ہیں، ان میں

ضروری نقشہ کشی، داخلی ترتیب میں جزوی تبدیلی اور موسم اور زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے عمارت میں جزوی ردوبدل، یہ ہر دور کے لحاظ سے ناگزیر رہتا ہے۔

اس نظام کے جو امتیازی اوصاف ہیں وہ یوں تو بے شمار ہیں، ان کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔ لیکن اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اقتصاد کے بنیادی خصائص میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ ایک دینی نظام ہے۔ بنیادی اور اساسی طور پر یہ ایک دینی اور روحانی نظام ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس نظام میں خالص دینی تصورات کی بنیاد پر اخلاقی اصول تشکیل پاتے ہیں۔ اور اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر زندگی کا نظام تشکیل پاتا ہے۔ قانون اور اخلاق، اقتصاد اور اخلاق، تجارت اور اخلاق، معیشت اور اخلاق، اسلامی تصور کی رو سے ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں، لہٰذا کوئی ایسی معاشی سرگرمی جس کا ربط اسلامی اخلاقیات سے نہ ہو، جس کا براہ راست تعلق اسلام کے عقائد سے نہ ہو، وہ اسلامی تعلیم کی رو سے قابل قبول نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی معیشت ایک جامع اور مکمل نظام کا ایک حصہ ہے۔ یہ زندگی کے بقیہ پہلوؤں سے کٹ کر، زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے ہٹ کر کوئی نظام نہیں دیتا۔ بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، زندگی کے پورے نظام میں معاشی سرگرمیوں کی جگہ متعین کرتا ہے اور پھر بقیہ تمام اجزاء کو ساتھ لے کر انسانی زندگی کے مشترکہ اہداف اور مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتا ہے۔ جس طرح میں نے ایک گفتگو میں گاڑی یا کہکشاں کی مثال دی تھی۔ جس طرح ایک گاڑی کے تمام اجزاء جب تک صحیح طور پر کام نہ کر رہے ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام نہ کر رہے ہوں تو اس سے وہ فوائد حاصل نہیں کیے جا سکتے جو ایک گاڑی سے حاصل کیے جانے مقصود ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کے وہ فوائد مکمل طور پر حاصل نہیں ہو سکتے جو شریعت سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر انسانی زندگی کے سارے پہلو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور متکامل نہ ہوں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معاشی نظام ہے جس کی بنیاد اسلام کے عقائد پر ہے۔ خالص عقائد اور روحانیات سے وابستہ بعض پہلو اور تصورات ایسے ہیں جن کا بڑا گہرا اثر اسلامی کی معاشی تعلیمات پر پڑتا ہے۔ بظاہر عقیدہ توحید ایک خالص الہیاتی معاملہ ہے۔ دوسرے مذاہب کی نظر میں یہ ایک خالص کلامی یا عقائدی مسئلہ ہے۔ اسلام کی تعلیم کی رو سے توحید کائنات

کی سب سے بڑی زندہ قوت ہے۔توحید انسانوں کے رویے کی تشکیل میں سب سے بڑا محرک ہے۔انسانی مساوات اور عدل وانصاف کا تصور براہ راست عقیدہ توحید سے جنم لیتا ہے۔اس لیے اسلامی اقتصادیات کے تمام پہلو، اس کی تعلیم کے تمام حصے اور اس کے تمام بنیادی اصول بالآخر اسلامی عقیدے سے وہی تعلق رکھتے ہیں جو ایک درخت کی شاخوں کا اور برگ وبار کا اس کی جڑ سے ہوتا ہے۔

اسلامی نظام معیشت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ معیشت کو عبادت کا رنگ دینا چاہتا ہے۔ایک تعبدی پہلو معیشت میں پایا جاتا ہے اگر اسلامی نظام معیشت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ روبہ عمل لایا جائے۔میں نے اس گفتگو کے شروع میں عرض کیا تھا کہ تجارت حضور ﷺ کی زندگی کی اہم معاشی سرگرمی تھی۔خاص طور پر نبوت سے پہلے۔صحابہ کرام میں جید ترین صحابہ کرام کا تعلق تجارت سے تھا۔قرآن کریم نے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔تجارت اور دینی سرگرمیوں کو ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے۔اس لیے اسلام کی تعلیم کی رو سے خالص تجارتی اور معاشی سرگرمی عبادت کا رنگ رکھتی ہے اگر وہ شریعت کے احکام کے مطابق انجام دی جائے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے۔اسلامی احکام تجارت اور اصول معیشت کا کوئی حکم یا کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو براہ راست اخلاقی تصورات پر مبنی نہ ہو۔انسانوں کے درمیان تعاون، تکافل، لین دین، عدل وانصاف، مساوات، روح انسانیت۔یہ تمام وہ امور ہیں جن کا تعلق اخلاق سے نہایت گہرا اور نہایت مضبوط ہے۔

اسلامی نظام معیشت کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حالات وزمانے کی رعایت اور تقاضوں کو اپنے اندر سمو لینے کی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے۔اس کی ایک بڑی دلیل تو یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت پر چودہ سو سال تک عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔اسلام کے معاشی احکام اور تجارت کے قوانین کے بعض حصوں پر آج بھی عمل درآمد ہو رہا ہے۔دنیا کے مختلف علاقوں میں، مختلف زمانوں میں، مختلف تہذیبی پس منظر رکھنے والی اقوام میں اس پر عمل درآمد کامیابی سے ہوتا رہا ہے۔ہر دور کے فقہائے اسلام نے اپنے اجتہادات کے ذریعے۔ہر دور کے اہل افتاء نے اپنے فتاویٰ کے ذریعے، حالات وزمانے کی رعایت کو پوری طرح پیش نظر رکھا اور ہر علاقے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کے احکام کی روشنی میں اس طرح کے اجتہادات کیے کہ اس علاقے

کے تقاضے، اس علاقے کے لوگوں کی ضروریات اس علاقے کے لوگوں کی مصلحتیں سب پوری ہو جائیں۔ رہے شریعت کے بنیادی احکام، قرآن وسنت کے بنیادی قواعد، ان پر بدستور عمل درآمد ہوتا رہے، اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو۔

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک معروضی اور موضوعی یعنی objective نظام ہے۔ جو براہ راست انسانوں کی حقیقی ضروریات کا پورا پورا ادراک بھی رکھتا ہے اور ان ضروریات کو عدل وانصاف کے ساتھ پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اگر حقیقی ضروریات اور غیر حقیقی ضروریات کا فرق سمجھ لیا جائے، اگر انسان کے ناگزیر معاشی تقاضوں اور وہمی اور فرضی تقاضوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو پھر آسانی کے ساتھ، موضوعیت کے ساتھ ان تقاضوں کو پورا کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

یہ معروضی یا واقعیت پسندانہ انداز شریعت کے تمام احکام میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر انسان کی مادی ضروریات کی تکمیل اور معاشی تقاضوں کے پورا کرنے میں یہ معروضیت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

اسی معروضیت سے شریعت کی اور اسلام کے اقتصادی نظام کی آٹھویں خصوصیت سامنے آتی ہے جو واقعیت پسندی ہے۔ اسلام کے نظام میں واقعیت پسندی اور مثالیت پسندی ان دونوں کا اتنا حسین امتزاج موجود ہے جو شریعت کے تمام پہلوؤں میں نظر آتا ہے۔ شریعت بیک وقت ایک انتہائی اعلیٰ درجے کا مثالیت پسند نظام ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انتہائی مؤثر اور حقیقی انداز میں واقعیت پسندانہ نظام بھی ہے۔ قرآن مجید میں انسانوں کی کمزوریوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی ضروریات کا بھی ادراک پورا موجود ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا یہ اشارے بھی کیے گئے ہیں کہ انسانوں کے ضروری اور حقیقی تقاضے کیا ہیں۔ اور ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک حقیقت پسندانہ اور واقعیت پسندانہ نظام کیا ہو سکتا ہے۔

پھر جس طرح توازن اسلامی شریعت کے اہم خصائص میں سے ہے، اسی طرح اسلامی نظام معیشت کی اہم خصوصیت بھی توازن ہے۔ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور مزارع ان سب کے حقوق اور ذمہ داریوں کے درمیان ایک مکمل توازن پایا جاتا ہے۔ یہاں نہ اس غیر حقیقی اور غیر عملی مساوات کا دعویٰ ہے جس کا دعویٰ کمیونزم نے کیا اور وہ اس پر عمل درآمد میں ناکام رہا۔ نہ

یہاں کسی ایک طبقے کے مفاد کی خاطر دوسرے طبقے کا استحصال ہے، جیسا کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح سے زندگی کے مختلف پہلوؤں اور معاشی زندگی کے مختلف حصوں کے بارے میں وہ توازن اسلامی شریعت میں موجود ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مکمل عمل درآمد کے لیے ناگزیر ہے۔

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے تقاضے جبھی پورے ہو سکتے ہیں جب ان کے درمیان عدل سے کام لیا گیا ہو اور ان کے درمیان توازن اس طرح برقرار رکھا گیا ہو کہ اس کے نتیجے میں زندگی کے جس شعبے کو، جس سرگرمی کو جتنی توجہ اور جتنے وسائل کی ضرورت ہے اتنے وسائل اس کی میسر ہوں۔ یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی شریعت نے مال کو قیام للناس قرار دیا ہے اور اس کی وہی حیثیت بتائی ہے جو انسانی زندگی میں خون کی ہوتی ہے۔ اگر خون جسم کے تمام اعضاء کو بقدر ضرورت ملتا رہے، تسلسل کے ساتھ ملتا رہے تو زندگی صحت مند ہوتی ہے۔ جسم کا توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر خون کی فراہمی مختل ہو جائے، کسی ایک عضو کو بقدر ضرورت خون نہ ملے تو پھر بالآخر پورا جسم اختلال کا نشانہ بن جاتا ہے اور انسانی صحت اضطراب کا شکار ہو جاتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کی دسویں خصوصیت عدل ہے۔ یوں تو عدل پوری شریعت کی اساس ہے۔ کائنات کا پورا نظام عدل اور اعتدال پر قائم ہے۔ لیکن عدل کا سب سے نمایاں نمونہ مال و دولت کی تقسیم میں عدل ہے۔ تقسیم دولت کا نظام اگر عادلانہ ہے تو معاشرتی زندگی کامیاب اور خوشگوار ہے۔ اگر تقسیم دولت میں عدل و انصاف کے تقاضے فراہم نہیں کیے گئے تو پھر عدل و انصاف کے سارے دعوے محض کاغذی اور زبانی دعوے ہیں۔ حقیقت کے میزان میں ان کا وزن بہت ہلکا ہے۔ Distributive Justice کی اصطلاح تو آج کل استعمال ہونے لگی ہے۔ لیکن یہ تصور اسلامی شریعت کی تاریخ میں بہت پرانا ہے۔

اسلامی شریعت میں روز اوّل سے اس بات کو یقینی بنایا گیا ہے کہ معاشرے میں عدل و انصاف مکمل طور پر قائم ہو اور معاشرے کا کوئی طبقہ اور کوئی فرد حتی الامکان اپنے بنیادی حقوق بالخصوص معاشی حقوق سے محروم نہ رہے۔ عدل کا لازمی تقاضا مساوات بھی ہے۔ مساوات سے مراد مواقع کی مساوات ہے۔ ہر شخص کے لیے حصول رزق کے مواقع یکساں طور پر کھلے ہونے چاہئیں۔ یہ عدل کا لازمی تقاضا ہے۔ جن معاشروں میں مساوات نہیں ہے، وہاں عدل بھی نہیں

ہے۔ جہاں عدل نہیں ہے وہاں مساوات بھی نہیں ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت نے جہاں تمام انسانوں کو برابر درجہ دیا ہے اور کرامت آدم کے مقام پر تمام انسانوں کو یکساں فائز کیا ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت نے وسائل رزق تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر کھول رکھے ہیں اور سب کو فراہم کر دیے ہیں۔

یہ وسائل دولت اسی وقت انسان کے کام آسکتے ہیں جب عادلانہ تقسیم میں پورا نظام ممد و معاون ہو۔ اگر عادلانہ تقسیم وسائل کی نہیں ہے۔ بلکہ دولت کا ارتکاز جنم لے رہا ہے تو پھر وسائل کی فراہمی بھی غربت اور فقر و فاقے کو ختم نہیں کر سکتی۔ آج دنیا میں انسانوں کی بڑی تعداد کو جس فقر و فاقے کا سامنا ہے اس کی بڑی وجہ غیر عادلانہ تقسیم دولت اور دولت اور وسائل ثروت کا ارتکاز ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں ختم ہو جائیں تو پھر عدل بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور مساوات بھی قائم کی جا سکتی ہے۔

اسلامی اقتصادیات کے یہ تو وہ اہداف تھے جو عمومی اور دور رس اہداف تھے۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ اہداف وہ بھی ہیں جو فوری طور پر سامنے آنے چاہئیں۔ اور جن کی فوری تکمیل اسلام کے معاشی نظام کا مقصود ہے۔ ان اہداف میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ معاشرے کے نادار طبقوں کی ناگزیر اور کم سے کم ضروریات فوری طور پر پوری کی جائیں۔ اس ناگزیر اور کم سے کم ضرورت کے درجہ کو فقہائے اسلام نے کفاف کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اور یہ لفظ غالباً سب سے پہلے سیدنا عمر فاروقؓ نے استعمال فرمایا تھا۔ کفاف کا یہ درجہ ہر انسان کو حاصل ہونا چاہیے۔ ریاست کے ہر شہری کو اور معاشرے کے ہر فرد کو کفاف یعنی روزی کے کم سے کم ناگزیر وسائل حاصل ہوں۔ بعض فقہاء نے اس کے لیے حد کفایہ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ حد کفایہ یعنی وہ کم سے کم حد جو ہر انسان کو حاصل ہونی چاہیے، اس کا حاصل ہونا اور پورا کیا جانا، یہ ریاست اور معاشرے کے معاشی فرائض میں شامل ہے۔

یہ بات کہ کچھ لوگ دولت کے انبار سے کھیل رہے ہوں، ان کے پاس دولت کی ریل پیل ہو، ان کی شہوات اور خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے ہزاروں وسائل دستیاب ہوں اور کچھ لوگ پینے کے لیے پانی کی بوند بوند کو ترستے ہوں۔ یہ صورتِ حال اسلامی شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر فرمایا کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ کامل

صاحب ایمان نہیں کہلا سکتا جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کے پڑوس میں لوگ بھوک کا شکار ہوں۔ یہ محض دو افراد کے درمیان کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہاں پورے معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری کو بیان فرمایا گیا ہے۔ معاشرے کا نظام ایسا ہونا چاہیے۔ ریاست کو ایسی معاشی پالیسی بنانی چاہیے کہ وسائل دولت کی تقسیم اس طرح ہو، اسباب رزق اس طرح منظم کیے جائیں کہ ہر شخص کی کم سے کم ناگزیر ضروریات کی تکمیل یقینی ہو جائے۔

دوسرا ہدف جو فوری عمل درآمد کے لیے ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے میں وہ توازن قائم ہو جائے جس کے نتیجے میں کم از کم یہ حد کفاف انسانوں کو حاصل ہوتی رہے۔ توازن سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ معاشرے میں دولت مند ہیں، جن کے پاس وسائل زیادہ ہیں، جن کے پاس صلاحیتیں زیادہ ہیں، ان کی صلاحیتوں کا استعمال اس طرح ہو کہ اس سے پورے معاشرے کو فائدہ ہو۔ جن کے پاس ضرورت سے زائد دولت موجود ہے ان کے اندر یہ رجحان پیدا کیا جائے کہ وہ عامۃ الناس کی ضروریات کو نظر انداز نہ کریں۔

توازن کی جتنی صورتیں معیشت اور مادیات سے متعلق ہیں، ان کو قائم کرنا اور عدم توازن کو جنم لینے سے روکنا۔ یہ معاشرے کی ذمہ داری بھی ہے اور ریاست کی ذمہ داری بھی ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاشرے سے استحصال کی تمام قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ استحصال سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی قوت، دولت، وسائل، اختیارات اور اثر رسوخ سے ناجائز کام لے کر وہ فوائد حاصل کرنا چاہیں جو اخلاقی یا قانونی طور پر ان کو حاصل نہیں کرنے چاہئیں اور دوسرے لوگوں کو ان ضروریات سے محروم کر دیں جو ان کی جائز اور بنیادی ضروریات ہیں۔ یہ رویہ استحصال کہلاتا ہے۔

استحصال کی بیسیوں قسمیں ہو سکتی ہیں، جن کا شریعت نے عمومی احکام اور کلیات کے ذریعے راستہ روکا ہے۔ مثلاً احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی استحصال کی ایک قسم ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ غبن فاحش یعنی غیر ضروری منافع خوری، حد سے زیادہ منافع خوری شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔ خرید و فروخت میں، لین دین میں دھوکہ دہی، ملاوٹ، یہ استحصال کی ایک قسم ہے۔ سود استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

ان تمام راستوں کو شریعت نے ایک ایک کر کے روکا ہے اور مقصد یہ ہے کہ ارتکاز

دولت کے راستے بند کیے جائیں اور جہاں ارتکاز دولت ہو گیا ہے اس کو جلد سے جلد کم کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ اسلامی معاشیات کے وہ فوری اہداف ہیں جو ریاست کو انجام دینے چاہئیں۔ ان کے نتیجے میں اقتصادی ترقی کا رخ مثبت سمت میں آپ سے آپ مڑ جائے گا، اقتصادی ترقی کا انداز تعمیری انداز ہو گا، سرمایہ کاری میں اضافہ ہو گا، انسانوں کی ضروریات بہتر انداز میں پوری ہوں گی۔ جب انسان کے مادی اور جسمانی معاملات اور اقتصادی تقاضے بہتر انداز میں پورے ہوں گے تو اس کے روحانی یا نفسیاتی تقاضے بھی بہتر انداز میں پورے ہوں گے۔ ہر شخص کو کفاف یعنی معیشت کی کم سے کم حد حاصل ہو گی۔ تقسیم دولت میں عدل وانصاف کے نتائج ومظاہر سامنے آئیں گے۔ معاشرے میں جو تفاوت ہے امیر اور غریب کے درمیان، نادار اور دولت مند کے درمیان، وہ تفاوت کم سے کم ہو گا۔ یہ وہ نتائج اور برکات وثمرات ہیں جو شریعت کے نظام تقسیم دولت اور نظام معیشت وتجارت کے ذریعے سامنے آنے چاہئیں۔

اسلامی شریعت نے جگہ جگہ تعمیر وترقی کی ہدایت کی ہے۔ زمین کو آباد کرنے کا، تعمیر اراضی کا حکم دیا ہے، تعمیر اراضی کی ہدایت دی ہے۔ شریعت نے ترقی کا جو تصور دیا ہے، اس کے مراد صرف مادی ترقی نہیں ہے۔ اس سے مراد مادی، اخلاقی، ذہنی، روحانی، تہذیبی ہر طرح کی ترقی ہے۔ ترقی محض کسی ایک پہلو کی نہیں ہوتی۔ ترقی کی مثال انسانی جسم کی سی ہے، اگر ننھا بچہ جس کی عمر پانچ چھ سال ہے، اس کی نشوونما کو ترقی سے تشبیہ دی جائے تو اس کی نشوونما یا ترقی یہ ہے کہ اس کا جسم، اس کے اخلاق، اس کا ذہن، اس کی نفسیات، اس کے اعضاء اور اس کی صلاحیتیں سب بیک وقت ترقی کریں۔ یہ سب چیزیں تناسب، تکامل اور اعتدال کے ساتھ ترقی کریں۔ اگر اس کا جسم بڑھ جائے، یا بعض اعضاء بے ہنگم طریقے سے بڑھ جائیں، ذہن وہیں کا وہیں رہ جائے تو وہ ترقی نہیں ہے، بیماری ہے۔ اگر جسم کا کوئی ایک حصہ بہت بڑھ جائے، جسم کے بقیہ حصے نہ بڑھیں یا کم بڑھیں تو یہ نشوونما نہیں ہے، بیماری ہے۔

اسی طرح انسانی معاشرے کی ترقی زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترقی سے عبارت ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ انسان کا جسم بھی ترقی کرے، اس کو مکمل نشوونما حاصل ہو۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طاقت ور مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے۔ وہ صاحب ایمان جو

جسمانی طور پر طاقتور ہے وہ زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس صاحب ایمان کے جو جسمانی اعتبار سے کمزور ہے۔ بلاشبہ دونوں میں خیر اور بہتری پائی جاتی ہے۔ مگر زیادہ خیر اور بہتری یہ ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بھی طاقتور رہو۔ قرآن مجید میں قیادت کے لیے جو صفات بتائی گئی ہیں ''بسطۃ فی العلم والجسم''، کہ جو قائدین ہیں وہ عقل اور فہم اور ذہن میں مکمل نشوونما پا چکے ہوں اور جسم میں بھی ترقی یافتہ ہوں۔ اسی طرح معاشرے کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہاں مادی ترقی بھی ہو رہی ہو، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بھی معاشرہ ترقی کر رہا ہو، تعلیمی اعتبار سے بھی ترقی کر رہا ہو۔ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بھی وہاں ترقی ہو رہی ہو۔ جب یہ سب پہلو ترقی کے مراحل سے گزریں گے، اس کو اسلامی تصور کی رو سے حقیقی ترقی قرار دیا جائے گا۔

فقہائے اسلام کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو ضروریات خمسہ ہیں، یعنی انسان کا دین، اس کی جان، اس کی عقل، اس کی نسل اور اس کا مال، یہ سب محفوظ ہوں اور یہ سب ترقی کریں۔ ان ضروریات کی حد تک تو یہ سب کے لیے محفوظ ہونی چاہئیں۔ اگر معاشرے کے ہر فرد کے لیے یہ چیزیں مکمل طور پر محفوظ ہیں اور ان کا تحفظ سب کو حاصل ہے تو ترقی کا ایک درجہ حاصل ہو گیا۔ دوسرا درجہ ترقی کا یہ ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد حاجیات کی تکمیل سب کے لیے ہو۔ معاشرے کے تمام انسانوں کے لیے یا معاشرے کی غالب ترین آبادی کے لیے حاجیات کی مکمل تکمیل کا بندوبست ہو گیا ہو۔ یہ ترقی کا دوسرا درجہ ہے۔ اس کے بعد جہاں تک تحسینیات کا تعلق ہے تو وہ بقدر وسائل معاشرے میں حاصل ہونے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ زیادہ وسائل عطا فرمائے تو تحسینیات کا درجہ بہتر ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے وسائل کسی معاشرے کو کم عطا فرمائے ہیں تو وہاں تحسینیات کی سطح کم ہو گی۔

اس پورے کام کے لیے عدل اجتماعی کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔ ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی، حاجیات کی تکمیل کے لیے بھی اور تحسینیات کی تکمیل کے لیے بھی۔

ترقی کا اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ وقتی نہ ہو بلکہ دیرپا ہو۔ وہ خیر بھی ہو اور باقی بھی ہو، جس کو آج کل sustainable development کہتے ہیں۔ یہ تصور سب سے پہلے سیدنا عمر فاروقؓ نے اختیار فرمایا تھا۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے جو پالیسیاں اختیار فرمائیں وہ یہ تھیں کہ ترقی کا عمل اور معاشی خوشحالی صرف آج کے لیے نہ ہو۔ بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہو۔ معاشی خوشحالی صرف انھی

لوگوں کی پیش نظر نہ ہو جو آج موجود ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی معاشی خوشحالی بھی پیش نظر ہو جو کل آنے والے ہیں یا جو پرسوں آنے والے ہیں۔ چنانچہ جب عراق فتح ہوا اور سواد کی زرعی زمین جو عراق کی انتہائی زرخیز سرزمین کہلاتی تھی مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔ وہاں کی زمینوں کے بندوبست کا معاملہ آیا تو سیدنا عمر فاروقؓ کا خیال تھا کہ یہ زمینیں بیت المال کی ملکیت قرار دی جائیں اور بیت المال کی طرف سے انہی لوگوں کو دوبارہ کاشت کرنے کے لیے دے دی جائیں جو پہلے سے وہاں کاشت کر رہے تھے۔ بیت المال ان سے ایک ایسے بندوبست پر اتفاق کر لے جس کے نتیجے میں پیداوار کا ایک حصہ ان کو بدستور ملتا رہے اور دوسرا حصہ بیت المال کے لیے حاصل کر لیا جائے تا کہ بیت المال سے عامۃ الناس کی ضروریات اور معاشی تقاضے پورے کیے جاسکیں۔ بعض صحابہ کرام کا شدت سے یہ اصرار تھا کہ جیسے بقیہ مفتوحہ زمینیں ماضی میں تقسیم ہوتی رہی ہیں یہ زمینیں بھی تقسیم کی جائیں۔ وہ اس کو مفتوحہ علاقہ قرار دے رہے تھے۔ یقیناً یہ ایک مفتوحہ علاقہ تھا۔ اس علاقے کی زمین مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔

صحابہ کرام کے مابین جو طویل بحث ومباحثہ ملکیت زمین کے بارے میں ہوا اس کا ایک بڑا محرک اور سبب اسلام کی یہ تعلیم بھی تھی کہ وسائل استثمار اور ذرائع پیداوار کو معطل اور بیکار رکھنا ناپسندیدہ ہے۔ وسائل پیداوار میں زمین ہو یا خود نقد رقم اور زر ہو یا آج کل سامنے آنے والے اور بہت سے اسباب اور وسائل ہوں، ان سب کے بارے میں شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو استعمال میں رکھا جائے۔ اللہ کی دی ہوئی دولت اور سرمائے کو معطل نہ رکھا جائے۔ اسی لیے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ اسی اکتناز یعنی دولت کو سینت سینت کر رکھنے کی ممانعت ہے۔

ان ممانعتوں کے علاوہ احادیث میں براہ راست بھی اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ مال و دولت اور ذرائع پیداوار کو معطل نہ رکھا جائے۔ چنانچہ ایک حدیث میں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں روایت کی گئی ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو یا تو خود اس کو کاشت کرے، اگر خود کاشت نہیں کر سکتا تو اپنے بھائی کو دے دے۔ اور اگر اس کے لیے بھی تیار نہ ہو تو پھر وہ زمین جس کی ہے۔ اگر بیت المال کی ہے تو بیت المال اس سے واپس لے لے یا جس کی ہے اس کو واپس کر دی جائے۔ اس لیے کہ زمین کو معطل رکھنا پیداوار میں بالآخر کمی کا ذریعہ بنے گا۔ وسائل کو معطل رکھنے کا سبب بنے گا۔ اور جتنے وسائل اللہ نے دیے ہیں ان کو

ضرورت سے کم استعمال کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت وحکمت کے خلاف ہے۔

یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر کسی یتیم یا کسی اور شخص کا مال کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہو تو اگر ممکن ہو تو اس کو بھی کسی مناسب کاروبار میں لگا دینا چاہیے ایسے کاروبار میں جہاں خطرات کم ہوں اور نقصان کے امکانات کم ہوں۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو جب تک اس شخص کو ضرورت پڑے گی۔ مثلاً اگر بچہ ہے تو جب وہ بالغ ہوگا اور اس کے پیسے واپس کیے جائیں گے تو اس کی مالیت بھی کم ہو چکی ہوگی۔ اس میں صدقات اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی وجہ سے کمی بھی ہوگئی ہوگی۔ اس لیے ان تمام چیزوں سے بچنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ اس کو کسی تجارت اور کاروبار میں لگایا جائے۔

شریعت کے احکام کے یہ وہ بنیادی قواعد اور اصول ہیں جن کی بنیاد پر جدید علمائے اسلام نے اسلامی معاشیات کے علم کو ایک نئے انداز سے مرتب کیا ہے۔ اسلامی معیشت ایک اعتبار سے ایک نیا علم ہے۔ اس لیے کہ اس کی ترتیب نو ہوئی ہے۔ نئے انداز سے اس کو دورِ جدید کے علمائے کرام نے مرتب کیا ہے۔ جدید معاشی تصورات کو سامنے رکھ کر اس کے ابواب ترتیب دیے ہیں۔ نئے مسائل سامنے رکھ کر شریعت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان تمام مباحث کو اس ترتیب اور تقسیم مباحث کے ساتھ مرتب کیا ہے جو فقہائے کرام کی قدیم ترتیب اور روایتی تقسیم مباحث سے مختلف ہے۔ اس لیے اس کو ایک نیا علم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا نیا علم جو ابھی وجود میں آیا ہے۔ جس کو ابھی تدوین اور تحقیق کے بہت سے مراحل سے گزرنا ہے۔ جس کے مختلف ابواب اور شعبوں کو ابھی مرتب اور مدون کیا جانا باقی ہے۔

لیکن ایک دوسرے اعتبار سے یہ ایک قدیم علم ہے۔ یہ علم اتنا ہی قدیم ہے جتنا اسلام قدیم ہے۔ اس لیے کہ اس علم کے جو قواعد ہیں، جو بنیادی ضوابط واصول ہیں وہ وہی ہیں جو شریعت میں بیان ہوئے ہیں، جو قرآن کریم یا سنت میں آئے ہیں۔ اس لیے ایک اعتبار سے یہ شرعی قواعد واحکام کا مجموعہ ہے، اس لیے قدیم ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے یہ بعض نئے مباحث اور تحقیقات اور وضعی معلومات کا یعنی ان مباحث کا مجموعہ بھی ہے جو انسانوں کی فہم، بصیرت اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔

اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی اساس اور بنیاد تو

ایک ہی ہے۔ وہ سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے کا معاشی نظام ہو، یا آج اکیسویں صدی میں کسی مسلم ملک میں مرتب کیا جانے والا معاشی نظام ہو۔ ایک اعتبار وہ ایک ہی معاشی نظام ہے کہ قرآن کریم اور سنت میں اس کی اساس ہے۔ صحابہ کرام کے اجتہادات پر مبنی ہے۔ ائمہ مجتہدین کے متفق علیہ فیصلوں پر اس کی اساس ہے۔ اور بحیثیت مجموعی علمائے کرام اور فقہاء کے اجتہادات سے وہ رہنمائی لیتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام کے مختلف علاقوں یا مختلف زمانوں میں مختلف سانچے، نمونے اور ماڈل ممکن نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خود آج بھی، اکیسویں صدی میں بھی، اسلام کے معاشی نظام کے ایک سے زائد سانچے، نمونے اور ماڈل مرتب کیے جا سکتے ہیں اس لیے کہ مختلف ممالک کی معاشی ضروریات مختلف ہوسکتی ہیں۔ مختلف ممالک کے معاشی وسائل متفاوت ہو سکتے ہیں۔ مختلف علاقے کے لوگوں کی ضروریات مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس لیے شریعت کے طے شدہ قواعد اور اساسات کے اندر رہتے ہوئے اجتہادی آراء میں تنوع کی گنجائش ہے۔ مقامی وسائل کو مقامی ضروریات کے تحت استعمال کرنے کی پوری گنجائش ہے۔

مقاصد شریعت کا تقاضا اگر سعودی عرب اور کویت میں کچھ ہے تو بنگلہ دیش اور سوڈان میں کچھ اور ہوگا۔ پاکستان اور ازبکستان میں کچھ اور ہوگا۔ اسی طرح سے مختلف ملکوں کے مقامی وسائل اور وقتی مصلحتوں کے سامنے رکھ کر تفصیلات میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ وقتی ضروریات ہر ملک کی مختلف ہوسکتی ہیں، جیسے افراد کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ شریعت افراد سے یہ نہیں کہتی کہ تمام افراد اپنی زندگیوں میں مکمل یکسانیت پیدا کر لیں۔ جہاں یکسانیت مطلوب ہے وہ شریعت کے بنیادی احکام اور اسلامی ثقافت کے بڑے مظاہر ہیں۔ لیکن ان احکام کے اندر اور ثقافتی مظاہر کی حدود کے اندر افراد کو کھلی آزادی ہے کہ وہ اخلاق اور حیاء کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو روبیہ اختیار کرنا چاہیں وہ اختیار کر سکتے ہیں۔

یہی کیفیت کسی معاشرے یا کسی ملک کے معاشی نظام کی ہوسکتی ہے۔ معاشی نظام کی تفصیلات حالات اور زمانے کے لحاظ سے، وقتی مصلحتوں اور مقامی وسائل کے لحاظ سے، تبدیل ہوسکتی ہیں۔ اس تبدیلی کے باوجود اسلامی معاشیات کے جو اہم عناصر ہیں وہ کم وبیش ایک ہی رہیں گے۔

آج جس اسلامی معاشیات کی تدوین نو کا عمل جاری ہے اور خاصی حد تک اس کے اساسات منقح ہو گئے ہیں۔اس کے کلیات مرتب ہو چکے ہیں،اس کے عمومی مباحث اور نتائج پر اہل علم کا اتفاق پیدا ہو رہا ہے۔اس علم کے بنیادی عناصر چار ہیں یا چار ہونے چاہئیں۔ظاہر ہے کہ سب سے پہلا عنصر تو فقہ اور شریعت کے احکام وقواعد ہیں۔وہ احکام وقواعد جن کا مآخذ قرآن کریم اور سنت رسول اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ فقہ کی بنیادی کتابیں، ائمہ کرام کے اجتہادات، حدیث نبوی کی شرحیں، بڑے بڑے مفسرین کی تفسیریں ہیں۔ان تمام مصادر میں تجارت، معیشت اور اقتصاد سے متعلق جتنے بھی مباحث ہیں وہ اسلامی معاشیات کی بنیادی اساس اور زمین ہیں۔یہ وہ بیج ہے جس سے اسلامی معاشیات کا گلستان پیدا ہوگا اور ہو رہا ہے۔

دوسرا عنصر دور جدید کے فقہاء کے وہ اجتہادات ہیں جو آج کے معاشی مسائل اور مشکلات کے بارے میں سامنے آئے ہیں۔مثلاً یہ اتفاق رائے کہ بنک انٹرسٹ ربا ہے۔مثلاً بیمہ کی کون سی صورتیں جائز ہیں،کون سی صورتیں ناجائز ہیں۔مثال کے طور پر زر اعتباری کے احکام ہیں۔مثال کے طور پر شخصیت قانونی کے معاملات ہیں۔محدود ذمہ داری کے تصورات ہیں۔یہ وہ نئے مسائل ہیں جو بیسویں صدی میں سامنے آئے اور بیسویں صدی کے اہل علم اور علمائے فقہ نے اپنے اجتہادات سے ان مسائل کا حل تجویز کیا۔

جیسا کہ فقہ اسلامی کی تاریخ میں ہر مسئلے میں ہوا ہے، ہر بڑے اجتہادی مسئلے میں ایسا ہی ہوا ہے، کہ جب مسئلہ سامنے آیا اور اہل علم اور مجتہدین نے اس پر غور کیا تو بہت کم ایسا ہوا کہ آغاز ہی سے سب نے ایک ہی رائے اختیار کی ہو۔ایسا کم ہوا ہے۔عموماً اجتہادی نوعیت کے معاملات میں جن میں حلال وحرام کے احکام بہت واضح نہ ہوں۔ہمیشہ ایک سے زائد آراء سامنے آئی ہیں۔اس کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ آراء پر بحث ومباحثہ کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ہر رائے رکھنے والے اہل علم نے دلائل سے اپنی آراء کی تائید کی اور دوسروں کی آراء کی کمزوری واضح کی۔بالآخر بہت سی صورتوں میں ایسا ہوا کہ کسی ایک قوی تر اور صحیح تر رائے پر اتفاق ہو گیا اور بقیہ علمائے اسلام نے اس رائے سے اتفاق کر لیا۔یہ وہ عمل ہے جس میں وقت بھی لگتا ہے اور بحث ومباحثہ بھی ہوتا ہے۔وقت اور بحث کے دورانیے کا دارومدار مسئلے کی اہمیت پر ہے۔بعض مسائل اتنے اہم تھے کہ ان پر طویل عرصہ بحث جاری رہی۔اس طویل بحث کے بعد اتفاق رائے ہوا۔

بعض مسائل جو اتنے اہم نہیں تھے۔ ان پر جلد اتفاق رائے ہو گیا۔ لیکن ایسے مسائل بھی تھے جن پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور ایک سے زائد نقطہ نظر ہی آخر تک قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں۔ یہی کیفیت جدید معاشی مسائل کے بارے میں رہی ہے کہ کچھ معاملات کے بارے میں بحث وتمحیص کا عمل جاری رہا۔ دلائل اور جوابی دلائل کا سلسلہ مسلسل قائم رہا اور بالآخر یا تو تمام علمائے کرام نے یا ان کی غالب ترین اکثریت نے ایک رائے سے اتفاق کر لیا۔ جیسے مثلاً تجارتی بیمے کا ناجائز ہونا، یا بنک انٹرسٹ کا ربا ہونا۔ بہر حال یہ وہ مباحث ہیں جو جدید اسلامی معاشیات کا دوسرا اہم عنصر ہیں۔

تیسرا بڑا اہم عنصر جس میں برصغیر کے اہل علم نے بنیادی حصہ لیا ہے۔ وہ مغرب کے معاشی افکار کا ناقدانہ مطالعہ ہے۔ مغربی معاشی افکار میں جو پہلو شریعت کے احکام وقواعد سے متعارض ہیں مثلاً تجارتی بیمہ ہے، مثلاً سود ہے، غرر ہے، قمار ہے، یہ صراحتاً شریعت سے متعارض پہلو ہیں۔ ان کا شریعت سے متعارض ہونا تو دنیا بھر کے اہل علم نے واضح کر دیا ہے اور اتنی تفصیل سے دلائل دے کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اب اس میں کسی اختلاف یا شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی ہے۔

لیکن ایسے دلائل جو فقہی مصادر اور شریعت کے مآخذ کی بنیاد پر دیے گئے ہوں ایک صاحب ایمان اور صاحب دین کو تو قائل کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے شخص کو قائل نہیں کر سکتے جو مصادر شریعت سے واقف نہ ہو یا جن پر اس کا ایمان کمزور ہو۔ ایسے حضرات کو مطمئن کرنے کے لیے اور اسلام کے موقف کی معنویت اور حکمت کو واضح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان مغربی افکار پر خالص عقلی اور فنی انداز میں تنقید کر کے ان کا کمزور ہونا واضح کیا جائے۔ مغربی افکار و تصوّرات پر علمی تنقید کا یہ کام برصغیر میں سب سے پہلے شروع ہوا۔ برصغیر ہی میں اس کا احساس بھی سب سے زیادہ کیا گیا اور یہاں کے اہل علم ہی نے سب سے زیادہ اس موضوع پر خالص علمی اور فکری انداز میں کام کیا۔ علامہ اقبال کے زمانے سے مغرب کے معاشی افکار پر علمی تنقید سلسلہ شروع ہوا، خود علامہ اقبال کی تحریروں اور ان کے مختلف مضامین میں اس طرف واضح اشارات موجود ہیں، ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ مغرب کے معاشی نظاموں میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور کون کون سے پہلو ہیں جو اسلام کے نقطہ نظر سے تنقید کے مستحق ہیں۔ علامہ اقبال کے بعد متعدد اہل علم

نے مغرب کے معاشی تصورات کا ناقدانہ مطالعہ کیا جن میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، پروفیسر شیخ محمود احمد اور عصر حاضر کے نامور ماہر معیشت ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا شامل ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں نے معاشی فکر کو ایک نئی جہت دی ہے اور آئندہ آنے والے مسلم معاشرہ کے ماہرین میں، یا مسلم ماہرین معیشت و تجارت میں ایک خوداعتمادی پیدا کی ہے۔ اسلام اور اسلامی معاشیات کے مستقبل پر ان کا اعتماد پختہ ہوا ہے۔ اور مغرب کی معاشی فکر کی کمزوریوں کا احساس بھی وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ جدید اسلامی علم معیشت کا تیسرا بڑا عنصر ہے۔

اسلامی معاشیات کا چوتھا بڑا عنصر آج کی دنیائے اسلام کی معاشی ضروریات اور مسائل کا حل ہے۔ آج دنیائے اسلام ایسے مسائل کا شکار ہے جو انتہائی پیچیدہ رخ اختیار کر چکے ہیں۔ معاشی مسائل اور سیاسی مشکلات، ان دونوں کا ایک دوسرے سے باہمی تعلق ہمیشہ سے رہا ہے۔ سیاسی مشکلات کے نتیجے میں معاشی مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں، معاشی کمزوری اور پسماندگی کی وجہ سے سیاسی کمزوری اور سیاسی افراتفری ماضی میں بارہا پیدا ہوئی ہے۔ آج ان دونوں اسباب کے ساتھ اور بہت سے اسباب بھی مل گئے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے معاشی مسائل و معاملات کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ جہاں مسلمان ماہرین معیشت کی ذمہ داری خالص نظری ہے، خالص فکری اور فنی ہے، وہاں ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ دنیائے اسلام کو درپیش معاشی مسائل کا ماہرانہ اور ناقدانہ مطالعہ کر کے ان کا حل تجویز کریں۔

ابھی تک تو یہ ہوتا رہا ہے کہ وہ عام نسخہ جو مغربی ماہرین ترقی پذیر یا پس ماندہ ممالک کے لیے تجویز کرتے آئے ہیں، جو ترقیاتی معیشت کے تصورات یا Development Economy کے اصول اور ضابطے مغربی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں ان کو جوں کا توں دنیائے اسلام میں آزمایا جا رہا تھا۔ اس کے نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ان نسخوں کے آزمانے سے جو نتائج نکلے ہیں ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ محض جزوی قرار دی جا سکتی ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی مثال سامنے نہیں آئی کہ اس Development Economics کے قواعد اور تصورات کو سامنے رکھ کر کسی مسلم ملک نے اپنی پالیسیاں بنائی ہوں اور مکمل طور معاشی خود کفالت اور ترقی کی منزل حاصل کر لی ہو۔

یہ تصورات معیشت یعنی Deveopment Economy کے اصول کن

ممالک کی معیشت کو سامنے رکھ کر مرتب کیے گئے؟ کیا دنیائے اسلام کے حقیقی مسائل کو سامنے رکھ کر ان کا حل تجویز کیا گیا؟ یا ان تصورات کی ترتیب میں وہی مغربی فکر کارفرما ہے جس نے مسلمانوں کے مسائل دراصل پیدا زیادہ کیے ہیں، حل کم کیے ہیں؟ آج کے مسلم ماہرین معیشت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم ممالک کے خصوصی پس منظر، مسلمانوں کے خصوصی مزاج، انداز فکر اور طرز حیات کو سامنے رکھ کر ان کا حل تجویز کریں جو شریعت کے مکمل طور پر مطابق ہو اور آج کے معاشی تقاضے بھی اس سے پورے ہو سکتے ہوں۔ اگر ایسا ہو اور ایسا ہونا چاہیے اور انشاء اللہ یقیناً ہوگا تو پھر Development Economy یعنی ترقیاتی معیشت کا ایک اسلامی تصور سامنے آئے گا اور ہم دنیا کو ایک ایسا نیا شعبہ علم دے سکیں گے جو نئے تصورات، نئے تجربے پر مبنی ہوگا۔ اسلامی تصورات سے مکمل طور پر ہم آہنگ بھی ہوگا اور اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مکمل ادراک پر بھی مبنی ہوگا۔

بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ آج جس چیز کو اسلامی معاشیات کہا جا رہا ہے یہ محض مغرب کی نقالی پر مبنی ہے۔ ان حضرات کے خیال میں اسلام میں نہ معیشت کا کوئی تصور ہے، نہ فن معاشیات کے نام سے کوئی فن مسلمانوں میں موجود تھا۔ یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ مسلم ماہرین معیشت کی تحریریں جن اصطلاحات میں بیان ہوئی ہیں وہ اصطلاحات آج مانوس نہیں ہیں اور جن اصطلاحات سے آج کا قاری مانوس ہے وہ اصطلاحات مسلم فقہاء اور مفکرین کے یہاں استعمال نہیں ہوئیں۔ مسلم مفکرین میں جن حضرات نے معیشت کے مضامین اور مباحث سے بحث کی ہے ان کے خیالات پر تفصیلی گفتگو اور مناقشہ ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے۔

لیکن اتنی بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مسلم ماہرین معیشت میں جہاں ایک طرف امام ابو یوسف اور امام ابو عبید قاسم بن سلام جیسے جید فقہاء اور محدثین کے نام ہیں وہاں برصغیر کے مشہور مفکر اسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام بھی شامل ہے۔ شاہ صاحب نے اس فن کو فن آداب معاش کا نام دیا ہے۔ یعنی معیشت کے آداب کو معلوم کرنے کا فن۔ اس کو شاہ صاحب نے حکمت کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یعنی وہ حکمت جو انسانی معاشرتی ترقی کے مختلف مراحل میں انسانوں کی معاشی اور اقتصادی ضروریات اور ان کی تکمیل کے طریقوں سے بحث کرے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اسلامی معاشیات صرف مغربی معاشیات کا چربہ ہے یا اس کا عمومی فکری فریم

ورک وہی ہے جو مغربی معاشیات کا ہے یا اس کے بنیادی تصورات اور عملی تفصیلات وہی ہیں جو مغرب کے اہل علم نے مرتب کی ہیں۔

ایسا سمجھنا درست نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ اس گفتگو سے اندازہ ہو گیا ہوگا، یہ مضمون مسلمان علماء کی دلچسپی کا مضمون ہمیشہ سے رہا ہے۔ اور دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک کے فقہائے اسلام اس پر تفصیل سے گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر جن حضرات کو یہ جدید علم اسلامی معاشیات محض مغربی معاشی افکار کا چربہ معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے جدید مصنفین نے ان مضامین کو بیان کرنے کے لیے مغربی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ انھوں نے مغربی اصطلاحات استعمال کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ معاشرے کے جس طبقے کو وہ خطاب کر رہے تھے وہ طبقہ مغربی تصورات اور مغربی اصطلاحات ہی سے واقف ہے۔ وہ طبقہ اسلامی اصطلاحات سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے اگر یہ حضرات مغربی اصطلاحات استعمال نہ کرتے، قدیم اسلامی عربی اصطلاحات ہی میں بات کرتے تو پھر ابلاغ اور تفہیم کا وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جو ان حضرات کے پیش نظر تھا۔

اگر اساسی قواعد وضوابط جو شریعت میں محفوظ ہیں، قرآن وسنت میں منصوص ہیں، وہ واضح طور پر سامنے ہوں، قرآن کریم اور سنت رسول نے جو معاشی مقاصد بتائے ہیں وہ سامنے رہیں۔ اسلامی اقتصادیات کا فلسفہ متعین ہو اور وہ سارا علمی کام پیش نظر رہے جو اب تک ہوا ہے تو پھر یہ شبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جدید اسلامی علم معاشیات محض مغربی معاشیات کا چربہ ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور ہوا ہے کہ ماضی قریب کے بعض اہل علم جو دراصل اسلامی علوم کے متخصص نہیں تھے، جب انھوں نے اپنے دینی جذبے اور اسلامی حمیت سے کام لے کر اسلامی معیشت پر لکھنا چاہا تو اپنے مختلف اسباب یا فکری پس منظر کی وجہ سے انھوں نے یا مغربی معیشت کی اصطلاحات اور مثالیں استعمال کیں یا مشرقی معیشت کی۔ پڑھنے والوں نے ان اصطلاحات کی وجہ سے ان کاوشوں کو یا مشرق کا چربہ قرار دیا یا مغرب کا۔ حالانکہ اس پورے کے پورے کام کو چربہ کہنا یا مغرب یا مشرق کے تصورات کی نقل قرار دینا زیادتی ہے۔

گزشتہ تقریباً سو سال کے دوران اسلامی احکام کی حکمتوں پر بھی غور ہوا ہے اور ان تمام مسائل کو نئے انداز سے مرتب کرنے کی کاوش بھی کی گئی ہے جو فقہائے اسلام کی کتابوں میں ملتے

ہیں۔اس کے نتیجے میں ایک وسیع لٹریچر وجود میں آ چکا ہے۔تاہم یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مغربی اقتصادیات کے مقابلے میں اسلامی اقتصادیات کا کام ابھی بہت پیچھے ہے۔وہاں فلسفہ اور نظریات پر بھی بہت تفصیل سے کام ہوا ہے۔مغربی معیشت اور علم الاقتصاد کے پیچھے تصورات اور فلسفہ کیا ہے،اس پر کئی سو سال سے وہاں لکھا جا رہا ہے۔معیشت اور اقتصادیات کا دستور العمل کیا ہونا چاہیے،اس پر ہزاروں انسانوں نے اپنی زندگیاں لگائی ہیں۔مختلف علاقوں اور مختلف ممالک کے تجربات کا الگ الگ مطالعہ کیا گیا ہے۔ Case Studies تیار ہوئی ہیں empirical data وہاں ہر تجربے کا دستیاب ہے۔تفصیلی قواعد وضوابط اور عملی دستاویزات اتنی تفصیل کے ساتھ موجود ہیں کہ اس نظام پر عمل درآمد کرنے والے کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

اس سب کے مقابلے میں اسلامی معیشت ابھی بہت پیچھے معلوم ہوتی ہے۔ابھی تک تو ہمارے یہاں اسلامی معیشت اور اقتصادیات کے فلسفہ اور نظریات پر بھی اتنا تفصیلی کام نہیں ہوا جتنا مغربی معیشت پر ہوا ہے۔کمیونزم اور سوشلزم کی معیشت کی عمر زیادہ طویل نہیں ہوئی تھی۔یہ تمام تصورات بہت جلد روبہ زوال ہو گئے۔لیکن ان کے فلسفہ اور نظریات پر بھی مشرق ومغرب میں اتنا کام ہوا تھا کہ انھوں نے پورے کتب خانے بھر دیے تھے اور ہزاروں صفحات پر مشتمل سینکڑوں کتابیں تیار کر دی تھیں۔اس کے مقابلہ میں ابھی اس کام کے سلسلے میں مسلمان اہل علم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کی مکمل تدوین اور مکمل نفاذ کا مرحلہ ایک طویل فرصت،کوشش اور محنت چاہتا ہے۔یہ مرحلہ مختلف مدارج اور مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اپنی مثالی اور مکمل شکل میں ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا۔اس پورے عمل کے دوران اجتہاد کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔نئے نئے مسائل اور مشکلات کا شریعت کی نصوص کی روشنی میں حل بھی تلاش کیا جاتا رہے گا۔ان سب امور کے ساتھ ساتھ خالص علمی اور تجربی انداز میں اس تجربے کا تجربی اور تجزیاتی مطالعہ بھی کیا جائے گا۔اس تجربے سے متعلق اعداد و شمار اور حقائق بھی جمع ہوں گے۔ان حقائق اور تجربات سے نئے نتائج سامنے آئیں گے۔ان نئے نتائج کی روشنی میں مزید عملی تفصیلات اور دستور العمل مرتب ہوں گے۔یوں یہ سلسلہ ایک طویل عرصے کے بعد جا کر مکمل ہوگا۔یہ مرحلہ اس وقت آئے گا جب اسلامی نظام معیشت اسی انداز میں اتنی ہی تفصیلات کے ساتھ،اتنی ہی جامعیت

کے ساتھ مرتب ہو جائے گا جتنی تفصیلات اور جامعیت کے ساتھ فقہ کے دوسرے ابواب مرتب ہوئے ہیں۔ یا جتنی جامعیت اور تفصیلات کے ساتھ مغربی نظام معیشت مرتب ہوا ہے۔

ابھی تک جو مرحلہ جاری تھا وہ ان بنیادی قواعد اور اساسات کی تدوین اور نشر و اشاعت کا تھا جن کی بنیاد پر اسلام میں معیشت کے احکام دیے گئے ہیں اور جن کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے فقہ المعاملات کے احکام مرتب فرمائے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات اب طے شدہ اصول کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا مالک اللّٰہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت ان تمام ملکیتوں میں جو انسان کے انتظام میں ہیں اور اس کے استعمال میں ہیں امین کی ہے۔ اس کی حیثیت اللّٰہ کے جانشین اور خلیفہ کی ہے۔ اس لیے انسان ان حدود اور قیود کے اندر رہنے کا پابند ہے جو اصل مالک یعنی ذات باری تعالیٰ نے واضح کر دی ہیں۔ انسان ان تمام وسائل کو انھی حدود کے اندر رہ کر استعمال کرے گا۔ پیداوار صرف جائز چیزوں کی ہوگی۔ پیداواری اہداف شریعت کی حدود کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ پیداواری منصوبوں کی رفتار کا تعلق قیمتوں کے مصنوعی اتار چڑھاؤ سے نہیں ہوگا۔ معروف معیار اور رائج الوقت شرائط اور اوصاف کی پابندی کی جائے گی۔

شریعت نے معروف کا جو اصول دیا ہے، جس کا قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر تذکرہ ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس علاقے اور جس دور میں جو رائج الوقت شرائط اور معیارات معلوم اور متعین ہوں جو اخلاق اور قانون کے مطابق ہوں، جو شریعت سے متعارض نہ ہوں، جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو مجروح نہ کریں ان کی حیثیت شرعاً معروف کی ہے اور ان پر عمل درآمد شریعت پر ہی عمل درآمد کے مترادف ہے۔ اسی طرح پیداوار کی فروخت میں، یعنی marketing اور تسویق میں ان تمام رجحانات سے بچا جائے گا جو ذخیرہ اندوزی پر منتج ہوتے ہوں یا جن کے نتیجے میں احتکار پیدا ہوتا ہو۔

قرآن کریم نے تقسیم دولت کے جو احکام دیے ہیں ان پر الحمد للہ اس دور میں بہت تفصیل کے ساتھ بحث ہوئی ہے۔ اسلام کا نظام تقسیم دولت کیا ہے۔ اس پر جید ترین اہل علم نے اپنی اپنی تحقیقات اور مطالعہ کے نتائج پیش کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلام کا تقسیم دولت کا نظام بہت واضح طور پر مرتب ہو گیا ہے۔ اس کی حدود اور اہم مضامین کا تعین ہو گیا ہے۔ اب مزید تفصیلات اور جزئیات پر غور و خوض جاری ہے۔

اسلام کے نظام تقسیم دولت کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ گئی ہے کہ مکمل یعنی میکانیکی انداز کی مساوات انسانوں کے درمیان غیر فطری ہے اور مکمل بے قابو اور بے تحاشا عدم مساوات بھی غیر فطری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان فرق رکھا ہے۔ انسانوں کی صلاحیتیں غیر متساوی ہیں۔ کارکردگیاں غیر متساوی ہیں۔ عادتیں اور دلچسپیاں مختلف ہیں۔ اس لیے پیداوار اور محنت کے نتائج کار بھی مختلف اور متفاوت ہوں گے۔ اس لیے پیداوار کی مکمل، متساوی اور جبری تقسیم بھی غیر فطری ہے۔ یہ بات قرآن کریم اور احادیث کی بے شمار نصوص سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ جن میں علم میں کمی بیشی کا تذکرہ ہے، جن میں رزق میں کمی بیشی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں عمل میں کمی بیشی کے اشارے موجود ہیں۔

یہ وہ تصورات تھے جو کمیونزم کے دور عروج میں بہت سے لوگوں کو متاثر کر رہے تھے۔ لیکن علمائے اسلام نے جب ان موضوعات کے بارے میں اسلام کے مؤقف کی وضاحت کی اور یہ بات واضح طور پر سامنے آ گئی تو بہت سے لوگوں کے دل سے وہ غلط فہمیاں نکل گئیں جو کمیونسٹوں کے پروپیگنڈے اور سوشلزم کے اثرات سے پیدا ہوئی تھیں۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عدم مساوات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانوں کے جو کم سے کم معاشی تقاضے ہیں وہ پورے نہ کیے جائیں۔ کم از کم معاشی تقاضے جس کے لیے کفاف کی اصطلاح فقہائے کرام نے استعمال کی ہے، وہ ہر دور کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ یہ تقاضے ہر علاقے کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور معاشی ترقی کے مختلف مدارج اور مراحل کے اعتبار سے بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نفقات واجبہ، یعنی وہ لازمی اخراجات جو انسان کو شرعاً ادا کرنے ہیں اور اس کے ذمے واجب الاداء ہیں، ان کے تعین میں بھی فقہائے اسلام نے اپنے اپنے زمانے اور حالات کا لحاظ رکھا ہے۔ مثال کے طور پر نفقات واجبہ میں کھانا پینا شامل ہے، لباس شامل ہے، رہائش اور مکان شامل ہے۔ یہ اخراجات ہر دور اور زمانے کے لحاظ سے طے کیے جائیں گے۔ جس علاقے میں جو اسلوب یا معیار رائج ہے، جس اسلوب اور معیار سے فریقین مانوس ہیں۔ اس معیار کے لحاظ سے نفقات کی نوعیت کا تعین ہوگا۔ مثال کے طور پر شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بیوی کا نفقہ برداشت کرے۔ نفقہ میں کھانا، پینا، لباس اور خوراک اور علاج، یہ بنیادی عنوانات ہیں۔ ان سب کی تفصیلات کا تعین ہر زمانہ کے طرز اور معیار کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔ بعض فقہائے کرام نے

نظافت کے نفقات کو بھی نفقات واجبہ میں شمار کیا ہے۔ یعنی ہر انسان کو جسمانی صفائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جسمانی صفائی کے لیے غسل ضروری ہے، غسل کے لیے پانی ضروری ہے۔ جسم کی صفائی کے لیے مختلف زمانوں میں مختلف وسائل رائج رہے ہیں۔ کہیں صرف صابن کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ کہیں خوشبو کی قسمیں بھی رائج ہیں اور ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ جسم کو صاف کرنے کے مختلف اسباب وسائل بھی ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ یہ وسائل علاقہ اور زمانہ کے تہذیبی اور معاشی معیار کے حساب سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر زمانے اور حالات کے لحاظ سے نظافت اور پاکیزگی کے اخراجات بھی نفقات واجبہ میں شامل ہیں۔ یہ وہ نفقات ہیں جن کا تعین فقہائے اسلام نے مختلف حالات کے لحاظ سے کیا ہے۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ اسلامی معیشت کی اساس اس بات پر ہے کہ اللہ کائنات کا اصل مالک ہے اور کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے، انسان اس کا جانشین اور امین ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا کہ مال فی نفسہ مقصود نہیں ہے۔ حصول مقصود کا ذریعہ ہے۔ حصول مال صرف جائز طریقے سے ہونا چاہیے۔ ناجائز طریقے سے حصول زر اور کسب مال شریعت کی رو سے ناپسندیدہ ہے۔ مال میں تصرف کا اختیار صرف جائز حدود کے اندر ہے۔ دولت کا حصول ایسے طریقے سے نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ارتکاز ایک متعین طبقے کے اندر ہو کر رہ جائے اور بقیہ طبقات اس سے محروم ہو جائیں یا ان کو ضرورت کے مطابق وسائل فراہم نہ ہوں۔ ذاتی ملکیت کا احترام شریعت کی حدود کے اندر رہ کر کیا جائے گا۔ ریاست کو ان حدود کی حفاظت کے لیے مداخلت کا اختیار ہے۔ ذاتی ملکیت کا احترام اور ذاتی ملکیت کی حدود کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ معاشرے میں محرمات سے اجتناب کیا جا رہا ہو اور اس کی فضا موجود ہو، اس بات کو یقینی بنانا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

قرآن کریم میں بیان کردہ معاشی احکام کا ایک انتہائی اہم اور بنیادی حکم یہ ہے کہ دولت کی گردش ایک خاص طبقے میں، دولت مندوں کے طبقے میں نہ رہے۔ بلکہ معاشرے کے ہر طبقے میں ہو۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے شریعت نے بہت سے احکام دیے ہیں۔ مثال کے طور پر انفاق کا ہر جگہ حکم دیا ہے۔ خرچ کرنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ مال و دولت کو روک کر رکھنا ناپسندیدہ ہے۔ قرآن کریم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شریعت نے انفاق کا جگہ جگہ حکم دیا ہے۔

ضروریات میں مکمل اور حاجیات حسب ضرورت انفاق ہوگا۔ کمالیات اور تحسینیات میں ریاست کے وسائل کا کم سے کم استعمال کیا جائے گا۔ جہاں تحسینیات میں ریاست کے وسائل صرف کرنے سے بچا جا سکتا ہو، اس کے بغیر کام چل سکتا ہو وہاں ترک افضل ہے۔

کمالیات سے مراد وہ اخراجات ہیں یا وہ تقاضے ہیں جن کو چھوڑ دینے میں کوئی مشقت یا تکلیف نہ ہو۔ مثال کے طور پر شریعت نے عمارتوں کو غیر ضروری طور پر سجانے اور ان کی خوبصورتی پر غیر معمولی توجہ دینے کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ دیواروں پر محض تزئین و آرائش کے لیے کپڑوں کے رنگ برنگ اور منقش پردے لٹکانے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے۔ قبروں کو چونا لگا کر پختہ کرنا اور آراستہ کرنا ناپسندیدہ ہے۔ یہ کمالیات کی وہ چند مثالیں ہیں جن پر وسائل خرچ کرنا شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں جب حاجیات عامۃ الناس کی ضرورت کے مطابق پوری نہ ہوئی ہوں۔ لوگوں کو ایسے مسائل اور مشکلات درپیش ہوں جس کے حل کے لیے ان کے پاس وسائل نہ ہوں، ایسی صورت میں لوگوں کی ان مشکلات کو نظر انداز کر کے کمالیات پر وسائل خرچ کرنا اسلامی نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں ضروریات یعنی بنیادی ضروریات مکمل طور پر پوری نہ ہو رہی ہوں۔ ان کو نظر انداز کر کے کچھ لوگوں کی حاجیات یا تحسینیات کے حصول پر وسائل صرف کیے جائیں، یہ بھی شرعاً اس ترتیب سے متعارض ہے جو ترتیب شریعت نے مقرر کی ہے۔

انفاق کی ان ہدایات کے ساتھ ساتھ، جس کا لازمی نتیجہ تقسیم دولت کی صورت میں نکلتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ ارتکاز دولت کو ختم کرنے کی صورت میں بالآخر برآمد ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ شریعت نے بعض صدقات واجبہ بھی مقرر فرمائے ہیں۔ زکوۃ سے ہم سب واقف ہیں۔ صدقہ فطر سے ہم سب واقف ہیں۔ قربانی سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کے علاوہ کفارہ، ہدی، نذر، ضمان ارش، یہ وہ احکام ہیں جن سے عام طور پر لوگ واقف یا مانوس نہیں ہیں۔ یہ سب صدقات واجبہ کی مختلف قسمیں ہیں جو مختلف حالات میں لوگوں پر واجب ہوتے ہیں۔ نتیجہ ان سب کا یہی ہے، ان کے علاوہ کوئی نہیں نکلتا کہ جس کے پاس غیر ضروری طور پر ضروریات سے زائد مال و دولت موجود ہے وہ زائد از ضرورت مال غرباء اور فقراء تک پہنچایا جائے۔ زکوۃ کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے، صدقہ فطر کا بھی یہی ہے، کفارہ، ھدی، نذر، ضمان، اروش، ان میں سے بہت

سے احکام کے نتیجے میں دولت کا پھیلاؤ بڑھتا ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ تعاون اور تکافل اسلامی معیشت کے بنیادی خصائص میں سے ہے۔شریعت کے احکام میں اس کے بہت سے مظاہر موجود ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک کا دوسرے سے ذاتی تعلق قائم ہو۔ برادری اور اخوت کے احساسات پیدا ہوں اور لوگ ایک دوسرے کے نفع نقصان کو اپنا نفع نقصان سمجھیں۔ مثال کے طور پر شریعت نے شریک کو حق شفعہ دیا ہے۔اس سے یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ ایک شریک کا دوسرے شریک پر وہ قریبی حق ہے جو عام انسان کا نہیں ہے۔ جب دونوں شریکوں کو اس کا احساس ہو کہ ان کے حقوق اور ذمہ داریاں خاص انداز کی ہیں تو ان میں قربت پیدا ہوگی ،تعاون اور تکافل کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جب یہ ایک شخص کے علم میں ہوگا کہ میرے قریبی رشتہ داروں میں اگر کوئی ضرورت مند یا محتاج ہے تو شریعت کے متعلقہ احکام کی رو سے بعض حالات میں میں اس کے نفقے کا پابند ہوں تو میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ میں اپنے غریب اور محتاج اور نادار اقرباء کا خیال رکھوں۔ جب ایک تجارتی یا کاروباری شریک کو یہ پتا ہوگا کہ خسارے کے عمل میں دونوں شریک ہیں، وہ بھی جس نے سرمایہ لگایا ہے، وہ بھی جس نے محنت لگائی ہے، اگر اس کا سرمایہ ضائع ہو رہا ہے تو میری محنت ضائع ہو رہی ہے۔ اگر میری محنت ضائع ہو رہی ہے تو اس کا سرمایہ ضائع ہو رہا ہے۔

یہ مثالیں جن میں بہت سا اضافہ کیا جا سکتا ہے اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شریعت کے تمام احکام میں بالعموم اور فقہ المعاملات میں بالخصوص تعاون اور تکافل کی روح موجود ہے اور اس کو برقرار رکھنے اور مزید ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی نظام معیشت کا ایک اہم میدان جس کا تعلق معاشی زندگی کے ساتھ ساتھ علم اور عدلیہ سے بھی رہا ہے۔جس کا تعلق معاشرتی انصاف سے بھی بہت گہرا ہے وہ اسلام کا ادارہ وقف ہے۔ یہ ایک ایسا منفرد ادارہ ہے جو روز اوّل سے اسلام کی تاریخ میں قائم رہا۔سب سے پہلا وقف خود سرکار دو عالم علیہ الصلاۃ والسلام نے قائم فرمایا۔آپ کے صحابہ میں سب سے پہلا وقف قائم کرنے کی توفیق اور شرف سیدنا عمر فاروقؓ کو حاصل ہوا۔یہ ادارہ دینی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی، تہذیبی، ثقافتی اور نیم عدالتی ادارہ رہا ہے۔ زندگی کے ان تمام پہلوؤں میں وقف کے

ادارہ نے مثبت اور نئے نئے اثرات پیدا کیے ہیں۔امام شافعی کا ارشاد ہے کہ وقف اسلام اور مسلمانوں کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ان کا کہنا ہے کہ میرے علم کی حد تک زمانہ جاہلیت میں کہیں بھی وقف کا نظام قائم نہیں تھا۔وقف کا نظام مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔

وقف سے مراد یہ ہے کہ کوئی جائداد اللہ کے راستے میں مخصوص کردی جائے،اس طرح کہ اس کی اصل تو موجود رہے اور اس سے آنے والی آمدنی یا فوائد کسی جائز مقصد کے لیے خاص کر دیے جائیں۔یہ جائز مقصد اسلامی تاریخ میں بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا۔طلبہ کے لیے اوقاف ہر مسلم ملک میں قائم کیے گئے۔عام لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے اوقاف،مسجدیں بنانے کے لیے اوقاف،بیواؤں اور یتیموں کی ضروریات کے لیے اوقاف،کمزور اور نادار ملازموں کو ان کے سخت گیر آقاؤں سے بچانے کے لیے اوقاف،غریب مریضوں کے علاج کے لیے اوقاف،جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے اوقاف،غرض خیر اور نیکی اور ہمدردی کے جتنے اعمال اور معاملات انسانوں کے ذہن میں آسکتے ہیں،ان سب کے لیے اسلامی تاریخ میں اوقاف قائم کیے گئے۔

ایک زمانہ تھا کہ بعض بڑے بڑے مسلم شہروں کی جائداد کا بڑا حصہ اوقاف پر مشتمل ہوتا تھا۔اس لیے کہ ہر صدی میں اور ہر دور میں مالکان جائداد نے اپنی جائدادیں وقف کیں۔مثال کے طور پر استنبول اور مکہ مکرمہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان شہروں کی جائدادوں کا غالب ترین حصہ وقف پر مشتمل تھا۔ظاہر ہے یہ اوقاف ہر دور میں قائم کیے گئے،ہر صدی میں اصحاب خیر لوگوں نے اپنی جائدادیں وقف کیں۔

وقف کا ایک اہم اصول یہ تھا جس سے تمام فقہاء اتفاق کرتے ہیں اور اس پر عمل درآمد ہر دور میں ہوا ہے کہ "شرط الواقف کنص الشارع" کہ وقف کرنے والے کی شرائط کا اور تفصیلات کا اسی طرح سے خیال رکھا جائے گا،اسی طرح سے ان کا اہتمام رکھا جائے گا،ان کی تعبیر وتشریح انھی قواعد کے مطابق کی جائے گی،جس طرح شریعت کی نصوص کی پابندی کی جاتی ہے اور تعبیر وتشریح کی جاتی ہے۔اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں وقف کا ادارہ کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فقر وغنا کا معیار ہر دور میں بدلتا رہا ہے۔اوقاف سے بھی فقر وغنا کا گہرا تعلق رہا ہے۔اگر کوئی وقف کسی علاقے کے غرباء یا فقراء کے لیے ہے تو

ظاہر ہے غرباء اور فقراء کا معیار ہر دور میں بدلتا رہے گا۔ جن علاقوں یا جن زمانوں میں بہت فقرو فاقے کا زمانہ ہو، ان زمانوں یا ان علاقوں کے دولت مند کسی اور زمانے یا علاقے کے فقراء شمار ہو سکتے ہیں۔ خود فقہائے اسلام نے یہ بات لکھی ہے، مثال کے طور پر امام طحاوی نے اپنے زمانے میں لکھا تھا کہ اگر کسی شخص کی ملکیت میں دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ ہوں تو اس کو دولت مند سمجھا جائے گا۔ درمیانے درجے کا دولت مند وہ سمجھا جائے گا جو دو سو درہم سے دس ہزار درہم تک کی رقم رکھتا ہو۔ جو اس سے کم رکھتا ہو اس کو فقیر سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ وہ معیار ہے جو امام طحاوی کے زمانے کے معاشی حالات کے مطابق انھوں نے بہتر سمجھا۔ بعد کے زمانوں میں اس میں تبدیلیاں آئیں جیسا کہ بعد کے فقہاء کے اقوال اور ارشادات سے معلوم ہوتا ہے۔

آج کل کے لحاظ سے فقر وغنا کا جو معیار مقرر کیا جائے گا وہ آج کل کی معاشی صورتحال کے لحاظ سے ہوگا۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور اہم ہے اور شریعت کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت کا ایک مظہر ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب جو شریعت نے مقرر کیا تھا اس پر ہر دور میں آسانی کے ساتھ عمل درآمد ہوتا رہا ہے اور معیار فقر وغنا کے بدلنے سے زکوٰۃ کے نصاب میں تبدیلی کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ جس کو ہم اسلامی نظام معیشت کہتے ہیں وہ ایک منفرد نظام ہے جس کی مختلف عملی تفصیلات اور صورتیں ماضی میں رہی ہیں۔ آج کے لحاظ سے اس کی تفصیلات از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اپنی اساس، اپنے قواعد، اپنے کلیات اور اہداف کے لحاظ سے یہ وہی نظام معیشت ہے جو حضور ﷺ کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اس پر ہر دور میں انھی بنیادوں اور انھی قواعد وکلیات کے ساتھ عمل کیا گیا جو قرآن کریم اور سنت میں منصوص ہیں یا جن پر ائمہ کرام کا اتفاق ہے۔

اسلامی نظام معیشت اور مغربی نظام معیشت کے درمیان یوں تو کئی اعتبار سے فرق ہے۔ ان میں سے بعض کی نشاندہی اس گفتگو میں کی گئی۔ ایک بڑا بنیادی فرق جو یاد رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت کی بنیادی دلچسپی اور اہتمام یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کیا ہونا چاہیے۔ اس کو صرف اس سے بحث نہ ہو کہ کیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ مغربی سرمایہ دارانہ معیشت کا مسئلہ ہے۔ یقیناً ''کیا ہے'' بھی دلچسپی کا مرکز ہونا چاہیے۔ لیکن ''کیا ہے'' سے زیادہ ''کیا ہونا چاہیے'' پر

توجہ صرف ہونی چاہیے۔ اسلامی نظام معیشت اخلاقی برائیوں کو اخلاقی برائی سمجھتا ہے اور شریعت کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ، اسلام کی تعلیمات کے دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر ان اخلاقی خرابیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً لالچ بری چیز ہے تو اس کو ختم ہونا چاہیے۔ مادی ترقی فی نفسہ مقصود نہیں ہے۔ اصل منزل اور مقصود اخلاقی اور روحانی ترقی ہے۔

یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن پر اسلامی نظام معیشت کی اساس ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی سرمایہ دارانہ معیشت لالچ کو ایک حقیقت سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک لالچ ایک حقیقت ہے، انسان لالچی ہے۔ اس کو ایک امر واقعہ کے طور پر مان لینا چاہیے اور اس کی بنیاد پر پورا نظام تشکیل دینا چاہیے۔ مغربی معیشت یہ مانتی ہے کہ نفع اندوزی جتنا زیادہ ہو اتنا اچھا ہے۔ maximization of profit ان کے یہاں ایک بہت خوش آئند نعرہ ہے۔ نفع اندوزی بڑھائی جائے، تجارت کا منافع بڑھے، اس میں تو اصولاً کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن اگر یہ اضافہ حدود و قیود کا پابند نہ ہو، اخلاقی قواعد وضوابط سے ماوراء ہو تو اس سے وہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جو دوسرے اخلاقی جرائم سے پیدا ہوتی ہیں۔ مغربی معاشیات کی نظر میں مادی ترقی ہی اصل مقصود ہے۔ اخلاق اور روحانیات کے بارے میں جو بھی کہا جاتا ہے، وہ مادی ترقی کی راہ میں اگر رکاوٹ ہے تو مغربی تصورات کی رو سے اس کو ختم کر دینا چاہیے۔ اصل منزل اعلیٰ سے اعلیٰ مادی مفاد کا حصول ہے۔ اخلاقی اور روحانی مفاد بے معنی چیز ہے۔ شریعت نے کہا کہ اللہ نے سب کے لیے روزی رکھی ہے۔ "وقدر فیھا اقواتھا" اس کے برعکس مغربی معیشت کا مفروضہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے روزی موجود نہیں ہے۔ اسی لیے اختلاف ہے، اسی لیے کشمکش ہے۔ اس کشمکش سے ہر شخص کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو۔ یہی اس کی ذمہ داری ہے۔

یہ خلاصہ ہے ان مباحث کا جو اسلامی نظام معیشت کے بارہ میں دور جدید کے ماہرین معیشت نے اسلام کے احکام کی روشنی میں مرتب کیے ہیں۔ اس خلاصے میں وہ فنی تفصیلات شامل نہیں کی گئیں جو اس فن کے ماہرین نے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے دوران مرتب کی ہیں۔ اس موضوع پر جو کام ہوا ہے اس میں بینکاری، بیمہ کاری، تجارت کے بارہ میں اسلام کی تعلیم کو نئے انداز، نئے اسلوب اور نئی اصطلاحات میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کام عموماً عربی یا انگریزی میں ہوا

ہے۔ یہ بات ہمارے لیے بہت خوشی اور افتخار کا باعث ہے کہ بیسویں صدی میں اسلامی معیشت و تجارت کے موضوعات پر جو مجتہدانہ کام ہوا ہے اس میں خاصا حصہ ہمارے جنوبی ایشیاء کے اہل علم کا ہے۔

برصغیر کے روایتی علماء نے بھی دوسروں سے بہت پہلے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس مضمون کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ چنانچہ برصغیر کے مشہور محقق عالم مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مشہور مجاہد آزادی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی کتابیں اسلامی معاشیات کے موضوع پر اہم مصادر میں شمار ہوتی ہیں۔ تاہم زیادہ مفید اور نتیجہ خیز کام جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اہل علم کے ہاتھوں ہوا۔ ان حضرات میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی، پروفیسر شیخ محمود احمد، ڈاکٹر محمد چھاپرا اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی جیسے اہل علم کے بلند پایہ علمی کام نے ان حضرات کو اسلامی معاشیات کی جدید تاریخ میں نمایاں مقام عطا کر دیا ہے۔ اب برصغیر جنوبی ایشیاء کے مسلمان ماہرین معیشت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان بنیادوں پر عمارت کی تعمیر، پھر تکمیل اور پھر تزئین میں بھرپور حصہ لیں اور اس روایت کو زندہ رکھیں۔

تیسرا خطبہ

دور جدید کے اہم معاشی اور مالیاتی مسائل: ایک جائزہ

تیسرا خطبہ

دور جدید کے اہم معاشی اور مالیاتی مسائل: ایک جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''دور جدید کے اہم معاشی مسائل اور مالیاتی مشکلات کا ایک جائزہ''۔ اس گفتگو میں ان اہم معاشی معاملات اور مالی مسائل کا اختصار سے تذکرہ کیا جائے گا جو آج ماہرین معاشیات کے لیے ایک بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کو سلجھانے، جن کو حل کرنے اور جن کے راستہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی کاوشوں کا ہی نام آج کل علم معاشیات اور علم مالیات ہے۔ یہ مشکلات کیا ہیں۔ کیوں پیدا ہوئیں، اور ان کا حل اسلام کی تعلیم میں کیا ہے۔ آج کی گفتگو میں اختصار کے ساتھ یہی مسائل زیر بحث آئیں گے۔

آج کل کے یہ مسائل بڑی حد تک اس معاشی نظام کی پیداوار ہیں جو دنیائے مغرب میں پچھلے کئی سو سال کے دوران سامنے آیا ہے۔ جس میں وقتاً فوقتاً بڑے پیمانے پر تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اس نظام نے ایک واضح شکل انیسویں صدی کے وسط سے اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ معاشی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی یہ خاص شکل جس کو کلاسیکی معاشیات کہا جاتا ہے۔ یہ مغربی معاشی فکر کا سب سے نمایاں رجحان رہی اور بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک، بلکہ

بیسویں صدی کے نصف تک جاری رہی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۲۰ء کے دور سے لے کر مغرب کے مشہور ماہر معاشیات لارڈ کینز کے خیالات نے معاشی افکار پر، معاشی نظریات پر اور معاشی تصورات پر بہت اثر ڈالا۔ معاشیات میں بہت تبدیلیاں آئیں اور اس نئی معاشیات کو، اس نئی مرتب شدہ معاشیات کو نیو کلاسیکی معاشیات یا جدید معاشیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نئی معاشیات کے نتیجے میں جو معاملات نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں ان کا تعلق جزوی معاشیات یعنی micro economics سے بھی ہے اور کلی معاشیات یعنی macro economics سے بھی ہے۔

کلی معاشیات یعنی macro economics میں قومی آمدنی، زر اور اس کی حقیقت، داخلی اور خارجی تجارت، ترقی اور ترقی کا مفہوم، اس کی قسمیں، منصوبہ بندی، آمدنی میں نشیب وفراز fluctuation، افراد کار اور روزگار، تقسیم دولت کے امور شامل ہیں۔ ان تمام میدانوں میں بعض بڑے بڑے اہم مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کے مختلف حل تجویز کیے گئے۔

اسی طرح جزوی معاشیات میں جو مسائل اہم ہیں ان میں تصور قیمت اور نظریہ قیمت، صارفین کا رویہ، آمدنی اور خرچ میں توازن اور اجرتوں کے مسائل شامل ہیں۔ ان مسائل سے متعلق بھی بعض ایسی مشکلات سامنے آئی ہیں جن پر بعض لوگوں نے گفتگو کی ہے۔ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایک خاص تصور جو مغربی معیشت میں پیدا ہوا ہے جس سے مسلم ماہرین معیشت نے بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ اشیاء یا خدمات یا وسائل کی اضافی کمی کا معاملہ ہے۔ یہ اضافی کمی relative scarcity کہلاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو وسائل یا اسباب دنیا میں موجود ہیں وہ کم ہیں، ان کے مقابلہ میں انسانوں کی ضروریات زیادہ ہیں۔ ان ضروریات کو، ان محدود وسائل کی موجودگی میں کیسے پورا کیا جائے، کیسے سب انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو ماہرین معیشت کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

مسلم ماہرین معیشت میں بعض حضرات اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اس مزعومہ کمی کو کوئی طے شدہ چیز، امر واقعہ یا حقیقت قرار نہیں دیتے، بلکہ محض مغربی تصورات بلکہ مفروضات کا ایک شاخسانہ سمجھتے ہیں، جس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور ماہرین معیشت نے اس تصور سے اتفاق کیا ہے مثلاً ہمارے فاضل دوست اور مشہور ماہر

معیشت ڈاکٹر عبدالرحمٰن یسری، اس کو ایک بہت اہم تصور سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید علمی تحقیقات نے یہ ایسا تصور تلاش کیا ہے جو ایک حقیقت واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کو بطور حقیقت واقعہ ہی کے دیکھنا چاہیے۔ اس حقیقت کو ان کے خیال میں اب کسی اخلاقی یا مذہبی نقطہ نظر سے نہیں، بلکہ خالص انتظامی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ معاشرے کی ضروریات کیا ہیں اور ان کو کیسے پورا کرنا چاہیے۔

بہر حال یہ ایک مسئلہ تھا جو مسلمان ماہرین معیشت کی توجہ کا مرکز بھی رہا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق پورے نظام معیشت سے ہے۔ اس لیے میں نے اس کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کا بڑا گہرا تعلق نفع کے تصور سے بھی ہے۔ یعنی افادیت یا نفع یا یوٹیلٹی کیا ہے۔ یہ نو کلاسیکی معاشیات کا ایک تصور ہے۔ اس سے مراد ہر وہ سرگرمی ہے جو کوئی منفعت پیدا کرے اور ہر وہ سرگرمی جو منفعت پیدا کرے وہ پیداواری سرگرمی ہے۔

یہاں منفعت سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو عامۃ الناس یا ان کی ایک قابل ذکر تعداد اپنے لیے مفید اور نافع سمجھتی ہو۔ یہ افادیت یا منفعت وہ ہے جس کو عام آدمی اپنے لیے افادیت یا منفعت سمجھتے ہوں۔ یہاں اس کے اخلاقی نتائج یا اجتماعی مقاصد سے بحث نہیں ہے۔ اس لیے کہ اقتصادی معاملات کا اخلاقی پہلو مغربی نو کلاسیکی معاشیات کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اس لیے مغربی معاشیات میں اخلاقی معاملات سے بحث نہیں ہوتی۔ ایک تھوڑی سی تبدیلی نو کلاسیکی تصور میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے یعنی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک خالص مادی اشیاء کو پیداواری سرگرمی کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور وہ ہر وہ سرگرمی جس کے نتیجے میں کوئی مادی چیز سامنے آئے صرف اسی کو پیداواری سرگرمی کہا جاتا تھا۔ لیکن اب نیو کلاسیکی تصور کی رو سے منافع اور فوائد بھی اور خدمات بھی اس میں شامل ہوگئی ہیں۔ خدمات، فوائد اور منافع ظاہر ہے مادیات سے ماوراء چیزیں ہیں۔ مادیات سے ماوراء جو بھی کچھ ہے، اگر وہ انسانوں کے لیے مفید ہے یا انسانوں کو پسند ہے تو پھر وہ پیداواری سرگرمی ہے۔ یہاں بھی اخلاقی اور مذہبی اعتبارات غیر متعلق ہیں۔ مذہبی اعتبار سے یا اخلاقی اعتبار سے کوئی چیز اچھی ہے یا بری، مغربی معیشت کو اس سے بحث نہیں ہے۔ اگر انسانوں کی ایک تعداد اس میں دلچسپی رکھتی ہے، اس پر پیسہ خرچ کرنا چاہتی ہے، اس کو حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کو فراہم کرنا ایک تجارتی اور پیداواری سرگرمی ہے۔

ظاہر ہے یہ بات اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ہے۔ اسلامی معاشیات تو دراصل ایک اخلاقی معاشیات ہے جس میں قسط یعنی حقیقی انصاف پر زور دیا گیا ہے اس میں احسان اور ایثار کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے احسان اور ایثار خالص مذہبی اقدار ہیں۔ آج کل کے تصورات کی رو سے تجارت کے باب میں ان کو کوئی باریابی حاصل نہیں ہوسکتی، لیکن اسلام کی تاریخ میں تجارت اور اخلاق، تجارت اور مذہبی تصورات ہمیشہ ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ پھر شریعت نے جگہ جگہ نصیحت یعنی خیر خواہی کی تعلیم بھی دی ہے۔ خیر خواہی تجارتی رفیق کے لیے بھی، خیر خواہی کسی گاہک کے لیے بھی۔ خیر خواہی ہر انسان کے لیے اور اللہ کی ہر مخلوق کے لیے ہر وقت پیش نظر رکھنا شریعت کی تعلیم کا بنیادی حصہ ہے۔ تجارت میں نصیحت یہ ہے کہ تراضی اور طیب نفس ہو۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی معیشت کو اخلاق اور مذہبی تصورات سے بالکلیہ الگ کر دینا شریعت کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے برعکس بہت سے مغربی ماہرین معاشیات کا محض خیال ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات ان کے لیے عقیدہ اور یقین کا درجہ رکھتی ہے کہ معاشی ترقی اور مذہبی تصورات ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ انھوں نے اپنی تمام معاشی پالیسیاں اور تحقیقات اسی بنیاد پر مرتب و مدوّن کی ہیں۔ چنانچہ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ مذہبی تصورات اور اقتصادی مسائل ایک ساتھ نہیں چل سکتے تو اس کے نتیجے میں بہت سے سوالات اور مسائل پیدا ہوں گے۔ ربا کے ناگزیر ہونے کا سوال پیدا ہوگا۔ غرر پر اصرار، furture sales کی افادیت اور ناگزیر ہونا، کاغذی کرنسی، قرض پر مبنی تجارت اور لین دین کی تمام صورتیں، یہ سب وہ معاملات ہیں جن کا واحد مقصد دولت کمانا اور دولت میں مسلسل اضافہ کرنا ہے۔ دوسری طرف مذہبی تعلیمات اور اخلاقی اعتبارات کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب امور ناپسندیدہ اور ناقابل قبول قرار پاتے ہیں۔

جدید مغربی معاشیات نے محض اخلاقی یا نظری سوالات ہی نہیں اٹھائے ہیں۔ اس نے محض مذہبی مسائل ہی پیدا نہیں کیے، بلکہ اس کے نتیجے میں بہت سے ایسے مسائل بھی سامنے آتے ہیں جو خود معاشیات کے اہم مسائل قرار پائے ہیں۔ اور ان کے حل پر دنیا کے مختلف ممالک میں، مختلف علاقوں میں توجہ دی جا رہی ہے۔ ان مسائل کا تذکرہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جدید مغربی معاشیات ہی اب سوویت یونین کے زوال کے بعد دنیائے مغرب بلکہ بڑی حد تک پوری دنیا میں اب واحد معاشی نظام ہے۔ اس جدید معاشی نظام میں اصل حیثیت

سرمایہ دارانہ تصورات کو حاصل ہے، جن کی اٹھان خالص استحصالی ہے۔

ایک زمانہ تھا۔ ۱۹۴۰ء، ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک، جب ہمارے یہاں ایک بہت بڑا طبقہ تھا جو کمیونزم کے پروپیگنڈے سے بہت متاثر اور مرعوب تھا۔ یہ لوگ اپنے کو ترقی پسند کہنے میں خوشی محسوس کرتے تھے، فخریہ ترقی پسندی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اور وہ مغربی معاشی نظام کے استحصالی ہونے کی بات شب وروز کیا کرتے تھے۔ وہ یہ بات کہتے تھکتے نہیں تھے، شب وروز ان کی تحریروں میں، ان کی زبانوں پر، ان کی گفتگوؤں میں۔ یہی بات رہتی تھی کہ مغرب کا نظام معاشی نظام سراسر استحصالی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد یہ پورا طبقہ نہ صرف منظر سے غائب ہو گیا بلکہ اس نے ان تمام تصورات اور خیالات کو بیان کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بلکہ ان کو بھلا دیا جو وہ مغرب کے استحصالی نظام کے بارے میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ ہیں جو آج اسی زور وشور سے مغربی تصورات کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور ان تمام خیالات کو اسی زور شور سے دہراتے ہیں جو آج امریکہ، برطانیہ اور اسی استحصالی معاشی نظام کے مراکز سے اٹھ رہے ہیں اور دنیا کے سامنے آرہے ہیں جو اس طبقے کے خیال میں ہر قسم کی برائی کا مرکز تھا۔

اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی معاشی نظام پر تنقید کرنے والے بہت سے اہل علم اور مفکرین اپنے خیالات میں اتنے مخلص نہیں تھے جتنے اخلاص کا وہ دعویٰ کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے یہ دونوں نظام، قدیم کیمونسٹ نظام ہو یا جدید مغربی معاشی نظام ہو، رائج الوقت نظام ہو، ان دونوں کی اساس اخلاقی اقدار اور دیگر روحانی اور انسانی تصورات کے انکار پر تھی۔ یہ دونوں اس اعتبار سے لا اخلاقی نظام تھے کہ اخلاقی اقدار کو، انتظامی، معاشی اور اجتماعی معاملات میں بالکل غیر متعلق سمجھتے تھے۔ کیمونسٹ نظام میں تو اخلاق اور مذہب کی سرے سے ہی کوئی حیثیت نہیں تھی، وہاں تو ان کو افیم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مغربی دنیا میں جہاں ان تصورات کو کم از کم زبانی یا تحریری طور پر افیم نہیں سمجھا گیا وہاں بھی اخلاق اور دین کو اجتماعیات میں دخل دینے کی نہ پہلے اجازت تھی، نہ آج اجازت ہے۔

اس تصور یا اس نظریاتی فضا کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان پر سرمایہ کی فوقیت قائم ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ ایک نظری بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے بہت سے معاشی، اجتماعی، اور ثقافتی

نتائج نکلتے ہیں جو بڑی خرابیوں پر مبنی ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور اور مایہ ناز معاشی مفکر پروفیسر شیخ محمود احمد نے سرمایہ دارانہ معیشت کی ان کمزوریوں پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور خاص طور پر انسان پر سرمایہ کی فوقیت کے بارے میں بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے۔

دوسری خرابی سرمایہ دارانہ معیشت سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس میں نفع کا محرک اولین اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ تمام معاشی سرگرمیوں کا محرک اولین نفع اور Profit کو زیادہ سے زیادہ کرنا بن جاتا ہے۔ چنانچہ maximization of profit، زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی، سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور معاشی سرگرمی کے اساسی اہداف میں سے ہے۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ نکلتا ہے کہ صارفین کے مفادات نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اگر پورے نظام کی اٹھان یہ ہو کہ وہ صنعت کار کا مؤید ہے۔ وہ مالکان اراضی کا مؤید ہے۔ ریاست اور حکومت بھی مالکان اراضی، سرمایہ داروں اور بڑے بڑے صنعت کاروں کی پشت پر ہے تو صارف کے مفادات سرے سے نظر انداز ہو جاتے ہیں اور ان پر وہ توجہ نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ صارف کا تعلق عموماً کمزور طبقے سے ہوتا ہے۔ صارفین کی غالب ترین اکثریت ان حضرات کی ہوتی ہے جو بہت کم وسائل رکھتے ہیں اور ہر اعتبار سے معاشرے میں کمزور سمجھے جاتے ہیں۔ نظام ان کے مفادات کا نہ صرف تحفظ نہیں کرتا، بلکہ ایک حد تک ان کے مفادات سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ یہ لاتعلقی نظری طور پر تو اتنی نہیں ہوتی لیکن عملی طور پر ضرور ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ ریاست، ریاست کے وسائل اور ریاست کی پوری قوت، سب سے پہلے کمزور وار بے سہارا انسان کی مدد کے لیے سامنے آنی چاہیے۔ اگر معاشرے کی قوت کمزور شہری کے پیچھے ہے تو یہ قانون کی بالادستی اور عدل وانصاف کی علامت ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، عام انسان، عام صارف اپنے کو بے حیثیت سمجھتا ہے، صنعت کاروں کی قوت، زمینداروں کے اثر ورسوخ اور بااثر لوگوں کے اثرات کے سامنے بے بس معلوم ہوتا ہے تو پھر یہ شریعت کے معیار کے نقطہ نظر سے قانون کی بالادستی اور عدل وانصاف نہیں ہے۔

صارفین کے ذہن کو ایک خاص رخ پر چلانے کے لیے اشتہار بازی، سرمایہ دارانہ معیشت کا ایک لازمی حصہ بن گئی ہے۔ اتنا لازمی حصہ بن گئی ہے کہ آج اشتہار بازی کو ایک ہنر سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کی حیثیت ایک باقاعدہ علم کی ہو گئی ہے۔ ایسا علم جس پر جامعات، علمی اداروں

اور تعلیمی سرگرمیوں کے مراکز بقیہ علوم وفنون سے کہیں زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ طلبہ کی بڑی تعداد اسی اشتہار بازی کی وجہ سے ان شعبوں میں مطالعہ کے لیے آتی ہے جہاں سے وہ مزید اشتہار بازی کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ ماہرین اشتہار بازی کی یہ روز افزوں تعداد نفع اندوزی کے محرکات کو مزید قوی کرنے میں حصہ لیتی ہے۔ صارفین کے مفادات کے عدم تحفظ کا مزید ذریعہ بنتی ہے۔ انسانوں پر سرمایہ کی فوقیت کو مزید مضبوط بناتی ہے۔ اس سب کے نتیجے میں طبقاتی تقسیم گہری سے گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ شکایت آج دنیا کے ہر ملک میں ہے کہ وہاں طبقاتی تقسیم وسیع بھی ہو رہی ہے اور گہری بھی ہو رہی ہے۔ اسی نعرے کے ساتھ کمیونزم اٹھا تھا اور ایک ایسی طبقاتی تقسیم کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہوا جس سے بدتر طبقاتی تقسیم آج بھی سرمایہ دارانہ معیشت میں موجود نہیں ہے۔ طبقاتی تقسیم کا لازمی نتیجہ ارتکاز دولت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ظاہر ہے جب ایک طبقہ قوی سے قوی تر ہوتا جائے گا، ریاست کے تمام وسائل اس کو حاصل ہوتے جائیں گے۔ اشتہار بازی کے وسائل اس کو حاصل ہوں گے۔ ان حالات میں صارفین اپنے مفادات کا تحفظ کرنے میں مزید ناکام ہوں گے اور وسائل کا بہاؤ بااثر طبقے کی طرف بڑھتا جائے گا۔ غریب اور نادار طبقے سے کم ہوتا جائے گا۔ یوں غرباء اور بے وسیلہ طبقے کی ضروریات سے مزید غفلت اور بے اعتنائی پیدا ہوتی جائے گی، اور یوں یہ طبقہ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا۔ اور بااثر طبقہ مزید بااثر اور طاقتور ہوتا جائے گا۔

اس منفی صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ذرائع پیداوار کا استعمال نامکمل ہونے لگتا ہے۔ اگر ذرائع پیداوار کی تقسیم مناسب ہو، منصفانہ ہو، عادلانہ ہو تو ہر شخص تک ذرائع پیداوار کا کوئی نہ کوئی حصہ پہنچتا ہے۔ وہ ان ذرائع پیداوار کو استعمال بھی کرتا ہے۔ اس طرح پیداوار کے دستیاب ذرائع کا بڑا حصہ استعمال میں آجاتا ہے۔ لیکن اگر ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائیں تو ان چند ہاتھوں کو تمام وسائل مکمل طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ بے مصرف اور بے استعمال وسائل پر پوری توجہ اور مناسب وقت صرف کریں۔ یوں ان وسائل کو استعمال کرنے کے لیے جو وسائل درکار ہیں وہ بھی کم پڑ جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذرائع پیداوار کا مکمل استعمال نہیں ہو پاتا۔

پاکستان میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بعض ایسے زمیندار جن کو انگریزوں نے سینکڑوں، ہزاروں ایکڑ کے حساب سے زمینیں دے دی تھیں۔ آج وہ زمینیں ان میں سے بعض کے خاندانوں کے پاس موجود ہیں۔ لیکن وہ ان کو خود آباد نہیں کر سکتے، کسی کو دینا بھی نہیں چاہتے۔ حکومتوں نے ان سے یہ زمینیں واپس لینے میں کوتاہی کی۔ مختلف سیاسی اور غیر سیاسی مفادات کی وجہ سے اس طبقے کو مزید نوازا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی وہ زرعی اراضی جو پاکستان کی موجودہ آبادی سے کئی گنا آبادی کے لیے کافی ہے، اور ذرا سی توجہ سے اس سے زیادہ کے لیے بھی کافی ہو سکتی تھی، وہ موجودہ آبادی کے لیے بھی بعض اوقات کافی نہیں ثابت ہوتی اور بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ پیداوار میں کمی آ جاتی ہے۔ اور بعض بہت اہم زرعی اجناس کی پیداوار بیرون ملک سے منگوانی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ذرائع پیداوار کا استعمال نامکمل ہے اور وسائل کی تقسیم غیر عادلانہ ہے۔

وسائل کی غیر عادلانہ تقسیم جب بھی ہوتی ہے تو اس سے ارتکاز دولت بھی پیدا ہوتا ہے اور معاشی اتار چڑھاؤ بھی تیزی کے ساتھ اور کثرت سے آتا ہے۔ جس کو fluctuation کہتے ہیں وہ بہت تسلسل کے ساتھ سامنے آنے لگتا ہے۔ اس اتار چڑھاؤ کو دور کرنے کے لیے حکومتیں جو قوانین نافذ کرتی ہیں وہ اکثر و بیشتر غیر عادلانہ ہوتے ہیں۔ غیر عادلانہ قوانین کے نتیجے میں مزید غیر عادلانہ تقسیم جنم لیتی ہے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آج عالمی سطح پر بھی جو قوانین ہیں وہ بڑے غیر عادلانہ ہیں۔ یہ WTO اور ISO اور اس طرح کے خوشنما عنوانات کے تحت جو قوانین دنیا میں بنائے گئے ہیں وہ عموماً مشرقی ممالک اور بالخصوص دنیائے اسلام کے لیے بالآخر انتہائی تباہ کن ثابت ہوں گے۔

مجھے تو واضح طور پر ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک نیا استعمار جنم لے رہا ہے جو ان تمام مفادات اور فوائد سے متمتع ہوگا جن کی وجہ سے مغرب کی استعماری قوتیں دنیائے اسلام میں آئی تھیں، لیکن اب ان پر استعمار کا دھبہ نہیں ہوگا۔ اس کو استعمار نہیں کہا جائے گا۔ استعمار کہلائی جانے کی جو خرابیاں یا نتائج ہیں اس سے وہ بریٔ الذمہ رہے گا۔ لیکن فوائد اس کو استعمار کے پورے پورے حاصل ہوں گے۔ ان تمام معاملات کا جو منفی اثر ہے وہ سب سے زیادہ دنیائے اسلام پر پڑے گا۔ اس لیے کہ دنیائے اسلام میں ان میں سے بہت سے مسائل پہلے سے بھی موجود ہیں۔ دو

ڈھائی سو سال کی مغربی استعماری صورتحال کا نتیجہ بھی ہیں اور اس سے پہلے سے مسلمانوں کے انحطاط کے دور سے بھی بعض مسائل چلے آ رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے انحطاط کا دور واضح طور پر دسویں صدی ہجری کے لگ بھگ شروع ہوا۔ پہلے مسلمان جمود کا شکار ہوئے۔ پھر ان کی ترقی میں کمی آئی، بلکہ ان کا پھیلاؤ اخلاقی، تہذیبی نظریاتی میدانوں میں کم ہوگیا۔ اور ان کے آپس کے اختلافات اور آپس کی جنگیں ان کے لیے بہت سے مسائل کا سبب بنیں۔

اس صورتحال کے نتائج بھی پہلے سے موجود تھے۔ تقسیم دولت میں ناہمواری تھی۔ ارتکاز دولت بھی تھا۔ فقر اور بیماری تھی۔ ناخواندگی بھی خاص شدید پیدا ہوگئی تھی۔ بعض ممالک میں ناخواندگی تھی۔ استحصال بھی تھا۔ اور کہیں کہیں امیر و غریب کی کشمکش یعنی polarization بھی تھا۔ لیکن یہ سب مسائل عموماً محدود اور بہت ابتدائی سطح پر تھے۔ کہیں کہیں ان کا اظہار تھا، کہیں کہیں نہیں تھا۔ لیکن جب مغربی استعمار دنیائے اسلام میں وارد ہوا تو ان تمام مسائل میں نہ صرف شدت پیدا ہوئی بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اور بھی بے شمار مسائل سامنے آ گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں اضافہ ہوتا گیا۔

مغربی نظام کی اٹھان اور اساس پچھلے کئی سو سال سے یہی ہے کہ دنیا کے وسائل کا رخ مغربی دنیا کی طرف رہے۔ خدمات اور ضمنی کام مشرق کے لوگوں سے لے لیے جائیں۔ لیکن ان کے نتائج اور ترقی کے مظاہر زیادہ قوت کے ساتھ مغربی دنیا میں سامنے آئیں۔ اگر پچھلے چند سالوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے، بین الاقوامی معاشیات کی اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بہت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار مختلف معاشی اخبارات اور کالموں میں اور بعض ہفتہ وار، ماہوار رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۹۸ میں ایک ایسے ہی سروے کی بنیاد پر جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ سنہ ۱۹۹۸ میں لوگوں کی ذاتی اور شخصی ضروریات پر جو رقم پوری دنیا میں خرچ کی گئی اس کا چھیاسی فیصد دنیا کے محض بیس فیصد لوگوں نے خرچ کیا۔ اور باقی ماندہ چودہ فیصد دنیا کے اسی فیصد انسانوں کے حصے میں آیا۔ یہ صرف ذاتی ضروریات پر خرچ کی جانے والی رقم تھی، یعنی یہ صرف وہ رقم تھی جو لوگوں کی خوراک، کھانا، پینا، کپڑا، لباس، علاج پر خرچ ہوئی۔ اس میں حکومتوں اور اداروں کے اخراجات اور بڑی بڑی کمپنیوں کے مصارف شامل نہیں ہیں۔ اگر یہ مصارف بھی شامل کیے جائیں گے تو یہ فرق اس سے بھی کئی سو

بلکہ شاید کئی ہزار گنا زیادہ ہوگا۔

یہ عدم توازن جو آج مشرق و مغرب کے درمیان پایا جاتا ہے، یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ یہ اس معاشی نظام کے لازمی نتائج ہیں جو آج دنیا میں قائم ہے اور جس کے تحفظ اور دفاع کے لیے مغربی دنیا سب کچھ کرنے کو تیار رہے۔ آج فری مارکیٹ اکانومی اور سرمایہ دارانہ معیشت مغربی دنیا کے لیے دین و ایمان کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور مغربی دنیا اس کے لیے اسی طرح کی قربانی دینے کو تیار ہے جیسا کہ مخلص مسلمان دین کے تحفظ کے لیے قربانی دینے کو تیار رہتا ہے۔ بلکہ آج مسلمانوں میں دین کے لیے قربانی دینے کا جذبہ کم ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی دنیا میں اپنے اس نظام کے تحفظ کا احساس دن بدن شدید ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس نظام کے تحفظ کے لیے ملکوں کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انسانوں کی نسلوں کو برباد کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ ملکوں کے وسائل پر قبضے کے لیے فوجیں اتارنے میں اور بمباری کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی دنیا اپنے اس نظام کے تحفظ کے لیے کہاں تک جا سکتی ہے۔

مغربی معاشیات کا ایک اہم رجحان یہ ہے کہ انسانوں کی ہر مادی خواہش کو جائز خواہش مان کر اس کی تکمیل کی کوشش کی جائے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ معاشیات کے میدان سے اخلاق اور دین کی اقدار کو نکال باہر کیا گیا ہے۔ کسی خواہش کو جائز خواہش ماننا یا ناجائز خواہش مان کر اس کو روکنے کی کوشش کرنا یہ اخلاق اور دین کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ حقیقی اور غیر حقیقی ضروریات میں فرق کی اصل بنیاد اخلاق ہی ہے۔ جب وہ ختم ہو جائے تو پھر حقیقی اور غیر حقیقی ضروریات میں فرق کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

اس کے برعکس صنعتی اشیاء پیدا کرنے والے کا مفاد اور وسائل پیداوار کے مالک طبقوں کی تجارتی مصلحت اسی میں ہے کہ وہ غیر حقیقی اور فرضی ضروریات پیدا کرتے چلے جائیں۔ غیر حقیقی اور فرضی ضروریات پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اشتہار کے تمام وسائل کو استعمال کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں ہوں، جیسا کہ آج ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور سرمایہ دارانہ کمپنیوں کے ہاتھ میں بڑے بڑے ذرائع ابلاغ بھی ہیں۔ اخبارات ان کے کنٹرول میں ہیں۔ ٹی وی کے بڑے بڑے نیٹ ورک ان کے پیسے سے چل رہے ہیں۔ بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے اہم عہدہ داران کے ساتھ کاروباری مفادات میں وہ شریک ہیں۔ ان

تمام وسائل کو استعمال کر کے مزید غیر حقیقی اور فرضی ضروریات پیدا کی جاتی ہیں۔

جن معاملات کو فقہائے اسلام نے کمالیات اور تحسینیات کے نام سے یاد کیا تھا ان کو ضروریات کا درجہ دینا اور بطور ضروریات کے انسانوں کو یہ باور کرانا کہ ان چیزوں کے بغیر ان کی زندگی مشکلات کا شکار ہو جائے گی یہ مغربی اشتہار بازی کا بنیادی فریضہ ہے۔ اخلاقی حدود اور روحانی اعتبارات کو معاشیات سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا اور نئی نئی کمالیات کو پیدا کرنا پھر ان کمالیات کو ضروریات کا درجہ دینا، یہ صنعت کار کے مفاد میں بھی ہے۔ یہ تاجر کے مفاد میں بھی ہے اور یہ ہر اس شخص کے مفاد میں ہے جو نئی نئی پیداواروں کا کاروبار کرتا ہو یا اس کاروبار سے مستفید ہوتا ہو۔

اس مقابلے میں اسلام کا مقصود یہ ہے کہ لامحدود مادی خواہشات کو محدود رکھا جائے۔ ضروریات، حاجیات اور کمالیات میں فرق کیا جائے۔ ضروریات، جن کی تکمیل لازمی ہے وہ واقعی اور حقیقی ضروریات ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہو۔ انسان کی صحت کا دارومدار ہو۔ انسان کی تعلیم اور علاج کا دارومدار ہو، جو انسان کی جائز دولت کے تحفظ کے لیے، جائز وسائل کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہوں، یہ وہ ضروریات ہیں جن کو شریعت تسلیم کرتی ہے اور ان کی تکمیل کے لیے احکام دیتی ہے۔

ضروریات کے بعد دوسرا درجہ فقہائے اسلام نے حاجیات کا بیان کیا ہے۔ حاجیات سے مراد وہ معاملات ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت تو ہوتی ہے لیکن اس سطح پر نہیں ہوتی جس سطح پر حقیقی اور ناگزیر ضروریات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہر شخص کو سر چھپانے کے لیے گھر چاہیے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ہر شخص یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کا گھر آرام دہ ہو۔ آرام دہ گھر کا تصور ہر زمانے کے لحاظ سے بدلتا رہے گا۔ یہ دوسرا درجہ ہے جو حاجیات کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کے درجات کمالیات کہلاتے ہیں۔ ضروریات اور حاجیات کے بعد کے جتنے درجے ہیں اس کو علمائے اسلام نے کمالیات یا تحسینیات کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایک شخص اپنے گھر کو جتنا بہتر سے بہتر بنانا چاہتا ہے جتنے خوبصورت انداز میں تعمیر کرنا چاہتا ہے، جتنے مکمل انداز میں اس کے اندر اسباب اور وسائل فراہم کرنا چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ جائز حدود کے اندر ہوں، حلال و حرام کی قیود کے مطابق ہوں اور دوسرے انسانوں کی ضروریات اور حاجیات کو نظر انداز کر کے ان کو حاصل نہ کیا

گیا ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب حقیقی اور غیر حقیقی ضروریات میں امتیاز کیا جائے۔ حقیقی ضرورت ہے وہ ہے جو شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ شریعت کے قواعد کے مطابق ہو۔ جو ان قواعد کے مطابق نہیں ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ پھر خود حقیقی ضروریات کی تکمیل اور تعمیل میں بھی شریعت حد بندی کرنا چاہتی ہے۔ یہ حد بندی عام حالات میں اخلاق اور روحانی تربیت کے ذریعہ کی جانی چاہیے اور جہاں ناگزیر ہو وہاں قانون سے بھی کام لیا جانا چاہیے۔ شریعت کی اصل توجہ انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے پر ہے۔ ہر انسان کو بقدر کفاف ضروریات میسر ہو جائیں۔ یہ شریعت کا بنیادی مقصد ہے۔ اس لیے ریاست کے عمومی وسائل کا بہاؤ عام آدمی کی فلاح و بہبود کی طرف ہونا چاہیے اور عام آدمی کی ضروریات کی تکمیل ریاست کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ اگر ریاست ایک محدود طبقے کی کمالیات پر اپنے بیشتر وسائل خرچ کر دے اور غالب ترین آبادی کی ضروریات اور حاجیات کو نظر انداز کر دے تو یہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی ہوگی۔

مغربی معیشت کے اس غلبے کی وجہ سے بالعموم، اور اسلامی احکام کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بالخصوص، ترقی پذیر معیشتوں کو بے شمار مسائل پیش آئے ہیں۔ ان میں کچھ مسائل تو وہ ہیں جو ترقی پذیر معیشتوں کو دنیا کے ہر ملک میں پیش آئے ہیں یا آ رہے ہیں۔ ان میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں اور غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔ کچھ مسائل وہ ہیں جو خاص طور پر مسلم ممالک میں پیش آتے ہیں۔ مسلم ممالک بہت سی پیچیدہ اقتصادی مشکلات کا شکار ہیں جن کی وجہ یہ ہے کہ مسلم معاشروں کے مزاج، رجحان اور انداز کو نظر انداز کر کے بعض ایسے حل تجویز کیے جا رہے ہیں جن کو مسلم معاشرے کا مزاج قبول نہیں کرتا۔ گزشتہ کم و بیش ایک سو سال سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ مغربی تعلیم اور پروپیگنڈے کے ذریعے عامتہ الناس کو قائل کیا جائے اور عامتہ الناس کو ان حلوں کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن نتیجہ ابھی تک کم از کم پچھلے سو ڈیڑھ سو سال سے یہی ہے کہ مسلمانوں میں ابھی تک خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے ان تمام کوششوں اور مادی ترغیبات کے باوجود اپنے کو اس پورے نظام سے الگ رکھا ہوا ہے۔

یہ بات ہم میں سے اکثر کے علم میں ہے کہ خود ہمارے ملک پاکستان میں بہت سے تاجر اور صنعت کار ایسے ہیں جنھوں نے کبھی کسی بنک سے لین دین نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی نہ سود دیا ہے، نہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے کاروباری معاملات میں کبھی بھی شریعت کے احکام کی خلاف

ورزی نہیں کی۔ ایسے بیسیوں لوگ ہیں جن کا کروڑوں کا کاروبار ہے۔ لاکھوں کا کاروبار کرنے والے تو اور بھی زیادہ ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک دنیائے اسلام میں مغربی معاشی تصورات کو اور لین دین کے طور طریقوں کو سو فیصد مقبولیت اس طرح کی حاصل نہیں ہوئی جس طرح کی دوسرے مغربی اور غیر مسلم ممالک میں حاصل ہوئی ہے۔

اس کا ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ بعض مسلم ممالک میں، خاص طور پر ہمارے ملک پاکستان میں، بیک وقت دو معیشتیں چل رہی ہیں۔ پاکستان میں تو یہ بات بہت نمایاں ہے کہ ایک زیر زمین معیشت ہے اور ایک سطح زمین والی معیشت ہے، جو زمین کے اوپر ہے۔ دونوں کا حجم بعض ماہرین کے بقول برابر برابر ہے۔ زیر زمین معیشت سے وابستہ لوگوں میں خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو شریعت کے احکام کا لحاظ رکھتے ہیں۔ شریعت کے احکام کی پیروی کرتے ہیں اور جس حد تک ان کو شریعت کے احکام کا علم ہے اس حد تک ان کی پیروی کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

ترقی پذیر معیشتوں کو دنیا میں جو مسائل درپیش ہیں، جن کا حل مغربی تصورات کے مطابق کرنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔ جو اوّل تو کامیاب نہیں ہیں اور اگر کامیاب ہیں تو یہ کامیابی محض جزوی ہے۔ ان مسائل میں بعض بہت نمایاں ہیں۔ ان نمایاں ترین مسائل میں پست معیار زندگی اور پیداواریت کی کم سطح بھی شامل ہے۔ پیداوار کا آج کی دنیا میں جو معیار ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں پیداوار کی جو سطح ہے، اس سے بہت کم سطح ہے جو ترقی پذیر معیشتوں کو حاصل ہے۔ پیداوار کی اس کم سطح کے بہت سے اسباب بھی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ تاہم ایک بڑا سبب صارفین کا معاشی اعتبار سے کمزور ہونا بھی ہے۔ جب صارف معاشی اعتبار سے کمزور ہوگا، نادار ہوگا تو وہ بڑے پیمانے پر پیداوار کی خریداری کے لیے کیسے تیار ہوگا۔ بڑے پیمانے پر پیداوار کی فروخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صارفین کے پاس وسائل ہوں۔ صارفین کا طبقہ قوی ہو، اور دولت کی تقسیم منصفانہ ہو۔ اگر صارفین سارے کے سارے فقیر اور نادار ہوں تو پھر پیداوار کی سطح اونچی بھی ہو تو اس معاشرے کے لیے بیکار ہے۔

بے روزگاری ترقی پذیر معیشتوں کا ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ بے روزگاری کھلی بھی ہوتی ہے اور چھپی بھی ہوتی ہے۔ کھلی بے روزگاری تو سب کو نظر آجاتی ہے، لیکن چھپی بے روزگاری بہت

سے لوگوں کو نظر نہیں آتی۔ یہ کھلی اور چھپی بے روزگاری جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے، یہ بھی مغرب کے معاشی نظام کا لازمی تقاضا ہے۔ مغربی ممالک میں آئے دن بڑے پیمانے پر بے روزگاری کی شکایتیں سننے میں آتی ہیں۔ لاکھوں ملازمین کو بڑی بڑی کمپنیاں لے آف کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ وہ اس لیے کرتی ہیں کہ ان کو اچانک کسی ایسے مالیاتی بحران کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ملازمین کی اتنی بڑی تعداد کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔

ایسا اچانک مالیاتی بحران کیوں پیدا ہوتا ہے؟ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں کا سارا کاروبار زرِ غیر حقیقی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ محض کاغذوں میں قرضے کی رقم بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کاغذوں میں آمدنی اور نفع کی رقم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حقیقی پیداوار یا حقیقی اصول یا موجودات اور اثاثے بہت کم وجود میں آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک غبارے میں گنجائش ہوتی ہے ہوا بھرتی رہتی ہے، بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اس میں ذرا سا بھی سوراخ ہو جائے تو یہ بہت چھوٹا سا سوراخ اس پوری ہوا کو بہت جلد خارج کر دیتا ہے۔

ترقی پذیر معیشتوں میں ایک عام صورتحال یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے، وہ خام مال کی برآمد کے مسائل سے دوچار رہتی ہیں۔ ان کے یہاں صرف معاشی پیداوار اور خام مال کی برآمد پر انحصار ہے۔ یہ خام مال جو بہت اونے پونے داموں ترقی یافتہ ملکوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ وہاں سے جب تیار ہو کر آتا ہے تو انھی مشرقی ممالک میں اس کی کئی گنا قیمت ہو جاتی ہے۔ یہ سالہا سال سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کی مثالیں آئے دن مختلف ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ معاشی بدحالی تو ہے ہی، لیکن ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک پر انحصار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر آپ صرف خام مال پیدا کریں گے اور اس خام مال سے صنعتوں کی پیداوار کی تیاری کسی اور ملک میں ہوگی تو آپ اس ملک پر انحصار کرنے کے پابند ہیں۔ وہیں آپ اپنا مال خواہی نہ خواہی بھیجیں گے، وہی آپ سے اپنی شرائط پر اونے پونے داموں خریدیں گے تو آپ اس کو بیچیں گے ورنہ آپ کے لیے آپ کا خام مال بے کار ہے۔ اگر باہر کسی ملک میں اس کی ضرورت ہے تو آپ اس کو بیچ کر کچھ وسائل حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر دوسرے ممالک آپ کی خام پیداوار آپ سے لینے سے انکار کر دیں تو آپ کے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

ہم اہل پاکستان کو اس کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ ہمارے یہاں مشرقی پاکستان مرحوم میں ہر سال بڑے پیمانہ پر پٹ سن پیدا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس پٹ سن کو استعمال کرنے کے جتنے کارخانے تھے وہ ہندوؤں کے پاس مغربی بنگال یا بہار یا اڑیسا وغیرہ میں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ سب کارخانے ہمارے لیے عملاً بیکار اور ختم ہو گئے۔ اب اگر کہیں اتفاقاً، مثلاً دوسری جنگ عظیم کے بعد کوریا وغیرہ میں، پٹسن کی طلب ایک دم بڑھ گئی تو بڑھ گئی۔ اور اگر بعد میں وہ پیداوار لینے کے لیے کوئی تیار نہ ہوا تو پھر اس خام مال کو اندرون ملک ہی اونے پونے بیچنے پر اکتفا کیا۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ لیکن ہمارے عزیز بنگالی بھائی اس سے شدید ناخوش ہوئے۔ انھوں نے اس کو مغربی پاکستانیوں کی بے تدبیری یا خودغرضی قرار دیا۔

یہ مظاہر اس نظام کے لازمی تقاضے ہیں جو پہلے بھی پیش آتے رہتے ہیں، بعد میں بھی پیش آتے رہے اور آئندہ بھی پیش آتے رہیں گے۔ جب ترقی پذیر معیشتیں صرف خام مال کی برآمد پر انحصار کریں گی اور ان کا سارا دارومدار ترقی یافتہ ملکوں کی طرف سے خریداری پر ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ سرمایہ میں کمی کی صورت میں آئے گا۔ سرمایے کی کمی کی صورت میں ٹیکنالوجی کی کمی بھی ہوگی۔ ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے سرمایہ درکار ہے، بڑی مشینری کے لیے سرمایہ درکار ہے۔ سرمایہ نہیں ہوگا تو ٹیکنالوجی بھی نہیں ہوگی۔ ٹیکنالوجی نہیں ہوگی تو آپ ویلیو ایڈ کر کے خام چیزوں کو فروخت نہیں کر سکتے۔ جب آپ اپنی تیار شدہ پیداوار کو باہر فروخت نہیں کر سکتے تو زرمبادلہ کی قلت ہوگی۔ زرمبادلہ کی قلت ہوگی تو اس کے نتیجے میں انڈسٹری میں پھیلاؤ رک جائے گا۔ جب انڈسٹری کا پھیلاؤ رک جائے گا تو انٹرپرینیئر ملک میں کم ہو جائیں گے۔

یہ سارے نتائج جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ایک ایک کر کے سامنے آتے جاتے ہیں۔ آپ اس کو ترقی پذیر معاشیات کے ثمرات کہیں، بیماریاں کہیں، نتائج کہیں۔ بہرحال یہ وہ نتائج وثمرات ہیں جو آج پوری دنیا میں ہر جگہ نظر آ رہے ہیں۔ مسلم ممالک میں بھی نظر آ رہے ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی نظر آ رہے ہیں۔

اس صورت حال کے اسباب پر اگر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اس کا ایک اہم سبب جو آج کل کا ایک بنیادی معاشی مسئلہ بھی ہے وہ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم ہے۔ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں۔ ان میں سے بعض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن اہم

ترین اسباب کا اگر تذکرہ کیا جائے تو وہ پانچ اسباب ہیں۔ خود سرمایہ دارانہ معیشت کو دنیائے اسلام میں دل و جان سے قبول کر لینا اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جب تک یہ سرمایہ دارانہ نظام جاری رہے گا، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ دولت کا رجحان غیر عادلانہ تقسیم کی طرف ہی رہے گا، عادلانہ تقسیم کی طرف نہیں ہوگا، اس لیے کہ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم اس نظام کی بنیادی روح ہے۔ اسی لیے اس نظام نے اپنے تمام ظاہری دعووں کے باوجود Laissez faire کی معاشیات کو بڑی حد تک اب بھی باقی رکھا ہوا ہے۔ Laissez faire سے مراد یہ تھا کہ معاشی سرگرمی پر کوئی بیرونی قیود عائد نہ کی جائیں، بازار کے نظام پر بیرونی پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ اگرچہ آج مغربی دنیا کا دعویٰ ہے کہ ہم نے بے قید معیشت کا نظام ختم کر دیا ہے۔ لیکن دراصل ختم نہیں کیا ہے۔ بے قید معیشت آج بھی اسی طرح بے قید ہے جیسے پہلے تھی۔ اخلاق کی قیود پہلے بھی نہیں تھیں، آج بھی نہیں ہیں۔ بلکہ پہلے شاید تھوڑی بہت اخلاقی قیود ہوں، اب بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ مذہبی تصورات کی حدود و قیود جو رہی سہی تھیں وہ بھی مٹ گئی ہیں۔ جو قیود آج عائد کی جا رہی ہیں، جن کی وجہ سے آج کہا جا رہا ہے کہ ہم نے بے قید معیشت ختم کر دی ہے، یہ حدود و قیود وہ ہیں جو خود نظام کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہیں۔ نظام کو بدلنے کے لیے یہ قیود نہیں لگائی گئیں۔ نظام کی خرابیاں دور کرنے کے لیے یہ پابندیاں نہیں لگائی گئیں، بلکہ خود نظام کو تحفظ دینے کے لیے قیود لگائی جاتی ہیں۔ جن کی بڑی مثال آج WTO اور ISO وغیرہ کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

چونکہ ان حدود نے اس نظام کو مزید پختہ کیا ہے، مزید تحفظ دیا ہے، اس لیے عالمی سطح پر کے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ خود سود یا ربا جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اس کا مزاج اور رجحان بھی یہی ہے کہ اس کے نتیجے میں دولت کے چھوٹے چھوٹے ذخائر مجتمع ہو کر بڑے ذخائر میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اور بڑے ذخائر جمع ہو کر مزید بڑے ذخائر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور بالآخر یہ بڑے بڑے ذخائر چند سرمایہ داروں کے کنٹرول میں آ جاتے ہیں۔ یہ بھی دولت کی غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ تقسیم ہے۔

مزید برآں ہمارے ملک میں خاص طور پر جاگیرداری کا نظام اس غیر منصفانہ تقسیم دولت اور غیر عادلانہ تقسیم وسائل کو پختہ سے پختہ تر کرنے کا سبب بنا ہے۔ سرمایہ داروں یا

جاگیرداروں کے بعض ممالک میں الگ الگ طبقے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر صورتوں میں یہ دونوں ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے وفادار سرداروں اور بااثر لوگوں کو زمینیں دے کر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کیا۔ اس زمیندار طبقے نے ملک کے زرعی وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ پھر ان زرعی وسائل سے کام لے کر صنعتیں قائم کیں۔ ان صنعتوں سے کام لے کر بڑی بڑی تجارتیں اپنے کنٹرول میں کیں۔ یوں ملک کے بڑے بڑے تجارتی ادارے ان کے انتظام میں آگئے۔ اس معاشی قوت سے کام لے کر انھوں نے سیاسی قوت بھی حاصل کر لی۔ اس طبقے کے بہت سے لوگ سول بیوروکریسی میں بھی شامل ہوئے، اور اب صورتحال یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ طبقہ جس کو انگریز نے اپنے استعماری مفادات کی خاطر وسائل سے نوازا تھا، جس کی بدولت چار ہزار انگریز پورے برصغیر پر حکومت کرتے رہے۔ وہ طبقہ اب پاکستان کا مستقل طور پر مالک بن چکا ہے۔ وہ طبقہ اب پاکستان کا مستقل طور پر حاکم بھی بن گیا ہے۔ موجودہ پاکستان کے علاقے میں جو انگریز متعین تھے ان کی تعداد چار پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ چار پانچ سو انگریز جو ساڑھے تین لاکھ مربع میل پر حاکم تھے، اس وقت تین ساڑھے تین کروڑ آبادی کو کنٹرول کر رہے تھے، وہ اسی وفادار اور جاگیردار طبقہ کے زور پر کر رہے تھے۔

ان تمام مسائل کا بنیادی، دائمی اور اصل حل تو یہ ہے کہ اسلامی معیشت کا نظام مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ ان تمام احکام اور قوانین پر ایک ایک کر کے عمل درآمد شروع کیا جائے جو شریعت نے ان مسائل کے حل کے لیے تجویز کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی سرگرمی میں حکومت کا موثر کردار، قانون سازی، پالیسی اور نگرانی کا رویہ، نگرانی کا ادارہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر اسلامی معیشت کے احکام پر عملدرآمد کا یہ کام قانون سازی اور عدالتی نگرانی کے ذریعے ہو تو اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ اسلامی نظام معیشت مؤثر انداز میں آگے بڑھے گا اور کام کرے گا۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ ابھی تک اس طبقے کے اثر رسوخ سے خاصی حد تک باہر ہے جو انگریز نے اپنے وفاداروں پر مشتمل تیار کیا تھا اور جس کی وجہ سے ابھی تک وہی پالیسیاں جاری ہیں، وہی نظام تعلیم جاری ہے، وہی قوانین کارفرما ہیں اور وہی عدالتی نظام جاری ہے جو انگریز نے آج سے دو سو سال پہلے برصغیر میں متعارف کرایا تھا۔

معاشی اصلاحات کی جب بھی بات ہوگی اور ممکنہ اقدامات کا جب ذکر آئے گا تو سود کا مکمل خاتمہ دولت کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے ایک ناگزیر قدم ہوگا۔ ربا کا خاتمہ، قانون وراثت کی مؤثر تنفیذ اور اسلامی نظام معیشت کے بقیہ احکام کا نفاذ، یہ تمام اقدامات دولت کی عادلانہ تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے ناگزیر ہیں۔

شریعت کا ایک حکم بہت اہم ہے جس پر اگر فوری طور پر عمل درآمد کیا جائے اور کچھ حکومتی وسائل اس کے لیے مختص کر دیے جائیں تو اس کے بہت دور رس مثبت اور تعمیری اثرات ہوں گے۔ وہ شریعت کا حکم احیائے موات یعنی مردہ زمینوں کی آبادکاری کا حکم ہے۔ شریعت کا حکم ہے "من احيا ارضا ميتة فهي له" جو شخص کسی غیر مملوکہ اور غیر آباد زمین کو آباد کرے وہ زمین اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اگر آج حکومت ایک پالیسی ایسی بنائے جس کے مطابق وہ تمام زمینیں جو حکومت کی ملکیت میں ہیں یا کسی فرد کی ملکیت میں نہیں ہیں، ان کی آبادکاری کی اجازت عام لوگوں کو دے دی جائے، اس کے قواعد وضوابط وضع کر دیے جائیں۔ قواعد وضوابط کا مقصد اس کام میں آسانی پیدا کرنا اور اس کام کو مرتب انداز میں کرنا ہو، رکاوٹیں ڈالنا اور کنٹرول کرنا مقصود نہ ہو تو یہ کام بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اگر حکومت زکوٰۃ کی رقم سے ان لوگوں کو مؤثر مالی امداد بھی فراہم کرے جو ان زمینوں کو آباد کرنا چاہتے ہوں اور ان کا تعلق مستحقین زکوٰۃ کے طبقے سے ہو تو بہت جلد ایسی زمینیں آباد کی جا سکتی ہیں جو آج غیر آباد پڑی ہیں۔ شریعت کا ایک حکم ہے جس کو بعض فقہائے اسلام نے ایک فقہی قاعدے کی شکل بھی دی ہے وہ ہے "التصرف على الرعية منوط بالمصلحة" یعنی حکومت کو جو اختیارات عامۃ الناس کے معاملے میں حاصل ہیں ان سب کا دار و مدار اور ان کے جواز کی بنیاد عامۃ الناس کی مصلحت پر ہے۔

تقسیم دولت کی اس ناہمواری کا جو سب سے اہم اور سب سے منفی نتیجہ نکلتا ہے وہ عام طور سے ارتکاز دولت کی صورت میں نکلتا ہے۔ یوں تو ارتکاز دولت کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن سب سے اہم سبب تقسیم دولت کے نظام کا غیر عادلانہ ہونا اور وسائل کی تقسیم میں ناہمواری ہے۔ ہمارے ملک کے لحاظ سے جاگیرداری اور ریاست کی پالیسیاں بھی اس کا بہت بڑا سبب ہیں۔ مختلف قسم کی اجارہ داریاں بھی اس کا ذریعہ ہیں۔ ان اسباب کا علاج بھی یہی ہے کہ ریاست کی پالیسیاں عادلانہ ہوں۔ اجارہ داریوں کو حتی الامکان ختم کیا جائے۔ جہاں جہاں ممکن

ہو قانون اور عدل وانصاف کے ذریعے اجارہ دارانہ کوششوں کا خاتمہ کیا جائے اور مشارکانہ سرمایہ کاری کو فروغ دیا جائے۔ یعنی استثمار اور سرمایہ کاری کی وہ صورتیں جن میں سرمایہ کاری کرنے والے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ شریک ہوں اور کاروبار کرنے والوں کے ساتھ مشارکت کے اصول پر کاروبار کریں۔ یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے تقسیم دولت کے عمل میں عدل وانصاف کی روح داخل کرنے کا اور ارتکاز دولت کے بالتدریج خاتمے کا۔

سب سے بڑھ کر اسلام کا قانون وراثت فوری طور پر اگر مؤثر انداز میں نافذ کر دیا جائے تو چند نسلوں کے بعد ہی یہ ارتکاز اراضی ختم ہوسکتا ہے۔ یوں تو نظری طور پر ہمارے ملک میں اسلام کا قانون وراثت نافذ ہے۔ لیکن اگر ریاست اس بات کو یقینی بنائے کہ جو بڑی بڑی جائدادیں ہیں، دولت کے بڑے بڑے وسائل ہیں وہ اصل مالکان کے مرنے کے بعد ان کے ورثاء میں قطعی اور یقینی طور پر تقسیم ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں دولت کا ارتکاز بہت تیزی کے ساتھ ختم ہوسکتا ہے۔

مغربی دنیا نے دولت کے اس ارتکاز کو ایک اصول کے طور پر اپنایا ہے۔ اس لیے وہاں بہت سے ایسے تصورات اور قوانین موجود ہیں جو ارتکاز دولت کو نہ صرف یقینی بناتے ہیں بلکہ اس میں اضافے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں اس طرح کا قانون وراثت نہیں ہے جس طرح کا شریعت اسلامیہ میں ہے کہ دولت وقفہ وقفہ سے قریبی رشتہ داروں میں وسیع پیمانے پر تقسیم ہوتی جاتی ہے۔ وہاں یا تو یہ بات فرد کے ذاتی صوابدیدی اختیار پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنی دولت جس کے نام کرنا چاہے کر دے۔ چنانچہ وصیت کے نتیجے میں بھی مرتکز شدہ دولت ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ کتوں کے نام دولت کی وصیت کر دیتے ہیں کوئی بلی کے نام کر دیتا ہے، کوئی کسی کے نام کر دیتا ہے، کوئی کسی کے نام کر دیتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ قریبی رشتہ داروں کو، اولاد کو، بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر کسی فاحشہ عورت کے نام پوری جائداد لکھ دی۔ بعض مغربی ممالک میں وراثت کا اگر کوئی قانون ہے بھی تو وہ توریث ذکر اکبر کا قانون ہے۔ یعنی جس شخص کی جائداد ہے، اس کے ورثاء میں جو قریب ترین مرد رشتہ دار ہے، بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا، بھتیجوں میں سب سے بڑا بھتیجا، بھائیوں میں سب سے بڑا بھائی، وہ پوری جائداد کا وارث ہو جاتا ہے۔ نہ خواتین وارث ہوتی ہیں، نہ دوسرے رشتہ دار وارث ہوتے

ہیں۔ یہ بات آپ کو حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ آپ نے آج تک پاکستان میں یا پاکستان سے باہر خواتین کے کسی بھی پلیٹ فارم کو یہ اعتراض کرتے نہیں سنا ہوگا کہ Primogeniture کا اصول خواتین کے حقوق کے منافی ہے۔ پوری جائداد سب سے بڑے بیٹے کو یا سب سے بڑے پوتے کو، یا سب سے بڑے بھائی کو کیوں چلی جائے، خواتین کو کیوں نہ ملے۔ اس پر آج تک کسی خاتون نے، کسی تنظیم نے، خواتین کے حقوق کے علمبرداروں میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ یہاں خواتین مکمل طور پر محروم ہیں۔ مرد بھی محروم ہیں۔ صرف ایک شخص دولت کا وارث بن رہا ہے۔ اس کے برعکس شریعت پر اعتراض آئے دن آپ سنتے رہتے ہیں کہ عورت کا حصہ بعض صورتوں میں آدھا کیوں ہے۔ حالانکہ جن صورتوں میں عورت کا حصہ آدھا ہے ان میں اور بقیہ تمام صورتوں میں بھی عورت پر کوئی معاشی ذمہ داری شریعت کے نظام میں نہیں ہے۔ بہر حال قانون وراثت کا عملاً نافذ نہ ہونا بھی ارتکاز دولت کے اسباب میں ہے۔

پھر مبنی پر سود معیشت کے نتیجے میں بھی ارتکاز دولت مزید شدید ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پورے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اور دولت کی تقسیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منصفانہ بنانے کے لیے پورے نظام پر بھرپور اور ناقدانہ نظر ثانی ہمہ گیر تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ ٹیکسوں کے نظام پر عادلانہ اور حقیقت پسندانہ نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ تمام طبقات کے لیے مساوی نظام ہونا چاہیے۔ بالواسطہ ٹیکس کم از کم ہوں، بلاواسطہ زیادہ ہوں۔ پھر اگر زکوٰۃ وعشر کا مؤثر نفاذ ہو تو اس سے بہت فرق پڑ سکتا ہے، تھوڑے سے وقت میں بہت بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔

شریعت نے زکوٰۃ وعشر کے نظام میں عجیب تاثیر رکھی ہے کہ چند سال کے اندر اندر غربت کا خاتمہ ہی نہیں، فقر کا خاتمہ ہی نہیں۔ بلکہ پورے معاشرے کی معاشی سرگرمی پر نمایاں طور پر مثبت اثرات سامنے آتے ہیں بشرطیکہ اس نظام کا مؤثر نفاذ کیا جائے۔ آج پاکستان میں عشر کی ادائیگی نہ ہونے کے برابر ہے جتنا عشر وصول ہونا چاہیے، اس کا پانچ فیصد بھی شاید وصول نہیں ہوتا۔ اور کوئی وصول کرنا بھی نہیں چاہتا۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے۔ زکوٰۃ جتنی وصول ہونی چاہیے اس کا پانچ فیصد بھی وصول نہیں ہوتی۔ جس زمانے میں میرا تعلق انتظامی طور پر ان معاملات سے تھا، میں نے کوشش کی تھی کہ کم از کم زکوٰۃ کے نظام کو بہتر اور مؤثر بنایا جائے، لیکن میں کامیاب نہیں ہوا۔ جن لوگوں کے مفادات تھے، جو لوگ زکوٰۃ کے تصورات کو مانتے ہی نہیں، ان کے اثرات

ملک میں بہت گہرے ہیں انھوں نے اس راستے میں رکاوٹ ڈالی اور زکوٰۃ وعشر کے نظام کو مؤثر اور بہتر بنانے کی کوششوں میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی انداز سے پورے ملک کے معاشی نظام کو از سرِ نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ ایسا معاشی نظام جس کا ایک رخ متعین ہو، جس کے اہداف اور مقاصد متعین ہوں، ان اہداف و مقاصد کے لیے جو جو اقدامات ناگزیر ہوں ان پر سختی سے عمل کیا جائے۔ ایک زمانے میں پاکستان کے پانچ سالہ منصوبوں کا بڑا چرچا تھا۔ پوری دنیا میں ان کا مطالعہ کیا جاتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ان پنج سالہ منصوبوں کے مؤثر نفاذ نے پاکستان کو معاشی اعتبار سے مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا تھا۔ اس دور کی حکومتوں اور حکومتوں کے ذمہ داروں کی باقی غلطیاں اپنی جگہ، ان کے بارے میں جو ملاحظات یا تحفظات پائے جاتے ہیں وہ اپنی جگہ بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن اس امر واقعہ کا اعتراف کرنا چاہیے کہ پانچ سالہ منصوبوں کا یہ نظام پاکستان کے لیے بہت مفید اور بار آور معاشی نتائج کا ذریعہ بنا، آج بھی ہمیں اس تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

آج کل ایک اہم مسئلہ جو مختلف ممالک کو، بالخصوص معاشی اعتبار سے پسماندہ یا کمزور ممالک کو، درپیش ہے وہ غربت اور فقر و فاقہ کا مسئلہ ہے۔ فقر و فاقہ شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ چیز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کفر اور فقر دونوں سے ایک ساتھ پناہ مانگی ہے۔ ''اللھم انی اعوذ بلك من الكفر و الفقر''۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بعض اوقات فقر کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فقر کے فتنے کی برائیوں سے پناہ مانگی ہے۔ ''شر فتنة الفقر''۔

یہ فقر معاشرے میں کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس کے کچھ اسباب تو وہ ہوتے ہیں جو انسانون کے بس سے باہر ہوں، مثلاً آفات سماوی ہیں۔ کسی علاقے کا جغرافیہ ہے، موسم ہے۔ لیکن کچھ اسباب بلکہ بیشتر اسباب وہ ہیں جو انسانوں کے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی مہم، کچھ طبقات کو محروم کیے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اخراجات کی حد بندی اگر نہ ہو۔ لوگ از خود شریعت کے احکام اور اخلاقی ہدایات کی پیروی نہ کریں اور حکومت کی طرف سے بھی اخلاقی اقدار اور اصولوں کی پابندی کا کوئی بندوبست نہ ہو تو پھر اخراجات کی حد بندی مشکل ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک خاص طبقے میں اظہار دولت اور اسراف و تبذیر میں

مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مقابلے کی تیاری کے لیے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے ناجائز دولت کا حصول شروع ہو جاتا ہے۔ ناجائز دولت کے حصول کی ان مساعی میں وہ لوگ زیادہ کامیاب رہتے ہیں جو زیادہ با اثر ہوں۔ نتیجے میں دولت کے وسائل کا رخ اس طبقے کی طرف مڑ جاتا ہے جس کے پاس وسائل زیادہ ہیں، جس کے پاس طاقت ہے، جس کے پاس اثر رسوخ ہے۔

فقر کے اسباب میں شہروں کی آبادیوں میں غیر حقیقی اور غیر ضروری اضافہ بھی ہے۔ پاکستان میں شہروں کی آبادیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ شہری آبادیوں میں غیر ضروری اضافہ جہاں بہت سے اخلاقی مفاسد کا ذریعہ بنتا ہے، بہت سی اجتماعی خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ جہاں بہت سے انتظامی مسائل پیدا ہوتے ہیں وہاں اس کے معاشی طور پر بھی منفی اثرات ہوتے ہیں۔ فقر و فاقہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیشتر شہروں کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ آبادی ان وسائل سے بڑھ جائے تو فقر و فاقہ تو لازمی طور پر پیدا ہوگا۔ اس میں اضافہ بھی ہوگا۔

پھر وہ طبقہ جو وسائل پر کنٹرول رکھتا ہے وہ عامتہ الناس کی ضروریات سے صرف نظر کر کے اپنی کمالیات پر زور دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایک محدود طبقے کی دلچسپی کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ وسائل، اور اعلیٰ سے اعلیٰ طرز معیشت فراہم کر دیا جاتا ہے۔ دولت اور وسائل کا بہاؤ اس طرف کر دیا جاتا ہے۔ عامتہ الناس کی ضروریات نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بھی مزید فقر پیدا ہوتا ہے۔ اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ شریعت کی اس ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے جو ضروریات کے بارے میں شریعت نے وضع کی ہے۔ کہ سب سے پہلے عامتہ الناس کی ضروریات کو مکمل طور پر پورا کیا جائے۔ ریاست کے وسائل اور پالیسیوں کا رخ یہ ہو کہ شہریوں کی جتنی بنیادی ضروریات ہیں ان کو اولین ترجیح حاصل ہو۔ ضروریات سے مراد وہ ضروریات ہیں جو شریعت کی نظر میں ضروریات ہوں۔ ان کو پہلے پورا کیا جائے۔ جب وسائل کے مطابق ضروریات مکمل طور پر پوری ہو جائیں۔ تو پھر جو باقی ماندہ وسائل ہیں ان کو حاجیات پر صرف کیا جائے۔ حاجیات سے مراد وہ معاملات ہوتے ہیں جن کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بنیادی ضرورت ضائع تو نہیں ہوگی۔ لیکن عامتہ الناس مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بستی میں پختہ سڑکیں نہ ہوں تو لوگ زندہ رہیں گے، لوگوں کو زندہ رہنے میں، آنے جانے میں علاج معالجے

میں، تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ لیکن مشکل بہت ہوگی۔ اگر سڑکیں موجود ہوں، وسائل دستیاب ہوں تو لوگوں کے لیے آسانی پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح کے معاملات حاجیات کہلاتے ہیں۔

ضرورت اور حاجت کا تعین حالات اور زمانے کی رعایت سے ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جو چیزیں آج ضروریات میں شمار کی جارہی ہیں وہ آج سے سو سال پہلے حاجیات میں شامل کی جاتی ہوں۔ جو چیزیں آج حاجیات میں شمار کی جارہی ہیں وہ ممکن ہے کہ آج سے سو سال پہلے کمالیات میں شامل ہوں۔ اس لیے جس دور میں فیصلہ کرنے والے فیصلہ کریں، یا وسائل صرف کرنے والے وسائل صرف کریں اس دور کے معیار اور رائج الوقت حالات کے لحاظ سے یہ تعین کرنا پڑے گا کہ ضروریات میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ حاجیات میں کون کون سے امور شامل ہونے چاہئیں۔ اور ان دونوں کے بعد کون سے معاملات ہیں جن کی حیثیت کمالیات کی ہے۔ جن کے لیے اگر وسائل موجود ہوں تو خرچ کیے جائیں۔ نہ موجود ہوں تو خرچ نہ کیے جائیں۔ کمالیات کا معاملہ اسلامی دور میں عام طور پر افراد پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ریاست کے وسائل عموماً کمالیات پر خرچ نہیں ہوتے تھے۔ اور اگر ہوتے بھی تھے تو بہت محدود سطح پر۔ ریاست کے وسائل کا بیشتر حصہ ضروریات پر اور حاجیات پر خرچ ہوتا تھا۔ اگر ایسا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تبذیر اور اسراف کو سختی سے روک دیا جائے۔ ریاست سادگی کو بطور ایک پالیسی کے اختیار کرے تو فقر و فاقے کا مسئلہ بڑی حد تک کنٹرول میں لایا جاسکتا ہے۔

آج کل جب فقر کی بات ہوتی ہے، غربت یا وسائل کی کمی کی بات ہوتی ہے تو بہت سے حضرات آبادی کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ مغربی دنیا میں یہ بات سب سے پہلے رابرٹ مالتھس نے اٹھائی تھی۔ اس کا بنیادی تھیسس یہ تھا کہ ملکوں کی آبادیاں جس رفتار سے بڑھتی ہیں وہ زرعی پیداوار کی رفتار سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے آبادی کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ مالتھس کا یہ نظریہ بہت سے مفروضات پر مبنی ہے جن کا معاشیات کے ماہرین نے گہرا علمی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ بعض جید ناقدین اور ماہرین معیشت کا کہنا یہ ہے کہ ان مفروضات میں سے ہر مفروضہ محل نظر ہے۔ خود بہت سے مغربی ماہرین معاشیات نے ان مفروضات کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

آج مغربی دنیا کے اعداد و شمار ہی نہیں، بلکہ خود مشرقی دنیا کے مثلاً پاکستان ہی کے اعداد و شمار اور اقتصادی مؤشرات سب مالتھس کے مفروضات کی غلطی اور بطلان کے شاہد ہیں۔ اعداد و شمار نے، حقائق نے، معاشی تاریخ نے، پیداوار کی رفتار نے یہ ثابت کر دیا کہ مالتھس کا نظریہ بالکل غلط اور علمی اعتبار سے بے بنیاد تھا۔لیکن اس کے باوجود مغرب کے سیکولر، مادہ پرست اور لذت پرست ذہن نے ان تمام مفروضات کو دل و جان سے قبول کر رکھا ہے۔

مالتھس کے نظریہ آبادی پر مغرب میں جن حضرات نے تنقید کی ان میں جان اسٹوارٹ مل بھی شامل ہے۔ اس نے علمی اعتبار سے، خالص مغربی معیارات کے مطابق اس نظریہ کی بہت سی کمزوریاں بتائیں۔ کارل مارکس نے بھی اس نظریہ کا بڑا مذاق اڑایا ہے۔ جدید مسلم مفکرین میں سید قطب، شیخ طاہر بن عاشور، استاذ ابوزہرہ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ وھبۃ الزحیلی، استاذ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر عبدالرحمان یسری اور دوسرے بہت سے حضرات نے خالص علمی انداز میں تنقید کر کے مالتھس کے نقطہ نظر کی غلطی واضح کی ہے۔

قرآن مجید نے واضح طور پر بتایا کہ رزق میں کمی بیشی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے رزق میں کمی بیشی رکھی ہے۔لیکن جہاں تک وسائل کی دستیابی کا تعلق ہے وہ ہر انسان کے لیے برابر ہے۔ یعنی وسائل رزق تک رسائی اور access ہر ایک کو برابر حاصل ہے۔ پھر ہر شخص اپنے وسائل، اپنی صلاحیتوں، اپنی محنت اور کوشش کے مطابق رزق پاتا ہے۔ دوسری طرف پیداوار میں اضافہ آبادی میں اضافے سے بہت زیادہ ہے۔ ہر ملک کے اعداد و شمار سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جتنا اضافہ آبادی میں ہوا ہے۔ اس سے بہت زیادہ پیداوار میں ہوا ہے۔ پاکستان میں 1947ء میں مغربی پاکستان کی آبادی کیا تھی اور پیداوار کیا تھی۔ آج مغربی پاکستان کی، جو اب پاکستان کہلاتا ہے اس کی آبادی کیا ہے، پیداوار کیا ہے۔ اور دوسرے ملکوں کے اعداد و شمار پچھلے پچاس سال کے لیے جائیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تصور بے بنیاد تھا۔ پھر رزق کے جو وسائل ابھی تک استعمال نہیں ہوئے، جن کو ابھی تک کام میں نہیں لایا گیا، وہ بے شمار ہیں۔ علامہ اقبال کے بقول ''ہزار بادہ ناسفتہ دررگ تاک است'' سمندر کے اندر کیا کیا وسائل رزق موجود ہیں۔ پہاڑوں کے اندر کیا کچھ موجود ہے۔ دریاؤں کی تہہ میں کیا ہے۔ جنگلات میں کیا ہے۔ ابھی تک تو ان میں سے بیشتر چیزوں کو کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

دوسری طرف یہ ایک امر واقعہ ہے جس سے قرآن وسنت کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ کہ اسلام کا رجحان کثرت آبادی کی طرف ہے۔ بشرطیکہ کثرت آبادی کسی فرد کے لیے ذاتی طور پر غیر عملی ثابت نہ ہو۔ شریعت نے نکاح کو سنت مؤکدہ قرار دیا۔ ازدواجی زندگی کو مجرد زندگی سے بہتر اور افضل قرار دیا۔ غیر شادی شدہ لوگوں کی شادی کرانے کی ہدایت اور تلقین کی۔ "**وانکحوا الایامی منکم و الصالحین من عبادکم وامائکم**" یہ بھی کہا گیا کہ اگر یہ لوگ فقر وفاقے کا شکار ہیں اور اس لیے ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں میں تامل کر رہے ہیں تو ان کو یقین دلاؤ کہ اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کو غنی کر دے گا۔ پھر یہ بات خاص طور پر یاد دلائی گئی کہ جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تھے وہ سب کے سب متاہلانہ زندگی گزار کر گئے ہیں اور ازواج اور اولاد کے تمام جھمیلے انھوں نے برداشت کیے۔ اور وہ حدیث تو ہم نے بارہا سنی ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "**انی مکاثر بکم الامم یوم القیامة**" کہ میں دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ کروں گا، امت کی کثرت اور قلت کے معاملے میں میری امت دوسری امتوں سے ممتاز ہونی چاہیے۔ جہاں ایسے انبیاء بھی آئیں گے جن کے ساتھ ایک ایک یا دو دو ہی پیروکار ہوں گے، وہاں حضور ﷺ کی امت تعداد اور آبادی میں سب سے زیادہ ہو گی۔

یہاں تعداد اور آبادی کی کثرت کا مطلب کیفیت کی قیمت پر کمیت میں اضافہ نہیں ہے۔ بلکہ کیفیت کے ساتھ ساتھ کمیت میں بھی اضافہ مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ کیفیت میں اضافہ کے لیے تو پورے قرآن کریم اور احادیث کے دفتر موجود ہیں۔ جہاں بہتر سے بہتر اخلاق، بہتر سے بہتر ایمان، بہتر سے بہتر کردار، بہتر سے بہتر کارکردگی، بہتر سے بہتر فکری اور تعلیمی ترقی کے بارے میں ہدایات موجود ہیں، ان سب کے ساتھ ساتھ کمی اعتبار سے بھی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ اسلام کو مطلوب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا نے محض اپنی تحسینیات اور کمالیات کی خاطر دنیا کی ضروریات وحاجیات کو قربان کرنے کا وتیرہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی آبادی کنٹرول میں رہے تا کہ جو درجہ کمالیات اور تحسینیات کا ان کو حاصل ہے وہ حاصل رہے۔ اس میں کوئی ان کا مقابلہ کرنے والا نہ ہو۔ کوئی انھیں compete کرنے والا نہ ہو۔ اور کسی ملک کی آبادی اس حد تک نہ جائے جو ان کے لیے خطرہ ہو سکے۔ یہ بات اس موضوع سے متعلق نہیں ہے جس پر ہم بات کر رہے ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

آبادی کا مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ بھی ہے۔ مغربی دنیا مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو سیاسی طور پر اپنے لیے خطرہ اور اپنے عالمی مفادات کے لیے غیر موزوں سمجھتی ہے۔

یہ بات محض اتفاق نہیں ہے کہ دنیائے اسلام کے کسی ملک کے لیے آبادی میں کنٹرول کے باب میں کبھی امداد کی کمی نہیں ہوئی۔ مختلف ملکوں پر مختلف پابندیاں لگتی رہتی ہیں۔ پاکستان بھی ان پابندیوں کا شکار رہا ہے۔ لیکن بدترین سے بدترین ادوار میں بھی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے باہر سے کبھی امداد میں کمی نہیں آئی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے جواب پر غور کیا جائے تو بہت سے نکتے واضح ہو جاتے ہیں۔

پھر یہ دعویٰ کہ کھانے والے زیادہ پیدا ہو رہے ہیں، پیداوار کم ہے، حقائق کے بھی خلاف ہے۔ خود امریکہ کی زرعی پیداوار اتنی ہے کہ وہ اپنے سے کئی گناہ آبادی کو خوراک فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن وہاں بھی تقلیل آبادی کے اصول کو بطور پالیسی کے اپنایا گیا ہے۔ مسلم ممالک میں میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ صرف ایک ملک سوڈان کی پیداوار اتنی ہو سکتی ہے کہ اگر وہاں کے تمام وسائل کو استعمال کیا جائے تو پوری دنیائے اسلام کو وہ پیداوار کافی ہو سکتی ہے۔

جدید مغربی معاشیات میں ایک اہم سوال یہ رہا ہے کہ کیا رسد اور کو مکمل طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے یا اس کو کنٹرول کیا جائے۔ اس معاملے پر ہر زمانے کے فقہاء اور مفسرین اسلام نے لکھا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے تو اس مسئلہ پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ دوسرے متعدد حضرات نے بھی اس مسئلے پر غور کیا اور اپنے غور و فکر کے نتائج کو مدون کیا۔ ان سب حضرات کی تحقیقات کی روشنی میں اسلام کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضروریات یعنی طلب کو ممکنہ حد تک محدود رکھا جائے۔ کنٹرول کیا جائے۔ یہ کنٹرول تربیت کے ذریعے بھی ہوگا۔ ماحول کے ذریعے بھی ہوگا۔ معاشرتی دباؤ کے ذریعے بھی ہوگا۔ اور جہاں ناگزیر ہو وہاں قانون کے ذریعے بھی ہوگا۔ دوسری طرف رسد یعنی ضروریات کی تکمیل کے معاملے کو قواعد کا پابند بنایا جائے۔ نہ ضروریات لا محدود ہوں اور نہ رسد لامحدود ہو۔ رسد کو قواعد کا پابند بنایا جائے اور اس کے ذریعے تقسیم دولت کے نظام کو عادلانہ بنایا جائے اور ضروریات میں سب سے اہم بات جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے وہ حاجات اصلیہ یعنی انسان کی لازمی بنیادی ضرورتیں ہیں، جس کے لیے فقہائے کرام نے کفاف کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

کفاف یعنی حاجات اصلیہ سے مراد بنیادی ضروریات ہیں۔ ان بنیادی ضروریات میں خوراک، لباس، مکان یہ تین چیزیں تو سب کے نزدیک شامل ہیں۔ کمیونزم میں بھی دعویٰ تھا کہ یہ چیزیں ہم فراہم کریں گے۔ لیکن فقہائے اسلام نے شریعت کا جو حکم سمجھا اس کی رو سے تعلیم، صحت، امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام کے ساتھ ساتھ ایک خاندانی اور متاہلانہ زندگی کی فراہمی بھی حاجات اصلیہ میں شامل ہے۔ ایک شخص کی بنیادی ضرورت میں یہ بات بھی شامل سمجھی گئی ہے کہ اس کے پاس صرف سر چھپانے کو محض ایک گھر ہی نہ ہو، بلکہ اس کا ایک خاندان بھی ہو جس کے ساتھ وہ سکون سے رہ سکے، گویا جو فرق مکان اور گھر میں ہے وہ فقہائے اسلام نے محسوس کیا۔ صرف مکان ہی کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص کو گھر کی بھی ضرورت ہے۔ ایک ٹھکانے کی ضرورت ہے جہاں اس کو روحانی اور نفسیاتی طور سکون مل سکے۔

یہی وجہ ہے کہ خلفائے اسلام نے بار بار ناداروں کی متاہلانہ زندگی کے اخراجات سرکاری وسائل سے ادا کیے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت تھی کہ بیت المال میں سال کے ختم پر جو وسائل بچ گئے ہوں ان سب کو خرچ کر کے جو غیر شادی شدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں ان سب کی شادی کرادی جائے۔ اگلے سال اطلاع ملی کہ مزید وسائل بچ گئے ہیں اور سب شادی شدہ نوجوان لڑکے لڑکیاں شادی کے فرض سے فارغ ہو گئے ہیں۔ حکم دیا کہ جتنے غیر مسلم نوجوان ہیں ان کی شادیاں کروادو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا مزاج حاجات اصلیہ کے بارے میں کیا ہے۔

یہ جو حقیقی ضروریات ہوتی ہیں یہ اگر ضرورت سے کم میسر ہوں تو اس کمی سے مایوسی جنم لیتی ہے۔ جس کو پوری خوراک نہیں ملے گی اس کے دل میں مایوسی پیدا ہونے کے خاصے امکانات ہیں۔ جسے ضرورت کے مطابق مکان اور ٹھکانہ نہیں ملے گا اس کے دل میں مایوسی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ مایوسی جب پیدا ہو جائے تو اس سے بے شمار قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مایوس انسان سے زیادہ خطرناک انسانی تہذیب تمدن اور معاشرے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ضروریات کی تکمیل میں وسائل کی بہتات ہو جائے تو یہ بھی معاشرے کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ مترفین کی کثرت بھی معاشرتی اقدار کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے، یعنی وہ دولت مند جو اپنی بے پناہ دولت کے خرچ میں کسی اخلاقی قاعدے ضابطے کے پابند نہ ہوں۔ یہ طبقہ جب کسی معاشرے

میں بڑھ جائے تو اس سے بے شمار معاشرتی خرابیاں اور اخلاقی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ایسی برائیاں جس کے نتیجے میں معاشرہ بالآخر تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔اس لیے ان دونوں کے درمیان توازن ہونا چاہیے۔

اسی توازن کا نام شریعت اور اسلام کا معاشی نظام ہے۔شریعت نے اس کے لیے ایک بنیادی اصول دیا ہے جو معروف کا اصول ہے۔معروف سے مراد یہ ہے کہ جس زمانے کے لحاظ سے آپ کوئی پالیسی یا قانون طے کر رہے ہیں اس زمانے اور ان حالات کے مطابق آپ ضرورت اور حاجت کا تعین کریں۔میں یہ بات پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بہت سے ایسے معاملات جن کو آج ضروریات میں شامل کیا جانا چاہیے وہ آج سے سو سال پہلے ضروریات میں شامل نہیں سمجھے جاتے تھے۔بہت سی ایسی چیزیں جو آج حاجیات میں سمجھی جاتی ہیں وہ آج سے پچاس سال پہلے کمالیات میں سمجھی جاتی تھیں۔آئندہ یہ صورتحال مزید تبدیل ہوگی اور ہوتی رہے گی۔

اسلامی معیشت کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ ضروری مہارتوں کا حصول بھی ہے۔فقہائے اسلام کی رائے میں مسلمانوں کے لیے ان تمام مہارتوں کا حصول فرض کفایہ ہے،جن کی ملت مسلمہ کو ضرورت ہو۔معاشی آزادی کے لیے،ملت مسلمہ کے دفاع کے لیے،علم اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے۔علاج کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اور کفاف کا بندوبست کرنے کے لیے مختلف ادوار میں مختلف مہارتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ان تمام مقاصد اور ضروریات کے لیے جن جن مہارتوں کا حصول ناگزیر ہے وہ فرض کفایہ ہیں۔یہ مہارتیں ہر دور میں بدلتی رہیں گی۔

یہ بات امام غزالی،علامہ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللّٰہ جیسے اکابر اسلام نے لکھی ہے۔جس اصول کی بنیاد پر ان حضرات نے یہ بات کہی ہے وہ مشہور فقہی اصول ہے"**ما لا یتم الواجب الابہ فھو واجب**"جس چیز پر کسی واجب کے حصول کا دارومدار ہو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔چنانچہ ملت مسلمہ کا دفاع واجب ہے،فرض ہے۔ملت مسلمہ کے دفاع کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں یا جن قوتوں کے مقابلے میں ملّت دفاع کرنا ہے ان کی ٹکر کا ساز و سامان موجود ہو۔ان کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج دستیاب ہو۔اس فوج کو وہ وسائل دستیاب ہوں جو اس دور کے لحاظ سے ناگزیر ہوں۔ان سب چیزوں کا حصول اسی طرح شرعاً فرض ہوگا جس طرح ملت مسلمہ کا دفاع فرض ہے۔یہی بات بقیہ فرائض کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

ان مہارتوں کا حصول معاشی اور مادی وسائل کا تقاضا کرتا ہے۔ معاشی وسائل ہوں گے تو یہ مہارتیں حاصل ہوں گی۔ یہ مہارتیں حاصل ہوں گی تو امت مسلمہ معاشی اعتبار سے ترقی کرے گی۔ اس لیے ان مہارتوں کی اہمیت دوہری اہمیت ہے۔ جب ہم وسائل کی بات کرتے ہیں اور ان کے لیے درکار اخراجات کی بات کرتے ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ معاشرے میں جہاں جہاں دولت خرچ ہو رہی ہے وہ کون کون سے میدان ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اور ان سے پہلے متعدد حضرات نے یہ لکھا ہے کہ وہ لوگ جو ریاستی وسائل پر انحصار کرتے ہیں، جن کو ریاستی وسائل سے تنخواہ ملتی ہے وہ تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ تو وہ ناگزیر اور بامقصد کام کرنے والے لوگ ہیں جن کے بغیر ریاست باقی نہیں رہ سکتی۔ یعنی وہ تمام لوگ جن کا تعلق زراعت سے ہے، صنعت سے ہے، تجارت سے ہے یا تعلیم و تحقیق سے ہے۔ یہ ناگزیر اخراجات کی مد ہے۔ دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اس پہلے درجے کے لوگوں کے لیے معاون اور سہولتیں فراہم کرنے والے ہیں۔ چنانچہ انتظامی امور سے وابستہ تمام لوگ، آج کل کے لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں سول ایڈمنسٹریشن۔ پھر عدالتی کام کرنے والے ادارے، دفاع سے وابستہ ادارے، مواصلات فراہم کرنے والے ادارے، صنعت و حرفت سے وابستہ حضرات۔ اور معاشرے میں مختلف خدمات پیش کرنے والے لوگ، یعنی سروسز فراہم کرنے والے لوگ۔ یہ معاون پیشے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ بھی ناگزیر ہیں۔ ان دونوں پر جو وسائل خرچ ہو رہے ہیں وہ جائز وسائل ہیں اور وہ جائز خرچ ہے۔ شریعت اس خرچ کو پسند کرتی ہے، شریعت کی نظر میں یہ مد ناگزیر ہے۔

ان دو کے علاوہ ایسے بہت سے پیشے ہو سکتے ہیں جو بے کار اور فضول ہوں، نہ دولت خود پیدا کرتے ہوں، نہ دولت پیدا کرنے میں مدد دیتے ہوں۔ شاہ ولی اللہ نے اس کی مثال دی ہے درباری شعراء کی، پیشہ ور پیروں کی، مترفین کی دل لگیوں کی اور فضول اور خرافات میں مشغول لوگوں کی۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے درباروں میں بھانڈ ہوا کرتے تھے۔ ان کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ لطیفے سنائیں اور بادشاہوں کے دل بہلائیں۔ یہ لوگ سرکاری خزانے پر بوجھ تھے۔ اس طرح شاہ صاحب کی رائے میں پیشہ ور پیر فقیر جو کچھ کام نہ کریں اور جن کی پوری زندگی اور ان کی خاندانوں کی زندگیاں لوگوں کے چندوں پر گزر جائیں۔ یہ بھی معاشرے پر بوجھ ہیں۔

یہ وہ تصور ہے جو اکابر اسلام نے وسائل کی تقسیم کے بارے میں شریعت کی تعلیم سے اخذ کیا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ آج جب ریاست کے وسائل کی تقسیم ہوگی یعنی resource allocction ہوگی تو ہمیں اسی طرح کے تین درجے یا چار یا پانچ درجے اختیار کرنے پڑیں گے۔ کچھ ناگزیر ہوں گے، کچھ ضروری ہوں گے، لیکن شاید ناگزیر نہ ہوں۔ کچھ معاون قسم کے پیشے ہوں گے۔ اسی طرح سے کچھ غیر اہم ہوں گے۔ کچھ بالکل فضول اور بے کار ہوں گے۔ وسائل کی تقسیم متعلقہ شعبوں اور مہارتوں کی اہمیت کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔

آج دنیائے اسلام کو جو اہم معاشی مسائل پیش ہیں یہ وہی ہیں جو دنیا کے اور ملکوں کو بھی پیش آ رہے ہیں۔ globalization ، privatization، multi national کمپنیاں، direct foreign investment، یہ عنوانات بڑے خوش آئند معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر عنوان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک جنت ارضی کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس کو پوری طرح لبیک کہنا چاہیے۔ دنیائے اسلام میں کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ گلوبلائزیشن اور پرائیوٹائزیشن کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں جتنے زور وشور سے آرہی ہیں۔ ڈائرکٹ فارن انوسٹمنٹ کے نام پر جس طرح اور جس انداز سے جس وسیع پیمانہ پر غیر ملکی کمپنیوں کو ملکی معیشت میں دخیل کیا جارہا ہے، جس طرح دنیائے اسلام کے لوگ دن بدن ان کے ممنون احسان ہو رہے ہیں۔ اس کے نتائج آئندہ پچاس سال بعد یا سو سال بعد کیا ہوں گے۔ اس سوال پر بہت سنجیدہ غور وخوض کی ضرورت ہے۔ پرائیویٹائزیشن کے نام سے یہ سارا زور و شور آئی ایم ایف ورلڈ بنک اور بڑے بڑے ممالک کی تجارتی کمپنیوں کے دباؤ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ دباؤ کمزور ترقی پذیر اور مقروض ممالک پر زیادہ ہے۔ اگر وہ یہ دباؤ قبول نہ کریں تو ان کے لیے مزید قرضے لینا بھی مشکل ہے، بلکہ سابقہ قرضوں کا سود ادا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

یہ تو وہ مسائل ہیں جن میں سے بعض کا تعلق حکومتی پالیسیوں سے زیادہ ہے۔ قانون یا فقہ یا شریعت کے مسائل سے کم ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسے مسائل بھی کم نہیں ہیں جو خالص فقہی نوعیت کے ہیں۔ اس دور کے اہل علم ان کو حل کر رہے ہیں۔ بعض معاملات کے بارے میں بہت سی آراء سامنے آئی ہیں۔ کئی معاملات کے بارے میں اتفاق رائے بھی پیدا ہوا ہے اور یہ رجحان واضح طور پر سامنے آیا ہے کہ ان مسائل کو اجتماعی کاوشوں اور اجتماعی اجتہاد کی بنیاد پر حل کیا

جائے اور کسی متعین فقہی مسلک کی پابندی ضروری نہ سمجھی جائے۔ بہت سے اہم معاشی مسائل کے بارے میں دور جدید کے فقہائے کرام ایک خاص انداز سے سوچ رہے ہیں۔ ان کے درمیان ایک فکری ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے۔ ان مسائل میں شیئرز اور حصص کی خرید و فروخت کا معاملہ بھی شامل ہے۔ جس پر اب تقریباً اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ ایک آدھ رائے مختلف ہے۔ لیکن غالب ترین اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ بعض شرائط کے ساتھ حصص اور شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے۔ سندات یعنی اوراق تجاریہ کی خرید و فروخت کا معاملہ بھی ایک اہم فقہی معاملہ ہے۔ فیوچر سیل یعنی مستقبل میں خرید و فروخت، ایسی خرید و فروخت جو اس چیز کی ہو جس کے آپ ابھی مالک نہیں ہیں، لیکن آئندہ جب مالک ہو جائیں گے تو اس تاریخ کو خرید و فروخت آپ ابھی سے کر رہے ہوں۔ یہ وہ معاملات ہیں جو آج اہم حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان میں جو زیادہ اہم مسائل ہیں، وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا فیوچر سیل کا مسئلہ، شیئرز اور حصص کی خریداری اور کاروبار۔ سندات اوراق مالیہ کی خرید و فروخت جیسے امور شامل ہیں۔

مقروض اگر قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے تو اس کو کیسے پابند کیا جائے کہ وہ قرضہ یا واجب الادا رقم بر وقت ادا کر دے۔ سودی نظام میں تو اس پر سود کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے سود میں اضافہ کی خوف سے وہ وقت پر قرضہ ادا کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر آج کوئی اس طرح کا قرضہ بروقت ادا نہ کرے اور قرضدار کو لٹکائے رکھے تو قرضدار کیا کرے۔ بعض حضرات اس کا حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں قرضدار کو عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن جو حال ہمارے یہاں عدالتوں کا ہے کہ دادا اپنے بچپن میں مقدمہ دائر کرے اور پوتا گر بہت خوش نصیب ہوا تو اپنے بڑھاپے میں اس کا فیصلہ حاصل کرے۔ اس صورتحال میں کسی فریق کے لیے اپنے واجبات کے حصول کے لیے عدالت میں جانا تو نا قابل عمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر کیا کیا جانا چاہیے؟

اسی طرح بیع التقسیط کا مسئلہ ہے کہ قسط وار اگر خریداری ہو رہی تو کیا اس کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ کیا نقد اور قسط وار قیمت میں فرق ہو سکتا ہے؟ پھر جسے عربی میں اسھم ممتازہ یا امتیازی حصص کہتے ہیں اس کے احکام کیا ہیں۔ اس پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ کورسز پڑھائے جا رہے ہیں۔ بازار زر کی اسلام کی تعلیم کی رو سے کیا حیثیت ہو گی۔ اس پر دورِ جدید کے فقہائے

اسلام نے غور وخوض کیا ہے اس دور میں بہت سے اہل علم نے تحقیقات اور مقالات کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان موضوعات پر عربی میں بہت سی علمی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ کریڈٹ کارڈ جسے عربی میں بطاقۃ الائتمان کہتے ہیں، بدل خلو جیسے اردو میں پگڑی کہتے ہیں، کاپی رائٹ جس سے ایک طویل زمانے تک بہت سے محتاط ایسے اہل علم اتفاق نہیں کرتے تھے۔ آج ان مسائل پر ازسرنو غور وخوض ہوا ہے۔ شخصیت اعتباریہ یعنی legal person، محدود ذمہ داری۔ یہ وہ معاملات ہیں جو آج غور وخوض کے متقاضی ہیں۔

ان معاملات میں بیشتر وہ ہیں جن کے بارے میں اتفاق رائے تیزی کے ساتھ پیدا ہو رہا ہے۔ مشرق ومغرب کے مسلمان اہل علم ایک ہی انداز سے ان مسائل کا حل سوچ رہے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ بہت جلد ان مسائل پر اجماع امت کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

بعض نئے مسائل بھی مزید سامنے آئے ہیں۔ مثلاً مشتقات مالیہ جس کو عربی میں کہا جاتا ہے۔ یہ وہ عقود ہیں جن میں قیمت کا تعین ان موجودات اور اثاثوں یعنی assets کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو موضوع عقد ہوں۔ آج وہ اثاثہ جات موجود ہیں لیکن ان کی فروخت آپ کسی اور سیاق وسباق میں کر رہے ہیں۔ مشتقات مالیہ کی خرید وفروخت میں انتقال ملکیت شامل نہیں ہوتا۔ یہ صرف ان مخاطر یا خطرات اور risks کی خرید وفروخت ہوتی ہے جو بازار زر میں کی جاتی ہے۔ جن کا تعلق ملکیت سے ہوتا ہے۔ اصل مقصد یا محرک خطرات اور رسک سے بچنا ہوتا ہے، بلکہ خطرے کو اپنے سے ٹال کر دوسرے کی طرف دھکیلنا۔ یہ تو دراصل محرک تھا۔ اب یہ مشتقات خود خطرات کا سب سے بڑا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس وقت بازار زر میں رسک کی تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مشتقات مالیہ ہیں جن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ Future Sale، Option Contract ،Forward Contract ،Future Contract ، Swap Contract، یہ سب مشتقات مالیہ ہی کے مختلف شعبے ہیں جن پر آج غور وخوض کی شدید ضرورت ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گذشتہ کچھ دنوں سے بازار زر میں بہت تیزی آئی ہے۔ نئے نئے مالیاتی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ سرمایہ کاری اور استثمار کے نئے نئے طریقے روز سامنے آ رہے ہیں۔ اس سب اسباب کی وجہ سے رسک یعنی مخاطرہ کی سطح بہت بڑھ گئی ہے۔ اب

ایک تاجر اور کاروبار کرنے والے سرمایہ کار کی بڑی کوشش یہ ہے کہ اس رسک کو اپنے سے ٹلا کر دوسرے کے سر مڑھ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین نے مشتقات مالیہ کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کو جوئے کی نئی شکل قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ مشتقات مالیہ کی کون سی قسمیں ہیں جو شرعاً قابل قبول ہوسکتی ہیں۔ کون سی قسمیں ہیں جو شرعاً ناقابل قبول ہیں۔ ان معاملات پر ابھی مزید تفصیلی غور وخوض کی ضرورت ہے۔

ان معاملات کا جواب دینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ شریعت میں رسک مینجمنٹ یعنی خطرات کے بندوبست کا کیا انتظام ہے۔ یہ دور جدید کی اسلامی بینکاری اور اسلامی تمویل کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ فقہی ادب میں یہ براہ راست زیر بحث نہیں آرہا ہے۔ فقہائے اسلام نے risk management پر براہ راست بحث نہیں کی ہے۔ لیکن فقہ اسلامی کے مجموعی قواعد کی روشنی میں اس کی تفصیلات طے کی جاسکتی ہیں اور بعض حضرات یہ کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تو وہ مسائل تھے جو آج دنیا کی اکثر معیشتوں کو پیش آرہے ہیں۔ ترقی پذیر معیشتوں کے مسائل ان کے علاوہ ہیں۔ ترقی پذیر معیشتوں میں مسلم ممالک کی معیشتیں بھی شامل ہیں اور غیر مسلم ممالک کی معیشتیں بھی۔ یہ مسائل پاکستان کو بھی درپیش ہیں۔ مثلاً معیار زندگی پست ہے۔ مثلاً پیداوار کی سطح بہت کم ہے۔ وسائل کے اعتبار سے جتنی پیداوار ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہو رہی ہے۔ بے روزگاری کھلی بھی ہے اور چھپی بھی ہے۔ زرعی پیداوار پر یا تو کلی بھروسہ ہے یا بیشتر بھروسہ زرعی پیداوار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ برآمدگی صرف خام مال کی ہو رہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک پر بھروسہ بڑھتا جا رہا ہے۔ سرمایہ کی کمی، زرمبادلہ کی کمی، ٹیکنالوجی کی کمی، یہ وہ مسائل ہیں جن کا پہلے بھی تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ یہ تمام ترقی پذیر معیشتوں کے مشترک مسائل ہیں۔

دنیائے اسلام کے مسائل ان کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی ہیں۔ غذائی پیداوار کی کمی تو ہے ہی۔ صنعتی ترقی کی بنیاد بھی کمزور ہے۔ معاشرہ عموماً صرفی معاشرہ ہے۔ معاشرہ صارفین پر مبنی ہے۔ Consumerism مسلم معاشروں میں بہت ہے۔ بیرونی ٹیکنالوجی کا غلبہ ہے۔ افرادی قوت تیزی سے بیرون ملک منتقل ہو رہی ہے، بلکہ فرار ہو رہی ہے۔ منصوبہ بندی نہ ہونے کے برابر ہے۔ تنسیق اور رابطہ کاری ناپید ہے۔ قرضوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ جہالت اور نا

خواندگی اور اس کے نتیجے میں بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ جدید دور میں ترقی کے عمل کے لیے جس بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ جس انفراسٹرکچر Infrastructure کا ہونا ناگزیر ہے وہ بہت سے مسلم ممالک میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ وسائل محدود ہیں۔ جو وسائل ہیں وہ فوری ضروریات پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ انفراسٹرکچر کی تعمیر پر وہ وسائل خرچ نہیں ہوتے۔ انفراسٹرکچر آج کل اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ جدید ترین معیار کے مطابق اگر فراہم کیا جائے تو شاید پورے ملک کے وسائل بھی اس کے لیے کافی نہ ہوں۔ یہ واقعی ایک ایسا مسئلہ ہے جو تمام کمزور ممالک کو بالخصوص مسلم ممالک کو درپیش ہے۔

پاکستان میں ان مسائل کے علاوہ اور مسائل بھی بے شمار ہیں۔ ہمارے یہاں بچتوں کی کمی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں دس فیصد کی شرح بھی بچتوں کی نہیں ہے۔ پھر جتنی بچتیں ہیں ان کا حقیقی سرمایہ کاری میں بہت کم استعمال ہے۔ بچت کا لوگ نامناسب استعمال کرتے ہیں، غیر پیداواری اخراجات میں دولت کا بیشتر حصہ خرچ ہوتا ہے۔ بعض لوگ دولت کو معطل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اسراف اور تبذیر کے معاملات میں دولت خرچ ہو رہی ہے۔ جو نہ صرف شرعاً ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔ بلکہ معاشی اعتبار سے بھی تباہ کن ہے۔

ہمارے ملک میں بھاری اور غیر عادلانہ ٹیکسوں کی بھرمار ہے۔ ٹیکسوں کا نظام غیر حقیقی ہے۔ ٹیکسوں کے نظام میں اصلاح کے لیے آوازیں تو اٹھتی رہتی ہیں۔ لیکن کوئی سنجیدہ کوشش اب تک نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی بھی تو وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ ٹیکسوں کے اس غیر عادلانہ اور غیر حقیقی نظام کی وجہ سے ٹیکس کی ادائیگی میں مشکل پیش آتی ہے۔ لوگ ٹیکس سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیکس سے فرار کے نتیجے میں سینکڑوں قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔

پھر ہمارے بہت سے مسلم ممالک میں افراط زر کی شدید بہتات ہے۔ بعض ممالک میں افراط زر کی شرح اور رفتار بہت زیادہ ہے، بعض ممالک میں کم ہے۔ پاکستان میں یہ شرح کبھی زیادہ رہی ہے، کبھی کم رہی ہے۔ ہمارے ملک میں منڈی کی کمزوری اور بے تاثیری بھی معاشی کمزوری کی ایک بڑی وجہ ہے۔ غیر پیداواری اخراجات کی کثرت، مستحکم مالیاتی اداروں کی شدید کمی اور شرح سود کی کثرت۔ یہ وہ اسباب ہیں جنھوں نے پاکستانی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہونے دیا۔ یہ سب مسائل دیرپا حل کے متقاضی ہیں۔ یہ ایک ایسے حل کے منتظر ہیں جو فنی

اعتبار سے کامیابی کا ضامن اور نظری اعتبار سے اسلامی شریعت کے مطابق ہو۔ جب ایسا ہوگا تو وہ معاشی ترقی روبہ عمل آئے گی جس کا پاکستانی عوام کو بہت عرصے سے انتظار ہے۔

معاشی ترقی اسلامی تصور کی رو سے کیا ہے۔ مغربی تصور کی رو سے کیا ہے۔ اس کی شرائط اور تقاضے کیا ہیں۔ رکاوٹیں کیا ہیں۔ یہ بھی ایک اہم معاشی مسئلہ ہے۔ جس پر مفکرین اسلام نے غور کیا ہے۔ شریعت اسلامیہ کے مطابق معاشی اور اجتماعی وسائل کی تیاری اور استعمال، افراد کار کی تیاری، کسب حلال کا بندوبست اور مسلم معاشرے کی مادی اور تہذیبی مقاصد کی تکمیل۔ یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن کو ترقی کا اسلامی تصور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ترقی کے اسلامی تصور میں صرف مادی ترقی شامل نہیں ہے۔ روحانی، اخلاقی، ذہنی اور تہذیبی ترقی بھی شامل ہے۔ قرآن مجید نے اس کو ''حیاۃ طیبہ'' کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ ایسی پاکیزہ اور ستھری زندگی جو ہر اعتبار سے پاکیزہ اور ہر اعتبار سے ستھری ہو۔ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ آسمان اور زمین کی برکتیں تم پر کھل جائیں گی۔ آسمان وزمین کی برکتوں سے مراد تمام اخلاقی، روحانی، مادی اور اقتصادی برکات کا حصول ہے۔

یہ وہ چند اہم مسائل ہیں جو آج ماہرین معیشت کو درپیش ہیں۔ ان میں سے بعض اہم کا میں نے تذکرہ کیا۔ کچھ اور مسائل ہیں جو رہ گئے ہیں۔ ان کا تذکرہ آئندہ گفتگوؤں میں کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ان میں سے ایک اہم مسئلہ جو ہر دور میں پچھلے سو پچاس سال سے بیشتر مسلم معیشتوں کو درپیش رہا ہے وہ افراط زر کا معاملہ ہے۔ افراط زر دراصل کاغذی کرنسی کے لازمی نتائج میں سے ہے۔ نہ صرف کاغذی کرنسی کے نتائج میں سے ہے، بلکہ سودی معیشت کا بھی ایک لازمی تقاضا ہے۔ جہاں جہاں سودی معیشت ہوگی وہاں افراط زر کسی نہ کسی صورت میں ضرور پایا جائے گا۔ افراط زر کو کنٹرول کرنے کی بہت سی صورتیں مغربی ماہرین معیشت نے سوچی ہیں۔ جن میں بعض شرعاً قابل اعتراض ہیں۔ بعض شرعاً قابل قبول ہوسکتی ہیں۔ ان تدابیر پر کم از کم غور ضرور کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب افراط زر کے وقتی، عارضی اور جزوی حل ہیں۔ افراط زر کا اصل حل یہ ہے کہ قرضوں کا کاروبار کرنے کے بجائے حقیقی تجارت ہو۔ حقیقی خدمات یا حقیقی اصول یعنی اثاثہ جات کی بنیاد پر کاروبار ہو۔ سودی معیشت کی جگہ مشارکانہ معیشت جنم لے۔ زر کاغذی کی بنیاد زر حقیقی پر ہو۔ اور زر حقیقی کی بنیاد حقیقی موجودات یا حقیقی اثاثہ جات یعنی real assets کی

بنیاد پر ہو۔ ظاہر ہے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے طویل کوشش اور محنت درکار ہے۔ اتنا وقت پاکستان میں کوئی دینا نہیں چاہتا۔ اتنا طویل عرصہ کوئی انتظار کرنا نہیں چاہتا۔ ذمہ دار حضرات دفع الوقتی سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اپنا وقت اچھا گزار کر مسائل آئندہ آنے والوں کے لیے ٹال دینا چاہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ مسائل جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مسئلے کا حل اس کو ٹالنا نہیں، اس کو حل کرنا ہوتا ہے۔

چوتھا خطبہ

معیشت وتجارت میں ریاست کا کردار

چوتھا خطبہ

معیشت وتجارت میں ریاست کا کردار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''معیشت وتجارت میں ریاست کا کردار''۔ یہ بات پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ اسلامی ریاست میں معیشت وتجارت کے معاملات عام طور پر ریاست اور حکومت کی مداخلت سے آزاد رہتے ہیں۔ ریاست کو براہ راست مداخلت کے اختیارات بعض خاص اور استثنائی صورتوں میں ہیں۔ عموماً اسلام کی تعلیم کا رجحان یہ ہے کہ بازار، معیشت اور تجارت کی قوتیں اور محرکات از خود آزادانہ اور منصفانہ انداز میں کام کرتے رہیں تو ریاست کو مداخلت کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔ البتہ ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ تجارت و معیشت کے لیے سہولتیں فراہم کرے۔ اس بات کو یقینی بنائے کہ شریعت کے قوانین اور ریاست کے احکام پر عمل ہو رہا ہے۔

اسلامی ریاست کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ معاشرے میں ایسے لوگ مؤثر نہ ہونے پائیں جو قوانین اور احکام کو نظر انداز کرکے اپنے ذاتی مفاد کے لیے بازار کے رجحانات کو خراب کر رہے ہوں۔ اسی طرح ریاست عامۃ الناس کو سہولتیں فراہم کرے گی اور تاجروں اور معیشت سے وابستہ حضرات کو قانون، پالیسی اور انتظامی سہولتوں کے ذریعے وہ تمام اسباب فراہم کرے گی جو تجارت اور معیشت کی آزادانہ کارکردگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشی سرگرمی کی نگرانی، ریگولیٹری فریم ورک، پیشوں کی تنظیم اور

ضابطہ بندی انفرادی ملکیت کو شریعت کو حدود کے اندر رکھنے کے لیے کنٹرول، احیائے موات کا مناسب بندوبست اور فرائض کفایہ کے باب میں ذمہ داریوں کی انجام دہی، یہ تمام معاملات ریاست کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔شریعت کی واضح نصوص کی رو سے نرخ بندی یعنی قیمتوں کا پیشگی تعین ریاست کونہیں کرنا چاہیے۔عام حالات میں ریاست کو نرخ بندی کے ذریعے بازار کو کنٹرول کرنے کی پالیسی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔لیکن اگر ریاست یہ محسوس کرے کہ بازار میں کچھ عناصر غیر ضروری طور پر قیمتوں میں اضافے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے، زیادہ منافع خوری کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے بازار کے نرخ کو خراب کر رہے ہیں تو پھر ریاست کو بطور نگران اور ریگولیٹر کے مداخلت کرنے کا اختیار ہے۔ان استثنائی حالات میں ریاست کو ایسے اقدامات کرنے کی اجازت ہے، جو قیمتوں کو معقول سطح پر رکھنے میں مدد دیں، تاکہ تمام متعلقہ طبقات کے حقوق عدل وانصاف کے ساتھ فراہم کیے جاسکیں۔

ریاست کی ذمہ داریوں کے باب میں فرائض کفایہ کی بہت اہمیت ہے۔فرائض کفایہ سے مراد وہ فرائض ہیں جو بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کے ذمے ہیں۔اگر امت مسلمہ میں سے کچھ لوگ ان فرائض کو بطریقہ احسن انجام دے رہے ہوں۔مناسب اور کافی انداز میں ان کی انجام دہی ہو رہی ہو تو پھر عام مسلمان ان ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔لیکن اگر کچھ حضرات اس کام کے لیے آگے نہ بڑھیں یا کچھ لوگ آگے بڑھیں لیکن وہ موثر اور کافی انداز میں مطلوبہ معیار کے مطابق ان فرائض کو انجام نہ دے پا رہے ہوں تو پھر پوری امت مسلمہ اس کوتاہی کی ذمہ دار اور اس کوتاہی کی حد تک گنہگار ہوگی۔

امت مسلمہ کے ارکان کی تعداد ظاہر ہے ہر دور میں بہت رہی ہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے، اس وقت بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔اس لیے امت مسلمہ کو ہمیشہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کی طرف سے کوئی ادارہ یا ریاست ان فرائض کو انجام دینے کا بندوبست کرے۔ریاست کی عدم موجودگی یا عدم دلچسپی کی صورت میں معاشرہ کے نمایاں افراد یا شہری تنظیموں کو یا جن کو آج کل سول سوسائٹی کہا جاتا ہے یہ ذمہ داری انجام دینی چاہیے۔اس طرح کی تنظیمیں ان فرائض کی انجام دہی کا اہتمام کریں۔تاہم یہ ذمہ داری سب سے زیادہ ریاست کی ہے۔ریاست کو ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جو امت مسلمہ کو فرائض کفایہ کی انجام دہی میں مدد

دیں اور ان تمام معاملات میں جو فرائض کفایہ کی نوعیت رکھتے ہیں ایک رابطہ کار کا فریضہ انجام دیں۔ ان فرائض کے علاوہ آج کل دور جدید میں جس کو اقتصاد کلی کہا جاتا ہے، کلی معاشیات یا macro economics، اس کے تقاضوں کی تکمیل میں ریاست کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ چونکہ آج کل کا معروف یہ ہے جس کی تائید تجربے نے بھی کی ہے، عقل اور منطق نے بھی کی ہے۔ اور یہ چیز شریعت کے احکام سے متعارض نہیں ہے۔ اس لیے شرعاً اس کو اختیار کرنا مستحسن ہے کہ macro economics کے معاملات میں ریاست کا کردار بنیادی ہو۔ یہ کام ریاست ہی کر سکتی ہے کہ پورے ملک کی معیشت کا ایک بھرپور جائزہ لے کر یہ طے کرے کہ کن کن شعبوں میں کس طرح کے کام کی ضرورت ہے۔ ملکی معیشت کا اندازہ کرنے کے لیے جن محرکات کا جائزہ لینا چاہیے، جن اسباب وعوامل کو ترقی دینی چاہیے۔ جن اسباب وعوامل کو کنٹرول کرنا چاہیے، یہ کام ریاست ہی کر سکتی ہے۔ معاشرے میں اگر بے روزگاری پھیل رہی ہے جو آج کل کا ایک بڑا اہم مسئلہ بن گیا ہے تو بے روزگاری ختم کرنے کے لیے بنیادی کردار ریاست ہی ادا کر سکتی ہے۔ افراد یا اداروں کا کردار بے روزگاری کے معاملے میں ظاہر ہے کہ بہت محدود ہوگا۔

پھر آج کل کے دور میں مالیاتی اور نقدی پالیسی ریاست ہی طے کرتی ہے۔ چونکہ آج کل سارا دارومدار زر اعتباری پر یا کاغذی سکہ پر ہوگیا ہے اور زر اعتباری ریاست ہی جاری کر سکتی ہے۔ ریاست کی طرف سے اس کا مرکزی بنک ہی زر اعتباری جاری کرتا ہے۔ اس لیے ریاست ہی کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس کی زری پالیسی کیا ہوگی۔ مالیات کے بارے میں اس نقطہ نظر کیا ہوگا۔ کس طرح اور کس انداز سے وہ اس پالیسی کو چلائے گی۔ کب اور کتنا زر جاری کرے گی۔ کتنے زر مبادلہ کے ذخائر اپنے پاس رکھے گی۔ ان زر مبادلہ کے ذخائر میں کتنے ہوں گے جو اندرون ملک رکھے جائیں گے۔ کتنے ہوں گے جو سرمایہ کاری کی غرض سے یا دوسرے اہم مقاصد کے لیے بیرون ملک رکھے جائیں گے۔ یہ کام افراد کے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ کام صرف ریاست کے کرنے کا ہے اور اس کو ریاست ہی کرے گی۔

اس کے علاوہ ملک کی عمومی طور پر معاشی ترقی ریاست کا کام ہے۔ ریاست ہی طے کرے گی کہ پورے ملک کو ترقی سے ہم کنار کرنے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ کیا کیا ترجیحات ہونی چاہئیں۔ یہ فیصلہ ریاست ہی کر سکتی ہے کہ کن پہلوؤں کو زیادہ توجہ کا مرکز

بنایا جائے اور کن پہلوؤں کو سردست مؤخر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ خاص طور پر پاکستان جیسے ملک میں ریاست کا یہ کردار انتہائی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں بعض علاقے الحمد للہ ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں وسائل سے خوب نوازا ہے۔ وہاں ہمارے بلوچستان میں بعض ایسے ضلع بھی ہیں جو ابھی تک انتہائی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہیں۔ بعض پورے پورے ضلع ایسے ہیں جن میں کوئی بنک سرے سے نہیں پایا جاتا۔ بعض ضلع ایسے ہیں جن میں ایک آدھ مرکزی سڑک کے علاوہ سڑکیں نہیں ہیں۔ ذرائع مواصلات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سندھ کے بعض علاقوں میں سینکڑوں میل تک پانی نہیں پایا جاتا۔ یہ وہ معاملات ہیں جو فقہی احکام کی رو سے ضروریات شدیدہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے ان علاقوں پر بھرپور توجہ صرف کی جائے جو انتہائی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ شریعت کی رو سے ریاست کے وسائل کو کہیں اور خرچ کرنا جائز نہیں ہے، حرام ہے، جب تک ملک کے کچھ لوگ اپنی انتہائی بنیادی اور شدید ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ یہ ترتیب جس کا پہلے بھی کئی بار ذکر کیا جا چکا ہے، ضروریات، حاجیات اور تکمیلیات کی اصطلاحات کے حوالے سے فقہائے اسلام نے بیان کی ہے اس ترتیب کو اقتصادی ترقی کے پروگرام میں ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔

پھر اقتصاد کلی کا ایک اور شعبہ درآمد اور برآمد میں توازن بھی ہے۔ آج کل یہ معاملہ اتنا اہم ہو گیا ہے کہ پورے ملک کی معیشت کا مستقبل درآمد و برآمد میں توازن پر منحصر ہے۔ یہ کام عامتہ الناس پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہاں ریاست کو اپنا بنیادی کردار ادا کرنا پڑے گا۔ اگر درآمد برآمد کا معاملہ صرف عامتہ الناس پر چھوڑ دیا جائے تو پھر ہر تاجر کی کوشش یہی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے، زیادہ سے زیادہ اشیائے صرف درآمد کرے۔

ہر قسم کی اشیائے صرف درآمد کرے، جس چیز کے بھی خریدار پائے جاتے ہوں وہ جہاں سے بھی ملے اندرون ملک درآمد کر لے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر چیز کے لیے ملک کے بازار کھل جائیں گے۔ مقامی صنعت اور انڈسٹری تباہ ہو جائے گی۔ درآمد و برآمد میں توازن مختل ہو جائے گا۔ اس لیے ریاست ہی کو یہ طے کرنا چاہیے کہ کن چیزوں کی درآمد ملک کے مفاد میں ہے۔ کن چیزوں کی برآمد ملک کے مفاد میں ہے۔ اور کن چیزوں کی درآمد و برآمد ملک

کے لیے نقصان دہ ہے۔

جن چیزوں کی درآمد و برآمد ملک کے لیے فائدہ مند ہے ان کی درآمد و برآمد کے لیے ریاست وسائل فراہم کرے گی۔ سہولتیں پیدا کرے گی۔ حوصلہ افزائی کے جتنے مناسب اور ضروری اقدامات ہو سکتے ہیں وہ ریاست کرے گی۔ لیکن اگر کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی درآمد و برآمد ملک کے لیے نقصان دہ ہے۔ عامۃ الناس کے لیے تکلیف کا موجب ہے تو ریاست اس پر پابندیاں لگائے گی۔ مثال کے طور پر ملک کے اندر اجناس خوردنی کی کمی ہو اور کسی پڑوسی ملک میں بھی شدید کمی ہو تو اس صورتِ حال میں اجناس خوردنی کی درآمد کی اگر کھلی چھٹی دے دی جائے اور یہ کام افراد کے اختیار میں ہو تو تمام بڑے بڑے تاجر اور ذخیرہ اندوز اجناس خوردنی دوسرے ملک کو برآمد کر دیں گے۔ زرمبادلہ کمائیں گے اور اندرون ملک عامۃ الناس کو اجناس ضرورت سے محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس طرح کے بہت سے معاملات ہو سکتے ہیں جہاں آج کل کے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر ریاست کو درآمد و برآمد کے عمل میں مداخلت کرنی پڑتی ہے اور یہ مداخلت ناگزیر ہے۔ جو چیز ناگزیر ہو تو اس کے لیے اسباب اختیار کرنا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ شریعت کا اصول میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ ''مالایتم الواجب الا به فهو واجب''۔ جس چیز پر کسی واجب کا دارومدار ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے۔ مشہور حکیم الاسلام اور نامور شافعی فقیہ علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے کہا ہے کہ ''الوسیله الی افضل المقاصد افضل الوسائل و الوسیله الی ارذل المقاصد ارذل الوسائل'' جو چیز اعلیٰ ترین مقصد کے حصول کا وسیلہ ہو وہ اعلیٰ ترین وسیلہ سمجھی جائے گی، جو چیز بدترین مقصد کے حصول کا ذریعہ ہو وہ بدترین ذریعہ سمجھی جاتے گی۔ یوں ذریعہ اور وسیلہ کے احکام وہی ہوں گے جو اس مقصد کے ہیں جن کے لیے وہ وسیلہ اختیار کیا گیا ہے۔

کلی معاشیات یعنی macro economics کے کچھ اہداف ہوتے ہیں، کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ وہ اہداف اور مقاصد ہیں جو ریاست کو پورے کرنے چاہئیں اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اپنی پالیسی، قوانین اور نگرانی کے اختیار کے ذریعے ان مقاصد کو حاصل کرے۔ ملک میں اقتصادی ترقی، توازن اور یکسانیت کے ساتھ ہو تو پورا ملک ترقی کرے گا، ورنہ بعض

علاقے پیچھے رہ جائیں گے۔ ایسا ہو تو یہ شریعت کے تصوّرِ عدل کے خلاف ہے۔ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ عدل اور مساوات کے اسلامی ہدف کو حاصل کرے۔ حتی الامکان ریاست کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ملک کے مختلف علاقوں اور عامتہ الناس کے مختلف طبقوں کے درمیان اقتصادی ترقی کی شرح بہت زیادہ متفاوت نہ ہو۔ تھوڑا بہت تفاوت تو ناگزیر ہوتا ہے جس سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا۔ بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے تجارتی مراکز ہوں گے۔ بڑے بڑے بینکوں کے دفاتر بڑے شہروں میں ہوں گے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں بڑے شہروں میں ہوں گی۔ یہ چیزیں چھوٹی بستیوں میں یا گاؤں میں نہیں ہو سکتیں۔ ان کے اقتصادی اثرات اور معاشی ثمرات بڑے شہروں تک محدود رہیں گے۔ اس حد تک تو تفاوت ناگزیر ہے۔ لیکن جیسا تفاوت ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے اور کافی عرصے سے موجود ہے۔ جس کو دور کرنے کی کسی حکومت نے سنجیدگی سے کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں کی۔ یہ شرعاً انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

اقتصادِ کلی کے دوسرے اہداف میں قیمتوں میں استحکام کا معاملہ بھی شامل ہے۔ قیمتوں میں استحکام ریاست کی معاشی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر قیمتوں میں استحکام نہ ہو تو نہ درآمد درست ہو سکتی ہے نہ برآمد درست ہو سکتی ہے۔ قیمتوں میں استحکام نہ ہو تو تنخواہ دار طبقہ اور محدود آمدنی رکھنے والے لوگ اپنی زندگی کے معاملات کو درست نہیں کر سکتے۔ قیمتوں میں استحکام اس لیے بھی ضروری ہے کہ افراطِ زر جو آج کل زر اعتباری کا ایک لازمی نتیجہ ہو گیا ہے اسے کم سے کم رکھا جائے۔ جب تک زر اعتباری کا نظام دنیا میں موجود ہے اس وقت تک مکمل طور پر افراطِ زر کو ختم کرنا شاید ممکن نہیں ہے۔ البتہ مناسب اقدامات اور تدبیروں سے اسے کم سے کم رکھا جا سکتا ہے۔ کم سے کم جو عامتہ الناس کی سکت سے باہر نہ ہو۔ اس کام کے لیے ضروری ہے کہ ایک متوازن مالیاتی اور زری پالیسی وضع کی جائے جس پر ریاست کے تمام ادارے کام کریں۔ مالیاتی اور زری پالیسی وضع کرنا ریاست کا ہی کام ہے اور یہ ریاست کے اقتصادی اہداف میں سے ایک ہے۔

حکومتی اخراجات کو کم سے کم کرنا اور ملک میں بے روزگاری کو ختم کرنا بھی اقتصادِ کلی کے مقاصد میں شامل ہے۔ ریاست کے اخراجات کم سے کم ہوں، یہ بات ہمیشہ سے ماہرین معیشت اور مفکرین کا اہم موضوع بحث رہی ہے۔ مفکرین اسلام نے بھی اس پر گفتگو کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے، علامہ ابن خلدون نے اور متعدد اہل علم نے اس بات کی اہمیت پر روشنی

ڈالی ہے کہ ریاست کے اخراجات کو کم سے کم کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا کیا جانا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ نے ایک جگہ پیشوں کی تفصیلات بتائی ہیں اور کچھ پیشوں کو بے کار اور فضول پیشے قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان پیشوں کے حاملین اگر معاشرے میں بڑھ جائیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو یہ ریاست کے خزانے پر غیر ضروری طور پر بوجھ ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ پورے معاشرے کی تباہی اور بربادی کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ اگر فن کے نام پر، شعر وادب کے نام پر، کسی اور تفریح کے نام پر ہزاروں، لاکھوں انسان سرکاری خزانے پر بوجھ بن جائیں تو سرکاری خزانہ بالآخر اس نقصان کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

ہم اہل پاکستان کے لیے پی آئی اے کی مثال بہت نمایاں اور عبرت انگیز سامنے ہے۔ پی آئی اے جو پاکستان کے لیے انتہائی قابلِ فخر ادارہ تھا، جو ایک زمانے میں پوری دنیا کے لیے نمونہ تھا، جس نے دنیا کی وہ بڑی بڑی ائر لائنیں بنائیں جو آج دنیا میں بڑی بڑی ائر لائنیں سمجھی جاتی ہیں۔ جن کا آغاز پی آئی اے کے ہاتھوں ہوا، وہی پی آئی اے آج تباہی اور بربادی کا شکار ہے اور اس کی اصلاح کی تمام کوششیں پچھلے تیس سال میں ناکام ہو گئی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ، شاید سب سے بڑی وجہ، یہ ہے کہ پی آئی اے کے خزانے پر ایسی ایسی سرگرمیوں کا بوجھ لاد دیا گیا جو غیر پیداواری سرگرمیاں تھیں۔ کسی سیاسی لیڈر نے یہ چاہا کہ اس کے حامیوں کو پی آئی اے میں نوکریاں دے دی جائیں۔ کسی کے دل میں یہ آیا کہ جتنے ناچ گانے والے طائفے ہیں ان کو پی آئی اے کے خرچ پر پالا جائے۔ کسی کے دل میں یہ آیا کہ جتنے لوگ اس ادارہ سے وابستہ ہیں ان کو زندگی بھر مفت سفر کی سہولتیں دے دی جائیں۔ ان سب ناجائز قباحتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اخراجات تو بڑھتے چلے گئے لیکن آمدنی کم ہوتی چلی گئی اور اب وہ صورتحال پوری طرح سامنے آ گئی ہے جس سے بچنے کی خاطر مفکرین اسلام نے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور دوسرے حضرات نے یہ تلقین کی تھی کہ سرکاری وسائل کو محدود انداز میں خرچ کیا جائے اور جہاں جہاں سرکاری وسائل خرچ کیے جاتے ہیں ان راستوں کو کم سے کم رکھا جائے۔

یہ تو گفتگو تھی اقتصاد کلی کے بارے میں ریاست کی ذمہ داری کی جہاں ریاست ہی کی اصل ذمہ داری ہے۔ جہاں تک اقتصاد جزئی یعنی micro economics کا تعلق ہے وہاں بھی ریاست کی ذمہ داری بالکلیہ ناپید نہیں ہے۔ وہاں ریاست کا کردار بنیادی طور پر صرف نگرانی

اور رہنمائی کا ہے، ثالث بالخیر کا ہے، سرپرستی اور حوصلہ افزائی کا ہے اور سہولت فراہم کرنے والے کا ہے۔ جزوی معاشیات میں بعض معاملات ایسے آجاتے ہیں جن سے ریاست کے ادارے ہی بہتر اور مؤثر طریقہ سے عہدہ برآ کر سکتے ہیں۔ مثلاً صارف اور صنعت کار کے رویے کا ماہرانہ تجزیہ، صارف کیا چاہتا ہے، صنعت کار کیا چاہتا ہے اور ان دونوں کی مصلحتوں کو ہم آہنگ کس طرح کیا جائے۔ جہاں یہ دونوں مصلحتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی اور قدرتی اور فطری اعتبار سے ہم آہنگ ہوں گی وہاں معاشرے کے لیے بہتری ہوگی۔ ان دونوں کو اگر مصنوعی طور پر ہم آہنگ کیا جائے گا، غیر ضروری طور پر صارف کے رویے کو بدلا جائے گا، غیر ضروری طور پر صنعت کار کے مفاد کو ترجیح دی جائے گی تو اس سے اقتصادی نظام مختل ہوگا۔

رسد اور طلب کا معاملہ بھی اقتصاد جزئی کا ایک اہم معاملہ ہے۔ عام حالات میں ریاست اس میں دخل نہیں دے گی۔ اگر رسد اور طلب کی قوتیں فطری انداز میں کام کرتی رہیں۔ اگر اخلاق اور شریعت کی حدود کی پابندی کی جائے تو اس کے نتیجے میں کوئی مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن جہاں اخلاق، شریعت یا قانون کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے وہاں رسد اور طلب کی قوتوں کو آزادانہ کام کرنے کا موقع نہیں ملتا، ایسے میں ریاست کو مداخلت کرنی چاہیے۔ وہاں ثالث بالخیر کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ قیمتوں میں اور جو مطلوبہ رسد ہے یا جو حقیقی سپلائی ہے ان دونوں میں منطقی اور معقول ربط ہونا چاہیے۔ یہ کام ریاست کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر افراد از خود یہ کام کرتے رہیں۔ تاجر اور خریدار، پیداوار کرنے والے، صنعت کار، زراعت پیشہ حضرات، یہ سب طبقے مل جل کر خود ہی توازن اور عدل وانصاف کے ساتھ یہ کام کرتے رہیں تو پھر ریاست کو مداخلت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ورنہ ریاست کو یہ کام کرنا پڑے گا اور ایک ایسے متوازن نقطے تک پہنچنے میں اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا جو ناگزیر ہے۔

اسلامی معاشیات کے بارے میں یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اس کی بنیاد عدل، وسائل کی منصفانہ تقسیم، ارتکاز دولت کی ممانعت اور حوصلہ شکنی، ذخیرہ اندوزی کی حرمت، شخصی ملکیت کے احترام اور ذرائع پیداوار تک رسائی میں مساوات جیسے اہم تصورات اور اصولوں پر ہے۔ انہی بنیادوں پر اسلامی معاشیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ تمام وہ معاملات ہیں جو آج کل ریاست کی طرف سے قانون سازی کے بھی متقاضی ہیں اور پالیسی سازی کا بھی تقاضا

کرتے ہیں، اور جب تک ریاست مؤثر نگرانی کے ذریعے ان قوانین اور پالیسیوں پر عمل درآمد نہ کرائے تو نہ عدل کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں، نہ منصفانہ تقسیم کے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں، نہ ارتکاز دولت کو روکا جا سکتا ہے، نہ ذخیرہ اندوزہ کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معیشت ایک اعتبار سے کنٹرولڈ معیشت ہے۔ یہ مغربی مفہوم میں کنٹرولڈ معیشت نہیں، بلکہ یہ اسلامی مفہوم میں کنٹرولڈ ہے کہ ریاست اپنے کنٹرول کے ذریعے شریعت کے احکام کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ شریعت کے واجبات پر عمل درآمد کرائے۔ شریعت کے محرمات کو سختی سے روکے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو مناسب سزا دے۔ ربا کی حرمت پر آج کل کے دور میں جب تک ریاست کی مداخلت اور پوری مدد نہ ہو، عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ غرر اور قمار شریعت میں حرام ہے۔ غرر اور قمار کی آج کل اتنی شکلیں رائج ہوگئی ہیں کہ جب تک ریاست قانون سازی کے ذریعے ان کی ممانعت نہ کرے اور پالیسی کے ذریعے مسلسل ان کی حوصلہ شکنی نہ کرے اس وقت تک ان محرمات سے اجتناب کرنا مشکل ہے۔

عدل اسلامی نظام کا بنیادی ستون ہے۔ شریعت کے تمام احکام کا دارو مدار عدل پر ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمام آسمانی شریعتوں کا، تمام انبیاء علیہم السلام کا، اور تمام آسمانی کتابوں کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔ عدل وانصاف کی سب سے اہم اور بنیادی قسم جس سے ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے وہ عدل اجتماعی ہے۔ عدل قضائی یا قانونی یعنی عدالتی عدل وانصاف کہ آپ کا مقدمہ ہے، آپ عدالت میں چلے گئے وہاں سے عدل کے مطابق فیصلہ ہو گیا، یہ بھی بہت اہم ہے۔ لیکن اس کا تمام انسانوں سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔ سو میں ایک آدھ کا مقدمہ عدالت میں ہوتا ہے، باقی اٹھانوے ننانوے فیصد لوگوں کا عدالتوں سے براہِ راست رابطہ نہیں ہوتا۔ لیکن عدل اجتماعی کا تعلق سب سے ہوتا ہے۔ ہر انسان کو وسائل پیداوار اور وسائل آمدنی کی ضرورت ہے۔ وسائل آمدنی کی تقسیم اگر عدل کے مطابق نہ ہو، معاشرے میں سوشل جسٹس موجود نہ ہو تو پھر ہر انسان ظلم کا شکار ہو جاتا ہے۔

عدل کی نقیض ظلم ہے۔ اسی لیے علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ ہر خیر عدل ہے اور ہر شر ظلم ہے۔ عدل نور ہے اور ظلم ظلمات ہے۔ حدیث میں آیا ہے، صحیح بخاری میں ہے "**الظلم ظلمات یوم القیامۃ**"۔ ظلم روز قیامت شدید تاریکیوں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ اس لیے ہے کہ عدل

توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر توحید پر حقیقی ایمان ہو تو عدل کا اصول اختیار کیا جانا ناگزیر ہے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ عدل کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے، ظلم سے ترقی رک جاتی ہے۔ ترقی رکنے سے ریاستیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ عدل کا حقیقی نفاذ شریعت کے نفاذ سے ہی ہو سکتا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے بغیر عدل حقیقی ممکن نہیں ہے۔ جہاں عدل حقیقی ممکن نہیں ہے وہاں حقیقی اور متوازن ترقی بھی ممکن نہیں ہے۔ حقیقی ترقی جہاں نہیں ہوگی وہاں ظلم ہوگا۔ ظلم سے رہی سہی ترقی بھی رک جائے اور ترقی رکنے سے ریاستیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ابن خلدون نے بھی لکھی ہے اور دوسرے بہت سے مؤرخین اسلام اور مفکرین نے بھی لکھی ہے۔

عدل کے حصول کے بنیادی عوامل شریعت کے مصادر میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہی عوامل ہیں جن کو آج کل فلاحی معاشرے کے عوامل کہا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی عامل یہ ہے کہ تقسیم دولت کا نظام عادلانہ ہو۔ ارتکاز دولت کو شریعت اسی لیے ناپسند کرتی ہے کہ ارتکاز دولت کی موجودگی میں عدل اجتماعی ممکن نہیں ہے۔ شریعت کے احکام تقسیم دولت کے نظام کو عادلانہ بنانے کے لیے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آمدنی کے وسائل کی عادلانہ فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ جب تک معاشرے کے ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق، اس کی ضرورت کے مطابق اور معاشرے کے رائج الوقت معاشی معیار کے مطابق وسائل رزق فراہم نہ کیے جائیں، تقسیم دولت کا عادلانہ نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ آمدنی کے وسائل فراہم کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کو گھر بیٹھے سرکاری وظیفہ ملے۔ شریعت مفت خوروں کے طبقے پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنی روزی کما سکتا ہے، جس کو اللہ نے جسمانی، ذہنی، فکری یا کسی اور طرح کی صلاحیت دی ہے، وہ اس صلاحیت کو استعمال کر کے جائز روزی کما سکے۔ جائز روزی کمانے کے لیے جب ایک شخص گھر سے نکلے تو اس کے راستے میں کوئی مصنوعی رکاوٹ نہ ہو۔ اجارہ داریاں نہ ہوں، ذخیرہ اندوزیاں نہ ہوں۔ غیر ضروری طور پر ظلم کی دیواریں کھڑی نہ کی گئی ہوں۔

روزگار کی سہولت میسر ہو، روزگار کی سہولت فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری بھی ہے، افراد کی ذمہ داری بھی ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ وسائل سے نوازا ہے۔ جن کے پاس دولت زیادہ ہے، صنعتیں ہیں، زمینیں ہیں، بڑے بڑے تجارتی ادارے ہیں، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ روزگار کی سہولتوں کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔

ریاست اپنی پالیسی کے ذریعے اس کام کو آسان بنائے گی، قوانین کے ذریعے آسان بنائے گی۔ قوانین کے ذریعے ان راستوں کو بند کرے گی جو روزگار کی سہولت کے راستے میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہوں۔

ان میں سے ایک اہم بات وسائل کا مکمل استعمال بھی ہے۔ جس کو آج کل optimum ultilization کہتے ہیں وہ شریعت کا بھی منشا ہے۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ اللہ نے جو رزق دیا ہے، جو وسیلہ عطا کیا ہے اس کا مکمل اعتراف اور اس احسان کا مکمل اظہار ہونا چاہیے۔ اس کی واحد شکل یہ ہے کہ اس کا استعمال مکمل ہو۔ جو جو ثمرات اور برکات اللہ نے اس میں رکھے ہیں انسان ان سب کو حاصل کرے۔ چھوٹے سے چھوٹے سے وسیلے سے لے کر بڑے سے بڑے وسیلے تک کا مکمل اور بہترین استعمال ہونا چاہیے۔ کسی چیز کو فضول قرار دے کر ضائع نہیں کر دینا چاہیے۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز کا بہتر سے بہتر استعمال کیا جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس بات کا علم اور مہارت حاصل کی جائے کہ کسی چیز کا بہتر سے بہتر استعمال کہاں کہاں اور کیسے کیسے ہوسکتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا گھریلو جانور جو مر جائے جس کو لوگ اس کے گھر سے باہر پھینک دیتے ہیں، اس کے بارے میں بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو کسی ایسی طرح استعمال کرو کہ اس کے مفید اجزاء بالکل ضائع نہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ مردہ بکری پڑی ہوئی ہے، جو کسی نے پھینک دی تھی، آپ نے فرمایا کہ بکری مردہ ہے اس کو پھینک دیا لیکن اس کی کھال کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دباغت کے ذریعے اس کی کھال کا چمڑا بنایا جا سکتا تھا۔ یہ چمڑا کسی ایسے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا جہاں چمڑا استعمال ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ ہدایت ملتی ہے کہ کسی چیز کو بھی بغیر مکمل استعمال کے ضائع کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ہے وسائل کا مکمل استعمال۔

پھر وسائل کا مناسب استعمال بھی ضروری ہے اور مناسب تقسیم بھی ضروری ہے۔ جب تک وسائل کی مناسب تقسیم نہیں ہوگی۔ وسائل کا مکمل استعمال نہیں ہوگا۔ میں پہلے زمین کی مثال عرض کر چکا ہوں کہ اگر کسی ایک شخص کو اتنی زمین دے دی جائے کہ اس کو وہ خود آباد نہ کر سکے، اپنے وسائل سے اس کو آباد نہ کرا سکے تو یہ وسائل کا مکمل استعمال نہیں ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان وسائل کی تقسیم پر نظر ثانی کی جائے اور جس شخص کے پاس غیر ضروری وسائل ہیں یا زائد ضرورت

وسائل ہیں وہ اس سے لے کر کسی ایسے شخص کو دے دیے جائیں جس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

ریاست کی ذمہ داریوں میں مالیات عامہ کا معاملہ ہر دور میں لازمی سمجھا گیا، اس کو ہمیشہ ایک اہم مسئلہ سمجھا گیا کہ ریاست کے عام مالیاتی نظم ونسق کو کیسے منظم کیا جائے۔ ریاست کی آمدنی کی مدّات کیا کیا ہوں اور اُن کو کہاں کہاں خرچ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مالیات عامہ ریاست کے معاشی مسائل میں سب سے اہم اور سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔ صدر اسلام میں مالیات عامہ کے جو وسائل تھے ان میں سب سے اہم زکوٰۃ تھی جو ڈھائی فیصد کے حساب سے وصول کی جاتی تھی۔ عشر اور عشور دونوں دس دس فیصد کے حساب سے وصول کیے جاتے تھے۔ عشر زرعی پیداوار پر مسلمان ادا کرتے تھے اور عشور تجارتی سامان کی درآمد برآمد پر وصول کیا جاتا تھا۔ یہ تجارتی ٹیکس بھی دس فیصد ہوتے تھے۔ جو تاجر باہر سے سامان لے کر ہمارے ملک میں آئے گا وہ دس فیصد ادا کرے گا۔ جو تاجر یہاں سے سامان باہر لے کر جائے گا وہ دوسرے ملک کو دس فیصد ادا کرے گا۔

یہ کسٹم ڈیوٹی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مقرر فرمائی تھی اور بعد میں فقہائے اسلام نے تفصیل سے اس کے احکام مرتب کیے جس کی بنیاد پر کسٹم ڈیوٹی کو جائز سمجھا گیا۔ اسلامی ریاست باہر سے آنے والے سامان تجارت پر مناسب کسٹم ڈیوٹی عائد کرسکتی ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے دس فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد کی تھی اس لیے کہ ان کے دور میں دوسری ریاستیں مسلمان تاجروں سے دس فیصد کسٹم ڈیوٹی لیا کرتی تھیں۔ آج کے عرض اور حالات کے لحاظ سے کسٹم ڈیوٹی کم وبیش ہوسکتی ہے۔ بین الاقوامی حالات، ملک کے معاشی مفادات، ملک کی پیداوار اور ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کسٹم ڈیوٹی میں کمی بیشی کرسکتی ہے۔ اس کسٹم ڈیوٹی کی خلاف ورزی اسی طرح شرعاً ناجائز ہے، جس طرح بقیہ احکام کی خلاف ورزی شرعاً ناجائز ہے۔

معدنی پیداوار پر خمس یعنی بیس فیصد ہوا کرتا تھا۔ فیئے سو فیصد ریاست کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔ فیئے سے مراد وہ آمدنی ہوتی تھی جو براہ راست ریاست کو اس کے اثر رسوخ کی وجہ سے حاصل ہو۔ جو براہ راست ریاست کی ملکیت میں آئے، جس کا عامتہ الناس کی ملکیت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ غیر مسلموں سے خراج اور جزیہ لیا جاتا تھا جو زکوٰۃ اور عشر کا متبادل تھا۔ غیر مسلم زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے، وہ زکوٰۃ کی بجائے جزیہ دیا کرتے تھے۔ غیر مسلم عشر نہیں دیا کرتے وہ عشر کی جگہ خراج ادا

کیا کرتے تھے۔ خراج اور جزیہ دونوں کا تعین ریاست کی صوابدید سے ہوتا تھا۔ ریاست اپنی صوابدید کے مطابق خراج اور جزیے کا تعین کرتی تھی۔ اس تعین میں بنیادی حکم یہ تھا کہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کی جائے، مشکل پیدا نہ کی جائے۔ ادا کرنے والے کی سکت اور استطاعت کے مطابق اس سے جزیہ اور خراج لیا جائے، اس کی سکت سے باہر اور بس سے بڑھ کر اس پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اس مضمون کی احادیث بھی آئی ہیں۔ اس مضمون کو تفصیل سے فقہائے کرام نے مرتب بھی کیا ہے۔

ریاست کی ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری جو شروع سے رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک سے جاری رہی وہ مجاہدین کی تنخواہیں اور عطاءات ہوا کرتی تھیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج کا تصور نہیں تھا۔ تمام بالغ مسلمان مرد مجاہدین کی ذمہ داریاں عندالطلب انجام دیتے تھے اور کبھی بھی عندالضرورت ان کو طلب کیا جا سکتا تھا۔ اس کام کے لیے وہ اپنی تجارت، اپنے کاروبار، اپنی زمینیں سب چھوڑ چھاڑ کر جہاد کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ اس زمانے کا یہ جہاد کوئی دو چار دن کا معاملہ نہیں ہوتا تھا۔ سرحد پر جانے میں کئی کئی مہینے صرف ہوتے تھے۔ جنگ کئی کئی مہینے چلتی تھی۔ واپسی میں کئی کئی مہینے لگتے تھے۔ بعض اوقات اس پورے عمل میں ایک ایک سال، بلکہ دو دو سال تین تین سال لگ جایا کرتے تھے۔ اس دوران مجاہدین کے اہل خانہ، مجاہدین کی معاشی ضروریات جن میں عملاً تمام مسلمان شامل تھے ان کی دیکھ بھال ریاست کے ذمے ہوتی تھی۔ اس لیے ریاست نے مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کیں جو عموماً ان وسائل سے ادا کی جاتی تھیں جو فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہوتے تھے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب تمام مجاہدین کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کی گئیں تو سیدنا صدیق اکبر نے سب کی تنخواہیں برابر رکھیں۔ ان کی اپنی تنخواہ اور ایک عام مجاہد، صحابی یا تابعی، کی تنخواہ کے برابر تھی۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ کمی بیشی اور اجر میں زیادتی یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر ہوگی۔ دنیوی معاملات کی حد تک ہم سب کو برابر رکھیں گے اور سب کو تنخواہ برابر دیں گے۔ اس لیے کہ معاشی ضروریات سب کی ایک جیسی ہیں۔ اہل خانہ سب کے ساتھ ہیں۔ کھانا پینا، روزی، علاج، تعلیم، یہ سب کو حاصل کرنی ہے۔ اس لیے تنخواہوں میں کمی بیشی کا تصور ان کے خیال میں مناسب نہیں تھا۔

جب سیدنا عمر فاروقؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ وہ اجتہاد جس پر آج تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدمات کے اعتبار سے لوگ برابر نہیں ہیں، اس لیے وہ تنخواہ میں بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اسلام کے لیے زندگیاں قربان کرنے میں لوگ برابر نہیں رہے تو تنخواہ میں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دین کو پھیلانے میں لوگوں کی کاوشیں برابر نہیں ہیں تو مراعات اور الاؤنسوں میں بھی برابری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انھوں نے مجاہدین کے مختلف درجات مقرر کیے۔ آج کل کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے تنخواہوں کے گریڈ مقرر کیے۔ سب سے بڑا گریڈ یا سب سے بڑی تنخواہ جس کے لیے عطیہ کا پرمعنی اور باعزت لفظ استعمال کیا جاتا تھا، جو مقرر کی گئی وہ رسول اللہ ﷺ کے اہل خاندان کی مقرر کی گئی۔ جن حضرات کا تعلق بنی ہاشم اور بنی مطلب سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پڑدادا اور ان کے بھائی مطلب کی اولاد سے تھا۔ وہ خاندان نبوت میں شمار کیے گئے۔ اس کے لیے کہ ان دونوں بھائیوں کی اولاد اور ان کے پس ماندگان حضور ﷺ کے انتہائی پرجوش اور مخلص مؤیدین میں سے تھے اور ان کی اولاد نے ہر دور میں، ہر زمانے میں، ہر مشکل میں رسول اللہ ﷺ کا بھرپور ساتھ دیا۔ جب شعب بنی ہاشم میں تمام مسلمان قید ہوئے تو حضور کے خاندان کے یہی دو بڑے گروپ تھے جو حضور ﷺ کے ساتھ شعب بنی ہاشم میں قید رہے۔ اس لیے سب سے پہلے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کا درجہ رکھا۔ ان کے بعد ازواج مطہرات کا۔ ان کے بعد اہل بدر کا۔ پھر ان مہاجرین کا جو غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ پھر ان انصار کا جو بدر میں بھی شریک رہے۔ پھر ان انصار کا جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے لیکن بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ اس طرح سیدنا عمر فاروقؓ نے اسلام میں سینیارٹی اور خدمات کے اعتبار سے تنخواہوں کے معیارات مقرر کیے۔

یہ معیارات چلتے رہے اور ہر زمانے کے حضرات ان پر عمل کرتے رہے۔ یہ بات غالباً بہت سے قارئین کے لیے دلچسپی کی ہوگی کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تنخواہ جیسا کہ مشہور مورخ مقریزی نے لکھا ہے چھ ہزار درہم سالانہ مقرر ہوئی تھی۔ اور یہ بات میں عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا صدیق اکبر نے سب کی تنخواہیں برابر کر دی تھیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں، اس کی کوئی تصریح تو کسی کتاب میں نہیں ملی لیکن ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تمام مسلمان سپاہیوں کی، افراد

کی اور بیواؤں کی تنخواہیں یا عطایا اسی کے برابر ہوں گے۔ چھ ہزار درہم سالانہ کے حساب سے اگر تنخواہ آنجنابؐ کی ہو تو پانچ سو درہم ماہانہ کے برابر بنتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں چاندی کا نصاب دوسو درہم تھا۔ دوسو درہم آج کل کے لحاظ سے ہمارے یہاں کے ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوتے تھے۔ گویا دوسو درہم ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے پانچ سو درہم کا اندازہ لگایا جائے تو وہ ایک سوتیس تولہ چاندی کے لگ بھگ بنے۔ جو قیمت آج بازار میں ایک سوتیس تولہ چاندی کی ہے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ماہوار تنخواہ مسلمان سپاہیوں کی رہی ہوگی۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہم نے تو جو واقعات سنے ہیں وہ اس سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سنا ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ میٹھا پکانا چاہتی تھیں، اس کے لیے وسائل نہیں تھے۔ انھوں نے ماہانہ تنخواہ میں سے پس انداز کر کے اتنی رقم بچائی کہ میٹھا بنا سکیں۔ یہ بات بھی درست ہے۔ دراصل صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی وہ تنخواہ وصول نہیں فرماتے تھے جو صحابہ نے ان کے لیے مقرر کی تھی۔ جتنی رقم ان کی کم سے کم ضروریات کے لیے ناگزیر ہوتی تھی اتنی رکھ کر باقی بیت المال میں واپس کر دیا کرتے تھے۔ یہی کیفیت سیدنا عمر فاروقؓ کی بھی رہی۔ اس لیے یہ حضرات جو اپنی ذات پر غیر معمولی سختی فرماتے تھے اس کا محرک ان کا ذاتی سادگی پسند طرز عمل اور شخصی زہد و استغناء تھا۔ ان حضرات کو ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ اگر کوئی ہم نے اپنی ذات پر کوئی رقم ایسی خرچ کر دی جو ہمیں نہیں کرنی چاہیے تو یہ آئندہ آنے والوں کے لیے قانون اور سنت کا درجہ اختیار کر لے گی۔ اس لیے کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی شریعت کے مآخذ میں ایک اہم درجہ رکھتی تھی۔ اس لیے یہ حضرات خاص طور پر اپنے اوپر وہ سختی کیا کرتے تھے جو بعد والوں نے نہیں کی اور نہ ان کو ضرورت محسوس ہوئی۔

اب آج کا ایک ظاہر پرست یا سطح بین مبصر جب دیکھتا ہے کہ بعد کے کسی فرماں روا نے اپنی بود و باش میں وہ سادگی یا سختی نہیں اپنائی جو سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنائی تھی یا سیدنا ابوبکر صدیق نے اپنائی تھی تو وہ اس کو اسلام سے انحراف سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ اسلام سے انحراف نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی پوری تنخواہ وصول کرے اور اس کے مطابق کام بھی کرتا ہو تو وہ شرعاً نہ صرف جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے۔ یہ بات کہ کوئی شخص اپنی جائز اور منظور شدہ تنخواہ کا بیشتر حصہ واپس کر

دے، تو یہ محض اس کا ذاتی اور شخصی فیصلہ ہے، یہ دراصل تقویٰ اور ذمہ داری کا وہ اعلیٰ ترین معیار ہے جس پر اگر کوئی شخص فائز ہونا چاہے، از خود اس کو اختیار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ کسی سے یہ مطالبہ کیا جانا یا کسی سے توقع رکھنا کہ ہر شخص ایسا ہی رویہ لازماً اختیار کرے گا یہ شریعت کا حکم نہیں ہے۔

سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں اگرچہ تنخواہوں کا نظام برابر نہیں رکھا تھا اور صحابہ کرام کی خدمات اور اسلام میں تقدم اور تاخر کی وجہ سے ان کے عطیات میں کمی بیشی کی تھی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ مراعات اور عطایا میں یہ کمی بیشی مناسب نہیں ہے اور صحیح رویہ وہی ہے جو سیدنا صدیق اکبر نے اختیار فرمایا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ انھوں نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اسی رویہ یا اسی پالیسی کو دوبارہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میں زندہ رہا تو اگلے سال سب سے کم سپاہیوں کی تنخواہیں، سب سے ادنیٰ درجے کے سپاہی کے برابر کر دوں گا۔ اور ایک عام سپاہی کی تنخواہ بھی دو ہزار درہم کر دوں گا اور خدا کی قسم جب تک بیت المال کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے گا میں تنخواہوں میں اضافہ کرتا رہوں گا۔ جتنا مال آئے گا اتنا ہی گن گن کر لوگوں کو دیتا جاؤں گا۔ اور اگر مال اتنا آیا کہ میں اس کو گن کر نہ دے سکا تو میں برتنوں میں بھر بھر کر دے دوں گا۔ اور وہ بھی ممکن نہ ہوا تو بوریاں بھر بھر کر دوں گا۔ اس لیے کہ یہ عامتہ الناس ہی کے وسائل ہیں۔ عامتہ الناس تک پہنچنے چاہئیں۔

اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ یہ چاہتے تھے کہ عامتہ الناس کی ضروریات میں کوئی کمی نہ کی جائے اور ریاست کے پاس اگر وسائل ہوں تو ان کو بھرپور انداز سے اس طرح استعمال کیا جائے کہ ہر شخص تک اس کے اثرات پہنچیں۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو میں ایک سپاہی کی تنخواہ چار ہزار درہم کر دوں گا۔ ایک ہزار درہم اس کام کے لیے کہ وہ اپنے اسلحے پر خرچ کرے، بہتر سے بہتر اسلحہ حاصل کرے۔ ایک ہزار درہم اس کے ذاتی اخراجات کے لیے، ایک ہزار درہم اس کے گھر والوں کے اخراجات کے لیے اور ایک ہزار درہم اس کے گھوڑوں کی تیاری کے لیے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سپاہیوں کی یہ تنخواہیں ان کی ذاتی ضروریات کے لیے بھی تھیں اور ان تمام وسائل اور ہتھیاروں کے لیے بھی تھیں جن کا بیشتر حصہ آج ریاست خود برداشت کرتی ہے۔ آج کا سپاہی اپنا اسلحہ خود فراہم نہیں کرتا۔ اپنی سواریاں خود فراہم نہیں کرتا۔ اپنی

جیپ اور ٹینک خود لے کر نہیں آتا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے دفاعی بجٹ کا اگر ایک بٹا چار حصہ سپاہیوں کی تنخواہوں، سہولیات، تیاری اور دیگر مراعات پر اور تین بٹا چار حصہ دوسرے وسائل، اسلحہ اور ہتھیاروں پر خرچ ہو تو یہ سیدنا عمر فاروقؓ کی اس پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔

یہ غالباً حضرت عمر فاروقؓ کے آخری زمانے کی بات ہے جب وہ عطاءات کے اس نظام پر از سرنو غور کر رہے تھے۔ عبیدہ سلمانی جو مشہور تابعی ہیں اور اس روایت کے راوی ہیں۔ ان کی ملاقات سیدنا عمر فاروقؓ سے ان کے آخری ایام میں ہی ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے سیدنا عمر فاروقؓ سے ان کی ملاقات کا امکان کم ہے۔ لیکن سیدنا عمر فاروقؓ کو اس خواہش کی تکمیل کا موقعہ نہیں ملا کہ وہ کم سے کم لوگوں کی تنخواہیں اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں کے برابر کر دیتے۔ "لالحقن آخر الناس باولهم حتى يكونوا في العطاء سواء" کہ میں سب سے نچلے طبقے کے سپاہیوں کی تنخواہیں سب سے اونچے طبقے کے سپاہیوں کے برابر کر دوں گا تا کہ وہ عطاء میں برابر ہو جائیں۔ لیکن پھر سیدنا عمر فاروقؓ کے بعد جب سیدنا عثمان غنی خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی اسی پالیسی کو برقرار رکھا جس کے مطابق سپاہیوں کی تنخواہوں میں فرق پایا جاتا تھا۔

سیدنا علی بن ابی طالب کے بارے میں دونوں طرح کی روایتیں ملتی ہیں۔ ان کا زمانہ خاصی افراتفری اور ہنگامی حالات میں گزرا۔ اس لیے قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے دور میں سپاہیوں کی تنخواہیں برابر ہوگئی تھیں یا کم وبیش تھیں۔ ایک روایت جو زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے سب کی تنخواہیں برابر کر دی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نہیں، بلکہ ان کے زمانے میں بھی وہی پالیسی جاری رہی جو سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ بہر حال سیدنا علی نے اگر تنخواہیں برابر بھی کی تھیں تو ان کے بعد پھر اس پالیسی پر قائم نہیں رہا جا سکا اور تنخواہوں میں کمی بیشی ہی کا طرز عمل جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔

جن چیزوں کو عطاءات کہا جاتا تھا ان میں مجاہدین کی تنخواہ تو خیر ہوتی ہی تھی۔ مجاہدین کے پسماندگان کو بھی پنشن ملتی تھی۔ مجاہدین کے علاوہ ریاست کے جتنے کارکن تھے ان کی تنخواہیں بھی بیت المال سے ہوتی تھیں۔ معذورین کے وظائف بھی بیت المال کے مصارف میں شامل تھے۔ وہ لوگ جو خود روزی نہ کما سکیں، وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کو وظائف ریاست سے ملتے تھے۔ سوشل سکیورٹی الاؤنس جس کو ہم کہہ سکتے ہیں وہ بھی ملتا تھا۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے سے بھی پہلے سے ،خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے اسلامی نظام معیشت کا ایک اہم شعبہ حسبہ ہوا کرتا تھا۔ حسبہ یوں تو ایک الگ ادارہ تھا جو نیم عدالتی اختیارات رکھتا تھا۔ اور عام طور پر معاشرتی انصاف، معاشرتی اخلاق اور اسلامی ریاست کے اجتماعی اہداف کے تحفظ کا فریضہ انجام دیا کرتا تھا۔ لیکن ان ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض میں بازار کی دیکھ بھال بھی شامل تھی۔ تاجروں کی نگرانی بھی شامل تھی اور یہ بات کہ بازار میں کوئی کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی نہ کرے، ملاوٹ نہ کرے، دھوکہ ہی نہ کرے۔ اس نوعیت کے کاموں کی نگرانی بھی حسبہ کا ادارہ کیا کرتا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام حسبہ کا اسلامی نظام معیشت سے گہرا تعلق تھا۔ بازار کے محتسب الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ زرعی پیداوار کے محتسب الگ ہوتے تھے۔ عام کمزور انسانوں کے ساتھ بلکہ جانوروں کے ساتھ انصاف بھی حسبہ کے فرائض میں شامل تھا۔ یہ بات کہ جانوروں کے استعمال میں ان کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے۔ زیادتی نہ کی جائے، کسی جانور پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ یہ نگرانی نظام حسبہ کیا کرتا تھا۔

آج بھی ریاست کی معاشی پالیسیوں کو یقینی بنانے کے لیے جو ادارے قائم ہیں یا آئندہ قائم کیے جائیں ان کو وہ اختیارات اور فرائض دیے جاسکتے ہیں جو حسبہ کے ادارے کو دیے جاتے تھے۔ ایک اعتبار سے وہ ادارے جو حکومت کی معاشی پالیسیوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان پر عمل درآمد کو یقینی بنا رہے ہیں وہ حسبہ ہی کی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ حسبہ کی ایک ذمہ داری اسٹیٹ بنک بھی انجام دے رہا ہے جو بینکوں کا محتسب ہے۔ حسبہ کی ذمہ داری کارپوریٹ لاء اتھارٹی Corporate Law Authority جس کو کہا جاتا تھا وہ بھی انجام دے رہی ہے۔ یہ کاروباری طبقوں کی محتسب ہے۔ ملاوٹ کو چیک کرنے کے ادارے ہیں۔ ناپ تول کے پیمانے کو یقینی بنانے کے ادارے ہیں۔ یہ سب وہ ادارے ہیں جو اسلامی دور میں حسبہ کہلاتے تھے۔ آج یہ ادارے الگ الگ ہو گئے ہیں۔ ان کو الگ الگ بھی رکھا جاسکتا ہے، ایک بھی رکھا جاسکتا ہے اور کسی ایک بڑے ادارے کا جزو بھی بنایا جاسکتا ہے۔

اسلامی ریاست کا ایک اہم وظیفہ احیاء الموات بھی تھا، یعنی مردہ زمینوں کا آبادکاری۔ مردہ زمینوں کی آبادکاری کے بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں جو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بہت

سی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ احادیث مختلف الفاظ میں روایت ہوئی ہیں۔ ''من احیا ارضا میتة فھی له'' جس نے کسی مردہ زمین کو آباد کیا وہ اس کی ہے۔ ''من عمر ارضا لیس لاحد فھوا حق بھا'' جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی کی نہ تھی وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں فقہائے اسلام نے جو احکام مرتب کیے ہیں، جن کی ترتیب میں خلفائے راشدین کے طرز عمل کو سامنے رکھا گیا ہے۔ ان کی رو سے احیاء اموات کے لیے ریاست کی اجازت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ناگزیر ہے۔ فقہاء کی خاصی تعداد اس رائے سے اتفاق کرتی ہے کہ حکومت کی اجازت سے کوئی بھی غیر مملوکہ زمین آبادکاری کے لیے کوئی بھی شہری حاصل کرسکتا ہے۔ اور یہ زمین بغیر کسی معاوضے اور بغیر کسی قیمت کے الاٹ کی جائے گی۔ اگر تین سال کے دوران وہ شہری اس زمین کو آباد کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ زمین اس کی ملکیت قرار پاجائے گی اور اگر وہ تین سال میں زمین کو آباد کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تو ریاست کو اختیار ہے کہ یا تو مزید مہلت دے دے یا زمین اس سے واپس لے لے۔

مشہور صحابی سیدنا بلال بن حارث المزنی، (یہ حضرت بلال مؤذن نہیں ہیں، یہ دوسرے بلال ہیں) ان کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے قریب عقیق کے علاقے میں ایک بہت بڑی زمین دے دی۔ صحابہ نے بعد میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس زمین میں فلاں قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ جو عامۃ الناس کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس لیے اگر وہ ایک شخص کے پاس رہی تو شاید اس کے اثرات مناسب نہ ہوں۔ اس پر وہ زمین رسول اللہ ﷺ نے ان سے واپس لے لی اور دوسری ایک زمین ان کو دی جس کی آبادکاری کا انھوں نے وعدہ کیا، لیکن وہ اس کو آباد نہیں کر پائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں جب یہ دیکھا کہ سیدنا بلال بن حارث اس زمین کو آباد نہیں کر پائے تو سیدنا عمر فاروقؓ نے ان سے وہ زمین واپس لے لی اور دوسرے مسلمانوں کو الاٹ کردی۔

زمینوں کی الاٹمنٹ کی تفصیلات احادیث میں کثرت سے ملتی ہیں۔ خاص طور پر سرکاری اور غیر آباد زمینوں کی مختلف حضرات کو الاٹمنٹ کی تفصیلات حدیث، شروح حدیث اور فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے ثلاثہ کے زمانے کے بہت سے نظائر امام ابو یوسف، امام عبدالرزاق، یحییٰ بن آدم اور امام ابوعبید نے کثرت سے نقل

کیے ہیں۔ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں میں کہیں نہ کہیں یہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان سب سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ شریعت کا ہدف یہ ہے کہ کوئی سرکاری زمین بے مصرف نہ رہے اور کوئی غیر آباد زمین بے کار نہ پڑی رہے۔ یہ اسی اصول پر عمل درآمد کی ایک صورت ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وسائل کا نامکمل استعمال نہ کیا جائے اور تمام دستیاب وسائل کا بہتر سے بہتر استعمال کیا جائے۔ اس لیے کہ وسائل کا استعمال جتنا بڑھے گا معاشرے کی خوشحالی اور ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوگا تو معاشرے کے پسماندہ ترین طبقات کی ضروریات پوری ہوں گی۔ کفاف کا درجہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے گا۔

معاشی ضروریات میں کفاف سب سے پہلا درجہ ہے۔ جس سے مراد وہ کم سے کم لازمی اور ناگزیر تقاضے ہیں جو ہر انسان کو فوری طور پر مطلوب ہیں۔ کفاف کے بعد دوسرا درجہ ضروریات کا ہے۔ وہ ضروریات جن کی نوعیت لازمی اور دائمی ضرورت کی ہوتی ہے۔ وہ دائمی بھی ہیں اور لازمی بھی ہیں۔ لباس کی ضرورت انسان کو دائمی ہے۔ یہ نہیں کہ آج آپ نے لباس فراہم کر دیا تو پوری زندگی ضرورت نہ پڑے۔ یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی اور لازمی ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آ سکتا کہ انسان کو لباس کی ضرورت نہ ہو۔ ان کے بعد حاجیات کا درجہ ہوتا ہے۔ حاجیات وہ ہیں جو لازمی تو ہیں لیکن ان کا لزوم ضروریات سے کم ہے۔ ضروریات کے مقابلے میں کم درجے کا ہے۔ عموماً دائمی ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات غیر دائمی بھی ہو سکتی ہیں۔ ان کے بعد تکمیلیات کا درجہ آتا ہے۔ جن کی حیثیت ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ یہ لامتناہی ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے حالات بہتر سے بہتر ہوں۔ شریعت کا رجحان اور مزاج یہ ہے کہ کفاف اور ضروریات کے لیے تو ریاست کے وسائل مکمل طور پر خرچ کیے جائیں۔ حاجیات کے لیے ریاست کے وسائل وہاں خرچ کیے جائیں جہاں دستیاب ہوں اور جتنے دستیاب ہوں ہی اتنے خرچ کیے جائیں۔ تکمیلیات کا جہاں تک تعلق ہے، وہ چونکہ لامتناہی ہیں اس لیے اگر ان پر کنٹرول نہ کیا جائے، ان کو حدود کے مطابق نہ بنایا جائے تو یہ رجحان ناپسندیدہ رنگ اختیار کر سکتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ "لو کان لابن آدم وادیان من ذهب لابتغى ثالثا"۔ اگر آدم کے کسی بیٹے کے پاس دو وادیاں سونے سے بھری ہوئی ہوں تو وہ تیسری مرادی کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ یہ انسان کا مزاج ہے۔ خود قرآن پاک کا ارشاد ہے: "انه لحب الخير

لشدید" انسان مال کی محبت میں شدید ہے۔" واحضرت الانفس الشح" بخل اور مال کی محبت انسان کے دل میں بٹھا دی گئی ہے۔ اس لیے اس رویے کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس جذبہ کو حدود میں رکھنے کے لیے ہی شریعت نے استغناء کی تعلیم بھی دی ہے۔ قناعت اور زھد کی تعلیم دی ہے۔ یہ تعلیم اسی لیے ہے کہ تکمیلیات کا یہ درجہ حدود سے باہر نہ جانے پائے۔ اس درجے کو حدود کے اندر پورا کرنے کی ذمہ داری افراد کی ہے۔ افراد اگر تکمیلیات حاصل کرنا چاہیں تو کریں۔ ریاست کے وسائل میں اگر گنجائش ہو، کفاف، ضروریات اور حاجیات کے تقاضے پورے کرنے کے بعد بھی اگر وسائل بچ رہیں تو پھر ریاست کے وسائل تکمیلیات میں بھی خرچ کیے جاسکتے ہیں۔

ریاست کی اصل اور بنیادی ذمہ داری کفاف کی ہے۔ کفاف میں بنیادی اور ناگزیر طور پر تین چیزیں تو لازماً اور ہر حال میں شامل ہیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا، بے لباس کو لباس فراہم کرنا، بے گھر کو گھر فراہم کرنا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کفاف ہے اور یہ پوری امت مسلمہ کے ذمے واجب علی الکفایہ ہے۔ اس واجب کو یا فرض کفایہ کو عامۃ الناس کی طرف سے ریاست ادا کرے گی، اس لیے کہ ریاست عامتہ الناس کی وکیل ہے۔ عامتہ الناس مؤکل ہیں، ریاست ان کی وکیل ہے۔ اس لیے مؤکل کی طرف سے وکیل اس فریضے کو انجام دے گا۔ فقہائے اسلام میں سے بعض حضرات نے یہ لکھا ہے جن میں علامہ ابن حزم کا نام بہت مشہور ہوگیا ہے کہ اگر ریاست اپنے ان تقاضوں کو پورا نہ کرے یا ریاست ان فرائض کی انجام دہی میں غفلت اور کوتاہی کو اختیار کرے اور معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہوں جن کو روزی پیٹ بھر کر نہ ملتی ہو، ایسے لوگ موجود ہوں جن کے پاس تن ڈھانپنے کو لباس نہ ہو، سر چھپانے کو چھت نہ ہو تو وہ زبردستی خود باوسیلہ لوگوں سے اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں کبھی الحمد للہ اس طرح کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ درجہ کفاف کی فراہمی کو فقہائے اسلام نے عامتہ الناس کے ذمے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ اگر معاشرے کے باوسیلہ اصحاب اپنے مالی فرائض انجام دیتے رہیں، انفاق کے احکام پر عمل کرتے رہیں، صدقات واجبہ ادا ہوتے رہیں تو یقینی طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ کفاف کا درجہ ہر شخص کو حاصل ہو جائے گا۔ کفاف کے اس تصور کو بعض ماہ . نے کفالت عامتہ کے لفظ سے

بھی یاد کیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ کفالت عامہ کا یہ حق زکوۃ کے علاوہ ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آیا ہے "وفی اموالهم حق للسائل و المحروم"۔ دولت مندوں کے مال میں سائل کا حق بھی ہے، محروم کا حق بھی ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت "لیس البر ان تولوا" میں زکوۃ کے علاوہ بھی مالی ذمہ داریوں کا صراحت سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث بھی ہے جس میں ارشاد ہے کہ "ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ" کہ زکوۃ کے علاوہ بھی مال میں معاشرے اور ریاست کا حق ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی یہی لکھا ہے۔ دوسرے متعدد مفکرین قرآن نے لکھا ہے کہ کفالت عامہ کے جس حق کا تذکرہ ان آیات میں آتا ہے وہ زکوۃ کے علاوہ ہے۔

یہی آیت "وفی اموالهم حق للسائل و المحروم" کفالت عامہ کے اسلامی تصور کی بنیاد ہے۔ اس کی تفصیل آیت بر میں ملتی ہے جو سورۃ بقرہ میں ہے۔ جس میں زکوۃ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے "و آتی المال علی حبه" کہ مال کی محبت کے باوجود یا اللہ کی محبت کی وجہ سے مال عطا کرتا ہے اور اپنے غریب رشتہ داروں کو اور فلاں فلاں کو دیتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ سیدنا عمر فاروقؓ کے الفاظ میں وہ ہدف حاصل ہو جائے "حتی نستوی فی الکفاف" تا کہ کفاف کے درجے میں سب مسلمان برابر ہو جائیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہ رہے جس کو درجہ کفاف بھی میسر نہ ہو۔ قرآن مجید میں جو مکی سورتوں کے آغاز سے اس طرح کے اشارے ہیں جیسے "لا یحض علی طعام المسکین" یہ اسی درجہ کفاف کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے ہے۔ یہ بات مسلم معاشرے کے مزاج کا حصہ ہونی چاہیے کہ وہ یہ اہتمام رکھے کہ یہ ضروریات ہر شخص کی پوری ہو جائیں۔

کفاف کے درجے میں یوں تو روٹی کپڑا اور مکان شامل ہیں لیکن بعض فقہائے اسلام نے کفاف اور حاجیات اصلیہ، ان دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم اور احادیث کی مختلف نصوص سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بنیادی ضروریات میں تعلیم، علاج، امن و امان، عدل و انصاف کی فراہمی اور ایک خاندانی زندگی کے وسائل بھی شامل ہیں۔ یہ سب ضروریات اصلیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر چہ کفاف کے بعد ہی ان کا درجہ آتا ہے، لیکن محض کفاف پر اکتفا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ انسان کے مزاج، ترقیاتی ذوق اور تہذیبی اور تمدنی رجحانات کے خلاف ہے۔ انسان کا مزاج

تہذیبی اور تمدنی ترقی کرنے اور اپنے معاملات کو بہتر سے بہتر بنانے کا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ارتفاق کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ ہر انسان اور ہر انسانی معاشرہ پہلے ارتفاق سے، یعنی تہذیب وتمدن کے ابتدائی درجے سے دوسرے درجوں میں جانا چاہتا ہے۔ دوسرے درجے سے تیسرے درجے میں جانا چاہتا ہے۔ اس کام کے لیے شریعت نے حدود وقواعد مرتب کر دیے ہیں۔ یہ ترقی یا یہ graduation شریعت کے قواعد اور احکام کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر یہ ترقیاتی عمل شریعت کے احکام کے مطابق ہے، اخلاق اور روحانیات کی حدود کے تابع ہے تو پھر یہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے۔

یہ ضروریات اور خاص طور پر جو ابتدائی تین ضروریات ہیں، کفاف کی جو ضروریات ہیں وہ اگر پوری نہ ہوں تو اس کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ مایوسی پیدا ہو تو مایوس انسان فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے۔ فرسٹریشن کے نتیجے میں بے شمار معاشرتی، اخلاقی، سیاسی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ان ضروریات کو پورا کرنا، خود معاشرے کی بقا اور تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ ان لوگوں کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ناگزیر ہے جن کے پاس وسائل موجود ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں، ماضی بعید کی بھی اور ماضی قریب کی بھی۔ انقلاب فرانس کی مثال ہے، انقلاب روس کی مثال ہے۔ متعدد اور ممالک کی مثالیں ہیں۔ ابھی چند سال پہلے رومانیا کی مثال ہے کہ پسماندہ اور غریب طبقات شدید ردعمل اور مایوسی کا شکار ہوئے، اور اس کے نتیجے میں وہ سب تباہ ہو گیا جو بااثر اور حکمران طبقوں نے کافی عرصے کے بعد حاصل کیا تھا۔

اسی طرح اگر مال و دولت اور اشیائے صرف ضرورت سے زیادہ دستیاب ہو جائیں، روٹی، کپڑا، مکان اور دوسرے مادی وسائل ضرورت سے زیادہ انسان کو حاصل ہو جائیں تو اس سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مترفین کا طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ مترفین کا طبقہ اخلاقی خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے ان دونوں میں توازن کی ضرورت ہے۔ توازن یہ ہے کہ ہر شخص کو بنیادی ضروریات ایک خاص سطح تک اس طرح حاصل ہوں کہ وہ مطمئن رہے۔ غذا، دوا، لباس، گھر، گھر کی ضروریات، سواری، تعلیم، عدل وانصاف، بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ صفائی کا سامان، یہ تمام اسباب ہر شخص کو بقدر ضرورت میسر ہوں، اس کی اتنی آمدنی ہو کہ وہ ان اسباب کو حاصل کر سکے۔ بازار میں ایسے وسائل موجود ہوں کہ ان ضروریات کا حصول آسان ہو جائے، تو پھر معاشرہ

مطمئن رہتا ہے اور اس اطمینان کے نتیجے میں کوئی اخلاقی قباحت یا افراتفری پیدا نہیں ہوتی۔

ریاست کی ایک اہم ذمہ داری اقتصادی منصوبہ بندی بھی ہے۔ آج کل منصوبہ بندی ایک بہت بڑا فن ہے۔ منصوبہ بندی کیا ہے۔ اس کی قسمیں کیا ہیں۔ منصوبہ بندی سرمایہ داری میں کس طرح ہوتی ہے۔ اشتراکیت میں کیسے ہوتی تھی۔ یہ وہ معاملات ہیں جن سے آج منصوبہ بندی کے ماہرین بحث کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں منصوبہ بندی کرتے ہوئے ریاست کو جو اصول پیش رکھنے چاہئیں ان میں سب سے پہلا اصول اقتصادی ذمہ داریوں کی حد بندی ہے۔ ریاست کو اجازت نہیں ہے کہ وہ عامتہ الناس کے کام میں بے جا مداخلت کرے۔ لوگوں کی آزادیوں کو سلب کرے۔ لیکن آزادی کے نام پر کسی کو بے سرو پا دوڑنے کی اجازت بھی نہ ہو۔ ہر شخص کو یکساں مواقع میسر ہوں۔ بازار سب کے لیے کھلا ہو۔ یہ بات یقینی بنانا اقتصادی منصوبہ بندی کا بنیادی حصہ ہے۔

شریعت نے سد ذرائع کا حکم دیا ہے۔ سد ذرائع سے مراد یہ ہے کہ ان تمام راستوں کو بند کر دیا جائے، ان تمام وسائل اور ذرائع کی حوصلہ شکنی کی جائے جن کے نتیجے میں قباحتیں پیدا ہو رہی ہوں یا پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس لیے ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، اسمگلنگ، ناجائز آمدنی، دھوکہ دہی، فریب، اس طرح کی تمام خرابیوں کا راستہ روکنا اور راستہ روکنے کے لیے مناسب انسدادی تدابیر اختیار کرنا، یہ ریاست کی ذمہ داری ہے اور اقتصادی منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے فقہائے اسلام نے قاعدہ کلیہ وضع کیا ہے کہ "**دفع المفاسد اولی من جلب المصالح**"۔ کہ پہلے مرحلے کے طور پر جو خرابیاں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ دوسرے مرحلے میں جو فوائد یا مصلحتیں ہیں ان کو حاصل کیا جائے۔ مصلحت کو حاصل کرنے کے لیے خرابی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کوئی بہتری اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک خرابی کو دور نہ کیا جائے۔

منصوبہ بندی سے متعلق اکثر کام وہ ہیں جن کا تعلق محض تجربے سے اور دور جدید کے عرف سے ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جو مسلمان کی گمشدہ پونجی ہے۔ جہاں ملے مسلمان کو اسے حاصل کرنا چاہیے۔ لہٰذا جن جن معیشتوں میں منصوبہ بندی کامیاب رہی ہے ان کامیابیوں کا جائزہ لینا، ان کے اسباب کا تعین کرنا اور ان اسباب کو اختیار کرنا شریعت کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مال اور وسائل اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ تحفظ مال شریعت کے مقاصد میں

سے ہے۔شریعت کے احکام کی رو سے اضاعت مال کی ممانعت ہے۔شریعت میں اسراف اور تبذیر سے روکا گیا ہے۔اس لیے کہ یہ بھی مال کی اضاعت ہے۔اس لیے وسائل کو ضیاع سے روکنا اور وسائل کے بہتر سے بہتر استعمال کو یقینی بنانا گہری منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اسی طرح صرف اور اخراجات کو حدود کے مطابق کرنا بھی شریعت کے احکام میں شامل ہے۔

شریعت نے جس طرح کا معاشرہ قائم کرنا چاہا ہے وہ محض صارفین کا معاشرہ نہیں ہے۔جب ایک مرتبہ صارفین کا سا مزاج قائم ہو جائے۔consumerism کا رویہ پیدا ہو جائے تو یہ زندگی کے ہر پہلو میں سامنے آتا ہے۔پھر یہ مادی پیداوار تک محدود نہیں رہتا۔دوسروں کی تیار کردہ چیز بیٹھے بٹھائے حاصل کرنا اور وسائل خرچ کر کے اس کو خرید لینا، یہ رویہ جب جنم لے لے تو پھر یہ اخلاق اور عقائد اور نظریات اور تہذیب اور ثقافت اور تعلیم، ادارے، ہر چیز میں سامنے آتا ہے۔دوسروں کی بنی بنائی چیزیں جوں کی توں اپنا لینے کا مزاج بن جاتا ہے۔دوسروں کی پکی پکائی بیٹھ کر کھانے کی عادت بن جاتی ہے۔اس لیے مسلم معاشرے کو محض صارفین کا معاشرہ نہیں ہونا چاہیے۔نہ مادیات کے صارفین کا، نہ فکریات اور تہذیبیات کے صارفین کا۔مسلم معاشرہ کو تو بلکہ ایسا معاشرہ ہونا چاہیے جہاں دنیا کے لیے سوچا جا رہا ہو۔دنیا کو کیا عطا اسلام کی طرف سے ملنی چاہیے، ان عطاؤں پر کام ہو رہا ہو۔طیبات کیا ہیں، ان کو کیسے حاصل کیا جائے، اس پر غور ہو رہا ہو۔خبائث کیا ہیں، ناپاک اور گندی چیزیں کیا ہیں، ان کی نشاندہی ہو رہی ہو۔طیبات کو فروغ دیا جائے، خبائث کو روکا جائے۔حلال وحرام کی پابندی کو یقینی بنایا جائے۔یہ سارے معاملات قانون سازی اور پالیسی سازی کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

آج کل ریاست کا کردار زری پالیسی کے بارے میں بنیادی ہو گیا ہے۔لیکن ماضی میں بھی فقہائے اسلام نے اس کو نظر انداز نہیں کیا۔فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سکے جاری کرے۔سکہ جاری کرنا فقہائے اسلام کی نظر میں ریاست کی ذمہ داری ہے۔مشہور محدث اور فقیہ امام نووی نے لکھا ہے کہ ریاست کے علاوہ کسی اور کے لیے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ دراہم ودنانیر ڈھالنے کا کام کرے۔چاہے وہ خالص ہی کیوں نہ ہوں۔اس لیے کہ یہ کام حکومت کا ہے اور حکومت ہی اگر سکہ ڈھالنے کا کام کرے گی تو یہ کام دھوکے اور ملاوٹ اور وزن کی کمی سے پاک صاف رہے گا۔ایک اور جگہ امام نووی نے لکھا ہے کہ "ان

ضرب النقود من اعمال الامام"۔ سکے ڈھالنا اور آج کل کے حساب سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوٹ جاری کرنا بھی ریاست کے وظائف اور ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

ظاہر ہے اگر نوٹ جاری کرنا اور سکے ڈھالنا ریاست کی ذمہ داری ہے تو جعلی اور کھوٹے سکوں کی روک تھام بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ایک مشہور مالکی فقیہ ہیں ونشریسی جن کا مغرب سے تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب المعیار المغرب میں لکھا ہے کہ حکومت کو یہ چاہیے کہ وہ اس بات سے غافل نہ رہے کہ بازار میں جعلی دراہم اور ملاوٹ والے سکے چل رہے ہیں۔ حکومت اس کو سختی سے روکے۔ جو لوگ اس حرکت میں ملوث ہیں ان کا پتا لگائے اور اگر وہ پکڑے جائیں تو ان کو شدید سزا دے۔ انالہ من شدة العقوبه. اس لیے کہ یہ ایک ایسا دھوکہ ہے جو محض کسی فرد کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ پورے معاشرے کے ساتھ ہے۔ اگر فرد کو دھوکہ دینا جرم ہے تو پورے معاشرے کو دھوکا دینا اس سے بھی زیادہ جرم ہونا چاہیے۔

یہ بات فقہائے اسلام نے قرآن کریم کی اس آیت سے نکالی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ولا تبخسوا الناس اشیاء هم" لوگوں کی چیزوں اور مال ودولت (کی قیمت) کم نہ کرو۔ اس حکم میں بہت عموم ہے۔ لوگوں کی چیزیں اونے پونے خرید لینا۔ کھوٹے سکے جاری کرنا۔ کم وزن کے دراہم ودنانیر سے کام چلانا۔ کسی کی قیمتی چیز کو کم قیمت قرار دے کر خرید لینا۔ یہ سب بخس میں شامل ہے۔ آج کل کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سکے کو ڈی ویلیو کرنا بھی بخس کی ایک قسم ہے۔ آپ نے بطور حکومت کے ذمہ دار کے مجھے پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سکے کی قیمت کم کر کے آپ نے پانچ ہزار کی قیمت ڈھائی ہزار کر دی اور مجھے پانچ ہزار کا نوٹ پکڑا دیا۔

میرا استحقاق جس قیمت کا تھا وہ قیمت آپ نے مجھے ادا نہیں کی۔ یہ بھی "ولا تبخسوا الناس اشیاء هم" میں شامل ہے۔ آج کل اس حکم پر عملدرآمد کی صورت کیا ہونی چاہیے۔ اس حکم کو آج کی معاشی زبان میں منتقل کیسے کیا جائے، یہ اہل علم کے غور کرنے کا سوال ہے۔

امام احمد بن حنبل نے کم وزن کے سکے جاری کرنے کو یا جعلی طور پر چلا دینے کو فساد فی الارض قرار دیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ فساد فی الارض کی سزا قرآن کریم میں بہت سخت ہے۔

سورہ مائدہ میں بیان کردہ احکام کی رو سے فساد فی الارض کی سزا بعض صورتوں میں سزائے موت ہے۔ مشہور مالکی فقیہ ابن رشد کی بھی یہی رائے ہے جو معروف فلسفی اور مفکر ابن رشد کے دادا تھے، ان کی رائے بھی یہی ہے کہ جو شخص جعلی سکے اسلامی ریاست میں جاری کرتا ہے یا کھوٹے سکے بازار میں پھیلاتا ہے، وہ فساد فی الارض کا مرتکب ہے۔ یہ فساد فی الارض ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا جو اجتماعی طور پر اور منظّم پیمانے پر یہ کام کر رہے ہوں۔ اگر انفرادی طور پر کوئی ایک آدھ آدمی کبھی جعلی سکہ کسی کو اصلی کہہ کر دے دے تو یہ جرم تو ہے، لیکن یہ فساد فی الارض نہیں ہے۔ لیکن کوئی شخص جعلی نوٹ چھاپنے کی مشین لگا لے، کوئی شخص جعلی سکے ڈھالنے کا کارخانہ بنا لے تو یہ جرم ان حضرات کے نزدیک فساد فی الارض ہے جس کی سزا سزائے موت ہو سکتی ہے۔

آج کل ریاستیں بڑے پیمانے پر جرمانے اور تاوان وصول کرتی ہیں۔ کیا اسلامی ریاست میں جرمانہ اور تاوان لگایا جا سکتا ہے؟ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ نہیں لگایا جا سکتا، بعض کا خیال ہے کہ لگایا جا سکتا ہے۔ تعزیر بالمال یعنی تعزیری سزا جرمانے کی شکل میں دی جا سکتی ہے یا نہیں، یہ مسئلہ فقہاء کے مابین زیرِ بحث رہا ہے۔ بعض احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے اور ماضی میں اس کی مثالیں ہیں کہ جرمانے کی سزا دی گئی ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب نے ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے ذخائر ضبط کر کے سرِ عام جلوا دیے۔ یہ بھی ایک اعتبار سے تعزیر بالمال کی ایک شکل ہے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں جن سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست دوسری سزاؤں کے ساتھ تعزیری سزا کے طور پر جرمانے اور تاوان کے طریقے بھی اختیار کر سکتی ہے۔

اسلامی شریعت کا ایک عام اصول یہ ہے کہ "الخراج بالضمان" یعنی جس چیز کا فائدہ آپ اٹھا رہے ہیں اس کا تاوان اور نقصان بھی آپ کو اٹھانا پڑے گا۔ اگر آپ کسی چیز سے مستفید ہو رہے ہیں تو اس سے متعلق ذمہ داریاں بھی آپ کو انجام دینی پڑیں گی۔ اسی اصول کے تحت اسلامی ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان تعلقات کے بعض پہلو بھی منضبط ہوتے ہیں۔

اگر کسی شخص کا کوئی وارث نہ ہو، اس کا کوئی رشتہ دار دور کا یا قریب کا موجود نہ ہو، تو بیت المال اس کا وارث ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کے ذمے کوئی قرض ہو اور وہ مر جائے،

اس کا کوئی متروکہ ورثہ نہ ہو تو اس کا قرض بیت المال ادا کرے گا۔ یہ بات متعدد احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ ''من ترك كلا فالينا'' جس شخص نے کوئی بوجھ چھوڑا تو وہ ہمارے ذمے ہوگا۔ یعنی ریاست اس کو ادا کرے گی۔

ریاست کی مالی ذمہ داریوں کے بارے میں جو کچھ احادیث میں آیا ہے وہ بہت مفصل ہے۔ اس کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے بہت سے احکام بیان کیے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست خالص اقتصادی اور معاشی معاملات میں بھی ایک اہم کردار رکھتی ہے۔ قرآن کریم کی وہ مشہور آیت جس میں اسلامی ریاست کے فرائض بیان کیے گئے ہیں۔ جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ اگر ہم مسلمانوں کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ ''......اتوا الزكوٰة و امروا بالمعروف و نهوا عن المنكر'' ......وہ زکوٰۃ ادا کریں گے، اچھائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ گویا ادائیگی زکوٰۃ کا بندوبست کرنا، یہ ریاست کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ ''السلطان ولی من لا ولی له'' جس کا کوئی ولی نہ ہو، وارث نہ ہو، ریاست اس کی وارث ہوگی۔ جس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو، ریاست اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ جس کا کوئی پوچھنے والا نہ ہو ریاست اس کو پوچھے گی۔ ایک جگہ آیا ہے ''الله ورسوله ولی من لا ولی له'' ۔ اللہ اور رسول اس کے ولی ہیں جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ اس لیے جو ریاست اللہ اور اس کے رسول کی جانشین ہے وہ اس کی ولی ہوگی جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ''انا اولی بالمؤمنين من انفسهم فمن توفی و عليه دين فعلی قضاؤه'' ۔ اگر کوئی شخص وفات پا جائے اور اس کے ذمے قرض ہو تو قرض کی ادائیگی میرے یعنی ریاست کے ذمے ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ جملہ تو ہم سب نے سنا ہے، جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر فرات کے کنارے پر کوئی بکری مر جائے تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں مجھ سے اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں نہ پوچھے، کہ ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے کہ بکری بھوکی مر گئی اور اس کو چارہ نہ ملا۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ اپنے گورنروں کو ہدایات دیں اور ان میں سے ایک کو لکھا کہ ''الا اوسعوا الناس في بيوتهم و اطعموا عيالهم'' لوگوں کے گھروں میں وسعت پیدا کرو ۔ یعنی لوگوں کو رہائش کھلی اور آرام دہ فراہم کرو۔ ان کو اتنی تنخواہیں اور وسائل دو کہ وہ اپنے گھر

والوں کو اچھی طرح سے کھلا پلا سکیں۔

ریاست کی ذمہ داری کے حوالے سے ایک آخری چیز کا ذکر کر کے بات کو ختم کرتا ہوں۔ وہ اسلامی ریاست میں وقف کا معاملہ ہے۔ یہ تاریخ اسلام کا بہت اہم معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور اجتماعی ادارہ تھا جس میں ریاست کا کردار خاصا اہم تھا۔ قانون سازی کے ذریعے بھی اور پالیسی سازی کے ذریعے بھی ریاست وقف کے ادارے کو بہتر سے بہتر چلانے میں مدد دیا کرتی تھی۔ آج کے دور میں ریاست کی ذمہ داریوں کے باب میں بعض ایسے اہم معاملات پیش آ رہے ہیں جن پر آج کل کے فقہاء کو غور وخوض کرنا چاہیے۔ آج سے پچاس سال پہلے، ساٹھ سال پہلے افراد کی بڑی بڑی ملکیتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے نام پر ضبط کر لینے کا رجحان پیدا ہوا۔ دنیائے اسلام میں بہت سے لوگ کمیونزم کے تصورات سے متاثر ہوئے۔ دنیا میں بعض مسلم حکمرانوں کو سوشلزم کی اور کوئی بات پسند آئی ہو یا نہ آئی ہو یہ بات ضرور پسند آئی کہ اپنے مخالف سیاسی قائدین کی جائیدادیں، زمینیں، کارخانے اور وسیع ملکیتیں اپنے قبضے میں لے لی جائیں۔ چنانچہ دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں میں بھی اور پاکستان میں بھی بڑی بڑی ملکیتیں، کارخانے، تجارتی ادارے، قومی ملکیت میں لے لیے گئے۔ چونکہ قومی ملکیت میں لینے والے سیاسی لیڈر خود کسی کارخانے کے مالک نہیں تھے اس لیے کارخانے اور فیکٹریاں قبضا لینے اور ہتھیا لینے میں تو بہت پر جوش رہے۔ لیکن چونکہ خود ان کا تعلق انگریزوں کے پیدا کردہ زمیندار طبقے سے تھا، اس لیے زمینوں کے معاملے میں انھوں نے نرمی دکھائی اور ظاہری لیپا پوتی کے علاوہ بڑی بڑی اراضی کو قومی ملکیت میں لینے کا کوئی کام نہیں کیا۔

لیکن خود یہ سوال کہ کیا قومی ملکیت میں لینا یا نیشنلائزیشن کا یہ عمل شریعت کے مطابق تھا؟ اس کے جو معاشی نتائج نکلے وہ بہت تباہ کن نکلے۔ پاکستان کی حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیشنلائزیشن کے اس عمل نے پوری پاکستانی معیشت کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کو بھی تباہ کر دیا، معیشت کو بھی تباہ کر دیا۔ جو صاحب یہ حرکت کر کے گئے ان کی اس حرکت کے نتائج بد آج تک پوری قوم بھگت رہی ہے۔ سرکاری ملکیت کے نام پر منظور نظر سرکاری افسروں کی بڑی بڑی حکومتیں اور رجواڑے قائم ہو گئے۔ وہ کمپنیاں، وہ کارخانے، وہ انڈسٹری، وہ صنعتیں، جو لوگوں نے خون پسینے کی کمائی سے بنائی تھیں، جس پر دن رات محنت کی تھی ان کے مالکان بیک جنبش قلم وہاں سے

نکال باہر کیے گئے اور یہ سارے ادارے بیٹھے بٹھائے منظور نظر سرکاری افسران کی عملاً ملکیت میں چلے گئے۔ نتیجہ وہ نکلا جو آج آپ کے سامنے ہے۔ پورے پاکستان کی معیشت بیٹھ چکی ہے اور اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی جو بھی کوششیں ہوئیں وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔

اس کے ردعمل میں اب ویسی ہی ایک اور قباحت اب پیدا ہو رہی ہے۔ وہ نئی قباحت اب نج کاری کے نام سے آ رہی ہے۔ اہل مغرب نے ہی قومی ملکیت میں لینے کا نسخہ سمجھایا تھا۔ اب وہیں سے نج کاری، خصخصہ یا پرائیویٹائزیشن کے نام سے یہ نیا نسخہ سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ اب قیمتی سرکاری جائدادیں اور وسائل اونے پونے دوسروں کے ہاتھوں بیچے جا رہے ہیں۔ غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں حساس ادارے بیچے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے یہ قیمتی وسائل ہم سب کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہیں۔ بجلی کی پیداوار کے وسائل، ایسے ایسے علاقوں میں موجود وسائل جہاں سے پاکستان کی شہ رگ گزرتی ہے۔ بجلی کے وسائل غیر ملکی کمپنیوں کے اونے پونے داموں بیچ دیے گئے ہیں۔ اتنی قیمت پر بیچ دیے گئے ہیں جس سے کئی گنا زیادہ مالیت کے ان کے پاس پہلے سے اثاثے موجود تھے۔ بعض ایسے ادارے فروخت کیے گئے جن کی مہینے کی آمدنی اس قیمت سے زیادہ تھی۔

یہ نسخہ چونکہ پوری دنیائے اسلام میں آزمایا جا رہا ہے۔ اس لیے دنیا میں ہر جگہ کے اہل علم اس پر غور کر رہے ہیں۔ متعدد حضرات نے اس موضوع پر مقالات بھی شائع کیے ہیں۔ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ بعض حضرات نے فقہ کے موقف کو محض فنی نقطہ نظر سے دیکھا اور اس کو جائز سمجھا۔ کچھ اور حضرات نے گہرائی سے اس کے حقائق، نتائج اور ثمرات پر غور کیا، ان کو یہ بات ناجائز معلوم ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ ایک نیا استعمار ہے۔ یہ آئے دن نت نئی ایسٹ انڈیا کمپنیاں قائم ہو رہی ہیں، دنیائے اسلام میں جگہ جگہ غیر ملکی کمپنیاں آ کر بیٹھ رہی ہیں، جو مسلمانوں ہی کے وسائل سے، مسلمانوں ہی کے ملک میں بیٹھ کر، مسلمانوں ہی کے دست و بازو سے کام لے کر وہ مقاصد حاصل کریں گی جو آج سے دو سو سال پہلے مختلف غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعے حاصل کیے گئے تھے۔

ریاست کی ذمہ داریوں میں آج کل ایک بہت اہم معاملہ، ایک ایسی اسلامی مارکیٹ کا قیام بھی ہے۔ جس پر خاصے عرصے سے غور و خوض بھی کیا جا رہا ہے اور اس کی دعوت بھی دی جا رہی

ہے۔ آج کل کا بازارزر مکمل طور پر سودی اداروں کے کنٹرول میں ہے۔ بازارزر کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سودی کاروبار، غرر اور قمار کی مختلف صورتیں ہیں۔ آج ایسے اسلامی بازار کی ضرورت ہے جہاں اسلام کی بنیاد پر کام کرنے والے تجارتی ادارے، اسلامی خطوط پر کام کا آغاز کرنے والے بینک، مصارف، اسلامی تجارتی کمپنیاں، شریعت کے احکام کے مطابق لین دین کریں اور بازارزر کے وہ جائز مقاصد پورے کریں جو بازارزر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ان کاموں کے لیے مختلف مسلم ریاستوں کو اپنی معاشیات اور ترقیاتی پالیسی میں تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ ریاست کس حد تک بازارزر کو قائم کرنے میں مدد ومعاون ہوسکتی ہے۔ یہ اس فن کے ماہرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بیان کریں کہ یہ کام کیسے ہونا چاہیے۔

بازارزر کے مسئلے پر آج کل کے اہل علم نے بہت تفصیل سے غور وخوض کیا ہے۔ اس پر متعدد کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں یہ بتایا گیا کہ دستاویزات قابل بیع وشراء کا اگر بازار ہو تو اس کے اسلامی اصول اور احکام کیا ہونے چاہئیں۔ اوراق مالیہ کو جب خرید وفروخت کے لیے پیش کیا جائے گا، اس کے احکام وقواعد کیا ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے یہ احکام وقوانین شریعت کے مطابق ہوں گے۔ ان میں ربا نہیں پایا جاتا ہوگا۔ ان میں سود نہیں پایا جاتا ہوگا۔ ربا کے احکام کی مکمل پابندی کرتے ہوئے جب اوراق مالیہ کی لین دین کی جائے گی تو وہ بہت حد تک اس لین دین سے مختلف ہوگی جو جدید بازاروں میں کیا جارہا ہے۔

اسی طرح جب حصص کی خرید وفروخت کا مسئلہ آئے گا تو حصص کی خرید وفروخت میں بھی حرمت ربا کا احکام کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ اگر کسی ایسی کمپنی کے حصص کی خرید وفروخت ہورہی ہو جس کے پاس صرف نقد رقم موجود ہے تو اس کے حصص کی خرید وفروخت کے معنی یہ ہیں کہ زر کی خرید وفروخت زر کے ساتھ ہورہی ہے جو صرف برابر سرابر کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے۔ کمی بیشی کی بنیاد پر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح حصص کی وہ خرید وفروخت جو آج کل رائج ہوگئی ہے جس میں فیوچر سیل بھی شامل ہے۔ جس میں امتیازی حصص بھی شامل ہیں۔ ان کے احکام مرتب کیے جانے ضروری ہیں۔

یہ سب وہ احکام ہیں جو بازارزر سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے بارے میں آج کل کے فقہاء نے تفصیل سے احکام مرتب کیے ہیں۔ اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور ان

اداروں کے فیصلے اور فتاوی بھی آئے ہیں جنھوں نے اجتماعی طور پر اجتہاد سے کام لے کر آج کل کے فقہی اور قانونی اور معاشی مسائل کا جواب دیا ہے۔ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت جو فقہ اکیڈمی قائم ہے اس نے اپنی بہت سے قراردادوں میں ان مسائل کا جواب دیا ہے۔ جدہ کی اسلامی تنظیم او آئی سی کے ماتحت جو بین الاقوامی فقہ اکیڈمی کام کر رہی ہے اس نے بھی ان معاملات کے بارہ میں بہت تفصیل سے رائے دی ہے۔ اس کے فیصلوں اور قراردادوں میں ان مسائل کا تفصیلی جواب ملتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دور جدید کے فقہائے اسلام نے اجتماعی طور پر کیا نتائج نکالے ہیں۔ ان کی اجتماعی بصیرت اس معاملے میں کیا کہتی ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا تعلق براہ راست ریاست اور ریاست کے اختیارات سے ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

پانچواں خطبہ

اسلام میں مال وملکیت کے احکام

پانچواں خطبہ

اسلام میں مال وملکیت کے احکام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے، اسلام میں مال اور ملکیت کے احکام۔ مال اور ملکیت کا احکام پر گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ معیشت وتجارت کا پورا دارومدار مال وملکیت کے تصورات پر ہے۔ مال اور ملکیت کے بارے میں جو تصورات ہوں گے، انھی کی بنیاد پر قانون کی تشکیل کی جائے گی۔ انھی کی بنیاد پر لین دین کے تمام احکام مرتب ہوں گے۔ قانون کے تفصیلات اسی کے مطابق طے ہونگی۔

اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلام میں مال اور ملکیت کے احکام اور تصورات کے بارے میں وہ تمام تفصیلات ہمارے سامنے رہیں جو قرآن کریم اور سنت میں بیان ہوئی ہیں اور جن کو سامنے رکھ کر فقہائے اسلام نے ان کے تفصیلی احکام مرتب کیے ہیں۔

یہ بات تو قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے اللّٰہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک حقیقی ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے اس کا خالق اور مالک حقیقی ہر اعتبار سے اللّٰہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ بات محض کسی مذہبی یا مابعد الطبیعی یا محض کسی نظری مفہوم میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قانونی تصور بھی ہے جس کے بہت سے اہم تضمنات ہیں۔ اگر اللّٰہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو روئے زمین پر یا روئے زمین سے باہر پائی جاتی ہیں تو پھر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ انسان قرآن

مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ان تمام ممتلکات میں اس کا جانشین ہے۔

قرآن مجید میں صراحت سے ارشاد ہوا ہے:"**وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ**"اس مال و دولت میں سے خرچ کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں جانشین بنایا ہے۔یہ جانشینی آزمائش کے لیے ہے۔انسان کی تکریم اور احترام کے لیے ہے۔انسان کے مقام و مرتبہ کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ اعلیٰ مقام اور مرتبہ عطا فرمایا ہے کہ اپنی جانشینی یا اپنی نیابت کا درجہ انسان کو بخشا۔اگر انسان اس روئے زمین پر اس محدود دائرہ کار میں اللہ کے نائب کی ذمہ داری انجام دے رہا ہے تو پھر یہ ذمہ داری ان حدود اور قواعد کے مطابق ہونی چاہیے جو اللہ نے بیان کیے ہیں۔

یہ جانشینی اور نیابت کا لازمی تقاضا ہے کہ نیابت کے فرائض ان حدود اور قواعد کے مطابق ہی انجام دیے جاتے ہیں جو اصل مالک نے طے کیے ہوں۔اگر آپ کسی کی جائداد کے متولی ہوں اور اس نے اپنی جائداد کا نگران اور منتظم آپ کو بنا دیا ہو تو آپ اس جائیداد کو انھی حدود اور قواعد کے اندر استعمال کرنے کے پابند ہیں جو اصل مالک نے آپ کے لیے مقرر کی ہیں۔آپ کی حیثیت اس جائداد کے بارے میں ایک امین کی ہے،بطور ایک امین کے آپ اس کے متولی ہیں،اس کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں۔آپ کو ان تمام شرائط اور حدود کی پابندی کرنی ہوگی جو اصل مالک نے مقرر کی ہیں۔یہی کیفیت اس کائنات میں پائے جانے والے وسائل اور مال و دولت کے بارے میں انسان کی ہے۔

مال فی نفسہ کوئی مقصود نہیں ہے۔سونا چاندی،زر و جواہر اپنی ذات میں مقصود نہیں ہوتے۔نہ انسان ان کو کھا سکتا ہے،نہ پی سکتا ہے۔نہ گرمی سردی محسوس ہو تو ان سے بچاؤ کر سکتا ہے۔نہ بیماری کی حالت میں ان کو بطور دوا کے کھا سکتا ہے،نہ بطور مرہم کے لگا سکتا ہے۔مال و دولت محض ایک ذریعہ ہے،وسیلہ ہے جن کے ذریعے انسان کے بہت سے کام نکلتے ہیں اور بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔بھوک پیاس میں مبتلا ہو تو مال و دولت کے ذریعے آدمی کھانا خرید سکتا ہے۔گرمی سردی کا مسئلہ ہو تو موسم کا لباس پیسے سے خرید سکتا ہے۔گھربار کی ضرورت ہو تو وہ پیسے سے حاصل ہوتا ہے۔اس لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شریعت کی نظر میں مال فی نفسہ کوئی مقصود نہیں ہے،بلکہ بہت سے مقاصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔جس طرح

بقیہ تمام چیزوں کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح ان زر و جواہر کے ذخائر کا مالک بھی اللہ ہے جو اللہ نے روئے زمین میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

چونکہ اللہ نے انسان کو اجازت دی ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور قواعد کے مطابق مال و دولت کو حاصل کرے۔اس لیے مال و دولت کے حصول کے وہی ذرائع جائز ہوں گے جو اللہ کی شریعت نے بیان کیے ہیں۔ اگر شریعت کے منظور کردہ وسائل اور طریقوں سے ہٹ کر مال و دولت کو حاصل کیا جائے گا تو ایسا کرنا ناجائز ہوگا۔شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہوگا۔جس طرح مال و دولت کا حصول جائز طریقے سے ہونا چاہیے،شریعت کے مطابق ہونا چاہیے،اسی طرح مال و دولت کا استعمال بھی شریعت کی حدود کے مطابق اور جائز طریقے سے ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر مال کی آمد و رفت کے دونوں راستے ، آنے کا راستہ اور جانے کا راستہ، دونوں جائز ہونے چاہئیں،اور شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

مال و دولت کے بارے میں یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کا منشا یہ ہے کہ مال و دولت معاشرے کے پورے طبقوں میں پھیلے، کسی ایک طبقے تک محدود نہ ہو۔ کسی ایک طبقے کی اس پر اجارہ داری نہ ہو۔شریعت نے بہت سے احکام اسی غرض کی تکمیل کے لیے دیے ہیں۔لہٰذا ہر وہ طریقہ کار، ہر وہ پالیسی ، ہر وہ قانون، ہر وہ فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں ہوگا، بلکہ شریعت سے متعارض ہوگا جس کا نتیجہ مال و دولت کے ارتکاز کی صورت میں نکلتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی محبت انسانوں کے دل میں رکھ دی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ یا فطری داعیہ ہے،شریعت اس کو ختم نہیں کرنا چاہتی۔ جو دواعی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھے ہیں وہ مادی ہوں، جسمانی ہوں،حیوانی ہوں، مال و دولت کے تقاضے سے متعلق ہوں، وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہیں۔ان کو سرے سے ختم کر دینے یا بالکل ہٹا دینے کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔ اگر یہ دواعی شریعت اور اخلاق کی حدود کے اندر ہیں تو بہت مفید اور نہایت مثبت نعمتیں ہیں۔لیکن اگر انسان اپنے مادی محرکات ،شہوات اور ذاتی مفاد کی وجہ سے انھی کو سب کچھ سمجھ لے اور ان چیزوں کی محبت کو دوسرے اہم تر مقاصد پر حاوی کر دے تو یہ شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

قرآن مجید نے کئی جگہ واضح طور پر یہ کہا ہے کہ انسان کے دل میں مال کی محبت شدید

ہے''وانہ لحب الخیر لشدید''کہ انسان مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی شہوات ہیں وہ سب انسانوں کے لیے مزین کر دی ہیں۔ان شہوات کو انسانوں کے لیے خوبصورت انداز میں تیار کر دیا گیا ہے جن کی تفصیلات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ ہر انسان ان شہوات کو حاصل کرنا چاہتا ہے،ان کو حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر ان کو شریعت کی حدود کے اندر رہ کر حاصل کیا جائے، جائز طریقے سے حاصل کیا جائے، جائز طریقے سے ان کو برتا جائے، جائز حدود کے اندر رہ کر ان کو استعمال کیا جائے۔ یہ سب چیزیں وہ ہیں جو متاع دنیا کہلاتی ہیں۔ دنیا کی عارضی لذت کا سامان کہلاتی ہیں۔

دنیا کی اس عارضی لذت کو چھوڑنے کا یا نظر انداز کر دینے کا اللہ کی شریعت نے حکم نہیں دیا۔اللہ کی شریعت نے تو ان سب چیزوں کو خود انسان کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔''خلق لکم ما فی الارض جمیعا''۔لہٰذا جو چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو،انسان کی خاطر پیدا کی گئی ہو،انسان اگر اس کو چھوڑ دے تو یہ اللہ کی مشیت اور اس کی بے پایاں حکمت کے خلاف ہے۔اسی لیے ارشاد ہوا''ولا تنس نصیبك من الدنیا''اس دنیا میں جو تمھارا حصہ ہے، جو محدود ہے، جو شریعت کی حدود کے مطابق حاصل کیا جانا چاہیے،اس کو حاصل کرنا مت بھولو۔اللہ تعالیٰ نے جو دعا اپنے نیک بندوں کو سکھائی ہے، جو عموماً نماز کے آخری قعدے میں مسلمان پڑھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ آخرت کی اچھائیاں بھی عطا فرما اور دنیا کی اچھائیاں بھی عطا فرما۔دنیا میں جو جو اچھائیاں ہیں وہ مادی اچھائیاں ہوں،اخلاقی ہوں،روحانی ہوں،ان سب کی دعا اللہ تعالیٰ سے ہر نماز میں کی جاتی ہے۔بہت سے صحابہ کرام نے ،تابعین اور مفسرین قرآن نے حسنہ کی تعریف کی ہے کہ حسنہ سے کیا مراد ہے۔حسنہ کا مفہوم کسی خاص چیز میں محدود نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے لفظ کو عام رکھا ہے تو اس کا مفہوم بھی عام ہے۔مفسرین کرام نے بطور مثال مختلف حسنات کا ذکر کیا ہے۔جن حسنات کی نماز میں دعا کی جاتی ہے وہ ان مثالوں میں منحصر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سب اچھائیاں جو انسان کو مطلوب ہیں وہ سب بطور حسنات اس دعا میں شامل ہیں۔

مال و دولت کو اللہ تعالیٰ نے خیر بھی کہا ہے،فضل بھی کہا ہے،متاع بھی کہا ہے،حسنہ بھی کہا ہے۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مال و دولت کی اہمیت شریعت کی نظر میں کیا ہے۔پھر یہ مال

ودولت پوری زندگی کے لیے قیام کی حیثیت رکھتا ہے۔جس طرح فرد کی زندگی کا دارومدار صحت مند خون پر ہے،اسی طرح اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا دارومدار مال ودولت کے حصول پر ہے۔

مال ہی ان تمام شرعی ذمہ داریوں کی بنیاد ہے جن کا تعلق مالی معاملات سے ہے۔ فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ ''المال مناط التکالیف المالیہ''۔اللہ تعالیٰ نے بہت سی شرعی ذمہ داریاں انسان پر عائد کی ہیں،ان میں سے بعض جسمانی ہیں جیسے نماز،بعض مالی ہیں جیسے زکوٰۃ،بعض میں دونوں پہلو ہیں جیسے حج۔اس لیے شریعت کے ان تمام مالی احکام پر عمل درآمد اسی وقت ہوسکتا ہے جب مال موجود ہو۔زکوٰۃ انسان اسی وقت ادا کرے گا جب اس کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو۔صدقہ فطر انسان اسی وقت ادا کرے گا جب اس کی شرائط موجود ہوں۔ نفقات واجبہ،کفارات،یہ سب وجود مال سے مشروط ہیں۔صدقات واجبہ کے باب میں انسان اس بات کا پابند ہے کہ اپنی سطح اور اپنے معیار کے مطابق اپنے اہل خاندان کو اخراجات فراہم کرے۔''اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم'' جہاں اور جس طرح تم رہتے ہو اسی سطح پر اپنی بیویوں کو رکھو۔''لینفق ذو سعۃ من سعتہ'' اگر کسی کو اللہ نے کشادگی عطا فرمائی تو وہ کشادگی کے مطابق خرچ کرے۔''فلینفق مما اتاہ اللّٰہ'' جو اللہ نے اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔''لا یکلف اللّٰہ نفسا الا ما اتاھا'' اللہ تعالیٰ جس فرد کو جو مال ودولت اور وسائل عطا فرماتا ہے اسی کے مطابق ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے۔یہ نہیں ہوتا کہ وسائل اللہ تعالیٰ عطا نہ فرمائے،ذمہ داری زیادہ ڈال دے۔یہ اللہ تعالیٰ کے عدل،فضل وکرم اور لطف کے خلاف ہے۔

مال سے کیا مراد ہے؟ مال میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں؟ مال کی کتنی قسمیں ہیں؟ یہ سوالات فقہ وقانون کے اہم سوالات ہیں۔مال کی تعریف میں فقہائے اسلام نے بہت سی بحثیں کی ہیں۔مال کی وضاحت اور تعریف کرتے ہوئے فقہائے اسلام نے خالص قانونی انداز کی تعریف بھی کی ہے۔معاشرتی انداز کی تعریف بھی کی ہے،اخلاقیات کے نقطہ نظر سے بھی مال کو دیکھا ہے۔معاشیات کے نقطہ نظر سے بھی مال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مال کی ان تمام تعریفات میں لفظ مال کی لغوی تشریح کو فقہائے اسلام نے عموماً نظر انداز نہیں کیا۔مال کا لفظ عربی زبان کے معروف لفظ میل سے نکلا ہے۔مال،یمیل کے معنی ہیں:

مائل ہونا، میل رکھنا۔ مثلاً کسی شخص کا ذاتی میلان کسی چیز کی طرف ہو تو اس کو لغوی اعتبار سے مال کہا جا سکتا ہے جس چیز کی طرف سب سے زیادہ میلان ہو وہ مال ہی ہوتا ہے۔ اس لیے مال کا لفظ میلان کے لفظ سے نکلا ہے۔ ہر وہ چیز جس کی طرف انسان طبعی طور پر میلان رکھتا ہو، اس سے جائز طور پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو، عام حالات میں وہ چیز انسان کے لیے جائز منفعت کا ذریعہ اور ماٴخذ ہو، اس کو مال کہا جاتا ہے۔

امام شاطبی نے لکھا ہے کہ مال کے مال ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ بازار میں اس کی کوئی نہ کوئی قیمت ہو۔ جس قیمت میں وہ فروخت ہو جاتا ہو یا اس کو خریدا جا سکتا ہو۔ چاہے وہ قیمت کتنی ہی کم ہو، لیکن اگر کوئی شخص اس کو ضائع کر دے تو اس پر اس کا تاوان ڈالا جائے۔ آج کل ماہرین معاشیات زر کی جو تعریف کرتے ہیں اس میں اس کے store of value ہونے کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہو کہ اس کی مالیت کو ضرورت کے وقت تک کے لیے محفوظ رکھا جا سکتا ہو۔ یہ تصور فقہائے اسلام کے یہاں موجود ہے۔ فقہائے اسلام نے لکھا ہے، یہ علامہ ابن عابدین کے الفاظ ہیں کہ "**والمال ما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة**" مال میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کی طرف انسان فطری طور پر میلان رکھتا ہو اور جن کو ضرورت کے وقت کے لیے ذخیرہ کر کے رکھا جا سکے۔ جب کسی چیز کو بہت سے لوگ یا کچھ لوگ مال سمجھنے لگیں اور مال سمجھ کر اس کو حاصل کرنے کی تگ و دو کریں، اس کے ذریعہ تمول حاصل کرنا چاہیں تو اس کی مالیت یعنی مال ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کا مال ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

مال کی قانونی تعریف کے بارے میں فقہائے احناف اور فقہائے غیر احناف کے درمیان تھوڑا سا فرق رہا ہے۔ غیر حنفی فقہاء، شافعی، مالکی اور حنبلی اور دوسرے متعدد فقہاء کے نزدیک مال سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی کوئی مادی قیمت عامۃ الناس کے درمیان سمجھی جاتی ہو اور شرعاً اس سے انتفاع جائز ہو چاہے خود اس کا اپنا وجود مادی طور پر الگ سے متمیز ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ منافع یعنی کسی چیز کے فوائد یا مجرد حقوق جیسے حق تصنیف، حق ایجاد وغیرہ۔ یہ تمام فقہاء کے نزدیک مال ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک ان کی ایک مادی قیمت ہے اس مادی قیمت کو کسی دوسرے مال کے معاوضے میں ایک کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں فقہائے احناف کا کہنا ہے کہ مال وہی ہوسکتا ہے جو اپنا خود مادی وجود بھی رکھتا ہو۔ محض کوئی مجرد چیز نہ ہو۔ اس لیے فقہائے احناف کے نزدیک روایتی طور پر منافع اور حقوق کو مال نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کوئی شخص اپنے حقوق کو فروخت نہیں کرسکتا، اس لیے کہ حقوق کوئی ایسی حسّی یعنی tangible چیز نہیں تھے جس کی ملکیت اور قبضہ ایک شخص سے دوسری شخص کو منتقل کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ برصغیر کے بے شمار اہل علم ایسے رہے ہیں جنھوں نے اپنی تصنیفات کا کبھی بھی کوئی حق تصنیف وصول نہیں کیا۔ حالانکہ ایسے ایسے حضرات برصغیر میں ہوئے ہیں جن کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ ان میں ایسے مصنفین بھی ہیں کہ جن کی تصنیفات اردو زبان کی مقبول ترین تصنیفات میں سے ہیں، جن کے شاید ہزاروں ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن انھوں نے ایک پیسہ بھی کبھی حق تصنیف کے طور پر وصول نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ حنفی نقطہ نظر کے مطابق حقوق اور منافع کو مال نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی خرید وفروخت کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن آج کل فقہاء کا عام طور پر رجحان یہی رہے کہ جمہور کی رائے کو اختیار کیا جائے اور منافع اور حقوق کو بھی مال سمجھا جائے۔ اس لیے کہ آج کل حقوق کی اتنی قسمیں رائج ہوگئی ہیں اور ان کی خرید وفروخت اس طرح وسیع پیمانے پر ہورہی ہے کہ اس کو ختم کرنا بہت مشکل بھی ہے اور اگر ختم کر بھی دیا جائے تو اس کے نتیجے میں بعض ایسے مسائل پیدا ہوں گے جن کا حل بہت دشوار ثابت ہوگا۔ اس لیے آج کل کے اہل علم نے عام طور پر غیر حنفی علماء کی رائے کو ہی کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ کاپی رائٹ اور اس طرح کے جو دوسرے حقوق ہیں اب دنیائے اسلام میں ہر جگہ ان کو مال تصور کیا جانے لگا ہے۔ جتنے بھی بین الاقوامی اسلامی ادارے ہیں، وہ مجمع الفقہ الاسلامی ہو یا اجتماعی فیصلے کے دوسرے ادارے ہوں، ان سب کا رجحان اور فیصلہ یہی ہے کہ منافع کو بھی مال سمجھا جائے اور ان کی خرید وفروخت جائز سمجھی جائے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھانا شریعت کی نظر میں جائز ہو وہ مال ہے۔ یہ تعریف بقیہ فقہاء کی، خاص طور پر فقہائے حنابلہ کی وضع کردہ ہے۔

ائمہ احناف سے جتنی تعریفات منقول ہیں، امام محمد سے، علامہ ابن عابدین سے ان سب کی تعریفات میں مادی اشیاء پر زور دیا گیا ہے اور ان کو بطور مثال مال کی تعریف میں شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً سامان تجارت، نقد زر وجواہر، زمین، جائداد، سونا چاندی، گندم، غلہ، کپڑا۔ یہ وہ

مثالیں ہیں جو ائمہ احناف نے مال کی تعریف میں بیان کی ہیں۔

شریعت نے مال کے بارے میں بہت سے احکام دیے ہیں۔ یہ احکام قانونی نوعیت کے بھی ہیں اور اخلاقی نوعیت کے بھی ہیں۔ بعض احکام ایسے ہیں کہ ان کا ایک پہلو یا ایک سطح قانونی طور پر واجب التعمیل یا واجب التنفیذ ہے۔ دوسرا پہلو یا دوسری سطح اخلاقی طور پر انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس پر عمل درآمد کریں۔ مثال کے طور پر شریعت نے حکم دیا ہے کہ مال کی حفاظت کرو، مال کو ضائع نہ کرو۔ ایک حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا، صحیح بخاری، صحیح مسلم دونوں میں یہ حدیث آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو چیزیں ناپسند کی ہیں ان میں سے اضاعۃ المال یعنی مال کو ضائع کرنا بھی ہے۔

مال کو ضائع کرنے کی بہت سے صورتیں ہوسکتی ہیں۔ بعض اوقات انسان وسائل کی کثرت اور مال ودولت کی بہتات کی وجہ سے مال کو ضائع کر دیتا ہے اور اس کو احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً بعض لوگ پرانے کپڑے ضائع کر دیتے ہیں۔ بچا ہوا کھانا پھینک دیتے ہیں۔ جو اشیاء ضرورت سے زائد ہوں ان کو نظر انداز کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہ سب اضاعت مال کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر کوئی چیز آپ کے استعمال میں نہیں ہے تو آپ اسے کسی ایسے شخص کو دے دیں جو ضرورت مند ہو۔ دنیا میں ضرورت مندوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ محض اہتمام اور خیال رکھنے کی بات ہے۔

دوسری طرف شریعت نے مال کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ بلکہ حفاظت مال کو تمام فقہائے اسلام نے بالاتفاق شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا ہے۔ آپ اپنے زیر انتظام اور زیر تصرّف مال کی حفاظت کرنے کے اس لیے بھی پابند ہیں کہ آپ اس کے امین ہیں۔ آپ اصل مالک کے جانشین ہیں۔ اصل مالک ذات باری تعالیٰ ہے، اور آپ اس کے نائب ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کو اپنی جائداد کا متولی مقرر کر دے اور آپ اس کی حفاظت نہ کریں تو آپ کو ایک نالائق متولی اور ایک نااہل منصرم قرار دیا جائے گا اور آپ کو جائیداد کی تولیت کے منصب سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس لیے مال کی حفاظت بھی ضروری ہے اور مال کو ضائع ہونے سے بچانا بھی ضروری ہے۔ ضائع ہونے سے بچانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو ضائع ہونے سے بچائے، یہ تو سبھی لوگ کرتے ہیں۔ ایک [illegible] سطح پر [illegible]

ہے۔لیکن دوسرے کے مال کی حفاظت بھی اپنی ذمہ داری سمجھی جائے،اس پر بھی شریعت نے بہت زور دیا ہے۔جس طرح ہر انسان کی عزت محترم ہے،اس کا مال بھی محترم ہے۔جس طرح ہر انسان کی عزت مقدس ہے اس کی جائز ملکیت بھی مقدس ہے اور ان سب کا احترام ہر عاقل بالغ انسان کی ذمہ داری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے بیٹھے تو اس کو شہید کا درجہ دیا جائے گا۔''**من قتل دون ماله فهو شهيد**'جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جائے اس کا درجہ شہید کا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت نے مال کو کتنی اہمیت دی ہے۔

مال کی حفاظت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی دیکھ بھال رکھی جائے۔اس میں سرمایہ کاری کی جائے،اس میں اضافے کی کوشش کی جائے۔میں یہ حدیث کئی بار بیان کر چکا ہوں جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس زمین ہو تو یا تو خود اس کو آباد کرے یا اپنے کسی بھائی کو دے دے جو اس کو آباد کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی یتیم کے مال کا متولی بن جائے تو اس مال کو تجارت میں لگا دینا چاہیے۔اس لیے کہ اگر اس کو خالی چھوڑ دیا تو ہر سال جب زکوۃ کی ادائیگی کرنی پڑے گی تو اس میں ڈھائی فیصد کمی آتی جائے گی اور جب تک یہ بچہ بڑا ہوگا،اس کے مال کا خاصا بڑا حصہ زکوۃ میں نکل چکا ہوگا مثلاً بچہ اگر ایک سال کا ہے تو جب تک وہ پندرہ سال کا ہوگا تو ڈھائی فیصد کے حساب سے دیکھیں کتنا حصہ مال کا غالباً سینتیس فیصد کم ہو جائے گا۔جب اس کا مال اس کو ملے گا تو اونے پونے ملے گا۔اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو تجارت میں لگا دیا جائے۔تجارت میں لگانے سے مال میں اضافہ بھی ہوگا،برکت بھی ہوگی اور پورا معاشرہ اس مال سے مستفید ہوگا۔

اس ہدایت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر میں تجارت اور سرمایہ کاری خود ایک پسندیدہ چیز ہے۔شریعت کی نظر میں ہر وہ سرگرمی پسندیدہ ہے جس سے تجارت اور معاشی سرگرمی کو مہمیز ملے جس سے معاشی سرگرمی میں اضافہ ہو۔

مال کی حفاظت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ شریعت نے مال کے استعمال پر بعض حدود اور قیود عائد کی ہیں۔مثلاً اگر کوئی شخص کم عقل ہو،بہت بے وقوف ہو تو اس وقت تک اس کا مال اس کو نہ دیا جائے جب تک اس میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے۔یہ حکم براہِ راست قرآن پاک میں آیا

ہے: "ولا تؤتوا السفهاء اموالكم" بے وقوف اور کم عقل لوگوں کے ہاتھ میں ان کا مال نہ دو، جب تک تم یہ محسوس نہ کرلو کہ ان میں سمجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے۔ "فان انستم منهم رشدا فادفعوا اليهم اموالهم"۔ جب تم یہ محسوس کرلو کہ ان میں سمجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے پھر ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ فرض کیجئے کہ ایک لکھ پتی باپ کا انتقال ہو گیا ہے اس کے وارث چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی عمر کے ہیں، ابھی معاملات کو سمجھتے نہیں ہیں۔ وہ پوری جائداد ان کے ہاتھوں میں آئے گی تو چند سال میں، بلکہ چند مہینے میں اڑا کر برابر کر دیں گے۔ مال کا غلط استعمال کریں گے۔

اس لیے معاشرے کو یہ ہدایت ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام رکھے کہ ایسے بے عقل اور ناتجربہ کار لوگوں کے ہاتھ میں دولت نہ چلی جائے۔ اگر کسی یتیم کے ولی موجود ہیں، مثلاً چچا زندہ ہے یا دادا موجود ہے تو یہ حکم ان کے لیے ہے کہ وہ اس مال کی حفاظت رکھیں اور جب تک اس کے یتیم پوتے یا بھتیجے سمجھدار نہ ہو جائیں، ان میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک ان کا مال ان کے حوالے نہ کریں۔ اگر کسی شخص کا کوئی قریبی ولی نہیں ہے تو پھر یہ ہدایت ریاست کو ہے۔ عدالت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام رکھے کہ بچوں اور بے سہارا لوگوں کے مال اور جائیداد کا تحفظ ہو۔

اسلامی قوانین کی رو سے قاضی اپنے علاقے کی تمام بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا لوگوں کا متولی ہے۔ ہر اس یتیم کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ ہر اس بیوہ کا رکھوالا ہے جس کا کوئی رکھوالا نہ ہو۔ ہر اس بے سہارا کا سہارا ہے جس کا کوئی سہارا نہ ہو۔ یہ قاضی کی ذمہ داریاں ہیں، اسلامی شریعت کی رو سے یہ قاضی کے فرائض ہیں۔ تمام فقہاء نے ان کو بیان کیا ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا "السلطان ولی من لا ولی له" جس کا کوئی ولی نہ ہو تو حکومت اس کی ولی ہوگی۔ حکومت کی طرف سے یہ ذمہ داریاں قاضی اور عدالتیں انجام دیں گی۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مال کے تحفظ کے بارے میں شریعت کتنا اہتمام رکھتی ہے اور کس طرح اس کی حفاظت اور اضافے میں دلچسپی رکھتی ہے۔

مال کی حرمت کی ایک سطح سے تو ہم سب واقف ہیں کہ شریعت نے ہر شخص کا مال محترم قرار دیا ہے: میرا مال محترم ہے، آپ کے لیے۔ آپ کا مال محترم ہے میرے لیے۔ میں آپ کے

مال پر بری نظر نہ رکھوں، آپ میرے مال پر بری نظر نہ رکھیں۔ اس کی ایک سطح تو اخلاقی اور معاشرتی ہے۔ جو اخلاق اور تربیت کے ذریعے حاصل کی جائے گی۔ تعلیم اور تربیت، معاشرتی ماحول اور اخلاق وکردار کے ذریعے یہ مزاج پیدا کیا جانا چاہیے کہ ہر شخص دوسرے کی چیز کا احترام کرے اور کسی دوسرے کی چیز کو لالچ کی نظر نہ دیکھے

لیکن اس کی ایک سطح قانونی بھی ہے۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ قانون سازی کے ذریعے اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر شخص کا مال محفوظ رہے۔ عدالتیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو مؤثر طریقہ سے انجام دیں اور لوگوں کے مال، جائداد اور ممتلکات کی حفاظت کی جائے۔ علامہ ابن عابدین جو متاخر حنفی فقہاء میں صف اوّل کے فقیہ ہیں، انھوں نے اس تصور کو ایک قانونی ضابطے کے انداز میں مرتب کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "**لا یجوز لا حد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی**" کسی بھی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی دوسرے کا مال بغیر کسی شرعی سبب کے لے لے۔ شرعی سبب سے مراد وہ تمام اسباب ہیں جو دوسرے کے مال کے حصول کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جائز تجارت، خرید وفروخت، ھبہ، ھدیہ، وراثت۔ یہ وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے دوسرے کا مال جائز طور پر انسان کو منتقل ہوتا ہے۔

چونکہ مال کے صحیح تصور اور صحیح تقسیم پر شریعت کے بہت سے احکام کا دارومدار ہے۔ اس لیے فقہائے اسلام نے مال کے تفصیلی احکام مرتب کیے ہیں اور ضروری قسمیں بیان کی ہیں۔ مال کے بارے میں یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مال سے مراد وہ ہے جس سے فائدہ اٹھانا یا انتفاع کرنا جائز ہو، جس کو عامتہ الناس مال سمجھتے ہوں اور بطور مال کے اس کے حصول میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس لیے وہ تمام چیزیں گفتگو سے خارج ہو جائیں گی اور مال کی تعریف میں شامل نہیں سمجھی جائیں گی جن کے ذریعے لوگ تمول حاصل نہیں کرتے۔ مثلاً گھاس کی بہت بڑی مقدار ہو تو وہ مال ہے۔ لیکن اگر ایک تنکہ ہو تو وہ مال نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے، نہ اس کو خریدنے کے لیے تیار ہے، نہ ایک تنکے سے عام حالات میں کوئی کام نکلتا ہے۔ کھجور کی اگر بہت سی گھٹلیاں ہوں تو وہ مال ہے۔ ایک گھٹلی اگر کہیں پڑی ہو تو وہ مال نہیں ہے۔

اسی طرح جائز انتفاع کی شرط بھی سب فقہاء نے بیان کی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف

نہیں ہے کہ مال وہ ہے جس سے انتفاع یا فائدہ اٹھانا شرعاً جائز ہو۔ چنانچہ مسلمان کے لیے خنزیر اور شراب مال نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ مسلمان شراب کو پی سکتا ہے نہ استعمال کر سکتا ہے، نہ اس کی ملکیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے مسلمان کی حد تک شراب مال نہیں ہے اور نہ شراب کی بنیاد پر کوئی مسلمان کوئی کاروبار یا لین دین وغیرہ کر سکتا ہے۔

اس تفصیل کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے مال کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک قسم متقوم کہلاتی ہے۔ دوسری قسم غیر متقوم کہلاتی ہے۔ متقوم سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی کوئی قیمت شرعاً قابل اعتبار ہو۔ جس کی مالیت اور قیمت کو شریعت تسلیم کرتی ہو۔ فقہاء نے اس کی تعریف کی ہے کہ مال متقوم وہ ہے جس سے فائدہ اٹھانا شریعت کی رو سے جائز ہو۔ ''ما یباح الانتفاع بہ شرعاً'' جس سے شرعاً فائدہ اٹھانا جائز نہ ہو وہ غیر متقوم ہے۔ لیکن متقوم اور غیر متقوم کا ملکیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات غیر متقوم چیز ملکیت میں آ سکتی ہے۔ لیکن غیر متقوم کی بنیاد پر کوئی عقد یعنی لین دین نہیں ہو سکتا۔ کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے گھر میں کسی مٹکے میں سرکہ رکھا ہوا تھا۔ کسی موسمی یا کیمیائی تبدیلی کی وجہ سے وہ سرکہ شراب میں تبدیل ہو گیا۔ اب ملکیت تو موجود ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ ذخیرہ جو بھی ہے، اس وقت شراب ہے کل سرکہ تھا۔ وہ اس شخص کی ملکیت میں ہے۔ لیکن اگر یہ شراب بن گئی ہے تو پھر نہ اس کو بیچا جا سکتا ہے، نہ ہدیہ کیا جا سکتا ہے، نہ اس کا کوئی اور استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مال متقوم اور غیر متقوم کی اس تعریف کے بعد بنیادی اصول یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان تمام عقود میں یعنی لین دین کی ان تمام قسموں میں جس میں بنیاد مال ہوتا ہے یہ ضروری ہے کہ وہ مال متقوم ہو۔ یہ عقد کے جائز ہونے کی، لین دین یا معاملہ کے درست ہونے کی لازمی شرط ہے۔ چنانچہ بیع میں، خرید و فروخت میں، ہبہ اور اجارہ میں، رہن اور مشارکہ میں ان تمام صورتوں میں جو مال ہوگا، جس کی بنیاد پر یہ سارے معاملات ہوں گے اس کا مال متقوم ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ مال غیر متقوم ہو تو پھر لین دین کی یہ صورتیں جائز نہیں ہونگی۔ مال متقوم کے بارے میں بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مال متقوم اور غیر متقوم میں صرف ان احکام یا اعتبارات کا لحاظ رکھا جائے گا جو قدیم فقہی کتابوں میں علماء نے بیان کر دیے ہیں۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اگر آج حکومت کے قوانین کسی چیز کو ممنوع قرار دے دیں، اس کا لین دین اور اس کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے دیں

وہ بھی مال متقوم کی تعریف سے نکل جائے گی۔مثال کے طور پر آج حکومت کے قوانین ہیروئن کی ملکیت کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔اس لیے ہیروین مال غیر متقوم ہے۔چاہے اس کوئی اور استعمال جائز ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ممکن ہے کسی دوا میں استعمال ہوتی ہو۔ممکن ہے کسی اور جگہ بھی استعمال ہو سکتا ہو،لیکن اس امکان کے باوجود اس کو غیر متقوم ہی سمجھا جائے گا اور اس کا لین دین درست نہیں ہوگا،اس لیے کہ حکومتوں کے قوانین میں اس کو ممنوعہ چیز قرار دے دیا گیا ہے۔

اسی طرح مثال کے طور پر بھاری اسلحہ کی ملکیت کا معاملہ ہے،حکومت کے قوانین بھاری اسلحے کی انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔کوئی شخص اپنی ملکیت میں ٹینک نہیں رکھ سکتا۔کوئی شخص اپنی ملکیت میں توپ نہیں رکھ سکتا،بم نہیں رکھ سکتا۔یہ چیزیں صرف حکومت کی مسلح افواج کی ملکیت میں اور حکومت کے انتظام میں ہی رہ سکتی ہیں۔اس لیے عامتہ الناس کی حد تک ان کی حیثیت مال غیر متقوم کی ہوگی۔اگر کوئی شخص ان کی خرید وفروخت کرتا ہے اور بھاری اسلحہ کا لین دین کرتا ہے تو یہ لین دین ناجائز لین دین ہوگا،جائز نہیں ہوگا۔

یہی کیفیت مثال کے طور پر جعلی سکوں کی ہے۔جعلی سکے اور جعلی نوٹ بنانا بھی جرم ہے،پاس رکھنا بھی جرم ہے اور ان کا لین دین کرنا بھی جرم ہے۔اس لیے جعلی سکے اور جعلی نوٹ بھی مال غیر متقوم شمار ہوں گے۔نہ صرف مال غیر متقوم ہوں گے،بلکہ ان کا لین دین دجل وفریب کی ایک قسم قرار دیا جائے گا اور دھوکہ دہی کا جرم بھی ان کی وجہ سے ثابت ہو جائے گا۔

مال کی ایک دوسری قسم ہے مثلی اور قیمی۔مثلی اور قیمی کا امتیاز بعض اوقات بہت ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا جواز اور عدم جواز مال کے قیمی یا مثلی ہونے پر منحصر ہوتا ہے۔مثلی سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی مثل بازار میں یا مارکیٹ میں عام طور پر دستیاب ہو اور اس کے اجزاء یا بنیادی یونٹوں میں کوئی قابل ذکر فرق نہ پایا جاتا ہو۔عامتہ الناس بازار میں ایک کی جگہ دوسرے کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہوں۔مثال کے طور پر انڈے مثلی ہیں۔آپ انڈا لینے بازار میں جائیں تو سب کا سائز بھی تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا ہے،وزن بھی قریب قریبا ایک ہی ہوتا ہے۔ایک کی جگہ دوسرا اور دوسرے کی جگہ تیسرا آپ لینا چاہیں تو دوکاندار کو اعتراض نہیں ہوتا۔مثلی چیزیں عموماً وہ ہوتی ہیں جو گن کر یا ناپ کر یا تول کر فروخت کی جاتی ہیں۔ ہر وہ چیز جو موزون ہو،یعنی وزن کر کے فروخت کی جاتی ہو،مکیل ہو یعنی ماپ کر فروخت کی جاتی

ہو، گن کر فروخت کی جاتی ہو، بشرطیکہ اس کے اعداد، اس کے افراد اور یونٹ قریب قریب ایک جیسے ہوں۔ان سب چیزوں کو مثلی کہا جاتا ہے۔

درہم و دینار مثلیات میں سے ہیں۔آج کل کے سکے اور کرنسیاں مثلیات میں سے ہیں۔آپ دس روپے کا ایک نوٹ نکالیں تو اس کی اور دوسرے جتنے بھی دس روپے کے نوٹ ہیں ان سب کی مالیت ایک ہی ہوگی۔آپ دوکاندار کو دس روپے ادا کرنا چاہیں تو دائیں طرف کی جیب والا نوٹ دیں یا بائیں طرف کی جیب والا نوٹ دیں دوکاندار کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔دوکاندار دونوں کو یکساں طور پر قبول کرے گا۔دونوں کی یکساں مالیت ہوگی۔آپ بازار میں غلہ خریدنے جائیں تو گندم کی ایک بوری اور دوسری بوری اور تیسری بوری سب کا وزن بھی ایک ہے، مالیت بھی ایک ہے، قیمت بھی ایک جیسی ہے اور گندم کی نوعیت بھی تھوڑے بہت فرق کو نظر انداز کر کے ایک جیسی ہے۔اگر آپ ایک من گندم خریدیں اور دوکاندار اپنے گودام میں موجود بوریوں میں سے کوئی ایک بوری رکھوا دے تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔یہ سب چیزیں مثلی کہلاتی ہیں۔یعنی وہ چیزیں جن جیسی یا جن کی مثل بازار میں آسانی کے ساتھ دستیاب ہیں اور بغیر کسی قابل ذکر فرق کے ان کا ایک یونٹ دوسرے یونٹ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور اس کی جگہ قبول کرلیا جاتا ہے۔

مثلی کے مقابلے میں دوسری قسم ہے قیمی۔اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ہر یونٹ کی الگ قیمت ہوتی ہے۔ہر یونٹ کی مالیت الگ طے ہوتی ہے اور ایک یونٹ دوسرے یونٹ کی جگہ عام طور پر قبول نہیں کیا جاتا۔مثال کے طور پر مکان ہے۔آپ اسلام آباد، کراچی، لاہور جیسے شہروں میں جائیں تو آپ کو ہر مکان کی قیمت الگ ملے گی۔حتی کہ بیشتر صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی علاقے میں ایک جیسے مکانوں کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے۔اگر کونے کا مکان ہے تو اس کی قیمت اور ہے، درمیان میں ہے تو قیمت اور ہے، نشیب میں ہے تو قیمت اور ہے۔حالانکہ رقبہ بھی وہی ہے، مکان کی ساخت بھی ایک جیسی ہے، نقشہ بھی ایک جیسا ہے۔لیکن قیمتوں میں فرق ہوتا ہے۔لہٰذا قیمی سے مراد مال کی وہ قسمیں ہیں جن کے افراد یا جن کے یونٹ الگ الگ مالیت رکھتے ہوں اور ایک کی جگہ دوسرے کو قبول نہ کیا جاتا ہو۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مثلی قیمی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور قیمی مثلی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر دو مثلی مال جو دو مختلف جنسوں سے تعلق رکھتے ہوں، اس طرح مل

کر ایک ہو جائیں کہ ان دونوں کو الگ الگ نہ کیا جا سکے تو وہ پھر مثلی نہیں رہتے، بلکہ مل کر قیمی ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آٹا بھی رکھا ہوا تھا اور چینی بھی رکھی ہوئی، کسی وجہ سے آٹا اور چینی اس طرح مل کر ایک ہو گئے کہ اب ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ مثلی نہیں رہے بلکہ قیمی ہو گئے۔ اس لیے کہ بازار میں کوئی ایسا آٹا نہیں ملتا جس میں اس طرح چینی ملی ہوئی ہو۔ اسی تناسب سے ملی ہو، اسی طرح کی چینی ملی ہو۔ چونکہ بازار میں اس کے یونٹ اس طرح کے اب دستیاب نہیں رہے اس لیے اس کی قیمت مختلف ہوگی اور اس کی حیثیت قیمی کی ہو جائے گی، مثلی کی نہیں رہے گی۔

اسی طرح سے اور اسباب اور محرکات بھی ہیں جس کی وجہ سے مثلی اموال تبدیل ہو کر قیمی اموال قرار پا جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مثلی مال میں کوئی عیب لگ گیا۔ نئی گاڑی جب آپ خرید کر لائے تھے تو شوروم میں اس ماڈل اور رنگ کی سب گاڑیوں کی قیمتیں ایک تھیں، ہونڈا گاڑیوں کے آپ اسٹور پر جائیں تو سب ہونڈا گاڑیوں کی، اگر وہ سب ایک خاص برانڈ کی گاڑیاں ہوں، تو ان سب کی قیمتیں ایک ہوتی ہیں۔ آپ نے گاڑی خریدی اور لے کر آئے اور کچھ دن استعمال کے بعد خدانخواستہ ایکسیڈنٹ ہو گیا اور گاڑی میں کوئی عیب ہو گیا۔ اب یہ گاڑی مثلی نہیں رہی۔ اب یہ قیمی ہو گئی۔ اب اس کی قیمت کا تعین اس کی اپنی ذات کے حساب سے ہوگا۔ بازار میں اس جیسی اب اور کوئی گاڑی دستیاب نہیں ہے۔

بعض اوقات آپ کوئی ایسی صنعت اس میں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دوسرے اجزاء سے منفرد چیز ہو جاتی ہے۔ آپ نے اپنی کسی مہارت سے اس میں کوئی ایسی ویلیو ایڈ کر دی جو بازار میں دستیاب نہیں ہے، اس ویلیو ایڈ کرنے سے بھی چیز وہ قیمی ہو جائے گی۔ استعمال کے بعد جب کوئی مثلی چیز وہ پرانی ہو جائے تو بھی وہ قیمی ہو جاتی ہے۔ آپ ایک جیسے قلم بازار میں جا کر دیکھیں تو آپ کو ایک ہی قیمت میں ملیں گے۔ لیکن اگر آپ ایک قلم خرید کر لے آئے اور کچھ دن استعمال کیا، استعمال کرنے کے بعد وہ پرانا ہو گیا تو اب وہ مثلی نہیں سمجھا جائے گا۔ اب اس کی حیثیت قیمی کی ہوگی۔ اس لیے کہ بازار میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بلکہ شاید نہیں ہوتا کہ سب پرانے قلموں کی ایک جیسی قیمت ہو۔ سارے پرانے قلم مثلاً بیس روپے کے ہوں، کوئی بیس کا ہوگا، کوئی پانچ کا ہوگا، کوئی دس کا ہوگا۔

یہ اور اس طرح کے کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے مثلی چیز قیمی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات قیمی چیز مثلی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اگر ایسا ہو تو پھر اس کے حساب سے اس کی قیمت اور مالیت کا تعین کرنا پڑے گا۔

مال کی ایک تقسیم اور ہے جو بہت اہم ہے وہ ہے استعمالی اور استہلا کی۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے انگریزی میں دونوں کے لیے ایک لفظ ہے۔ دونوں کے حصول کے لیے borrow کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس چیز کو آپ خرچ کر کے consume کر دیں، جس کا وجود آپ کے استعمال کے نتیجے میں ختم ہو جائے۔ اس کے لیے بھی انگریزی زبان میں borrow کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جس چیز کو آپ استعمال کر کے جوں کا توں واپس کر دیں، اس کے وجود پر آپ کے استعمال سے کوئی فرق نہ پڑے اس کو بھی انگریزی میں borrow کرنا کہتے ہیں۔ اس لفظی التباس کی وجہ سے بہت سی قباحتیں اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

استعمالی مال وہ ہے جس کا اصل وجود، یعنی corpus استعمال کے باوجود موجود اور باقی رہے، اور استعمال سے اس کے وجود پر فرق نہ پڑے۔ مثلاً آپ کے پاس سائیکل ہے۔ میں نے آپ سے استعمال کے لیے مانگی اور تین دن استعمال کرنے کے بعد آپ کو آپ کی سائیکل جوں کی توں واپس کر دی۔ یہ استعمالی ہے۔ اس کے برعکس استہلا کی مال وہ ہوتا ہے کہ جس کو میں consume کر لوں گا، اس کو خرچ کر لوں گا، جب میں اس کو خرچ کر لوں گا تو وہ پھر اصلی چیز موجود نہیں رہے گی۔ میں اس جیسی کوئی چیز آپ کو واپس کر دوں گا۔ مثال کے طور پر گھروں میں اکثر ہوتا ہے، پرانی بستیوں، محلوں میں ہوتا تھا، کہ خواتین گھر کی ضرورت کی چیزیں محلے سے لے لیا کرتی تھیں۔ کسی کے یہاں چینی ختم ہو گئی، اس نے پڑوسن سے کہا بہن ایک پاؤ چینی دے دو، بہن نے ایک پیالہ بھر کر چینی دے دی۔ اب وہ چینی تو یہاں استعمال ہو گئی، خرچ ہو گئی، وہ چینی تو اب واپس نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک واپس نہیں آ سکتی۔ جب یہ بہن مہینے کے شروع میں واپس کرے گی تو اس جیسی چینی اتنے ہی ناپ کے مطابق واپس کر دے گی۔ یہ استہلا کی ہے۔

جس کو شریعت میں عاریت کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ borrow کرنا ہے وہ استعمال کی چیزوں میں ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو قرض ہوتا ہے وہ استہلا کی چیزوں میں ہوتا ہے۔ قرض سے مراد یہ ہے کہ آپ نے کوئی چیز کسی سے لے لی، اس کو خرچ کر دیا، اب وہ آپ

کے پاس موجود نہیں رہی۔ جب قرض ادا کرنے کا وقت آئے گا تو آپ اس جیسی چیز بازار سے لے کر واپس کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز مثلیات میں سے ہوگی، اسی لیے اس کو آپ واپس کر دیں گے۔ خرچ عموماً مثلیات کا ہوتا ہے۔ استعمال عموماً قیمیات کا ہوتا ہے۔ تاہم ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ بعض اوقات قیمیات کا خرچ بھی ہوتا ہے۔ مثلیات کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر ایسا ہی ہے کہ خرچ مثلیات کا اور استعمال قیمیات کا ہوتا ہے۔

مال کی ایک اور قسم جس سے انگریزی قانون بھی واقف ہے، وہ عین اور دین ہے۔ عین سے مراد تو وہ چیز ہے یعنی وہ corpus جو آپ کے پاس موجود ہو۔ آپ کے پاس گھڑی ہے، آپ کے پاس چشمہ ہے، آپ کے پاس ریڈیو ہے، آپ کے پاس ٹیپ ریکارڈر ہے، آپ کے پاس خوشبو کی شیشی ہے، کتابیں، کرنسی ہے، زر و جواہر ہے یہ سب عین ہے۔ لیکن بعض اوقات آپ کی ملکیت میں ایک چیز ہوتی ہے جو ابھی آپ کے پاس نہیں ہے، لیکن بہت جلد آپ کے پاس آجائے گی، آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ اس وقت وہ کسی دوسرے شخص کے ذمہ واجب الادا ہے۔ اس کو شریعت میں دَین کہتے ہیں۔ دَین سے مراد ہر وہ واجب الادا مال ہے جو دوسرے کے ذمے ہو اور وہ آپ کو ادا کرنے کا پابند اور مکلّف ہو۔ ایک شخص نے آپ سے ایک من گندم یہ کہہ کر لی اور کہا کہ جب میری فصل کٹے گی تو میں آپ کو واپس کر دوں گا۔ اب یہ ایک من گندم دَین ہے، یہ عین نہیں ہے۔ یہ اس کے ذمے ہے کہ وہ آپ کو واپس کر دے۔

عین اور دین کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ ربا کے بہت سے احکام کا تعلق عین اور دین سے ہے۔ استہلاکی اور استعمالی کا تعلق بھی ربا کے احکام سے بہت گہرا ہے۔

ایک اور تقسیم ہے عین اور منفعہ۔ یہ تقسیم، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، فقہائے احناف کے یہاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اس لیے کہ فقہائے احناف منفعت کو مال نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے فقہاء جو منفعت کو بھی مال سمجھتے ہیں انھوں نے یہ دو تقسیمیں بیان کی ہیں۔ ایک تو مادی وجود رکھنے والی کوئی چیز ہے جو عین کہلاتی ہے۔ ایک اس مادی وجود سے اٹھایا جانے والا وہ فائدہ ہے جو اپنا الگ مادی وجود نہیں رکھتا۔ فائدے کا کوئی ظاہری یا مادی وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے فقہائے احناف اس کو مال نہیں سمجھتے۔ دوسرے فقہاء جو مال کے مادی ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے وہ منافع کو بھی مال سمجھتے ہیں۔

یہ تو وہ اہم تقسیمیں ہیں جن کا شریعت کے احکام سے گہرا تعلق ہے اور ان معاملات کو، ان احکام کو سمجھنا شریعت کے بہت سے احکام کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ تقسیمیں ہیں جن کے کچھ ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تفصیلات کی بات ہے اس لیے ان کو میں نظر انداز کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر منقول اور غیر منقول کی تقسیم ہے۔ جائداد منقولہ اور جائداد غیر منقولہ سے انگریزی قانون بھی واقف ہے۔

اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی بھی ایک تقسیم ہے۔ اس تقسیم کا تعلق زکوٰۃ یا ٹیکسیشن کے دائرے سے ہے۔ اموال ظاہرہ وہ ہیں جو ہر ایک کو نظر آ رہے ہوں۔ مثلاً کھیتی یا باغ ہے۔ وہ زمین پر موجود ہے، جس کا جی چاہے جا کر دیکھ لے۔ کسی نے مویشی پالے ہوئے ہیں، وہ ہر ایک سامنے ہیں، سامان تجارت ہے، دوکان میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اموال ظاہرہ کہلاتے ہیں۔ اموال باطنہ وہ ہیں کہ جو عام طور پر نظر نہیں آتے۔ آپ نے اپنی رقم پس انداز کر کے بنک کے لاکر میں زیور یا نقد پیسہ رکھا ہوا ہے۔ آپ کو علم ہے یا شاید بنک کے کارندے کو علم ہے، یا گھر میں آپ نے کوئی مال و دولت محفوظ رکھا ہوا ہے یہ اموال باطنہ کہلاتے ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللّٰہ عنہ کے زمانے سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ ریاست وصول کرتی تھی اور اموال باطنہ کی زکوٰۃ افراد خود دیا کرتے تھے۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللّٰہ عنہ کو اللّٰہ تعالیٰ نے بہت غیر معمولی بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انھوں نے بہت سے معاملات میں ایسے فیصلے کیے جن کے بہت دور رس اثرات ظاہر ہوئے اور اگر وہ یہ فیصلے نہ فرماتے تو آج بہت سے مسائل کھڑے ہو گئے ہوتے۔ چنانچہ اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم بھی ان اہم معاملات میں سے ایک ہے۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللّٰہ عنہ نے یہ محسوس فرمایا کہ ہوسکتا ہے آئندہ چل کر کچھ لوگ اپنے اموال باطنہ کی زکوٰۃ دینے میں تامل کریں۔ محصل زکوٰۃ اصرار کرے کہ ان کے پاس مال ہے۔ وہ اصرار کریں کہ ان کے پاس مال نہیں ہے، اور نوبت تلاشی اور گرفتاری تک پہنچے تو یہ سرکاری کارندوں کو ایک ایسا ہتھیار دینے کے مترادف ہوگا جس سے کام لے کر سرکاری کارندے ہر شخص کی شخصی زندگی میں بے جا مداخلت کر سکتے ہیں۔ یوں تجسس کا ایک ایسا مکروہ عمل عام ہو جائے گا جس کے نتیجے میں بہت سی قباحتیں پیدا ہوں گی۔ شریعت نے تجسس سے منع کیا ہے۔ عامۃ الناس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس لیے یہ توقع کرنی

چاہیے کہ عامۃ الناس اپنے اموال باطنہ کی زکوٰۃ خود ادا کر دیں گے اور اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ ریاست وصول کرے گی۔

یہ محض انتظامی سہولت کا مسئلہ نہیں تھا۔ اگر چہ اس سے انتظامی سہولتیں بھی بہت پیدا ہوئیں اور تیرہ سو سال کا تجربہ شاہد ہے کہ اس انتظامی سہولت کی وجہ سے زکوٰۃ کا نظام کامیابی سے چلتا رہا۔ لیکن یہ ایک نظری معاملہ بھی ہے کہ ریاست کو افراد کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے اور افراد کے ذاتی معاملات کی کھوج لگانے کی کہاں تک اجازت ہے۔

اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کے علاوہ ایک اور تقسیم بھی بعض فقہاء نے کی ہے، وہ اصول اور ثمرات کی ہے۔ مال کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو اصل ہے۔ ایک وہ ہے جو اس اصل کے ثمرات ہیں۔ آپ بکری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے لے کر آئے۔ اصل تو آپ کے پاس بکری کے یہ دو بچے ہیں۔ اس کے بعد ان میں توالد اور تناسل کا سلسلہ شروع ہوا اور پچاس بکریوں کا ایک گلہ وجود میں آ گیا۔ بقیہ بکریاں ثمرات ہیں اور وہ دو بچے اصل تھے۔ آپ نے چھوٹا پودا خریدا، پرورش کر کے بڑا کر لیا، اس میں پھل پیدا ہوا، برگ و بار آئے وہ اس کے ثمرات ہیں۔ بعض اوقات فقہی احکام کی تفصیلات میں اس تقسیم کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک اور تقسیم مملوک اور مباح کی ہے۔ مال کی ایک قسم تو وہ ہے جو کسی کی ملکیت ہے۔ فرد کی ملکیت ہے یا ریاست کی ملکیت ہے۔ ریاست نے کسی خاص غرض کے لیے اس کو سرکاری ملکیت میں رکھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سرکاری گھوڑوں کی چراگاہ ہے۔ فوج کے گھوڑے وہاں چرتے ہیں یا مثال کے طور پر سرکار نے کوئی زمین حاصل کی ہے، کسی چھاؤنی کی تعمیر کے لیے، یا ائرپورٹ کی تعمیر کے لیے۔ ان مملوکہ زمینوں کے علاوہ جو زمینیں ہیں وہ مباح کہلاتی ہیں۔ مباح سے مراد وہ زمین یا وہ مال ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ دریا میں پانی بہہ رہا ہے۔ یہ مباح ہے اور سب کے لیے عام ہے، کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ جس کا دل چاہے جا کر پانی بھر کر لے آئے۔ جب وہ بھر کر لے آئے گا، بالٹی میں یا مٹکے میں محفوظ کرے گا تو اب یہ اس کی ملکیت ہو جائے گا۔ جب تک وہ پانی دریا میں تھا سب کی یکساں ملکیت تھا۔ جنگل میں گھاس اگا ہوا ہے، کھلی زمین ہے کسی شخص کی ملکیتی نہیں ہے۔ گھاس ہر شخص کو لینے کا اختیار ہے۔ ہر شخص اپنے جانوروں کے لیے وہاں سے گھاس حاصل کر سکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی چیزیں وہ ہیں جن کو فقہائے اسلام نے

اموال مباحہ قرار دیا ہے جو سب کے لیے مباح ہیں۔

ایک اور تقسیم ہے قابل تقسیم اور نا قابل تقسیم۔ مال کی کچھ قسمیں وہ ہیں جو قابل تقسیم ہیں۔ اگر وہ ایک سے زائد افراد کی ملکیت میں ہوں، اور وہ اس کو تقسیم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ دو بھائیوں کو اپنے باپ سے ایک لاکھ روپے وراثت میں مل گئے، وہ چاہیں تو پچاس پچاس ہزار روپے آپس میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی مشینری مل گئی جو پورا ایک یونٹ ہے، وہ تقسیم نہیں ہو سکتی۔ تقسیم ہونے کے بعد نہ اس کے کام کی رہے گی نہ اُس کے کام کی رہے گی۔ یہ نا قابل تقسیم مال ہے۔ ایک سائیکل دو بھائیوں کو مل گئی۔ بائیسیکل نا قابل تقسیم ہے۔ اس کے دونوں پہیوں کو الگ الگ کر دیا جائے گا تو ان کی کوڑی کی قیمت نہیں رہے گی۔ اس لیے قابل تقسیم اموال اور نا قابل تقسیم اموال کے الگ الگ احکام ہیں۔

مال کی ان تقسیموں سے کسی حد تک اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ فقہائے اسلام نے کس تفصیل کے ساتھ اور کتنی دقت نظر اور باریک بینی کے ساتھ مال کے احکام پر غور کیا ہے اور شریعت کے ایک ایک لفظ، قرآن کریم کے ایک ایک حرف اور احادیث کے ایک ایک جزو سے کس طرح استفادہ کر کے یہ احکام مرتب فرمائے ہیں۔

مال اور ملکیت کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ ملکیت مال ہی کی ہوتی ہے۔ غیر مال کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فقہائے اسلام نے جہاں مال کے احکام سے بحث کی ہے وہاں ملکیت کے احکام سے بھی بحث کی ہے۔ ملک اور ملکیت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ ملکیت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز پر اس طرح کا قانونی اور شرعی استحقاق رکھتا ہو جو اُسے اس چیز کو استعمال کرنے، اس میں تصرف کرنے اور دوسروں کو استعمال اور تصرف سے روکنے کے قابل بناتا ہو۔ ایک فقیہ نے ملکیت کی تعریف کچھ یوں کی ہے۔ "اختصاص شخص بشئی، اختصاصا یمکنه من التصرف فیه و یمنع غیره منه" کسی شخص کا کسی چیز کے بارے میں ایسا خاص یا خصوصی استحقاق جو اس کو اس چیز میں تصرف کے قابل بنائے اور دوسرے کو اس چیز میں ہر قسم کے تصرف سے روکنے کی اجازت دے۔ یہ استحقاق ملکیت کہلاتا ہے۔

ملکیت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک ملکیت تامہ کہلاتی ہے یعنی مکمل ملکیت۔ مکمل ملکیت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کی مکمل ملکیت آپ کے پاس ہو اس کی ذات اور منفعت دونوں

کے آپ مالک ہوں۔ یعنی انگریزی اصطلاح میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے corpus کے بھی آپ مالک ہوں اور usufruct کے بھی مالک ہوں۔ مثلاً آپ نے ایک گاڑی خریدی، گاڑی کی ذات، یعنی corpus بھی آپ کی ملکیت ہے اس کا فائدہ بھی آپ کی ملکیت ہے۔ یہ ملکیت تام ہے۔ گاڑی آپ کے قبضے میں بھی ہے، آپ نے اس کی پوری قیمت ادا کردی۔ ہر اعتبار سے گاڑی آپ کی مکمل ملکیت میں آگئی۔

لیکن اگر آپ نے گاڑی خرید لی اور خرید کر دوسرے شخص کو چھ مہینے کے لیے اجارے پر دے دی۔ اب اس کی ذات تو آپ کی ملکیت میں ہے۔ آپ اس کے corpus کے تو مالک ہیں۔ لیکن اس کی منفعت کے اب مالک نہیں رہے۔ منفعت سے فائدہ اٹھانے یا اس کو استعمال کرنے کا حق اس شخص کو ہے جس نے گاڑی آپ سے اجارے پر لی ہے۔

تیسری قسم ہے ملک منفعت۔ ملک منفعت سے مراد یہ ہے کہ گاڑی یا اس چیز کا مالک تو کوئی اور ہو لیکن منفعت کا مالک کوئی اور ہو۔ جیسے اسی گاڑی کی مثال میں اس شخص نے آپ سے گاڑی کرائے پر لی ہے، وہ اس کی منفعت کا مالک ہے، گاڑی کے جتنے جائز منافع ہیں ان سب سے فائدہ اٹھانے کا اور ان کے مطابق گاڑی میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار ہے۔ ملک منفعت سے ملتی جلتی ایک چیز اور ہے جس کو فقہائے اسلام نے ملک انتفاع کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

ملک انتفاع سے مراد وہ ہے جس کو آپ مرافق یا یوٹیلٹیز یا سروسز بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض فقہاء نے اس کے لیے مرافق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس ملکیت سے مراد ایسے حقوق کی ملکیت یا ایسے حقوق وفوائد یا خدمات کا استحقاق ہے جو کسی ملکیت سے تو وابستہ ہوں گے۔ لیکن جب اور جہاں آپ ان سے فائدہ اٹھائیں گے وہ جگہ یا وہ وقت آپ کی ملکیت نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک زرعی زمین خریدی۔ زرعی زمین کے آپ مکمل طور پر مالک ہیں۔ اس کا رقبہ بھی آپ کی ملکیت ہے، اس کی منفعت بھی آپ کی ملکیت ہے۔ لیکن آپ کی اس زمین میں اور پانی کی نہر جو بہہ رہی اس میں کسی تیسری شخص کی زمین آتی ہے۔ اب جب تک آپ اس تیسرے شخص کی زمین سے پانی گزار کر لے کر نہ لائیں آپ اپنی زمین سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کا پانی کا پائپ وہاں سے گزرے گا یا پانی کا نالہ وہاں سے گزرے گا یا پانی کا راستہ گزرے گا۔ یہ آپ کو حق ہے کہ آپ اس تیسرے شخص کی زمین سے پانی گزاریں۔ اس کو حق نہیں کہ وہ آپ

کو پانی لے جانے سے روکے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے۔ تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ آپ کا یہ حق ہے کہ وہاں سے گزر کر جائیں۔ آپ اس کی زمین سے گزر کر ہی اپنی زمین پر جا سکتے ہیں، آپ کی زمین تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا اُس درمیانی رقبہ کا مالک آپ کو گزر گاہ دینے سے نہیں روک سکتا۔ اگر روکے گا تو قانون آپ کی مدد کے لیے آئے گا۔ آپ اس کی زمین میں سے پانی لے کر جائیں گے، وہ پانی لے جانے سے نہیں روک سکتا۔ اگر آپ جائز اور معقول طریقے سے پانی لے جا رہے ہیں تو شریعت آپ کو اس کا پورا حق دیتی ہے۔ البتہ اگر آپ بدنیتی سے اس طرح وہاں سے پانی لے کر جا رہے ہیں کہ اس کی زمین کو نقصان ہوتا تو پھر اس کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ یہ حقوق حقوق انتفاع کہلاتے ہیں۔ آپ کے لیے اپنی ملکیت سے انتفاع کرنے کے لیے ان حقوق کا استعمال کرنا ناگزیر ہے۔ جب آپ اپنی زمین کے مالک ہو گئے تو اس ملکیت کے ساتھ ساتھ آپ ان حقوق کے مالک بھی ہوئے جو آپ کو لازمی طور پر استعمال کرنے ہیں۔

ملک کی ایک قسم ہے ملکیت حقوق معنویہ۔ حقوق معنویہ کی مثال میں پہلے دے چکا ہوں۔ فقہائے احناف کا روایتی مؤقف یہ رہا ہے کہ وہ حقوق مجردہ کی ملکیت کو ملکیت نہیں مانتے۔ نہ ان کو مال مانتے ہیں۔ لیکن بقیہ فقہاء ان کو مال سمجھتے ہیں اس لیے ان کی ملکیت کے جائز ہونے کے بھی قائل ہیں۔

ملکیت کیسے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کسی چیز کا مالک بنتا ہے تو کیسے بنتا ہے؟ یہ سوالات بھی مال اور ملکیت کے ضمن میں اہمیت کے حامل ہیں۔ حصول ملکیت کے جو اسباب شریعت نے متعین کیے ہیں یا بتائے ہیں وہ چار ہیں۔ سب سے پہلا سبب تو عقد ہے کہ آپ کسی contract کے ذریعے دوسرے شخص کی ملکیت کو حاصل کر لیں۔ اس ملکیت کو حاصل کرنے کے لیے آپ خرید وفروخت سے کام لیں۔ مشارکہ اور مضاربہ سے کام لیں۔ یا اس طرح کے اور معاملات یا لین دین کے طریق کار سے کام لیں یہ سب عقد کی مختلف شکلیں ہیں۔

دوسری صورت ہے احراز مباحات۔ وہ تمام چیزیں جو مباح ہوں اور کسی کی ملکیت میں نہ ہوں وہ سب کے لیے دستیاب ہیں، جو شخص جا کر اس کو حاصل کرے وہ اس کی ملکیت قرار پائے گی۔ احراز مباحات کا یہ اصول شریعت کے بہت سے احکام کی بنیاد ہے۔ متعدد احادیث سے ثا

بت ہے۔امام بخاری اور متعدد محدثین نے روایت کی "**من عمر ارضا ليست لاحد فهو احق**"،جس شخص نے کوئی ایسی زمین آباد کرلی جو کسی کی نہیں تھی تو وہ اس کا حق دار ہے۔وہ زمین اس کی ملکیت قرار پائے گی۔ایک اور حدیث ہے جس کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ "**من سبق الى ماء لم يسبقه اليه مسلم فهو له**"۔کسی شخص نے آگے بڑھ کر پانی بھر لیا اور اپنی ملکیت میں لے لیا تو وہ اس کی ملکیت ہے۔مثلاً کوئی پانی کا چشمہ تھا،صحراء میں، جنگل میں، کوہستان میں بہہ رہا تھا،کسی کی ملکیت نہیں تھا۔ایک شخص نے جا کر وہاں گھر بنایا،عمارت بنائی، رہائش اختیار کرلی تو جتنا پانی وہ چشمہ سے حاصل کر کے اپنے قبضہ میں کرلے گا وہ اس کی ملکیت ہو جائے گا۔یہ احراز مباحات کی وہ مثالیں ہیں جو خود احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔

ملکیت حاصل کرنے کا تیسرا ذریعہ وراثت ہے۔ایک شخص کے باپ کے پاس زمین تھی، جائداد تھی، مال و دولت تھا۔اس کا انتقال ہو گیا۔اس کی جائداد اس کی اولاد میں منتقل ہو جائے گی۔یہ انتقال ملکیت وراثت کی صورت میں ہوا ہے۔جو شخص کسی کا وارث ہو اور شریعت کے احکام کی رو سے اس کو حق وراثت حاصل ہو وہ اپنے مورث کی جائداد اور ممتلکات کا جائز مالک بن سکتا ہے اور شریعت اس کو جائز ملکیت تسلیم کرتی ہے۔

ملکیت کا چوتھا ذریعہ وہ ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ آپ کے پاس اصل مال موجود تھا۔اصل کے آپ مالک تھے۔اس میں آپ نے اضافہ کیا،اس کی سرمایہ کاری کی، اس میں بڑھوتری پیدا ہوئی تو اس کے نتیجے میں، اس سرمایہ کاری یا اضافے یا بڑھوتری کے نتیجے میں جو بھی مال حاصل ہوگا وہ خود بخود آپ کی ملکیت قرار پائے گا۔آپ کے پاس ایک لاکھ روپے تھے،آپ نے سرمایہ کاری کی،اس کے نتیجے میں فائدہ ہوا۔آپ کو ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہو گئے تو یہ اضافی پچاس ہزار بھی آپ کی جائز ملکیت ہوگا۔میں نے بکریوں کے گلے میں کی مثال دی تھی کہ آپ نے بکری کے دو بچوں سے کاروبار شروع کیا اور آپ کے پاس پچاس بکریوں کا گلہ ہو گیا۔تو بقیہ اڑتالیس بکریاں بھی آپ کی جائز ملکیت ہونگی۔اسی طرح زرعی پیداوار،صنعت، انڈسٹری، یہ سب جائز ذرائع ملکیت ہیں اور ان کے ذریعے جو چیز ملکیت میں حاصل ہوگی وہ آپ کی جائز ملکیت ہوگی۔

ملکیت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ عقد ہے، لین دین ہے۔اسلامی شریعت کے

احکام کی روشنی میں فقہائے اسلام نے عقود کی بہت سے قسمیں بیان کی ہیں۔ ان قسموں کو سامنے رکھ کر عقود کی متعدد قسمیں بھی کی گئی ہیں۔ ایک تقسیم ہے عقود تملیکات اور عقود اسقاطات۔ تملیکات سے مراد وہ عقود ہیں جن کے نتیجے میں کوئی شخص کسی کے مال یا کسی کی جائداد کا مالک ہو جائے۔ اسقاطات سے مراد وہ عقود ہیں جس میں کوئی شخص اپنی ملکیت یا اپنے حق کو ساقط کر دے۔ عقد جس نوعیت کا بھی ہو اس کا دارومدار یا اس کی بنیاد مال ہوتا ہے۔ اگر مال متقوم نہ ہو تو وہ عقد جائز نہیں ہوگا۔ جس وقت وہ عقد ہو رہا ہے اس وقت وہ مال عقد کرنے والے کی ملکیت میں نہ ہو، یا اس وقت موجود نہ ہو، یا موجود تو ہو لیکن اتنا غیر معلوم اور غیر متعین ہو کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ ایسا کوئی عقد بھی درست نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر عقد کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مال متقوم ہو، عاقد کی مکمل ملکیت میں ہو، یا تو عقد کے وقت موجود ہو، یا اتنی وضاحت اور صراحت کے ساتھ اس کی توصیف کر دی گئی ہو کہ مشتری اور بائع دونوں کے ذہن میں یہ واضح ہو جائے کہ کیا چیز اور کس طرح کی چیز ہے جس پر عقد ہو رہا ہے اور مقررہ وقت پر اس کو ادا کرنا یا مشتری کے حوالے کرنا ممکن ہو، آسان ہو۔

تملیکات سے متعلق جو عقود ہیں ان کی بڑی بڑی قسمیں دو ہیں۔ ایک تو وہ عقود ہیں جو عقود المعاوضہ کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ عقود جس میں ایک شخص اپنا مال دے اور دوسرے سے بدلہ میں اس کا مال لے۔ آپ بازار میں خرید و فروخت کرنے جاتے ہیں یا کوئی اور عقد یا معاملہ جس کے نتیجے میں لین دین ہوتا ہے، کوئی ایک چیز آپ دیتے ہیں اور کوئی دوسری چیز اس کے عوض میں حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ سب عقود عقود معاوضہ کہلاتے ہیں۔ عقود کی سب سے بڑی قسمیں یہی ہیں۔

ان کے مقابلے میں ایک عقد وہ ہوتا ہے جو عقد تبرع کہلاتا ہے یا عقود التبرع کہلاتے ہیں۔ جس میں تملیک اور تملک بغیر کسی بدل کے واقع ہوتے ہیں۔ بغیر کسی معاوضے کے چیز کی ملکیت دوسرے کو منتقل ہو جاتی ہے۔ صدقہ، وصیت یا اعارہ یہ سب عقود تو ہیں لیکن ان میں کوئی بدل نہیں ہوتا۔ آپ کسی کو تحفہ دیں، ہدیہ دیں تو اس کے مقابلے میں آپ کوئی قیمت وصول نہیں کرتے۔ قیمت وصول کریں گے تو وہ ھبہ نہیں رہے گا، بیع ہو جائے گی۔ اس لیے ان عقود میں دوسرے شخص کے مالک بن جانے اور ملکیت کی منتقلی کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ شخص اس چیز کو اپنے قبضے میں لے لے جس کے لیے آپ تبرع کیا ہے یا جس کو ہدیہ دیا ہے۔ جب وہ اپنے قبضے میں

لے لے گا، اس وقت سے وہ اس چیز کا مالک ہو جائے گا۔ جب تک قبضے میں نہیں لے گا، اس وقت تک مالک نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں مقابلے میں کوئی عوض موجود نہیں ہے۔

عقود معاوضہ میں جب فریقین وہ چیز اور اس کا عوض وصول کرلیں تو بیع مکمل ہو جاتی ہے۔ یہاں چونکہ عوض نہیں ہے۔ اس لیے اصل چیز کا قبضہ ہی عوض کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔

عقود میں جو چیز سب سے زیادہ ناگزیر ہے، جس کی صراحت قرآن کریم میں آئی ہے جس کے بغیر کوئی عقد عقد جائز نہیں قرار پاتا وہ تراضی ہے۔ معاہدہ کرنے والے دونوں فریق، لین دین یا تجارت کرنے والی دونوں پارٹیاں مکمل رضا مندی کے ساتھ، جس کو حدیث میں طیب نفس کہا گیا ہے، یعنی دل کی مکمل صفائی اور خوشی کے ساتھ، لین دین کریں تو وہ جائز ہوگا۔ اگر تراضی یعنی آپس کی مکمل رضا مندی نہ پائی جاتی ہو تو یہ تراضی کے نہ ہونے کے مترادف ہے۔ حقیقی رضا مندی یا تراضی کے نہ ہونے سے بعض صورتوں میں بیع باطل ہوتی ہے، سرے سے کالعدم ہوتی ہے، بعض صورتوں میں فاسد ہو جاتی ہے، بعض صورتوں میں شدید مکروہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے تراضی کا تحقق اور تیقن ناگزیر ہے۔

مثال کے طور پر جس وقت آپ لین دین کر رہے تھے اس وقت کسی ایک فریق میں یہ اہلیت ہی نہیں تھی کہ وہ عقد کر سکے۔ مثلاً وہ چھوٹا بچہ تھا، آپ نے چھ سال کے بچے سے مکان خرید لیا تو یہ عقد بالکل باطل ہے۔ اس لیے کہ یہاں تراضی نہیں ہے، چھ سال کے بچے کی رضا مندی کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ بات کہ ایک یتیم بچے نے اپنے باپ کی وراثت میں مکان حاصل کیا اور آپ نے ٹوفیوں کا لالچ دے کر مکان کا کاغذ اس سے لے لیا تو یہ شدید دھوکے کے مترادف ہے۔ یہ ڈاکہ ہے، تراضی نہیں ہے۔ آپ لاکھ کہیں کہ بچہ راضی تھا، اس نے خوشی خوشی سے مکان دے دیا تھا، یہ درست نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص بے چارہ پاگل ہے، اس کو دورے پڑتے ہیں، آپ نے دورے کے وقت میں یا پاگل پن کی حالت میں اس کی رضا مندی حاصل کر لی تو یہ رضا مندی جائز رضا مندی نہیں ہے۔ کسی شخص نے غلطی سے محل عقد کو جس پر عقد ہو رہا ہے اس کو غلط سمجھا اور معاملہ کر لیا، یہ بھی تراضی کے خلاف ہے۔ فقہاء کہتے ہیں ''غلط فی محل العقد''، یعنی جس چیز پر عقد ہو رہا ہے اس کو غلطی سے کچھ کا کچھ سمجھ لیا تو یہ عقد درست نہیں ہوگا۔ مثلاً شیشے کا عام ٹکڑا تھا، کسی سادہ لوح

ناواقف نے یاقوت سمجھ کر لاکھوں روپے کا خرید لیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ تو یاقوت نہیں تھا، بلکہ شیشے کا ایک عام سا ٹکڑا تھا، تو یہ عقد جائز ہوگا اور اگر بیچنے والا اس کو از خود منسوخ نہ کرے تو عدالت اس کو کالعدم یا منسوخ قرار دے دے گی۔

دھوکہ، تغریر اور فریب بھی تراضی کے منافی ہیں، بعض فقہا نے تدلیس کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ یعنی جس چیز کو بیچا جا رہا ہے اس کے بارے میں کوئی ایسی تفصیل بیان کی گئی جو اس میں موجود نہیں ہے۔ جیسے آج کل کے بیچنے والے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ یہ بھی تدلیس اور تغریر کی ایک شکل ہے۔ اشتہاری کمپنیوں نے اس دجل وفریب اور تغریر اور تدلیس کو ایک فن کی شکل دے دی ہے جو خصوصیات بنانے والوں کے وہم گمان میں بھی نہ ہوں وہ اشتہارات کے ذریعے عام کر دی جاتی ہیں اور خالص دھوکہ اور فریب کے ذریعے چیزیں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ شریعت نے اس کو تغریر قرار دیا ہے اور ایسی بیع کو ناجائز کہا ہے۔ اگر وہ خصائص اس چیز یا سودے میں نہیں ہیں جو بتائے گئے ہیں تو یہ بیع درست نہیں ہے۔

غبن فاحش کو بھی فقہائے اسلام نے تراضی کے منافی قرار دیا ہے۔ غبن فاحش سے مراد قیمتوں میں اتنا اضافہ ہے جو کسی اندازہ کرنے والے کے اندازے میں نہ آسکے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بازار میں قیمتوں میں تھوڑا بہت تفاوت تو ہوتا ہے۔ اگر یہ چشمہ ایک جگہ دو سو کا ہے تو دوسری جگہ دو سو دس روپے کا ہوگا۔ تیسری جگہ شاید ایک سو نوے کا ہو۔ چوتھی جگہ شاید دو سو بیس روپے کا ہو۔ تو گویا دو سو روپے مالیت کی اگر کوئی چیز ہے تو اس میں بیس پچیس روپے تک کی کمی بیشی بازار میں ہو سکتی ہے۔ اتنی کمی بیشی غبن فاحش نہیں کہا جائے گا۔ لیکن اگر دو سو روپے کی چیز کوئی چار سو روپے میں بیچ دے تو یہ بلاشبہ غبن فاحش ہے۔ اس لیے کہ جن لوگوں کو چشمے کی قیمتوں کا اندازہ ہے ان کا اندازہ اگر پوچھا جائے تو ان کے اندازوں اور اصل قیمت میں پندرہ بیس پچیس روپے سے زیادہ کا فرق نہیں ہوگا۔

غرض اس کے لیے فقہاء نے ایک ایسا اصول تجویز کیا ہے جس پر ہر جگہ عمل ہو سکتا ہے۔ جس چیز کی خرید وفروخت کے متعلق بات ہو رہی ہے اس کی خرید وفروخت سے متعلق ماہرین اس کی قیمت کا جو اندازہ لگائیں، ان اندازوں میں جو تفاوت ہو، وہ تفاوت اگر معقول اور گوارا ہے، تو اس کو غبن فاحش نہیں کہا جائے گا۔ لیکن اگر تفاوت اس سے آگے بڑھ کر ہو تو وہ غبن فاحش ہوگا اور وہ

جائز نہیں ہوگا۔

تراضی کو جو چیز متاثر کرتی ہے اس میں اکراہ یا زبردستی بھی ہے۔ اکراہ کی کچھ قسمیں تو وہ ہیں جو قانون کے دائرے میں بھی آتی ہیں اور وہ جرم ہیں۔ دنیا کے ہر قانون کی طرح شریعت کے قانون میں بھی جبر و اکراہ کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے جہاں جبر و اکراہ اس انداز کا ہے جو قانون کے دائرے میں آتا ہے وہاں تو معاملہ واضح ہے۔ لیکن جبر و اکراہ کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جس کا تعین قانون کے ذریعے کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ محض ایک اخلاقی انداز کے دباؤ کی بات ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کسی شخص کے لیے دوسرے کا مال جائز نہیں ہے۔ "الا عن طیب نفس منه" اس کے دل کی انتہائی خوشی کے بغیر۔ اب دل کی خوشی ہے کہ نہیں ہے، اس کا تعین بعض حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن متعلقہ فریقین کو معلوم ہوتا ہے کہ طیب نفس، تھا یا نہیں تھا۔ اکراہ کتنا تھا یا نہیں تھا۔

دین کے بعض جید مزاج شناسوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وجاہت یا اپنی شخصیت کا اثر ڈال کر کسی کو کوئی چیز خریدنے یا بیچنے پر مجبور کرے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ طیب نفس کے خلاف ہے۔ آپ کسی شخص کی کوئی قیمتی چیز بہت کم قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں، وہ راضی نہیں ہے، آپ اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے کسی انتہائی محترم شخصیت کو لے گئے جن کا کہا وہ ٹال نہیں سکتا، یا اس کے کسی ایسے محسن کو لے گئے جن کے احسان کے بوجھ تلے وہ دبا ہوا ہے۔ اس کے کہنے سے وہ بہت کم قیمت پر اپنی چیز بیچ دینے کو تیار ہو جائے گا۔ اندر سے دل میں راضی نہیں ہوگا، لیکن بادل ناخواستہ آمادہ ہو جائے گا۔ بعض اہل علم نے اس کو بھی ناجائز لکھا ہے۔ چونکہ یہ فیما بینہ و بین اللّٰہ معاملہ ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو خود طے کرنا چاہیے، صاحب معاملہ کو خود دیکھنا چاہیے کہ اس نے جو جائداد حاصل کی ہے وہ طیب نفس کے ساتھ حاصل کی ہے یا بغیر طیب نفس کے۔

تراضی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ جو چیز خریدی جا رہی ہو یا بیچی جا رہی ہو وہ واضح طور پر معلوم و متعین ہو۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ وہ چیز موجود ہو۔ بائع کی مکمل ملکیت میں ہو اور بطور بائع آپ کے قبضے میں ہو اور اس وقت دستیاب ہو۔ یہ تو مثالی اور آئیڈیل خرید و فروخت ہے۔ لیکن شریعت نے انسانی ضروریات اور حاجات کے پیش نظر ایسی چیزوں کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دے دی ہے جو اس وقت آپ کے قبضے یا ملکیت میں نہیں ہیں۔ لیکن آپ آسانی کے

ساتھ مطلوبہ شرائط پر اس چیز کو فراہم کر سکتے ہیں۔مثلاً آپ سپلائر کا کام کرتے ہیں۔آپ کے پاس اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔لیکن آپ مثلاً کاغذ سپلائی کرتے ہیں۔لاکھوں روپے کا کاغذ آپ سپلائی کر سکتے ہیں۔کاغذ بنانے والوں سے آپ کا معاملہ رہتا ہے۔آپ کاغذ کے کارخانوں سے لین دین کرتے ہیں۔ان سے ادھار کاغذ لیتے ہیں۔خریداروں کو بیچنے کے بعد جو قیمت وصول ہوتی ہے تو اپنا نفع رکھ کر کاغذ کے کارخانے کے مالکان کو قیمت ادا کر دیتے ہیں۔آپ کے لیے متعین انداز اور نمونہ کا کاغذ، اس مقدار اور انداز کا کاغذ، جس معیار کا خریدار کو درکار ہے دستیاب کرنا مشکل نہیں ہے۔اس صورت حال میں آپ اُس کاغذ کا کاروبار کر سکتے ہیں جو سر دست آپ کی ملکیت یا قبضہ میں نہیں ہے، مثلاً آپ کے پاس خریدار آیا، اس نے بتایا کہ مجھے نوے گرام کا کاغذ درکار ہے، اس کا یہ سائز ہوگا، یہ رنگ ہوگا، فلاں قسم کا ہوگا، یہ سب چیزیں معلوم اور متعین ہیں۔آپ کاغذ کے کارخانے میں جائیں گے، اس کو آرڈر دیں گے، وہ مقررہ مدت میں آپ کو کاغذ فراہم کر دے گا، یہ تو جائز ہے۔

اس صورت کے علاوہ ایسی بہت سی صورتیں بازار میں رائج ہو جاتی ہیں جن میں کوئی شخص کوئی ایسی چیز فروخت کر رہا ہے جو نہ اس کے پاس اس وقت موجود ہے، نہ اس کو یہ معلوم ہے کہ جو چیزیں میں فراہم کروں گا ان کی مالیت کیا ہوگی، اس کی کمیت کیا ہوگی، اس کی کیفیت کیا ہوگی، معیار کیا ہوگا۔ایسی چیز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔یہ وہ چیز ہے جس شریعت میں غرر کہتے ہیں۔غرر کی تعریف شمس الائمۃ السرخسی نے یہ لکھی ہے "**ما کان مستور العاقبة**"۔جس کا انجام معلوم نہ ہو، جس کا انجام پوشیدہ ہو۔اسی سے ملتی جلتی تعریف شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے بھی کی ہے۔انھوں نے کہا ہے کہ "**الغرر هو مجهول العاقبة**" غرر وہ ہے جس کی عاقبت مجہول ہو، معلوم نہ ہو۔جن معاملات میں غرر پایا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہیں۔نہ وہ لین دین جائز ہو گا، نہ ملکیت منتقل ہوگی، نہ وہ جائز ملکیت ہوگی۔

غرر کی تین بڑی بڑی صورتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ آپ اس چیز کی فروخت کر رہے ہیں وہ جو سرے سے ہی معدوم ہے، سرے سے موجود ہی نہیں ہے، یا وہ کہ جس کو آپ خریدار کے سپرد کرنے سے عاجز ہیں، معذور ہیں۔مثلاً آپ بہت اچھا خوبصورت ہرن خرید کر لائے اور وہ بھاگ گیا۔اب کہاں چلا گیا، صحرا میں چلا گیا، پہاڑوں میں چلا گیا۔اگر آپ اس ہرن کو یہ کہہ کر

فروخت کریں کہ میرا ہرن بھاگ گیا ہے، اتنے پیسے اس کی قیمت کے طور پر مجھے دے دو اور جا کر پکڑ لو۔ یہ غرر ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ یا وہ سودا اتنا نا معلوم ہو کہ مجہول مطلق ہو، کچھ معلوم نہ ہو۔ جیسے آج کل کاروبار کی بعض صورتیں ہیں کہ میرے پاس گھر، دکان، یا اسٹور میں جو سامان ہے وہ آپ لے لیں اور اتنے پیسے دے دیں۔ اس شخص نے گھر میں آ کر دیکھا ہی نہیں، اس کو اندازہ نہیں کہ کتنا مال ہے، کتنا سامان ہے اور اس کی مالیت کیا ہے، یہ بھی غرر ہے اور یہ بھی ناجائز ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص آ کر گھر کا جائزہ لے لے اور دیکھ لے کہ کتنا سامان ہے، اس کو اندازہ ہو جائے کہ کتنی مالیت کا ہے تو پھر وہ غرر نہیں رہے گا۔

غرر کی فقہائے اسلام نے بہت سی قسمیں بتائی ہیں۔ ایک تو غرر کبیر ہے۔ یعنی بڑا غرر، وہ تو کسی صورت میں جائز نہیں ہے، ہر صورت میں حرام ہے۔ ایک غرر حقیر ہے، غرر تو معمولی ہے اور اتنا معمولی ہے کہ عام طور پر لوگ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض سودے بازاروں میں ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اگر کوئی معمولی کی بیشی ہو تو عام طور پر لوگ اس کا خیال نہیں کرتے اور عام طور پر اس کی کوئی شکایت بھی نہیں کی جاتی۔ یہ غرر حقیر ہے۔ اس لیے جہاں غرر حقیر ہو اور ناگزیر بھی ہو تو اس کو شریعت گوارا کرتی ہے، اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر آپ بادام خرید کر لائے، بہت سا بادام مثلاً بیس پچیس کلو بادام آپ نے خرید لیا۔ اب ہوسکتا ہے کہ اس میں بعض دانے ایسے ہوں جس میں گری نہ ہو، بادام کے سودوں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔ بظاہر آپ یہ فرض کر کے لے رہے ہیں کہ جتنے بادام آپ لے رہے ہیں اُن سب میں گری موجود ہے۔ ان باداموں میں کچھ دانے ایسے ضرور ہوں گے جن میں گری نہیں ہوگی۔ حقیقت میں تو یہ بھی غرر ہے، لیکن غرر حقیر ہے، اسی لیے اس کو عام طور پر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں، کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہ جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایک ناگزیر غرر ہوتا ہے جو ایسا ہے کہ آپ اس سے بچ نہیں سکتے اس کا پتا لگانا بھی آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔ آپ ایک بہت بڑی عمارت خرید لیں، اس کی بنیاد بنانے والے نے کیسی بنائی ہے، بنیاد میں کیا رکھا ہے، کتنی گہری، جتنی بتاتا ہے واقعۃً بھی اتنی ہے کہ نہیں ہے، کوئی شخص کھود کر نہیں دیکھتا اور نہ کھود دیکھا جا سکتا ہے۔ غرر کی یہ قسم ناگزیر ہے، اس کے بتانے پر ہی آپ کو اعتماد کرنا پڑے گا۔ اس اعتماد کو حاصل کرنے کے جو ممکنہ طریقے ہو سکتے ہیں وہ آپ اختیار کر لیں۔ حقیقی طور پر بعض چیزوں کا پتا لگانا مشکل ہوتا ہے، بلکہ ممکن نہیں

ہوتا۔ شریعت نے ان کا پتا لگانے کا حکم نہیں دیا اور ناگزیر سمجھ کر نظر انداز کرنے کی ہدایت کی ہے۔

مال اور ملکیت سے وابستہ ایک چھوٹا سا معاملہ حق اور ذمہ کا بھی ہے۔ حق سے کیا مراد ہے؟ ملکیت بھی ایک حق ہے۔ اس لیے جب ملکیت کی بات آئے گی تو حق کی بات بھی آئے گی۔ منفعت بھی ایک حق ہے۔ حقوق مجردہ بھی حق ہیں۔ حق کی متعدد تعریفیں جدید فقہائے اسلام نے کی ہیں۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی ایک بہت بڑے فقیہ استاد مصطفیٰ احمد الزرقاء نے جو حق کی تعریف کی ہے وہ فقہائے اسلام کے مباحث سے ماخوذ ہے۔ خاص طور پر فقہائے احناف کے کلام سے جو کچھ مستنبط ہوتا ہے، اس کی روشنی میں حق سے مراد شریعت کا مقرر کردہ یا تسلیم کردہ وہ خصوصی استحقاق ہے جس کے نتیجے میں صاحب حق کو وہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا۔ اسی کے قریب قریب تعریف مشہور ماہر قانون اور فقیہ مصر کے استاذ عبدالرزاق سہنوری نے بھی کی ہے۔ ان حضرات کی تعریفوں پر بڑا گہرا اثر فرانسیسی قانون کے تصورات کا ہے۔ یہ دونوں حضرات فرانسیسی قانون سے اچھی طرح واقف تھے اور جن حضرات کی خاطر یہ تعریف مرتب فرما رہے تھے وہ فرانسیسی قانون کے ماہرین ہی تھے۔ اس لیے انھوں نے حق کی تعریف اور قسمیں بیان کرتے ہوئے فرانسیسی قانون کے تصورات کو پیش نظر رکھا ہے۔ فقہائے اسلام نے، قدیم فقہائے اسلام نے حق کے تصور کو اتنا واضح اور نمایاں سمجھا کہ الگ سے حق کی تعریف کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن چونکہ فقہاء کے کلام میں حق کا تذکرہ بار بار آتا ہے، احادیث میں آیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے۔ ان سب کو سامنے رکھ کر حق کا جو تصور فقہاء کے سامنے ہے۔ وہ واضح ہو جاتا ہے۔ حق سے مراد وہ استحقاق ہے یا وہ امتیاز یعنی privillege ہے جو کسی شخص کو جائز طریقے سے شریعت کے احکام کے مطابق حاصل ہو اور اس کے نتیجے میں اس کو کوئی تصرف کرنے یا کوئی انتفاع حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہو۔

حق سے ملتا جلتا ایک تصور ذمہ کا بھی ہے۔ ذمہ کے لفظی معنی تو گارنٹی کے ہیں لیکن ذمہ سے مراد وہ لائبیلٹی ہے جو کسی شخص پر عائد ہوتی ہو یا وہ ذمہ داری ہے جو کسی شخص پر عائد ہوتی ہو اور اس ذمہ داری کے نتیجے میں وہ کوئی کام کرنے یا کوئی فریضہ ادا کرنے کا پابند ہو۔ ذمہ، حق اور التزام ان تمام امور کا تعلق مال سے ہے۔ مال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ذمہ، حق اور التزام کے تصورات سے بھی آگاہی حاصل کی جائے۔

التزام سے مراد وہ ذمہ داری ہے جو کوئی شخص خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قرض کی کفالت یا قرض کے حوالے میں کوئی شخص یہ ذمہ داری لے کہ وہ دوسرے کا قرض ادا کرے گا تو یہ التزام کی ایک قسم ہے۔ التزام یا تو کسی قرض کا ہوتا ہے، یعنی التزام بالدین۔ یا کسی متعین چیز کی فراہمی کا ہوتا ہے، یعنی التزام بالعین۔ یا کسی کام کو کرنے کا التزام ہوتا ہے کہ میں فلاں کام کر دوں گا، یعنی التزام بالفعل۔ یا کسی چیز سے بچنے اور احتراز کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ یہ کام میں نہیں کروں گا اور نہ ہونے دوں گا، یہ التزام بالامتناع کہلاتا ہے۔ یہ تمام التزام کی قسمیں ہیں جن کا عقود سے گہرا تعلق ہے۔ اور چونکہ عقود کا مال وملکیت سے گہرا تعلق ہے اس لیے فقہائے اسلام جب مال سے بحث کرتے ہیں تو ان تمام موضوعات سے بھی بحث کرتے ہیں جن کا مال اور ملکیت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے۔

یہ تھا انتہائی مختصر خلاصہ ان مباحث کا جو مال وملکیت کے بارے میں فقہائے اسلام نے کیے ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

چھٹا خطبہ

اسلام میں معیشت وتجارت کی اہمیت اور اس کے احکام

چھٹا خطبہ

اسلام میں معیشت وتجارت کی اہمیت اوراس کے احکام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے۔ ''اسلام میں معیشت وتجارت کی اہمیت اور اس کے احکام۔ یہ گفتگو خاص طور پر اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیم میں قرآن مجید، احادیث، فقہ اور تصوف کے ذخائر میں تجارت کے بارے میں بہت تفصیل سے ہدایات اور تعلیمات ملتی ہیں۔ تجارت کی فضیلت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ پھر تاریخ اسلام سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اسلام کی نشر واشاعت میں تاجروں کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ یہ بات سیرت کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ نہ صرف رسول اللہ ﷺ عرب کے نامور، کامیاب اور انتہائی نیک نام تاجر تھے بلکہ آپ کے کبار صحابہ، سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان غنی، حضرت طلحہ، سیدنا زبیر اور متعدد دوسرے کبار صحابہ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی عرب کے نمایاں ترین اور کامیاب ترین تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔

اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ تجارت سے متعلق احکام، تجارت کی اہمیت اور نشر و اشاعت اسلام میں تاجروں کا کردار اسلام کی تاریخ میں روزِ اول سے موجود ہے۔ جائز اور دیانت

دارانہ تجارت کے حق میں احادیث میں بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ جامع ترمذی کی مشہور روایت ہے جس میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ایک سچا اور دیانت دار تاجر روز قیامت پیغمبروں، صدیقیوں، اور شہدا کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دیانت دار اور سچا تاجر جو شریعت کے احکام کے مطابق تجارت کرتا ہو، جو قرآن کریم اور سنت کی ہدایات کی پابندی کرتا ہو وہ اپنے طرز عمل سے اسلامی معاشرے میں، اسلامی تعلیم اور اسلامی احکام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنتا ہے۔

جب ایک تاجر جائز طریقے سے تجارت کرتا ہے تو وہ تعمیری معاشی سرگرمی میں شریعت کے احکام کے مطابق حصہ لیتا ہے۔ گویا شریعت کے مقاصد کی تکمیل میں عملاً شریک اور حصہ دار بن جاتا ہے۔ اس کا اپنا پیشہ، اس کا اپنا روزگار اور اس کی ذاتی دلچسپی شریعت کے مقاصد سے اس حد تک ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ جہاں جائز روزی کا حصول، اسلامی معاشرے میں رزق حلال کی تلاش اور احکام شریعت کی پابندی، شریعت کے اہم مقاصد میں شامل ہے وہاں یہ چیز اس تاجر کے رویے کا حصہ بھی بن جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہے جب تاجر امین اور صدوق ہونے کے ساتھ ساتھ، یعنی دیانت دار اور سچا ہونے کے ساتھ ساتھ احکام شریعت پر مکمل طور پر عمل درآمد بھی کرتا ہو۔ احکام شریعت پر مکمل عمل درآمد کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے احکام کو جانتا اور سمجھتا ہو۔

اسلامی تاریخ میں تاجروں اور تجارت سے وابستہ حضرات نے مقاصد اسلام کی تکمیل میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے ابتدائی تاجران اسلام تھے وہ سب داعیان اسلام بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے کبار فقہائے اسلام اپنے ذریعۂ روزگار کے اعتبار سے تاجر بھی تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کوفہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت امام لیث بن سعد مصر کے بڑے تاجروں میں شمار ہوا کرتے تھے۔ یہی کیفیت دوسرے متعدد فقہائے کرام کی ہے۔

سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں یہ حکم دیا تھا کہ جو شخص بازار میں بیٹھ کر کاروبار کرنا چاہیے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقہ کا علم رکھتا ہو۔ "**لا یبیع فی سو قنا الا من تفقه**" ہمارے بازار میں خرید و فروخت وہی کر سکتا ہے جو فقہ جانتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص فقہ کے احکام سے واقفیت حاصل کیے بغیر تجارت کرے گا وہ چاہے یا نہ چاہے ربا میں مبتلا ہو جائے گا، نا

جائز کاموں میں مبتلا ہو جائے گا۔ گویا ریاست نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ بازار میں کام کرنے والا ہر تاجر بقدر ضرورت فقہی احکام سے واقف ہو اور تجارت کے بارے میں اسلامی ہدایات کا علم رکھتا ہو۔

اس علم اور اس جذبے کے ساتھ جب کوئی شخص پیداواری سرگرمی میں حصہ لے گا تو وہ نہ صرف اپنی روزی کمائے گا بلکہ وہ ایک نیک اور مفید عمل میں بھی حصہ دار ہوگا۔ بعض فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ ہر پیداواری سرگرمی جو شریعت کی حدود کے مطابق ہو، مستحب ہے، مندوب الیہ ہے۔ اس لیے کہ خود قرآن مجید نے جا بجا صیغہ امر میں پیداواری سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ہدایات دی ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں صیغہ امر آتا ہے اس کے بارے میں فقہائے اسلام کا کہنا یہ ہے کہ یا تو وہ وجوب کے لیے ہوتا ہے، یا استحباب کے لیے ہوتا ہے۔ بعض خاص حالات میں جہاں سیاق وسباق اس کی اجازت دیں صیغۂ امر جواز کے لیے بھی ہوتا ہے۔ لیکن جہاں سیاق وسباق اس بات کی نشاندہی نہ کرتا ہو وہاں صیغہ امر یا استحباب کے لیے ہوتا ہے یا وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں کہا گیا کہ ''**فامشوا فی مناکبها و کلوا من رزقه**'' زمین میں چلو پھرو اور جو رزق اللہ نے دیا ہے اس کو کھاؤ، حاصل کرو۔ ''**سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منه**'' جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے وہ سب تمہارے فائدے کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ ''**واستعمرکم فیها**'' تمھیں اس زمین کو آباد کرنے کی ہدایت دی ہے، اس لیے ''**وابتغوا من فضل الله**'' اللہ کا رزق اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ یہ اور اس طرح کی دوسری ہدایات جو صیغہ امر میں آئی ہیں یہ استحباب کے لیے ہیں۔ گویا رزق حلال کا حصول کم از کم استحباب کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

بعض حالات میں فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن عام حالات میں یہ ایک مندوب الیہ اور پسندیدہ سرگرمی ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو جائز رزق عطا فرمایا ہے اس میں دس میں سے نو حصے تجارت کے ذریعے عطا فرمائے ہیں۔ ''**تسعة اعشار الرزق من التجارة**''۔ تجارت میں محض روایتی تجارت یعنی سادہ کاروبار ہی شامل نہیں ہے، بلکہ

ہر وہ سرگرمی شامل ہے جس میں انسان اپنی ذاتی محنت سے روزی حاصل کرتا ہو۔ اس میں صنعت بھی شامل ہے، اس میں دستکاری بھی شامل ہے اور وہ تمام معاملات شامل ہیں جو انسان اپنی محنت سے انجام دیتا ہے۔ محنت کے نتیجے میں کمائی ہوئی روزی اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بعض حلقوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ معاشی سرگرمی میں حصہ لینا زہد اور استغناء کے منافی ہے۔ شریعت نے بلاشبہ زہد کی تعلیم دی ہے، استغناء کی بھی تعلیم دی ہے۔ صحابہ کرام سے بڑا زہد کا علمبردار کوئی نہیں ہوسکتا۔ انبیاء علیہم السلام سے بڑا مستغنی کوئی نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ سب حضرات رزق حلال اور تجارت کے حصول میں حصہ لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر اسلام سے یہ بات منسوب ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ زہد یہ نہیں ہے کہ دنیا کے مال کو اپنے اوپر حرام کرلیا جائے یا جائز مال کو ضائع کر دیا جائے۔ بلکہ زہد یہ ہے کہ تم یہ یقین رکھو کہ اللہ نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اس سے کہیں زیادہ یقینی تمھارا وہ رزق ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ یعنی اللہ کے رازق ہونے کا یقین اور اس پر مکمل اعتماد زہد کی روح ہے۔

توکل زہد کا لازمی جزو ہے۔ اگر توکل نہ ہو تو زہد کا دعویٰ بے کار ہے۔ مشہور مزاج شناس اسلام علامہ عزالدین بن عبدالسلام السلمی نے لکھا ہے کہ زہد یہ ہے کہ کسی مادی چیز کا دل سے گہرا تعلق نہ ہو۔ دل اس کی محبت سے خالی ہو، دل میں اس کی رغبت نہ ہو، دل صرف اللہ سے لگا ہوا ہو۔ زہد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہاتھ بھی مال و دولت سے خالی ہو۔ ملکیت میں بھی مال و دولت نہ ہو۔ مال و دولت کا ہاتھ میں یا جیب میں ہونا زہد کے منافی نہیں ہے۔ دل میں ہونا زہد کے منافی ہے۔ پھر علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر زہد کا علمبردار کوئی نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ تمام زاہدین کے لیے نمونہ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کی ملکیت میں فدک کی زمینیں بھی تھیں، آپ کے تصرف میں عوالی کے چند باغات اور مکانات بھی تھے۔ آپ کے تصرف میں وادی القریٰ کی زمین کا ایک حصہ بھی تھا۔ خیبر میں جو آپ کو حصہ ملا تھا وہ بھی تھا۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی ملکیت میں آیا، آپ نے اس دولت کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا، لیکن ان میں سے کسی چیز نے آپ کے دل

میں جگہ نہیں بنائی۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بہت بڑے رقبے کے مالک ہوئے، بہت بڑی ریاست کے حکمران رہے، لیکن ان میں سے کوئی چیز اللّٰہ کی طرف ان کی توجہ کو کم نہیں کرسکی۔ اس رویے کے ساتھ مال ودولت اگر اللّٰہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے تو اس کا حصول اوراس کا استعمال زہد کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ اس رویے کے بعد ہر تجارتی سرگرمی، ہر معاشی سرگرمی عبادت اور صدقے کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کی روایت ہے کہ اگر کوئی شخص پودا لگائے یا کوئی کھیتی لگائے، اس پودے اور کھیتی میں سے کوئی انسان، کوئی پرندہ یا جانور اپنی روزی حاصل کرلے تو یہ چیز پودا لگانے والے کے لیے صدقے کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا اللّٰہ کی تمام مخلوقات، انسان، جانور، پرندے، ان میں سے کسی کے رزق کا بندوبست اگر کسی کے ہاتھوں ہوتا ہے تو وہ اس شخص کی طرف سے صدقہ کے قائم مقام ہے، جس کا اللّٰہ کی بارگاہ میں اجر ملے گا۔

صحابہ کرام صرف تجارت میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ بلکہ انھوں نے تجارت کو اس طرح نئے انداز سے مرتب کیا، بڑے پیانے پر منظم کیا، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بین الاقوامی سطح پر تجارت کو فروغ دیا۔ کہ صحابہ کرام کی اس کارپوریٹ تجارت کے نتیجے میں بڑے پیانے پر مسلمان تاجر دنیا بھر میں پھیل گئے، وہاں انھوں نے اسلام کی تبلیغ بھی کی اور رزق حلال کے طریقے بھی دنیا کو سکھائے۔ صحابہ کرام کے زمانے سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وہ بیت المال سے تجارت کے لیے قرضہ لیا کرتے تھے۔ گویا تجارت کے لیے قرض لینے کی سہولت جو آج بینکوں کے ذریعے ہے یہ روایت بیت المال کے ذریعے صدر اسلام سے موجود رہی ہے۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے صاحب زادگان کا واقعہ مشہور ہے جنھوں نے بیت المال کی رقم سے تجارت کی اور مضاربہ کے طور پر نفع کا ایک حصہ خود رکھا اور ایک حصہ بیت المال میں جمع کرایا۔ جن کبار صحابہ کی بڑے پیانے پر تجارت تھی جس کو کارپوریٹ تجارت کہا جاسکتا ہے ان میں سیدنا زبیر، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف اور سیدنا عثمان بن عفان کی تجارتیں شامل تھیں۔ یہ تجارتیں اتنے بڑے پیانے پر تھیں کہ آج ان کی تفصیلات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ تدین کے اعلیٰ ترین معیار، تقویٰ اور زہد کے بلند ترین نمونہ ہونے کے باوجود دنیاوی اعتبار سے کامیاب ترین تجارت ان حضرات نے کس طرح اور کتنے بڑے پیانہ پر چلا کر دکھائی۔ اور یہ

ثابت کیا کہ تدین اور تجارت میں کوئی تعارض نہیں ہے اور ان دونوں کو ساتھ ساتھ کیسے چلایا جاسکتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کا کاروبار اور تجارت مشہور ہے۔ کوفے کے بڑے تاجروں میں سے حضرت امام صاحب بھی تھے۔

نہ صرف صحابہ کرام، فقہائے اسلام اور بہت سے اولیائے عظام خود تاجر تھے، بلکہ تجارت سے وابستگی دنیائے اسلام کا ایک طرہ امتیاز تھی۔ مسلم جہاز رانوں نے تجارت کے ذریعے پوری دنیا کے سفر کیے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کو پھیلایا۔ آج انڈونیشیا، ملیشیا، فلپین اور چین کے بیشتر علاقوں میں جو مسلمان پائے جاتے ہیں یہ سب مسلمان تاجروں کے ذریعے مسلمان ہوئے۔ انڈونیشیا، ملیشیا کے وسیع علاقوں میں کروڑوں مسلمانوں پر مشتمل آبادیاں مسلمان تاجروں کی مرہون منت ہیں۔ اگر آج ہمارے تاجر اس قدیم اسلامی روایت کو زندہ کریں جس میں تجارت اور دعوت دونوں کو یکجا کیا گیا تھا تو وہ بڑے پیمانے پر ایک نئے انداز سے اسلام کی دعوت کو منظّم کر سکتے ہیں۔

آج دنیا جس معاشی مشکل اور پریشانی کا شکار ہے، آج دنیا کو جو شدید معاشی بحران درپیش ہے اس کا حل اسلامی تعلیم کے پاس موجود ہے۔ اسلامی شریعت اس بحران سے نکلنے میں دنیا کی رہنمائی کرسکتی ہے۔ یہ کام آج پاکستان کے تاجر اور کاروباری طبقے سے وابسطہ حضرات کر سکتے ہیں کہ اسلام میں تجارت اور کاروبار کے جو اصول بتائے گئے ہیں، اسلامی معاشیات اور بینکاری کے جو قواعد دورجدید کے علماء نے مرتب کیے ہیں ان کو مغربی دنیا میں متعارف کرایا جائے اوران کی بنیاد پر ایسی کامیاب تجارتیں منظّم کی جائیں جو دنیا کو اسلام کی تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ یہ سرگرمی خود ایک عبادت ہے۔ لیکن جب اس نیت سے کی جائے گی کہ اس کے ساتھ ساتھ دعوت کا کام بھی کرنا ہے تو یہ اعلیٰ ترین درجہ کی عبادت بن جائے گی۔

یہ بات کہ تجارت میں حصہ لینا فی نفسہ نیکی کا کام ہے اور خدمت خلق ہے یہ متعدد احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا۔ اور یہ روایت موطا امام مالک میں موجود ہے، کہ جو شخص گرمی سردی کی پروا کیے بغیر ہماری منڈیوں میں باہر سے مال لے کر آتا ہے اور اس کو فروخت کرتا ہے تو وہ عمر کا مہمان ہوگا۔ یعنی سرکاری مہمان ہوگا۔ ہماری مہمانی کے دوران جس طرح چاہے اپنا سودا فروخت کرے اور جتنا چاہے فروخت کرے اور جتنا چاہے

فروخت نہ کرے۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ تاجروں کو سہولتیں فراہم کرے اوران سہولتوں کوفراہم کرنے میں سرکاری وسائل بھی خرچ کرے۔ سرکاری وسائل اگرخرچ کرنے پڑیں تو ریاست اس میں تامل نہ کرے، جیسا کہ سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ باہر سے جو تاجر مال لے کر آئے گا وہ ریاست کا مہمان ہوگا۔ ریاست اس کے قیام و طعام کے اخراجات برداشت کرے گی۔ اس تصور کو آج کل کے ماحول میں کیسے روبہ عمل لایا جائے؟ یہ اہل علم کے غور کرنے کی بات ہے۔ دورِ جدید کے ذمہ دار حضرات کے غور کرنے کی بات ہے۔ یہ اصول بہرحال اس ارشاد پاک سے نکلتا ہے کہ تاجروں کو سرکاری وسائل فراہم کرنا، سرکاری وسائل سے ان کے لیے سہولتیں مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔

شریعت نے تجارت کے بارے میں جو احکام دیئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔تھوڑا سا حصہ تو ان احکام کا ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ تجارت کرتے ہوئے کیا کیا قواعد پیش نظر رہنے چاہئیں۔ یہ حصہ تو عموماً ان اخلاقی ہدایات پر مبنی ہے جن سے ہر مسلمان واقف ہوتا ہے۔ مثلاً سچ بولنا، دیانت داری سے کام لینا، صحیح ناپ تول کرنا، ان تصورات سے اکثر و بیشتر مسلمان واقف ہوتے ہیں۔ یہ بیشتر وہ معاملات ہیں جو دنیا کی تمام مہذب اور متمدن اقوام میں متفق علیہ ہیں۔ کوئی قوم یہ نہیں کہتی ہے ناپ تول میں کمی کی جائے۔ کوئی قوم یہ نہیں کہتی کہ کاروبار اور تجارت میں دھوکا دیا جائے۔ کوئی قوم یہ نہیں کہتی کہ مال تجارت کے بارے میں جھوٹ بولا جائے۔ اس لیے شریعت نے ان معاملات کی زیادہ تفصیل بیان نہیں کی بلکہ ان کی صرف یاددہانی کرانے پر اکتفا کیا ہے۔ دوسرا حصہ شریعت کی تعلیم کا وہ ہے جن میں تفصیل کے ساتھ ان محرمات کو بتایا گیا ہے جو تجارت کے عمل میں شامل نہیں ہونی چاہئیں اور جن سے تجارت کے عمل، صنعت اور کاروبار کے عمل میں اجتناب کرنا چاہیے۔

ان محرّمات میں سب سے نمایاں اور واضح طور پر حرام چیز تو ربا ہے جس کے بارے میں ایک الگ اور مستقل گفتگو میں تفصیل پیش کی جائے گی۔ دوسری چیز غرر ہے۔ جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ غرر سے مراد وہ لین دین ہے جس میں کسی ایک فریق کا حق غیر متعین، غیر معلوم اور غیر واضح ہو۔ دو فریقوں میں سے ایک فریق کا حق تو متعین طور پر طے ہو جائے دوسرے کا حق طے شدہ نہ ہو۔ یہ شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے۔ غرر کی بہت سی قسمیں احادیث میں بیان ہوئی

ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ احادیث میں 56 کے قریب احکام دیئے گئے ہیں یا تجارت کی 56 کے قریب صورتوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یا ان میں ربا پایا جاتا ہے یا غرر پایا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر جاہلیت کے سادہ ماحول میں، اسلام سے پہلے کی سادہ تجارت میں غرر اور ربا کی چھپن صورتیں پائی جاتی تھیں تو آج کی پیچیدہ معیشت میں کتنی صورتیں پائی جاتی ہوں گی۔

تیسری چیز جو شریعت میں حرام قرار دی گئی ہے وہ قمار ہے۔ قمار کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قمار وہ ہے کہ جس میں دونوں فریقوں کا حق غیر واضح اور غیر متعین ہو اور ایک فریق کا نفع دوسرے کے نقصان پر لازمی طور پر منتج ہوتا ہو۔ مثلاً تین آدمیوں نے مل کر پیسے برابر لگائے اور کسی بخت واتفاق کے نتیجے میں وہ پوری رقم کسی ایک شخص کو مل گئی یہ قمار کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ دو افراد کا نقصان ہوگا تو تیسرے کو پیسے ملیں گے۔ کس کو رقم ملے گی، کس کو نہیں ملے گی۔ یہ بھی غیر متعین ہے۔ کون نقصان اٹھائے گا، کون نفع اٹھائے گا، یہ بھی غیر متعین ہے۔ یہ چیز قمار کہلاتی ہے اور یہ واضح طور پر حرام ہے۔

قمار ہی کی ایک نسبتاً ہلکی شکل جو حرام ہے وہ میسر ہے۔ میسر وہ ہے کہ جس میں کسی شخص کی یافت محض بخت واتفاق پر مبنی ہو۔ ایسا کاروبار، ایسی تجارت، جس میں ایک سے زائد افراد حصہ لیں اور اس میں کسی ایک کو محض اتفاق کے نتیجے میں فائدہ ہو جائے۔ یہ بھی گویا قمار اور جوے کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس سے ذرا ہلکی ہے۔ قرآن کریم نے جب میسر کو حرام قرار دیا ہے۔ تو قمار خود بخود حرام ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کا ایک اسلوب یہ ہے کہ حرام باتوں کے سارے درجوں کو الگ الگ بیان کرنے کے بجائے بعض اوقات ان کے سب سے پہلے اور ابتدائی درجہ ہی کو حرام قرار دے دیتا ہے۔ بقیہ درجوں کی حرمت اسی سے واضح ہو جاتی ہے۔ جب کسی ہلکی چیز کو حرام قرار دے دیا گیا تو اس ہلکی کے بعد کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب آپ سے آپ حرام ہو جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہلکی چیز تو حرام ہو اور بھاری چیز حلال ہو۔ قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ ماں باپ کے سامنے اف تک نہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ماں باپ کی رضا اور احترام کے خلاف کوئی کام نہ کرو۔ اب کوئی پرلے درجے کا بے وقوف شخص ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم نے کہیں یہ تو نہیں کہا کہ ماں باپ کی پٹائی نہ کرو۔ نہ قرآن میں آیا ہے، نہ حدیث میں آیا ہے، اس لیے ماں

باپ کے سامنے اف کرنا تو جائز نہیں ہے پٹائی کرنا جائز ہے۔ جتنی مضحکہ خیز بات یہ ہوگی اتنی ہی مضحکہ خیز بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے میسر کو حرام قرار دیا ہے، قمار کو حرام قرار نہیں دیا۔ حالانکہ ہلکی چیز کو حرام قرار دینے کا منطقی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ بھاری جرم رکھنے والی چیز ہے وہ بطریق اولی ناجائز ہے۔

محرمات تجارت میں پانچویں چیز جو غرر کا ذریعہ بنتی ہے وہ جہالت اور لاعلمی ہے۔ کسی ایسی تجارت میں حصہ لینا جس کی شرائط نامعلوم ہوں، مجہول ہوں، جس میں جو چیز بیچی جارہی ہے وہ نامعلوم ہو۔ جو قیمت شخص وصول کرنا چاہتا ہے وہ قیمت نامعلوم ہو۔ یہ سب اسباب چونکہ غرر پیدا کرتے ہیں اس لیے فقہائے اسلام نے ان کو الگ سے بھی بیان کیا ہے اور جہل سے اس کی تعبیر کی ہے۔ چھٹی چیز ضرر ہے۔ ضرر سے مراد نقصان ہے۔ لیکن ہر وہ تجارت یا کاروبار جس میں کسی ایک فریق کو بلا وجہ کا نقصان ہو رہا ہو وہ درست نہیں ہے۔

ساتویں چیز غبن ہے۔ یعنی ایسی منافع خوری جو بازار میں عام طور پر رائج نہ ہو۔ اس سطح کا نفع رکھنا جس سطح کا بازار میں رواج نہیں ہے۔ یہ شریعت میں غبن کہلاتا ہے۔ یاد رکھیے گا کہ اردو میں غبن کے معنی اور بن گئے ہیں۔ قدیم فقہی ادب میں غبن کے معنی غیر حقیقی انداز کی نفع خوری ہے۔ آٹھویں چیز جو شریعت نے منع فرمائی ہے وہ خلابہ ہے۔ خلابہ سے مراد ہے کسی شخص کی سادگی کی وجہ سے اس کو دھوکا دینا یا کسی شخص کے سامنے چکنی چپڑی باتیں بنا کر اس کو ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دینا جو اس کے تجارتی مفاد میں نہ ہو۔ شریعت نے ایسی صورت میں نقصان اٹھانے والے شخص کو یہ حق دیا ہے کہ وہ چاہے تو سودے کو منسوخ کردے اور اپنی دی ہوئی رقم واپس لے لے۔

نویں چیز تدلیس ہے۔ تدلیس کا کام آج کل بہت ہو رہا ہے تدلیس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تجارت یا اپنے سودے اور سامان تجارت میں ایسے اوصاف بیان کرنا جو اس میں نہیں پائے جاتے۔ اس کو تدلیس کہتے ہیں۔ آپ نے کوئی پروڈکٹ تیار کی۔ اس پروڈکٹ کے ایسے ایسے اوصاف بیان کیے جو اس میں نہیں پائے جاتے۔ لوگوں نے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس کو خرید لیا۔ یہ عمل شریعت میں درست نہیں ہے۔ یہ تدلیس کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تدلیس کے نتیجے میں اپنا کاروبار چلائے اور چیز بیچ دے۔ تو وہ شرعاً غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ گناہ کا کام ہے۔ ریاست کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کو روکنے کے لیے قوانین وضع کرے اور کوئی مناسب پالیسی

اختیار کرے۔

دسویں چیز جو محرمات میں سے ہے بیع معدوم ہے۔ یعنی ایسی چیز کی فروخت جو اس وقت نہ موجود ہے اور نہ بیچنے والے کے اختیار میں ہے کہ وہ فراہم کر سکے۔ اگر کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن بیچنے والا اس کو فراہم کر سکتا ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہاں بکتی ہے، کیسے بنتی ہے، کیسے حاصل ہوتی ہے۔ وہاں سے حاصل کر کے آپ کو فراہم کر دے گا۔ جیسے اکثر سپلائی کا کام کرنے والے کرتے ہیں۔ یا جو چیزیں تیار کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس آج چیزیں تیار نہیں ہیں۔ لیکن آپ ان کو پیشگی قیمت ادا کر دیتے ہیں وہ چیزیں خود بنا کر یا بنوا کر یا بازار سے خرید کر آپ کو فراہم کر دیتے ہیں، یہ جائز ہے۔ معدوم سے مراد یہاں وہ چیز ہے جو نہ موجود ہو اور نہ بیچنے والے کے بس میں ہو کہ وہ خرید کر آپ کو دے سکے۔ ایسی چیز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

اسی طرح سے ایسی تجارت بھی جائز نہیں ہے جس میں دو متناقض یا متعارض کاروباروں کو اس طرح ملا دیا گیا ہو کہ ایک کی تکمیل دوسرے پر موقوف ہو۔ اس کو شریعت میں ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے سود کا راستہ کھلتا ہے۔ مثال کے طور پر اس طرح کا کاروبار کہ میں آپ کو فلاں چیز بیچنے کے تیار ہوں بشرطیکہ آپ مجھے اتنا قرضہ دیں۔ میں آپ کو قرضہ دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری فلاں چیز خرید لیں، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ دونوں دو الگ الگ معاملات ہیں۔ جب دونوں کو ایک دوسرے پر موقوف قرار دیا جائے گا تو اس سے ناجائز تجارت اور سود خوری کا راستہ کھلے گا۔ اس لیے یہ ناجائز ہے۔

ان احکام سے ایک اہم بات سامنے آتی ہے کہ حصول دولت کے بارے میں اسلام کا ایک عمومی مزاج ہے۔ وہ عمومی مزاج یہ ہے کہ بغیر محنت کے حصول دولت کے راستے کم سے کم کیے جائیں۔ مشاہدہ یہ ہے کہ بغیر محنت کے جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ بالعموم غلط راستے میں صرف ہوتی ہے۔ مال مفت دل بے رحم کا محاورہ جس نے بھی سوچا تھا صحیح سوچا تھا۔ میسر، قمار، غرر، ربا، سٹہ، یہ سب وہ راستے ہیں جن کے نتیجے میں بیٹھے بٹھائے بغیر کسی محنت کے بے شمار دولت انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جب دولت کے انبار بیٹھے بٹھائے موصول ہونے لگیں تو انسان کا نفس اس کو غلط راستوں میں خرچ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ جس سے نہ صرف مترفین کا طبقہ پیدا ہوتا ہے، بلکہ خود عام معاشرہ میں بھی بہت سی اخلاقی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اسلامی شریعت کا

مزاج یہ ہے کہ دولت کے حصول کے لیے قواعد وضوابط مقرر کیے جائیں۔ بغیر محنت کے حاصل ہونے والی دولت کے راستوں کو کم سے کم اور محدود سے محدود تر کیا جائے۔ یہ کام اسلامی ریاست کو بھی کرنا چاہیے۔ اس کے لیے قانون سازی بھی ہونی چاہیے اور یہ بات مسلم معاشرے کا اور مسلمانوں کے مزاج کا حصہ بھی ہونی چاہیے۔

دوسری بات جو شریعت کے احکام سے واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک تاجر اور کاروبار کرنے والے میں یہ حوصلہ ہونا چاہیے کہ وہ پہل کر سکے اور اقدام کر سکے۔ یعنی کوئی جرات مندانہ قدم اٹھا سکے۔ یہ کامیابی اور ترقی کی ایک اہم شرط ہے۔ زندگی کے کسی بھی پہلو میں واقعہ یہ ہے کہ پہل اور اقدام کا حوصلہ رکھے بغیر کامیابی اور ترقی حاصل نہیں ہوتی۔ ربا اور سودخوری سے یہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس لیے شریعت نے یہ کوشش کی ہے اور جابجا ایسے احکام دیے ہیں جن کے نتیجے میں ہر جائز روزی کمانے والا محنت، پہل اور اقدام سے کام لے۔ گھر بیٹھ کر کھانے کا عادی نہ ہو۔ اس لیے کہ گھر بیٹھ کر کھانے سے تجارتی سرگرمی بھی کمزور ہو جاتی ہے اور پہل اور اقدام کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

شریعت نے تجارت کے جو احکام دیے ہیں ان میں ایک بہت اہم بلکہ بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت اور کاروبار میں بالخصوص اور معاملات میں بالعموم اصل یہ ہے کہ ہر چیز جائز ہے۔ تاقتیکہ اس کی حرمت یا کراہت شریعت کی نصوص سے ثابت نہ ہو جائے۔ ''**الاصل فی المعاملات الاباحة**'' لہٰذا کاروبار تجارت کی ہر قسم جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی ایسا عنصر شامل نہ ہو جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ دوسری بڑی وجہ اس حکم کی یہ ہے کہ فقہ معاملات کا دارومدار انسانوں کے جائز مفاد اور جائز مصلحت کی تکمیل پر ہے۔ شریعت یہ بات جانتی ہے کہ انسانوں کی زندگی کا دارومدار تجارت اور کاروبار پر ہے۔

امام الحرمین امام جوینی نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ تجارت اور کاروبار کی جتنی بڑی بڑی اور اہم صورتیں ہیں وہ سب بنیادی ضروریات میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ ان پر انسانی زندگی کی بقاء اور تحفظ کا دارومدار ہے اور انسانی زندگی کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بے شمار آیات سے پتا چلتا ہے۔ لہٰذا جن جن چیزوں پر انسانی زندگی کے تحفظ کا دارومدار ہے وہ سب کی ضروریات میں شامل ہیں۔ معاملات اور تجارت سے متعلق

سب تمام ابواب شریعت نے اسی ضرورت کی تکمیل کی خاطر دیے ہیں۔

تجارت اور کاروبار میں جو چیز ناگزیر ہے وہ سہولت کا حصول ہے۔ یوں تو یسر اور تیسیر شریعت کے ہر حکم میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ آسانی پیدا کرنا شریعت کا مزاج ہے۔ آسانی عبادات میں بھی پیدا کی جائے گی۔ آسانی معاملات میں بھی پیدا کی جائے گی۔ آسانی خاندانی معاملات میں بھی رکھی گئی ہے۔ لیکن تیسیر کی سب سے زیادہ ضرورت جس چیز میں پڑتی ہے وہ معاملات، تجارت اور کاروبار ہیں۔ جب تک معاملات، تجارت اور کاروبار میں آسانیاں پیدا نہیں کی جائیں گی عامتہ الناس کے لیے اپنی ضروریات کی تکمیل مشکل ہو جائے گی۔ اسی آسانی کے پیش نظر شریعت نے ان محرمات کی تفصیل بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کی وجہ سے کوئی کاروبار ناجائز قرار پاتا ہے۔ ان محرمات سے جن کی تعداد بہت محدود ہے اگر اجتناب کیا جائے تو پھر تجارت اور کاروبار کی تمام صورتیں جائز ہو جاتی ہیں۔ کسی تجارت کے جائز ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ شریعت میں واضح طور پر اس کو جائز قرار دیا گیا ہو۔ تجارت اور کاروبار کی ہر صورت شریعت میں جائز ہے بشرطیکہ اس میں حرام عنصر شامل نہ ہو۔

ان حرام عناصر میں سب سے اہم جیسا کہ عرض کیا گیا رہا ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہو گی۔ دوسری اہم چیز غرر ہے۔ جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ غرر کے بارے میں مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین نے لکھا ہے کہ غرر سے مراد یہ ہے کہ مبیع یعنی۔ جس چیز کو فروخت کیا جا رہا ہے اس کا وجود مشکوک ہو۔ "هو الشك في وجود المبيع" یہ شک کہ وہ چیز موجود ہے، یا موجود نہیں ہے یا یہ شک کہ موجود ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، موجود ہو سکتی ہو تو فراہم بھی کی جا سکتی ہے یا فراہم نہیں کی جا سکتی۔ اس کی تیاری کا عمل میں آنا مشکوک ہے۔ یہ غرر کہلاتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے اسی کی وضاحت یوں کی ہے کہ جس کا حاصل ہونا اور ضائع ہونا دونوں یکساں طور پر ممکن ہوں۔ "هو ما تردد بين الحصول و الفوات"۔ اس کا امکان بھی ہے کہ وہ آپ کو حاصل نہ ہو سکے اور اس کا امکان بھی ہے کہ حاصل ہو جائے دونوں طرح کے امکانات پچاس پچاس فیصد موجود ہیں۔ یہ غرر کہلاتا ہے۔

شریعت میں غرر جو مثالیں دی گئی ہیں، احادیث میں وہ اتنی سادہ اور واضح ہیں کہ ان سے غرر کی حقیقت فوری طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "لا تبیعوا

السمکة فی الماء''۔ جب تک مچھلی دریا میں تیر رہی ہے یا سمندر میں موجود ہے اس وقت تک اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ ایک مچھیرا جال لے کر کشتی میں بیٹھ کر نکلتا ہے اور آپ سے پیشگی ہی معاملہ کر لیتا ہے کہ آج جتنی مچھلی ہاتھ آئے گی وہ آپ کو ایک ہزار روپے میں فروخت کر دیتا ہوں۔ آپ سے پیشگی ایک ہزار روپے وصول کر لے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ غرر ہے۔ اس لیے کہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو کتنی مچھلی ملے گی، کیسی ملے گی، اچھی ہوگی کہ بری ہوگی۔ کم ہوگی کہ زیادہ ہوگی۔ ہوسکتا ہے آج اس کو بالکل مچھلی نہ ملے۔ ہوسکتا ہے بہت مل جائے۔ ہوسکتا ہے اس طرح کی مچھلی نہ ملے جس طرح کی مچھلی ملنے کا آپ کو اندازہ تھا کہ ملنی چاہیے۔ ان سب صورتوں میں بدمزگی پیدا ہوگی۔ بدگمانی ہوگی۔ ممکن ہے اختلاف تک نوبت پہنچے۔ اس لیے شریعت نے اس راستے کو بند کر دیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ''**لا تبیعوا الطیر فی الھواء**'' یا اس طرح کے الفاظ آئے ہیں کہ جب تک پرندہ ہوا میں اڑ رہا ہے اس وقت تک اس کی فروخت جائز نہیں ہے۔ یعنی وہ پرندہ جو جنگلی ہے اور ابھی آپ نے شکار نہیں کیا۔ یہاں وہ پرندہ مراد نہیں ہے جو آپ کا سیدھایا ہوا ہے۔ مراد وہ پرندہ ہے جس کو ابھی آپ نے شکار نہیں کیا، جنگلی ہے، ہوا میں اڑ رہا ہے اور اندازہ نہیں کہ آپ اس کو شکار کر سکیں گے یا نہیں کر سکیں گے۔

غرر کے بارے میں فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر معمولی غرر ہو، تھوڑا بہت تو وہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ تھوڑا بہت عدم تعین ہر چیز میں ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت غیر یقینی یا نا معلومیت ہر چیز میں ہوتی ہے۔ آپ نے کاغذ کا ایک بہت بڑا پیکٹ خریدا، باہر سے دیکھا، اس کا امکان چاہے بہت تھوڑا ہو، ایک فی ہزار ہو لیکن اس بات کا امکان تو ہے کہ اس میں بعض کاغذ خراب رکھے ہوئے ہوں۔ لیکن اس طرح کا امکان چونکہ بہت بعید ہوتا ہے اس لیے یہ غرر یسیر ہے، اس کا شریعت نے کوئی خاص اعتبار نہیں رکھا۔

قمار کے بارے میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ قمار میں دو فریقوں یا دو مقابلہ کرنے والوں میں ایک کا نقصان دوسرے کے فائدہ کو مستلزم ہو، ایک کا نقصان دوسرے کے فائدے کو مستلزم ہو۔ اور دوسرے کا فائدہ پہلے کے نقصان کے مستلزم ہو۔ فقہائے اسلام نے یہی تعریفیں قمار کی کی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قمار میں غیر معمولی رسک پایا جاتا ہے۔ لیکن خود فی نفسہ رسک قمار نہیں ہے۔ تھوڑا بہت رسک یا خطرہ تو ہر چیز میں ہوتا ہے۔ اگر یہ خطرہ معقول اور معتدل حدود کے اندر ہو تو یہ قمار نہیں ہے۔ اس حد سے بڑھ جائے تو قمار ہے۔ اس خطرہ یا رسک کو ختم کرنے یا محدود رکھنے کے معقول اور جائز طریقے بھی ہو سکتے ہیں، وہ اسلامی طریقے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ رسک کا وجود ہر اسلامی پروڈکٹ میں لازمی ہے، اس کو کم نہیں کیا جا سکتا یہ درست نہیں ہے۔ رسک کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلامی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ معقول حدود کے اندر ہوں۔

اسلامی شریعت کی رو سے کاروبار اور تجارت کی سب سے اہم صورت جس کو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے وہ بیع ہے۔ بیع یعنی خرید وفروخت چونکہ تجارت کی سب سے بڑی اور قدیم ترین قسم ہے اس لیے قرآن مجید میں بیع کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ بیع کی حقیقت تو جیسا کہ فقہائے اسلام نے لکھا ہے یہ ہے کہ مال کی خرید وفروخت یا مال کا تبادلہ مال کے ساتھ کیا جائے۔ مبادلۃ المال بالمال۔ اس میں ایک طرف کے مال کو قیمت کہا جاتا ہے دوسری طرف کے مال کو سودا کہا جاتا ہے۔ جس زمانے میں بارٹر کی نوعیت کی خرید وفروخت ہوتی تھی وہاں یہ تعین دشوار ہوتا تھا کہ کیا چیز قیمت ہے اور کیا سودا ہے۔ لیکن جب سے زری معیشت رائج ہوگئی ہے یعنی مونیٹری اکانومی آگئی ہے اس وقت سے یہ تعین آسان ہو گیا ہے کہ قیمت کیا ہے اور سودا کیا ہے۔ اس لیے کچھ فقہاء بیع کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں بارٹر اور زری دونوں معیشتیں شامل ہو جائیں۔ کچھ فقہاء جو دور جدید کے ہیں وہ بیع کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں زری معیشت میں ہونے والی بیع ہی شامل ہوتی ہے۔

فقہائے اسلام نے قرآن کریم کی واضح ہدایات کی روشنی میں یہ لکھا ہے کہ خرید و فروخت یا تجارت کے لیے ایجاب وقبول لازمی ہے۔ دونوں فریق جو تجارت کی اہلیت رکھتے ہوں، عاقل بالغ ہوں، وہ اپنے ایجاب وقبول سے تجارت کر سکتے ہیں۔ لیکن خود ایجاب وقبول کیا ہے۔ کیا ایجاب وقبول کے لفظ کا دہرانا ضروری ہے؟ فقہائے اسلام کی غالب ترین اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ زبان سے ایجاب وقبول کے الفاظ کہنا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ طرز عمل یا رویہ یا اشارہ یا عرف جو دونوں فریقین کی رضامندی کو بتاتا ہو وہ کافی ہے۔

چنانچہ بیع بالتعاطی جمہور فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ بیع بالتعاطی ہاتھ در ہاتھ لین دین کو کہتے ہیں۔ اس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ تاجر نے سامان رکھا ہوا ہے، آپ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ قیمت سامنے رکھ دی اور سامان اٹھا کر لے آئے۔ اس نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ گویا وہ بھی راضی ہے آپ بھی راضی ہیں۔ اس کو بیع بالتعاطی کہتے ہیں۔ اکثر بازاروں میں خاص طور پر چھوٹی چیزوں کے بارے میں جو مثلیات سے تعلق رکھتی ہیں اس طرح کی بیع کا عام رواج ہوتا ہے جو چیزیں اس طرح کی بیع میں رکھی جاتی ہیں ان میں سے ہر ایک کی قیمت متعین ہوتی ہے۔ بازار میں ایک انڈے کی قیمت مثلاً دو روپے ہے۔ آپ نے دو روپے دوکاندار کے سامنے رکھ دیے، انڈا اٹھا کر لے آئے۔ ایک ڈبل روٹی کی قیمت مثلاً پچاس روپے ہے، آپ نے پچاس روپے کا نوٹ رکھا اور ڈبل روٹی اٹھا کر گھر لے گئے۔ یہ سب تعاطی کی قسمیں ہیں۔

اس بیع کو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد اور بیشتر فقہاء جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اسی پر عام طور پر دنیائے اسلام کا رواج رہا ہے۔ امام شافعی نے اس بیع کو شروع میں ناجائز سمجھا اور اس کو تراضی یعنی آپس کی رضامندی کے خلاف قرار دیا۔ امام شافعی کے بعد آنے والے شافعی فقہاء میں سے کچھ لوگ اس کو جائز سمجھتے ہیں کچھ لوگ ناجائز۔ لیکن عملاً جو طریقہ شافعی دنیا میں رائج ہے وہ وہی ہے جو جمہور فقہاء کے نقطہ نظر کے مطابق ہے۔

بیع کے بعد کاروبار کی ایک اور اہم قسم جو قدیم زمانے سے رائج ہے وہ اجارہ ہے۔ اجارہ سے مراد کسی منفعت کی فروخت ہے۔ کسی چیز کی اصل ملکیت آپ کی ہو اور آپ ہی کی رہے۔ البتہ اس کے فوائد اور منافع آپ وقتی طور پر کسی کو فروخت کر دیں، اس کو اجارہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے ایک گاڑی خریدی، گاڑی آپ کی ملکیت ہے۔ لیکن آپ نے ایک سال کے لیے متعین کرایہ پر اس کا فائدہ اٹھانے کی کسی شخص کو اجازت دے دی، گویا کرائے پر دے دی، یا بالفاظ دیگر اس کے فوائد اور نفع کو فروخت کر دیا۔ یہ اجارہ کہلاتا ہے۔ اجارہ کی شرائط اگر پوری کی جائیں تو یہ جائز کاروبار ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر قسم کا کاروبار کیا جا سکتا ہے۔ اگر اجارہ کا کوئی نیا طریقہ شریعت کی حدود کے مطابق ہو اور اس سے سرمایہ کاری میں کام لیا جا سکتا ہو تو اس کے ذریعہ سرمایہ کاری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جدید بینکاری میں اجارہ کی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔ جن کے بارے میں یہ دیکھنا

چاہیے کہ وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہیں کہ نہیں ہیں۔ اگر شریعت کے احکام کے مطابق ہیں تو ان پر عمل درآمد میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اجارہ کی بنیادی شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ وہ منفعت کی بنیاد پر ہو۔ یعنی اس چیز کی جو منفعت ہے وہ معاملے کی بنیاد ہو۔ اس کی ذات معاملہ کی بنیاد نہ ہو۔ یعنی اس چیز کا استعمال یعنی use نہ ہو سکتا ہو، استھلاک (یعنی consumption) نہ ہوتا ہو۔ اس کی اصل محفوظ رہتی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس مال کی منفعت کو آپ کرایے پر لے رہے ہیں وہ مال متقوم ہو یعنی شریعت میں جائز ہو۔ شریعت میں اس کا استعمال جائز ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ حقیقی اعتبار سے بھی اور شرعی احکام کے اعتبار سے بھی اس منفعت کو پورا پورا وصول کیا جا سکتا ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ منفعت معلوم اور متعین ہو۔ معلوم اور متعین میں بہت دوٹوک انداز سے معلوم اور متعین ہونا لازمی نہیں ہے۔ عمومی طور پر اندازہ ہونا چاہیے کہ کتنی منفعت مقصود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات منافع میں سو فیصد تعین ممکن نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنی گاڑی کرایے پر دے دی۔ اب کرایے پر لینے والا سو میل روز چلائے گا، یا دس میل چلائے گا یا پانچ سو میل روز چلائے گا۔ اس کا تعین تحدید کے ساتھ مشکل ہے۔ آپ کا عمومی اندازہ ہے کہ جس شخص کو آپ نے گاڑی کرایے پر دی ہے وہ عموماً روزانہ سو میل چلاتا ہے۔ کسی دن ڈیڑھ سو چلائے گا کسی دن پچاس چلائے گا۔ کسی کسی دن کئی سو میل چلائے گا۔ اس لیے کہ اگر آپ چاہیں کہ پہلے سے یہ طے کر لیں کہ آپ کی گاڑی کرایہ پر لینے والا مثلاً دو سو میل روزانہ سے زیادہ نہیں چلائے گا تو یہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے اس کو لازمی قرار نہیں دیا۔

اجارہ کے نتیجے میں جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو مستاجر ہے جس نے چیز کرایے پر لی ہے وہ اس مقررہ مدت تک کے لیے اس منفعت کا مالک ہوگا جس کی خاطر اس نے وہ چیز کرایہ پر لی ہے۔ اور جو موجر ہے جو اصل مالک ہے وہ مقررہ اجرت کا حق دار ہوگا۔ مالک کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ چیز مستاجر کے حوالے کردے، اور اگر اس میں کوئی عیب پایا جاتا ہے یا اس پر کوئی تاوان ہے، تو وہ خود ہی اس کا ذمہ دار ہوگا اور اس کو ادا کرے گا۔ مستاجر کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس چیز کی حفاظت کرے، اجرت کو بروقت ادا کرے اور جب مدت اجارہ ختم ہو جائے تو جو چیز مستاجرہ ہے اس کو جوں کا توں واپس کردے۔ اس لیے کہ جب مدت ختم ہو جائے تو پھر اجارہ ختم ہو جاتا ہے۔

اجارہ کو دونوں فریقوں کی آپس کی رضامندی سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ چیز

ضائع ہو جائے تو بھی اجارہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ نے کسی کا گھوڑا کرایے پر لیا، آپ نے مثلاً ایک سال کے لیے یہ معاملہ کیا تھا، لیکن درمیان میں گھوڑا بیمار ہوا اور مر گیا۔ اب اجارہ آپ کا ختم ہو گیا۔ اب دونوں فریقوں کو اپنے اپنے حقوق کے لیے بعض قواعد کے مطابق معاملے کو طے کرنا پڑے گا۔

اسلام میں تجارت کے احکام فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ احکام آج کل کی بہت سی صورتوں کو حاوی نہیں ہیں اس لیے آج اسلامی تجارت کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ نئے انداز سے فقہی سرمایہ کی تدوین نو کی جائے۔ اسلام میں سرمایہ کاری کے جتنے طریقے رائج رہے ہیں ان کی آج کل کی زبان میں وضاحت کی جائے۔ یعنی معاملات سے متعلق فقہی سرمایے کی تدوین نو اور اصول سرمایہ کاری کی تبیین نو۔ یہ دونوں آج کل کے فوری تقاضے ہیں۔

یہ بات خوشی اور اطمینان کی ہے کہ اس دور کے فقہائے اسلام نے بڑے پیمانے پر یہ کام کیا ہے، اور بڑے پیمانے پر آج کل بھی ہو رہا ہے۔ ان میں سے ہر تجارت کے لیے، خاص طور پر اگر بڑے پیمانے پر اس کو کیا جائے تو دستاویزات اور معاہدات کی تیاری بھی ناگزیر ہے۔ یہ کام بینکاری کی حد تک تو بہت ہوا ہے اور بحرین میں جو ادارہ آیوفی کے نام سے کام کرتا ہے اس نے بہت سی دستاویزات اور معاہدات کے مسودے تیار کیے ہیں۔ جن کی ذریعے اسلامی بینکوں کا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔

لیکن تجارت کا بڑا حصہ وہ ہے یا خاصا بڑا حصہ وہ ہے جو بینکوں سے باہر انجام پا رہا ہے۔ ان کے لیے بھی مختلف انداز کی دستاویزات اور کاغذات کی تیاری ضروری ہے۔ اسلامی مالیاتی اور تجارتی اداروں کا قیام بھی تجارت کی لازمی ضرورت ہے۔ آج کل تجارت بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اس کی نئی نئی شکلیں اور صورتیں سامنے آنے لگی ہیں۔ ان نئی نئی صورتوں اور شکلوں کو منظم کرنے کے لیے نئے مالیاتی اور تجارتی اداروں کی ضرورت ہے۔ ان کا قیام مختلف مسلم ممالک میں ہونا چاہیے۔ اسلامی مالیاتی مارکیٹ کا قیام ناگزیر ہے۔ آج کل جو مالیاتی مارکیٹ، Money Market یا بازار زر ہے وہ پورا کا پورا یا اس کا بیشتر حصہ سودی کاروبار پر مبنی اور مشتمل ہے۔ اس کاروبار میں یا اس بازار میں اسلامی معیشت اور اسلامی تجارت کا پنپنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے

اسلامی مالیاتی بازار کی تشکیل ناگزیر ہے۔

پھر اسلامی مالیات وتجارت کے لیے محاسبین اور مالی محاسبہ کی تیاری بھی ناگزیر ہے۔ شریعہ آڈٹ اور تجارت کی نگرانی کا اسلامی بندوبست بھی ہونا چاہیے۔اسلامی اداروں کی درجہ بندی یعنی rating کا نظام بھی اب شروع ہونے لگا ہے۔ اور یہ بات خوشی کی ہے کہ اسلامی تجارتی اداروں کی درجہ بندی بھی اب شروع ہوگئی ہے۔اور امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا۔اور وہ تمام تقاضے پورے کرنے کے قابل ہو جائے گا جو آج دور جدید کے لحاظ سے ناگزیر ہیں۔

اسلام میں تجارت کے احکام پر گفتگو بہت مختصر بھی کی جاسکتی ہے اور بہت مفصل بھی کی جاسکتی ہے۔مفصل گفتگو اگر کی جائے تو وہ بہت طویل بھی ہوگی اور بہت پیچیدہ بھی ہوگی۔اس لیے کہ تجارت کے احکام کے بارے میں جتنی تفصیل سے فقہائے اسلام نے لکھا ہے وہ فقہ المعاملات کی ہزاروں کتابوں اور لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔جس جس زمانے میں فقہائے اسلام نے لکھا، اس زمانے کے اصول تجارت، اور اسالیب تجارت کو سامنے رکھ کر لکھا۔

اسالیب تجارت اور طرق تجارت ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔اس لیے قرآن کریم اور سنت میں طرق تجارت کی تفصیلات کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں ہے۔قرآن کریم نے چند اصولی ہدایات دینے پر اکتفا کیا ہے۔احادیث مبارکہ میں ان اصولوں کی مزید عملی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اور ان حدود کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے نتیجے میں کوئی تجارت جائز یا ناجائز قرار پائے گی۔ یہ وہ حدود ہیں جن کی اس گفتگو میں اختصار کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔ان حدود کے اندر جو بھی تجارت اختیار کی جائے گی اس کا نام جو بھی ہو وہ جائز اور شریعت کے مطابق ہوگی۔

کسی تجارت کے جائز اور مطابق شریعت ہونے کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سو فیصد ان فقہی طریقوں کے مطابق ہو جو فقہائے اسلام نے فقہ کی کتابوں میں لکھے ہیں۔فقہائے اسلام نے فقہ کی کتابوں میں جو طریقے لکھے ہیں یہ وہ ہیں جو ان کے زمانے میں جابجا رائج تھے۔فقہائے اسلام نے ان طریقوں کا جائزہ لیا۔ان میں جو چیز شریعت سے متعارض نہیں تھی اس کے تفصیلی احکام بیان کردے۔ جب تک ان جائز طریقوں کو شریعت کے احکام کے

مطابق برتا جاتا رہا وہ اسلامی طریقے سمجھے جاتے رہے۔ جب تجارت کے ان طریقوں کو اسلام کی تعلیم سے ہٹ کر برتا گیا تو وہ غیر اسلامی طریقے ہو گئے۔ اسی طرح آج کے تمام رائج الوقت طریقوں کو اگر اسلام کے احکام کے مطابق برتا جائے گا تو وہ جائز طریقے ہوں گے۔ اسلام کے احکام سے ہٹ کر ان پر عمل کیا جائے گا تو وہ ناجائز طریقے ہوں گے۔

اس لیے تجارت کے رائج الوقت طریقوں سے واقفیت بھی فقہائے اسلام کے لیے ضروری ہے۔ یہ واقفیت نہ صرف فقہائے اسلام کے لیے ضروری ہے بلکہ تجارت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ امام محمد بن حسن شیبانی جس زمانے میں معاملات کے احکام مرتب فرما رہے تھے تو وہ کچھ عرصہ روزانہ بازار جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اپنے مقررہ وقت کا ایک حصہ انھوں نے اس کام کے لیے رکھا تھا کہ بازار میں اپنے کسی دوست کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور بغور تجارت کے طریقے اور لین دین کے اسالیب کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ پتا چلائیں کہ بازار میں لین دین ہوتا کیسے ہے۔ تاکہ اس کے احکام مرتب کیے جائیں۔

اسی طرح آج کے اہل علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ آج کل رائج الوقت اسالیب تجارت کا جائزہ لیں اور اگر ان میں کوئی چیز شریعت سے متعارض نہیں ہے تو اس کے بارے میں وضاحت کر دیں کہ یہ جائز ہے۔ اور اگر کوئی چیز شریعت سے متعارض ہے تو یہ بتائیں کہ وہ کیوں متعارض ہے اور اس تعارض کو دور کیسے کیا جائے۔ اور اس رائج الوقت طریقے کو اسلام کے مطابق کیسے بنایا جائے۔ یہ دونوں کام انجام دینا اور اس ضرورت کی تکمیل کرنا آج کل کے علمائے کرام اور فقہاء کی ذمہ داری ہے۔ کسی تجارت کو ناجائز قرار دے کر بالکلیہ نظر انداز کر دینا اور عامتہ الناس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس سے مجتنب ہو جائیں گے۔ یہ قابل عمل رویہ نہیں ہے۔ یہ طرز عمل نہ صحابہ کرام کا تھا، نہ ائمہ مجتہدین کا تھا، اور نہ گزشتہ تیرہ سو چودہ سو سال کے دوران فقہائے اسلام کا یہ طرز عمل رہا ہے۔

یہی معاملہ بینکاری کے نظام کا ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے بات آئے گی۔ بینکاری کے نظام میں کچھ معاملات ہیں جو جائز ہیں، کچھ معاملات ہیں جو ناجائز ہیں۔ جو ناجائز ہیں وہ کس حد تک ناجائز ہیں اس کی نشاندہی ہونی چاہیے۔ جو پہلو ناجائز ہیں ان کو کیسے جائز بنایا جائے، یہ

وضاحت بھی درکار ہے۔ اس وضاحت اور ان احکام کی تدوین کے بعد بینکاری کے مقاصد کے لیے اور بینکاری کے میدان میں کیا جانے والا ہر وہ کام جو شریعت میں جائز ہو اور شریعت کی حدود کے مطابق انجام دیا جارہا ہو وہ اسلامی بینکاری کہلائے گا اور جائز کام ہوگا۔ یہی طرز عمل، تجارت، معیشت، کاروبار اور معاملات کے تمام شعبوں میں اختیار کیا جانا چاہیے۔

تجارت اور کاروبار کی اس بنیادی اہمیت کے پیش نظر ائمہ اسلام نے تجارت اور کاروبار کے مختلف پہلوؤں سے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ گفتگو جہاں فقہاء، مفسرین قرآن اور محدثین کرام نے کی ہے وہاں اس گفتگو سے اصحاب تربیت اور علمائے تزکیہ واحسان نے بھی دلچسپی لی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تجارت اور کاروبار سے وابستگی کسی انسان کی روحانی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہوسکتی اگر ان سرگرمیوں کو شریعت کی حدود کے مطابق انجام دیا جائے۔

امام غزالی جو اس معاملے میں ضرب المثل ہیں کہ ان کا رویہ بیشتر دنیاوی معاملات میں خاصا سخت گیر ہوتا ہے اور جو انتہائی اعلیٰ اخلاقی اور کڑا روحانی معیار انھوں نے اپنے لیے اختیار کیا تھا وہ توقع کرتے ہیں کہ ہر مسلمان اخلاقی بلندی اور مادیات سے بالاتری کے بارے میں اسی معیار پر فائز ہوگا۔ انھوں نے بھی جہاں تجارت اور کاروبار کے مشاغل کو روحانیات سے وابستہ قرار دیا ہے وہاں انھوں نے اعتدال کا راستہ یہ بتایا ہے کہ انسان اپنی پوری معاشی ذمہ داریوں کو بھرپور طریقہ سے انجام دے۔ اقتصادی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی اخروی ذمہ داریوں کو بھی فراموش نہ کرے۔ ایسا شخص ہی اعتدال کے راستہ پر قائم رہتا ہے اور ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جنھیں قرآن کریم نے مقتصدین کے نام سے یاد کیا ہے یعنی میانہ رویہ اختیار کرنے والے۔

امام غزالی نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ طلب رزق کے بارے میں لوگوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی سرگرمی اور دلچسپی کا پورا مرکز معاشی اور دنیاوی فوائد ہی کے حصول کو قرار دیا اور اخروی ذمہ داریوں کو بھول گئے۔ یہ تو ہلاک ہونے والوں میں سے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی توجہ کا اصل مرکز آخرت کو قرار دیا اور اپنی دینی ذمہ داریوں پر ہی توجہ دی، دنیاوی ذمہ داریاں یا تو ان سے فراموش ہوگئیں یا وہ ان پر اتنی توجہ نہیں دے سکے جتنی توجہ عام طور پر لوگ دیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کو امام غزالی فائزین کے نام سے یاد

کرتے ہیں۔ یہ کامیاب ہیں اس لیے کہ حقیقی کامیابی ان کو حاصل ہو گئی۔ جہاں تک دنیاوی معاملات کا تعلق ہے تو زندگی ان کی بھی کٹ گئی جیسے باقی لوگوں کی کٹ جاتی ہے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جو اپنی معاشی سرگرمیوں میں آخرت کو یاد رکھتے ہیں۔ معاشی سرگرمیوں سے جو فوائد اور نعمتیں حاصل ہوتی ہیں ان کو آخرت مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یوں دنیا اور آخرت دونوں کو ملا کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو مقتصدین میں سے ہیں اور راہ اعتدال پر فائز ہیں۔

جو شخص طلب معیشت میں سیدھے راستے کو اختیار نہیں کرتا اور راہ راست پر قائم نہیں رہتا۔ وہ میانہ روی کے درجے کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کے مال و دولت کو اخروی کامیابی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ اخروی مقاصد کے لیے مال و دولت کو استعمال کیا جائے اور مال و دولت کی طلب اور حصول سب کا سب مکمل طور پر شریعت کے مطابق ہو۔ مال کا حصول بھی شریعت کے مطابق ہو اور مال کا خرچ بھی شریعت کے احکام کے مطابق ہو۔ یعنی جہاں سے کمانے کی اجازت ہے وہاں سے کمایا جائے اور جہاں خرچ کرنے کی اجازت یا تلقین ہے وہاں خرچ کیا جائے۔

کسب مال کی اسی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے متعدد بار یہ ارشاد فرمایا اور آپ کا یہ ارشاد گرامی متعدد محدثین نے جن میں امام احمد، امام حاکم اور امام بزار شامل ہیں روایت کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ حلال رزق جو انسان حاصل کرتا ہے وہ ہے جو وہ اپنی ذاتی کمائی سے اور نیک اور دیانت دارانہ تجارت سے حاصل کرے۔ دیانت دارانہ تجارت سے جو کمائی حاصل ہوتی ہے وہ انتہائی بابرکت کمائی ہوتی ہے، جس کے اثرات انسان کی اخلاقی زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص دنیاوی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہا ہو، معاشی ذمہ داریاں پورے طور پر انجام دے رہا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اخروی ذمہ داریوں کو بھی پورے طور پر یاد رکھے ہوئے ہو وہ روحانی تربیت کے مقامات کو بہت جلدی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ان اخلاقی پاکیزگیوں سے جلدی بہرہ یاب ہو جاتا ہے جو شریعت کے پیش نظر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور تابعی فقیہ اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے استاد الاستاذ ابراہیم نخعی فرمایا کرتے تھے کہ سچا تاجر، دیانت دار مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس شخص کے جو سب کام

چھوڑ چھاڑ کر عبادت میں اپنی زندگی گزارے۔ اس لیے کہ جو شخص تجارت کرتا ہے، زندگی کی سرگرمیاں بھرپور طریقے سے انجام دے رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عبادت بھی کرتا ہے دینی ذمہ داریاں بھی انجام دیتا ہے وہ مسلسل جہاد کی کیفیت میں رہتا ہے۔ وہ جہاد جو اس کا اپنے نفس کے خلاف ہے، شیطان کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ ابراہیم نخعی نے کہا کہ شیطان طرح طرح سے اس تاجر کے سامنے آتا ہے، کبھی ناپ تول اور ترازو کے ذریعے آتا ہے۔ کبھی لین دین کے ذریعے سامنے آتا ہے اور اس کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیانت دار تاجر شب و روز شیطان کے ان حربوں کو ناکام بنانے میں مصروف رہتا ہے، اپنے کو ان سے دور رکھتا ہے، اپنے طرز عمل کو پاکیزہ رکھتا ہے۔ یوں اس کو تزکیہ حاصل ہوتا ہے اور تزکیہ کے نتیجے میں جو کھرا پن پیدا ہوتا ہے، جو ستھرا مزاج انسان کا بنتا ہے وہ اس شخص کا نہیں ہوسکتا جو سب کام چھوڑ کر مسجد کے گوشے میں یا خانقاہ کے گوشے میں بیٹھ گیا ہو۔

یہ اس لیے بھی ہے کہ رزق حلال کی طلب خود ایک فریضہ ہے۔ امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ "طلب الحلال فریضة علی کل مسلم"۔ کہ ہر مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ رزق حلال کی تلاش اور طلب کرے۔ رزق حلال کی طلب اور تلاش جب انسان کرتا ہے تو جہاں وہ ایک شرعی حکم پر عمل درآمد کر رہا ہوتا ہے، وہاں اپنی دنیوی اور مادی سرگرمیوں کو شریعت کے احکام کے مطابق انجام دے رہا ہوتا ہے اور بقول حضرت ابراہیم نخعی ان تمام منفی قوتوں سے بھی نبرد آزما رہتا ہے جو اس کو راہ راست سے ہٹانا چاہتی ہیں۔ کوئی حرام کھلانا چاہتا ہے، کوئی رشوت دینا چاہتا ہے کوئی ناپ تول میں کمی کروانا چاہتا ہے۔ کوئی ٹیکس میں گڑبڑ کرانا چاہتا ہے۔ اور اس شخص کو دن رات ان تمام منفی رجحانات سے بچنا پڑتا ہے۔ اپنے فوری مالی مفادات میں سے بعض کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ اس لیے اس مسلسل قربانی اور جدوجہد کے نتیجے میں جو تربیت ہوتی ہے وہ بہت ٹھوس اور پختہ ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ فریضہ بقول امام غزالی انتہائی مشکل فریضہ ہے اور انسان پر انتہائی بھاری گزرتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناجائز روزی مل رہی ہو، بیٹھے بٹھائے مادی مفاد حاصل ہو رہا ہو، بیٹھے بٹھائے خاموشی سے ناجائز مفادات حاصل ہو رہے ہوں اور انسان صرف اللہ کی رضا کی خاطر ان سے احتراز کرے، بلاشبہ یہ ایک بہت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس کو دین کا ایک بنیادی راز قرار دیا

ہے۔ بنیادی حکمت اس کو ٹھہرایا ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں ''سر دین : صدق مقال، اکل حلال''۔ زبان کی سچائی اور اکل حلال، ان دو چیزوں پر دین کی حکمت کا دارو مدار ہے۔ صدق مقال ہوگا تو اکل حلال بھی ہوگا۔ اکل حلال ہوگا تو اس کی برکت سے صدق مقال بھی حاصل ہوگا۔

بعض علماء نے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ **''کلوا من الطیبات و اعملوا صالحا''** ۔ یہاں عمل صالح سے پہلے **''کلوا من الطیبات''** کا ذکر ہے۔ یعنی پاکیزہ چیزوں کا حصول عمل صالح سے مقدم رکھا گیا ہے۔ اس لیے رزق حلال کی اہمیت بعض اعتبار سے ان اعمال صالحہ سے بڑھ کر ہے جن کا درجہ فرائض کا نہیں ہے۔ اس لیے کہ معاشی سرگرمی یا تجارتی سرگرمی فی نفسہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ امام بخاری نے حضرت انس ابن مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کوئی کھیتی بوتا ہے اور اس کا پھل یا دانہ کوئی انسان یا جانور یا پرندہ کوئی بھی کھائے تو وہ اس کے حق میں صدقہ شمار ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ جانوروں اور پرندوں کی فلاح و بہبود کا کام بھی اللہ کی نظر میں صدقہ ہے۔ لہٰذا جانوروں کو بھوک اور پیاس سے بچانا، گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے لیے ان کا بندوبست کرنا، یہ بھی صدقے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مفہوم کی ایک دو احادیث اور بھی ہیں جن کو مختلف محدثین نے نقل کیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر معاشی سرگرمی، ہر پیداواری سرگرمی شریعت کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ مشہور محدث حضرت ابو قلابہ جو علم حدیث کی تاریخ کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں، جن کی سند سے بہت سے ائمہ حدیث کو بہت سی روایات ملی ہیں۔ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر تلاوت اور عبادت کیا کرتا تھا، انھوں نے اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟ تمھارا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ذریعہ آمدنی کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ ہدیہ دیتے ہیں وہ استعمال کرتا ہوں اور اپنا وقت عبادت میں صرف کرتا ہوں۔ ابو قلابہ نے کہا کہ **''لان اراك تطلب معاشك احب الی من ان اراك فی زاویة المسجد''** ۔ میں تمھیں معاشی زندگی اور رزق حلال کے حصول میں سرگرم دیکھوں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں تمھیں مسجد کے گوشے میں بیٹھے دیکھوں۔ اس لیے کہ عبادت کا اپنا وقت ہے، معاشی سرگرمی کا اپنا وقت ہے۔ دونوں کی ذمہ داریاں اپنی اپنی جگہ ہیں۔ ایک کو دوسرے کے لیے قربان کرنا یہ

شریعت کے توازان اور اعتدال کے خلاف ہے۔

معاشی سرگرمیوں سے دلچسپی پیدا کرنا اور نوجوانوں کو اس طرف مائل کرنا ائمہ اسلام میں سے بہت سے حضرات کا کام رہا ہے۔ حضرت حسن بصری، جو مشہور تابعی ہیں اور مشہور محدثین اور اصحاب تزکیہ میں سے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بازار اللّٰہ تعالیٰ کے دستر خوان ہیں، جو اس دسترخوان پر آئے گا اس کو اپنا حصہ ملے گا۔ لہٰذا بازار میں جائے بغیر نہ تجارت ہوسکتی ہے، نہ کاروبار ہوسکتا ہے۔ جب بازار میں جاؤ تو یہ سمجھ کر جاؤ کہ اللّٰہ تعالیٰ کا دسترخوان ہے، یہاں جا کر محنت کروں گا تو مجھے رزق ملے گا جو اللّٰہ کی طرف سے میرے لیے نعمت ہوگی۔

لیکن بازار جانے سے پہلے ضروری ہے کہ تاجر کو تجارت کے ضروری احکام کا علم ہو۔ علم ہر چیز کے لیے ناگزیر ہے۔ شریعت میں اجمالی احکام جاننا فرض عین ہے۔ ہر شخص کی یہ ذاتی ذمہ داری ہے کہ جس سرگرمی سے اس کا تعلق ہو اس کے بارے میں شریعت کے احکام معلوم کرے۔ عام زندگی سے متعلق حلال وحرام کے احکام جاننا بھی فرض عین ہے۔ جس شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ پاک پانی کون سا ہوتا ہے اور ناپاک پانی کون سا ہوتا ہے تو وہ نماز کے لیے وضو کیسے کرے گا۔ وضو نہیں کرے گا تو نماز کیسے ادا کرے گا۔ اسی طرح جو شخص جائز روزی کے حصول کے لیے بازار جانا چاہتا ہے اور بازار کو اللّٰہ کا دسترخوان سمجھ کر جارہا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے احکام کا علم رکھتا ہو۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ تاجر کے لیے چھ قسم کے معاملات کا علم ناگزیر ہے۔ ایک تاجر کو ان چھ معاملات کا علم ضروری حاصل کرنا چاہیے۔

۱۔ خرید وفروخت

۲۔ سود اور ربا

۳۔ بیع سلم

۴۔ اجارہ

۵۔ مشارکہ

۶۔ مضاربہ

اس لیے کہ تجارت اور کاروبار کی بڑی بڑی قسمیں یہی ہیں اور ان میں جو خرابی پیدا

ہوتی ہے۔ وہ عموماً سود کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ربا کی بعض صورتیں اتنی باریک اور مخفی ہیں کہ بعض اوقات اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کاروبار میں ربا داخل ہوگیا ہے۔ اس لیے ربا کے احکام تاجروں کے لیے جاننا ناگزیر ہے۔

بیع کے معاملات فقہائے اسلام نے بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ یہ بھی بتایا ہے کہ بیع یا خرید وفروخت اور بیع وشراء کون لوگ کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں شریعت اور ملکی قوانین متفق ہیں کہ بیع وشراء کے لیے متعلقہ فریق کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے۔ بعض مستثنیات ہیں جن سے قانون بھی اتفاق کرتا ہے، شریعت بھی اتفاق کرتی ہے، جہاں چھوٹا بچہ بھی خرید وفروخت کر سکتا ہے۔ جن معاملات کی بنیاد پر کاروبار ہونا چاہیے، تجارت جس مال کی ہونی چاہیے اس کی تفصیل تھوڑی سی بیان کی جا چکی ہے۔ ایک بار اختصار کے ساتھ پھر دہرا دیتا ہوں کہ وہ کوئی ناپاک چیز نہ ہو، مال متقوم ہو، یعنی شریعت اس کو مال تسلیم کرتی ہو۔ جس شخص کی طرف سے بیچا جا رہا ہے وہ چیز مکمل طور پر اس کی ملکیت میں ہو۔ جو شخص کوئی چیز بیچ رہا ہے وہ اس چیز کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر ہو۔ جو چیز وہ فروخت کر رہا ہے اس وقت اگر موجود نہیں ہے تو اس کو اتنی قدرت ہونی چاہیے اور وہ چیز ایسی ہونی چاہیے کہ بروقت حاصل کر کے خریدار کو فراہم کی جا سکے۔ اگر کسی شخص نے کوئی چیز خریدی ہے تو جب تک اس کے قبضے میں نہ آ جائے اس وقت تک وہ آگے فروخت نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ "نهى رسول الله ﷺ من بيع مالم يقبض" جو چیز ابھی تک خریدار کے قبضے میں نہیں آئی۔ حقیقی قبضے میں آئی ہو یا نظری اعتبار سے قبضے میں آ گئی ہو۔ اس کی فروخت قبضے سے پہلے جائز نہیں ہے۔ جو چیز بیچی جا رہی ہے اور آئندہ کسی تاریخ کو ادا کی جائے گی، اس کی مقدار، اس کے اوصاف، اس کی نوعیت، وہ چیز مکمل اور واضح طور پر معلوم ہونی چاہیے۔

امام غزالی نے ایک بات بہت دلچسپ لکھی ہے۔ آج کل کے لحاظ سے اس کی تشریح کی جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔ انھوں نے لکھا کہ تاجروں کو زر کے معاملات کا علم ہونا چاہیے۔ "يجب على التاجر تعلم النقد"۔ نقد کا علم یا زر کا علم تاجر کو ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے مراد کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مراد ہر دور کے لحاظ سے مختلف معاملات ہو سکتے ہیں۔ آج کل کے تاجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کاغذی کرنسی کی تفصیلات کا علم رکھتا ہو۔ دستاویزات

قابل بیع وشراء سے واقفیت رکھتا ہو۔ کرنسی کے لین دین کے احکام کو جانتا ہو۔ حقیقی اور جعلی کرنسی کا فرق سمجھتا ہو۔ حکومت کے جو قوانین کرنسی کے لین دین کے لیے مقرر ہیں ان سے واقف ہو۔ یہ سب معاملات نقد کے علم میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ جن مقاصد اور احکام کے لیے امام غزالی نے تعلم نقد کی شرط رکھی۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آج کا تاجر کرنسی سے متعلق ان تمام معاملات سے اچھی طرح سے واقف ہو۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ ضرر کی ممانعت آئی ہے۔ ظلم کی ممانعت آئی ہے۔ ضرر سے مراد ہر وہ نقصان ہے جو کسی شخص کو دوسرے کے طرز عمل سے پہنچے اور اس کا حق متاثر ہو۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ ضرر سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث میں ضرر کی ممانعت آئی ہے اور یہ مشہور حدیث تو اب قاعدہ فقہیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ "لا ضـــرر ولا ضـــرار"۔ نہ تم کسی کو ضرر پہنچاؤ، نہ بدلے میں کوئی تمھیں ضرر پہنچائے۔ ضرر کا بڑا دخل معاملات میں ہوتا ہے۔ اگر تاجر شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرے یا جہاں جہاں شریعت کے احکام کی پابندی نہ ہو رہی ہو وہاں دوسرے فریق کو ضرر پہنچنے کے غالب امکانات پیدا ہو جائیں گے اور جب اس کو ضرر پہنچے گا تو آپ اس کے ساتھ ظلم کر رہے ہوں گے۔ اس لیے کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے دوسرے فریق کو ضرر یا نقصان پہنچنے کا امکان پیدا ہوتا ہو، اس لیے کہ جب بھی کسی کو ضرر پہنچے گا تو وہ ظلم سمجھا جائے گا اور آپ ظلم کے مرتکب قرار پائیں گے۔ ضرر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ کسی خریدار کو کوئی ایسا سودا فروخت کر دیں جو اس کی توقع کے مطابق نہ ہو۔ لیکن آپ اسے یہ باور کرا دیں کہ یہ اس کی توقع کے مطابق ہے۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ ارتکاب ضرر اور اس کے نتیجہ میں ارتکاب ظلم سے بچنے کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ضروری ہے کہ کوئی بیچنے والا اپنے سودے کی کوئی ایسی تعریف نہ کرے جو اس میں نہیں پائی جاتی۔ آج کل اشتہار بازی ایک فن بن گیا ہے۔ اشتہار ساز کمپنیاں تو جس چیز کو چاہیں آسمان پر پہنچا دیں اور جس کو چاہیں زمین پر گرا دیں۔ دوسری بات امام غزالی نے یہ لکھی ہے کہ بائع کی ذمہ داری ہے کہ اپنی چیز کا کوئی عیب پوشیدہ نہ رکھے۔ اور اگر کوئی اس میں ایسی کمزوری یا خامی ہے جو واضح طور پر نظر نہیں آتی تو اس کا بتا دینا اور ظاہر کر دینا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ دھوکے کے مترادف ہوگا۔ تیسری بات یہ کہ اس کا اصل وزن، اصل

مقدار اور اصل مالیت چھپائی نہ جائے۔ چوتھی بات یہ کہ بازار میں جو بھاؤ ہے، جو رائج الوقت ہے اس کو خریدار سے نہ چھپایا جائے۔ یہ تمام باتیں صحیح صحیح خریدار کو بتا دی جائیں اور اس پر کوئی ایسا دباؤ نہ ڈالا جائے جس کی وجہ سے وہ کوئی ایسی چیز خریدنے پر آمادہ ہو جائے جو وہ خریدنا نہیں چاہتا یا اگر دباؤ نہ ڈالتے تو وہ نہ خریدتا تو ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں تاجروں کے قسم کھانے کو برا سمجھا گیا ہے۔ چیز بیچنے والا اپنی چیز فروخت کرنے کے لیے بار بار قسمیں کھائے تو یہ بہت نامناسب بات ہے۔ دو چار کوڑی کی آمدنی کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاک اور بابرکت نام کو بیچ میں لانا یہ مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ ناپسندیدگی اس وقت ہے جب قسم سچی ہو۔ اور اگر جھوٹی ہو تو ویسے ہی بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کے نتیجے میں برکت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ سودا تو شاید بک جائے۔ لیکن برکت جاتی رہتی ہے۔ پھر یہ دھوکا بھی ہے۔ جہاں یہ جھوٹی قسم ہے وہاں دھوکہ بھی ہے۔

شریعت میں دھوکے کی شدید ممانعت آئی ہے۔ امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہ نے اور دوسرے بہت سے حضرات نے یہ بات تفصیل سے لکھی ہے کہ دھوکے میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے سودے کے تمام عیب یا کمزوریاں ظاہر نہیں کرتا، اس میں سے کچھ چھپاتا ہے اور کچھ ظاہر کر دیتا ہے، تو یہ بھی ایک طرح کا دھوکا ہے۔ بلکہ ظلم بھی ہے اور مسلمان کی جو ذمہ داری دوسرے مسلمان کے بارے میں ہے خیر خواہی کی اس سے احتراز بھی ہے۔

اگر ایک شخص جان بوجھ کر اندھیرے میں مال دکھاتا ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے خریدار کو پورے طور پر مال نظر نہ آئے۔ مثلاً قربانی کا موقعہ ہے، جانور فروخت کے لیے لائے گئے ہیں، ایسے میں خریدار کو اندھیرے میں لے جا کر لنگڑا جانور دکھا دیا، بیمار جانور دکھا دیا۔ پرانی گاڑی تھی اندھیرے میں جا کر دکھائی، پتہ نہیں چلا کہ اس میں کیا کیا خرابیاں تھیں یا بہت سی چیزیں تھیں جن کا یکجا سودا ہونا تھا، ان میں سے اچھے اجزا دکھا دیے، برے اجزاء نہ دکھائے۔ مشتری نے سمجھا کہ سارے اجزاء ایسے ہی اچھے ہوں گے۔ یہ سب دھوکے کی مختلف قسمیں ہیں جس سے کاروبار اور تجارت ناجائز ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر کاروبار اور تجارت سچ اور نیکی کی بنیاد پر ہو تو وہاں اللہ تعالیٰ کی برکت نازل ہوتی ہے۔ شیخین یعنی امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے

کہ جب دو کاروبار کرنے والے سچ بولتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں تو ان کے اس معاملے میں برکت نازل ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کوئی چیز چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کے اس کاروبار سے برکت چھین لی جاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں جو ہمارے پاکستان کے حضرت امام ابوداؤد نے روایت کی ہے (حضرت امام ابوداؤد کا تعلق ہمارے صوبہ بلوچستان سے تھا) حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک دونوں کاروباری شریک ایک دوسرے کے ساتھ دھوکہ نہیں کرتے، خیانت نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کا دست کرم اور دست شفقت ان کے اوپر رہتا ہے۔ اور جونہی وہ خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ اپنا دست کرم ان کے اوپر سے ہٹا لیتا ہے۔

خیانت میں جو جو چیزیں شامل ہیں ان میں سب سے نمایاں ناپ تول میں کمی بیشی کا معاملہ ہے۔ ناپ تول میں کمی بیشی قرآن کریم کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے۔ قرآن کریم نے ان تاجروں کو ہلاکت کی دھمکی دی ہے جن کے لینے کے پیمانے اور ہوتے ہیں، دینے کے پیمانے اور ہوتے ہیں۔ پیمانہ یکساں ہو، ناپ تول میں مکمل طور پر حق اور انصاف سے کام لیا جائے بلکہ تھوڑا سا جھکتا ہوا تول کر دیجیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت ہوتی ہے۔ جو شخص قیمت لگا رہا ہے اگر وہ حقیقی خریدار ہے اور نیک نیتی سے قیمت لگا رہا ہے تو درست ہے۔ ورنہ اگر وہ اس لیے قیمت لگا رہا ہے کہ دوسرا خریدار حوصلہ ہار جائے یا اصل قیمت پر خریدنے سے باز رہے تو یہ شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، اور بعد کے ادوار میں ایسے سینکڑوں اور ہزاروں واقعات دیندار تاجروں کے موجود ہیں جنھوں نے معمولی سی بے احتیاطی کے خطرے کی وجہ سے اپنے پورے پورے کاروبار صدقہ کر دیے اور ذرہ برابر شک اپنے کسی کاروبار میں قبول نہیں کیا۔

جہاں شریعت نے یہ ہدایات دی ہیں وہاں اس سے بھی روکا ہے کہ لین دین کرنے والے اپنے ذرا ذرا سے حق کے لیے آپس میں الجھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تلخ کلامی اور بدمزگی کا رویہ اختیار کریں، یہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ ایک مشہور حدیث میں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کتابوں میں آئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "خیرکم احسنکم قضاء" ۔ تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے ذمے واجبات کو بہترین طریقے سے ادا کرتا ہے۔ بروقت ادا کرتا ہے، مکمل ادا کرتا ہے، اخلاق اور کردار کے ساتھ ادا کرتا ہے، وہ بہترین شخص ہے۔ ایک اور

جگہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو خرید وفروخت میں بھی آسانی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور بیچنے میں بھی آسانی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ نہ کوئی چیز بیچتے وقت جھک جھک کرتا ہے، نہ خریدتے وقت بک بک کا رویہ اپناتا ہے۔ اس کے برعکس نرمی اور آسانی اس کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔

نرمی اور آسانی کا رویہ اختیار کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں سہولت پسند ہونا، یہ اللہ کو پسند ہے۔ اگر کسی شخص سے غلطی سے کوئی ایسا لین دین ہو گیا جو اس کے مفاد یا مصلحت کے خلاف تھا اور بعد میں وہ اس پر پچھتاتا ہے اور اس کو ختم کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ تم اس کو ختم کرنے میں مدد دو۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کے معاملے کو ختم کرنے میں مدد دے جو اپنے معاملے پر پچھتا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کی بہت سی غلطیاں ختم فرما دیں گے۔ بہت سے ایسے جرائم اور معاملات میں جہاں اس سے غلطی کا ارتکاب ہوا تھا اور وہاں اس سے باز پرس ہونی چاہیے تھی، اس نیکی کے عوض میں اللہ تعالیٰ اس سے باز پرس ختم کر دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے یہ لکھا تھا کہ تجارت انسانوں کی کسوٹی ہے۔ انسان کے تدین، تقویٰ اور پرہیزگاری کا امتحان لین دین اور تجارت میں ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص پوری زندگی تدین کا رویہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔ نمازیں، روزے، عبادات اور تمام مذہبی سرگرمیوں کی پوری پابندی کرتا ہے۔ یہ سب کام اس کے ٹھیک رہتے ہیں۔ لیکن اس کو کبھی بھی کسی سے لین دین کا اتفاق نہیں ہوتا۔ جب لین دین کا اتفاق پہلی مرتبہ ہو جائے تو پتا چلتا ہے کہ کتنا زر پرست انسان ہے۔ ذرا ذرا سی چیز پر کس حد تک لڑنے جھگڑنے کے تیار ہے۔ معمولی معمولی بات پر سب وشتم پر اتر آتا ہے۔ یوں تقویٰ کا سارا ملمع منٹوں میں اتر جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقی تقویٰ کا اصل مظاہرہ کاروبار اور لین دین میں ہی ہوتا ہے، جہاں مال وزر کا معاملہ ہو۔ کسی شاعر نے کہا تھا

اگر جاں طلبی مضایقہ نیست
اگر زر طلبی سخن درین است

جان کی قربانی چاہتے ہو تو تیار ہوں، مضایقہ نہیں ہے۔ لیکن اگر مال چاہتے تو پھر سوچنا

پڑے گا، یہ ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مال وزر کی محبت میں انسان چونکہ بہت شدید ہے اس کے لیے اصل امتحان اس کی دین داری اور تقویٰ کا وہاں ہوتا ہے جہاں مال و دولت ہاتھ سے جا رہا ہو۔ مال و دولت بھی ہاتھ سے نہ جائے، تدین بھی برقرار رہے، تقویٰ بھی حاصل ہو اور دینوی مال و دولت بھی حاصل ہو، اس لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان کی نیت اور عقیدہ پاکیزہ ہو۔ نیت بھی صاف ہو اور عقیدہ بھی صاف ہو۔

انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ پیشہ اختیار کرے جس کا تعلق فرائض کفایہ سے ہو۔ تاکہ وہ امت کی طرف سے فرض کفایہ کو انجام دینے کا شرف بھی حاصل کر سکے۔ جب بازار دنیا میں بیٹھے تو تجارت آخرت سے غافل نہ ہو۔ بازار دنیا کو تجارت آخرت کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھ کر بیٹھے۔ جب تجارت کی سرگرمی میں ہو تو دینی ذمہ داریوں سے غافل نہ رہے۔ "رجل لاتلهيهم تجارة و لا بيع عن ذكر الله و اقام الصلاة"۔ یہ وہ مردان حق ہیں جن کو کوئی تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر اور اقامت نماز سے غافل نہیں کرتی۔

ایک تقویٰ شعار تاجر کے لیے صرف حرام معاملات سے اجتناب پر اکتفا کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ایک متقی تاجر کو شبہات سے بھی بچنا چاہیے۔ جو معاملات واضح طور پر حرام ہیں ان سے تو بچنا ہی چاہیے۔ لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں شبہ ہو انسان کو اس سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔

معاملات اور تجارت میں زیادہ حرص اور لالچ کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ لالچ اور حرص کا رویہ اگر ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور اس طرح بڑھتا ہے کہ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس میں لالچ پیدا ہو گیا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ اس لیے پہلے ہی قدم پر حرص اور لالچ کے جذبات کو ختم کر دینا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ہر تجارت کرنے والے کو اپنے گاہکوں سے یا اپنی متعلقہ پارٹیوں سے یا فریقوں سے معاملہ خوب کھول کھول کر صاف کرنا چاہیے۔ معاملات کی صفائی شریعت کے بنیادی احکام میں سے ہے۔ روز قیامت ہر معاملے کا الگ الگ حساب دینا ہوگا۔ اس لیے وہاں کے حساب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ یہیں معاملات صاف کر لیے جائیں اور ہر شخص کا دل پہلے ہی صاف ہو۔

تجارت اور معیشت کی اہمیت شریعت کی نظر میں کئی پہلوؤں سے ہے۔ ایک جگہ امام

غزالی نے لکھا ہے کہ اگر صنعت اور تجارت کو لوگ چھوڑ دیں تو لوگوں کی روزی تباہ ہو جائے گی اور اللہ کی مخلوقات کا بیشتر حصہ ہلاک ہو جائے گا۔ ان تمام معاملات کا دار و مدار انسانوں کے آپس کے تعاون اور آپس کی کفالت پر ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کی ضروریات کا بندوبست کر رہا ہو گا تو پھر معاملات درست رہیں گے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے یا ریاست کے مختلف طبقے، مختلف پیشے اور مختلف صنعتیں الگ الگ اختیار کریں۔ اگر سب لوگ کسی ایک صنعت کو اپنا لیں گے تو باقی صنعتیں تباہ ہو جائیں گی۔ اور سب لوگ تباہی اور بربادی کا نشانہ بنیں گے۔ اگر سب لوگ کوئی ایک پیشہ اپنا لیں گے اور باقی پیشے چھوڑ دیں تو معاملات گڑبڑ ہو جائیں گے۔ اس لیے ان تمام صنعتوں کو اور ان تمام کاروباروں اور پیشوں کو اختیار کرنا چاہیے جن کی معاشرے کو ضرورت ہے اور جن پر انسانی معاشرے کا، انسانی ترقی کا دار و مدار ہے۔

انسانی ترقی کا دار و مدار یا انسان کی بقا کا دار و مدار جن معاملات پر ہے ان میں مشہور مالکی فقیہ اور مفسر قرآن علامہ ابن العربی کے بقول عقد نکاح اور عقد بیع دو بنیادی اہمیت رکھنے والے معاملات ہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ کہتے ہیں "**یتعلق بھما قوام العالم**"۔ دنیا کی پوری زندگی کی بقا ان دونوں پر موقوف ہے۔ عقد بیع غذا اور ضروریات زندگی کے لیے ضروری ہے اور عقد نکاح تسلسل نوعی کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے شریعت نے ان دونوں کے بہت تفصیلی احکام بتائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے فقہ العبادات اور فقہ المناکحات یعنی احوال شخصیہ کے احکام و مسائل کے بعد سب سے اہم درجہ فقہ المعاملات کا قرار دیا ہے۔ معاملات ہی کی بنیاد پر تمام تجارتیں، تمام لین دین، تمام معاشی سرگرمیاں اور انسان کی پوری اقتصادی زندگی کا دار و مدار ہے۔

اس پوری زندگی کے احکام فقہائے اسلام نے اسلامی فقہ کے جس باب اور جس شعبے میں مرتب کیے ہیں وہ فقہ المعاملات کہلاتا ہے۔ اس لیے عبادات اور مناکحات کے بعد فقہ اسلامی کا انتہائی اہم اور ناگزیر حصہ فقہ المعاملات کا ہے۔ فقہ المعاملات میں محض کاروبار اور تجارت ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک روحانی پہلو بھی ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی جو فقہ حنفی کے مدون اوّل ہیں، ان سے کسی نے کہا کہ آپ نے زہد پر کوئی

کتاب نہیں لکھی ۔اس زمانے میں،یعنی دوسری تیسری صدی ہجری میں محدثین کرام زہد اور رقاق کے موضوعات پر کثرت سے کتابیں تصنیف فرمایا کرتے تھے ۔یعنی ان احادیث کے مجموعے یا ان ہدایات کے مجموعے جو انسان کے دل میں دنیا سے استغناء پیدا کریں، للٰہیت پیدا کریں، دل میں نرمی پیدا کریں اور اللہ سے تعلق کو مضبوط بنائیں۔امام محمد سے پوچھا گیا کہ آپ نے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ امام محمد نے جواب دیا: میں نے کتاب البیوع لکھ دی ہے۔یعنی جب کتاب البیوع میں بیان کردہ حلال وحرام کے احکام پر انسان مسلسل عمل کرے گا تو لازماً تدین پیدا ہوگا۔جب تدین پیدا ہوگا تو حلال وحرام کی تمیز پیدا ہوگی، جہاں حرام سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوگا وہاں مشتبہات سے اجتناب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔اس لیے زہد خود بخود پیدا ہو جائے گا۔اور اگر کوئی شخص احکام حلال وحرام کی خلاف ورزی کرے گا، تو اس کے زہد و استغناء کے سارے دعوے رکھے رہ جائیں گے۔اس لیے اکل حلال کا گہرا تعلق صدق مقال سے ہے۔اور صدق مقال اور اکل حلال دونوں کا گہرا تعلق زہد واستغناء سے ہے۔

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ تجارت اور کاروبار کے معاملات جو بظاہر خالص مادی اور دنیاوی ہیں وہ دراصل محض مادی اور دنیاوی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے اندر ایک گہرا روحانی اور اخلاقی پہلو بھی رکھتے ہیں۔بشرطیکہ ان کو شریعت کے احکام کے مطابق انجام دیا جائے۔

ساتواں خطبہ

حرمت ربا اور اس کی حکمت

ساتواں خطبہ

حرمت ربا اور اس کی حکمت

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلي على رسوله الكريم و علىٰ اله و اصحابه اجمعين

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''حرمت ربا اور اس کی حکمت''۔ قرآن مجید، حدیث شریف اور فقہ اسلامی کا ہر طالب علم اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ شریعت نے ربا کو واضح اور قطعی طور حرام قرار دیا ہے اور نہ صرف حرام قرار دیا ہے بلکہ اس کی حرمت اور اس کی برائی کو اتنے واضح، دو ٹوک اور صریح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ صراحت اور شدت کم معاملات میں نظر آتی ہے۔ ربا وہ واحد جرم ہے جس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے سودخوروں اور ربا کا کاروبار کرنے والوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یا اس کے رسول ﷺ نے سود خوری کے علاوہ کسی اور جرم کے مرتکبین کے خلاف اعلان جنگ نہیں فرمایا۔ حتیٰ کہ قتل انسانی یا دوسری اخلاقی برائیاں جو شریعت کی نظر میں انتہائی مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ ان کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف بھی اعلان جنگ نہیں فرمایا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت کے محرمات میں ربا کی حرمت کا درجہ کیا ہے اور ربا اور سودی معاملات سے بچنے کی شریعت میں کیا اہمیت ہے۔

اردو زبان میں ربا کا ترجمہ سود کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ربا اور سود میں لغوی اعتبار سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہے۔ عربی زبان میں ربا کے معنی ہیں زیادتی یا بڑھوتری۔ جب کسی چیز میں کوئی زیادتی ہو، اضافہ ہو یا وہ پہلے سے بڑھ جائے تو اس کے لیے عربی زبان میں

ربا کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ربا الشیئ یربو اذا زادو علا۔ جب کوئی چیز زیادہ ہو جائے اور بڑھ جائے تو اس کے لیے ربا، یربو کا فعل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ربا کا لفظ اپنے لغوی معنی میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے، ''ویربی الصدقات''۔ اللہ تعالیٰ صدقات میں اضافہ فرماتا ہے۔ اگر انسان صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے اجر وثواب میں مسلسل اضافہ فرماتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں ربوہ کا لفظ بھی آیا ہے جو کسی بلند قطعۂ زمین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''واوینا ھما الی ربوۃ ذات قرار و معین''۔ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک ایسی بلند زمین پر ٹھکانہ عطا فرمایا جہاں ٹھنڈا پانی بھی تھا اور ان کے لیے جائے رہائش بھی تھی۔ ایک اور جگہ قرآن کریم میں آیا ہے ''اھتزت و ربت'' جب کھیتی پوری طرح سے کھلکھلانے لگتی ہے اور بڑھ جاتی ہے۔ اس منظر کو بیان کرنے کے لیے قرآن کریم نے یہ دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ایک اور جگہ ہے ''فأخذھم اخذہ رابیة''۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی گرفت کی اس طرح کی کہ اس سے بڑھ کر گرفت نہیں ہو سکتی۔ یعنی بڑی مضبوط گرفت۔ رابیہ عربی زبان میں بلند سرزمین کو بھی کہا جاتا ہے۔ ربوہ اور رابیہ کے معنی گویا ایک ہی ہیں۔

ان لغوی استعمالات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ربا کے لفظی مفہوم میں اضافہ، زیادتی اور بڑھوتری کا مفہوم شامل ہے۔ ایک حدیث میں بھی ایک صحابی ربا کا لفظ زیادتی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں ایک جگہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر کھانے میں برکت کی دعا فرمائی۔ صحابہ کرام جو یہ روایت کرتے ہیں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس دعا کی برکت اتنی غیر معمولی تھی کہ جب ہم کوئی لقمہ اٹھاتے تھے تو لگتا تھا کہ وہ بڑھ رہا ہے۔ نیچے سے اس لقمے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں بھی ربا کا لفظ اضافے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''فو اللّٰہ ما اخذنا من لقمه اِلا ربا من تحتھا''۔

ربا کے ان لغوی معانی کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں ربا ایک معاشی اصطلاح کے طور پر بھی زمانہ جاہلیت ہی سے استعمال ہوتا تھا۔ معاملات اور بیع وشراء سے متعلق احادیث میں ربا کا لفظ انہی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہ لفظ اسی اصطلاحی مفہوم میں قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں بھی کئی بار استعمال ہوا ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال میں ربا کا لفظ اصطلاحی معنی میں بار بار آیا ہے۔

ربا کی تعریف فقہائے کرام نے کیا کی ہے۔ اس کی طرف میں بھی آتا ہوں۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام سے پہلے سودی کاروبار پورے عرب میں رائج تھا۔ عرب کے تاجر ربا کی حقیقت سے پوری طور پر واقف تھے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ ابہام نہیں تھا کہ ربا کس کو کہتے ہیں اور کس کو نہیں کہتے۔ اس لیے جب قرآن مجید نے ربا کی حرمت کا حکم نازل فرمایا تو قرآن کریم کے ہر قاری اور سامع نے یہ سمجھ لیا کہ کس چیز کو حرام قرار دیا جارہا ہے۔ قرآن پاک کے ابتدائی سامعین میں سے کسی کے ذہن میں بالکل یہ ابہام نہیں تھا کہ ربا سے کیا مراد ہے، نہ ان کو اس کی ضرورت تھی کہ ان کے لیے ربا کی کوئی فنی انداز کی تعریف کی جائے۔

فقہائے کرام نے ربا کی جو تعریفیں کی ہیں وہ درسی ضروریات کے لیے کی ہیں۔ یہ تعریفیں اس لیے نہیں کیں کہ اگر وہ ربا کی یہ تعریف نہیں کرتے تو ربا کی حرمت واضح نہ ہوتی۔ ربا کی حقیقت تو پہلے سے واضح تھی اور نہ صرف ربا کی حقیقت واضح تھی بلکہ قرآن کریم اور احادیث اور شریعت کی تمام اصطلاحات اچھی طرح سے واضح تھیں اور متعین معانی و مفاہیم کی حامل تھیں۔ فقہائے کرام نے ان سب اصطلاحات کی تعریفیں درسی ضروریات کے لیے، تحقیقی اور تصنیفی ضروریات کے لیے کرنا مناسب سمجھا۔ ان تعریفات سے یہ سمجھنا کہ ربا یا کوئی اور اصطلاح پہلے سے واضح یا متعین نہیں تھی۔ فقہائے کرام کے متعین کرنے سے متعین ہوئی، یہ انتہائی غلط فہمی اور نا سمجھی کی بات ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کریم میں نماز کی کوئی تعریف نہیں ہے۔ لیکن اقامت صلاۃ کا حکم بار بار دیا گیا ہے۔ لیکن صلاۃ کی اس طرح کی درسی یا فنی انداز کی تعریف قرآن پاک یا حدیث نبوی میں کہیں موجود نہیں ہے جو فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں زکوٰۃ کا حکم ہے، حج کا حکم ہے، جہاد کا حکم ہے۔ ان میں سے کسی اصطلاح کی اس انداز کی تعریف نہیں کی گئی جس انداز کی تعریف فقہائے کرام کے اسلوب کے مطابق کی جاتی ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب اور انداز یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کے لیے عموماً وہ اصطلاح استعمال کرتا ہے جو پہلے سے عرب میں مروج ہو۔ جیسے حج کی اصطلاح مروج تھی۔ قرآن کریم نے حج کی اصطلاح استعمال کی۔ عمرے کی اصطلاح استعمال کی۔ ان اصطلاحات سے عرب کے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے واقف تھے۔

جہاں قرآن کریم کوئی نئی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہاں اپنے خاص اسلوب میں اس کی تشریح بھی کرتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی اصطلاح نئی ہے۔ صلاۃ کی اصطلاح عربی زبان کے اس خاص مفہوم میں نئی ہے۔ ان نئی قرآنی اصطلاحات کی تشریح کا طریقہ قرآن کریم میں یہ نہیں ہے کہ پہلے اس اصطلاح کی فنی انداز میں تعریف بیان کرے۔ جس طرح قانونی اصطلاحات کی فنی تعریفیں قانون کے شروع میں دی جاتی ہیں اس طرح تعریفات دی جائیں۔ یہ قرآن کریم کا اسلوب نہیں ہے۔ قرآن کریم ایک خاص اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کی بار بار مختلف طریقوں سے نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ پھر جا بجا قرآن کریم میں اس کے بارے میں احکامات دیے جاتے ہیں۔ ان سب احکامات پر مسلسل غور کرنے سے اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس اصطلاح کا پورا مفہوم اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ پھر احادیث کے ذریعے، رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ کے ذریعے اس اصطلاح کی مزید تحقیق، مزید توضیح اور مزید تحدید ہو جاتی ہے۔ جہاں جہاں اجمال محسوس ہو، یا کسی غلط فہمی کا امکان ہو تو رسول اللہ ﷺ اس غلط فہمی کی تردید فرما دیتے ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کی مختلف آیات اور احادیث میں بیان کردہ تفصیلات کو سامنے رکھنے سے ان تمام اصطلاحات اور احکامات کی وضاحت مکمل طور پر ہو جاتی ہے جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔

ربا کی جو فنی تعریف فقہائے کرام نے کی ہے اس کی طرف سے بعد میں آؤں گا۔ لیکن پہلے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ ربا کی بڑی بڑی قسمیں دو ہیں۔ ربا کی ایک قسم تو وہ ہے جس کو ربا النسیئۃ کہا جاتا ہے۔ یعنی ادھار پر دیا جانے والا سود۔ اسی کو ربا الجاھلیۃ بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ ربا جو جاہلیت کے دور میں رائج تھا اور جاہلیت کے لوگ جس ربا سے مانوس تھے۔ اسی کو ربا القرآن بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے صراحت سے جس ربا کی حرمت بیان کی ہے وہ یہی ہے۔ ربا النسیئۃ، ربا الجاہلیۃ یا ربا القرآن سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے ذمے کوئی رقم واجب الادا ہو جس کی ادائیگی کے لیے کوئی مدت مقرر ہو۔ اس ادائیگی کی مدت میں اضافہ کیا جائے اور اس اضافے کے مقابلے میں کوئی اضافی رقم وصول کی جائے۔ اس کو ربا النسیئۃ کہا جاتا تھا۔ مثلاً ایک شخص کے ذمے ایک ہزار روپے واجب الادا تھے، ایک مہینے بعد ادا کرنے تھے، وہ ایک مہینے بعد ادا نہیں کر سکا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اس کو ایک مہینے کی مزید مہلت مل جائے۔ جاہلیت کے

زمانے میں اس مزید مہلت کی قیمت وصول کی جاتی تھی۔ گویا وقت کی قیمت وصول کی جاتی تھی۔ اس وقت کی قیمت وصول کرنے ہی کا نام ربا النسیئۃ یا ربا الجاہلیت تھا۔ یا کسی شخص نے کسی سے قرض لیا اور قرض کی مدت مثلاً ایک سال ہے، چھ مہینے ہے، چار مہینے ہے۔ اس مدت کے مقابلے میں اصل رقم سے زائد جو رقم لی جاتی تھی وہ بھی ربا کہلاتی تھی۔ گویا اصل رقم پر اضافہ ہو یا بعد میں واجب الادا اصل اور سود دنوں میں ملا کر پھر اضافہ ہو، دونوں کو ربا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ربا کی سب سے بڑی قسم تھی اور حقیقی مفہوم میں ربا یہی ہے۔ ربا کی ایک دوسری قسم وہ بھی ہے جس کو ربا الفضل کہا گیا ہے، یا ربا الحدیث بھی کہا گیا ہے، یا ربا البیوع بھی کہا گیا۔ ربا کی یہ قسم احادیث کے ذریعے حرام قرار دی گئی ہے اور یہ دراصل ہلکے درجے کا ربا، مخفی قسم کا ربا ہے جو بڑے اور اصل ربا کا راستہ روکنے کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کا ایک مزاج جو جگہ جگہ نظر آتا ہے وہ یہ بھی ہے کہ شریعت جب کسی چیز کو حرام قرار دیتی ہے تو ان تمام راستوں کو بھی حرام قرار دے دیتی ہے جو اس بڑے حرام کے ارتکاب کا ذریعہ بن سکیں۔ اس کی بے شمار مثالیں شریعت کے احکام میں ملتی ہیں۔

چونکہ ربا کا راستہ کھولنے والے بہت سے ابواب ہیں۔ بہت سے راستے ایسے ہیں کہ جو انسانوں نے ایجاد کیے۔ بظاہر شروع میں ان میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس راستے پر انسان چل پڑے تو بالتدریج اس کی برائی واضح ہونا شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ ربا کے ارتکاب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح کے تمام راستوں کو شریعت نے بند کیا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شریعت میں جن جن قسم کے کاروباروں کی ممانعت کی گئی ہے وہ چھپن قسم کے کاروبار ہیں اور یہ سب کاروبار وہ تھے جو بالآخر یا ربا پر منتج ہوتے تھے یا قمار اور غرر پر منتج ہوتے تھے۔ انھی راستوں کی ایک بڑی قسم ربا الفضل بھی ہے۔

ربا الفضل دراصل بارٹر سیل میں ہوتا تھا، جب خرید و فروخت اشیاء کی اشیاء کے بدلے میں ہوتی تھی۔ عرب میں بالعموم اور مدینہ منورہ میں بالخصوص بارٹر سیل کا بہت رواج تھا۔ مدینہ منورہ ایک زرعی آبادی تھی۔ تھوڑی بہت مقامی صنعتیں بھی تھیں۔ اس لیے زرعی پیداوار میں حصہ لینے والے لوگ اپنی پیداوار کو بارٹر کے ذریعے فروخت کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ مدینہ منورہ میں عام طور پر لوگوں کی خوراک یا جو ہوتی تھی یا کھجور ہوتی تھی، اس لیے جو اور کھجوروں کی ضرورت ہر وقت ہر شخص کو رہتی تھی۔ جو لوگ زمینوں کے مالکان تھے، جن میں خاصی بڑی تعداد یہودیوں کی تھی وہ

لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اور اس دعوے کی بنیاد پر کہ فلاں کھجور گھٹیا ہے، اور فلاں بڑھیا ہے، اور فلاں کی مالیت زیادہ ہے، فلاں کی مالیت کم ہے۔ ان بنیادوں پر یا ان بہانوں سے اشیاء میں کمی بیشی کیا کرتے تھے۔ جو دراصل وقت کی قیمت ہوتی تھی۔

مثلاً آج ایک شخص کو کھجوروں کی ضرورت ہے، اس کے گھر میں کھجوریں ختم ہوگئیں یا مثلاً جو کی ضرورت ہے، گندم کی ضرورت ہے۔ اس کو حسب ضرورت جو یا گندم ادا کردیا اور جب فصل کٹنے پر اس کی ادائیگی کا وقت آیا تو دعویٰ کیا کہ میں نے جو تمہیں گندم دی تھی وہ بہت بڑھیا تھی اور جو تم مجھے دے رہے ہو وہ گھٹیا ہے۔ لہٰذا تم مجھے اس کا دوگنا ادا کرو۔ یا جو وقت گزرا ہے، چھ مہینے، اس کے مقابلے میں اگر تم نے مجھ ڈیڑھ من گندم لی تھی تو آپ دوگنا ادا کرو۔ یہ سب بہانے دراصل سودخوری کا راستہ کھولنے کے بہانے تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ان چیزوں کے لین دین میں کمی بیشی کو ناجائز قرار فرمایا۔

کمی بیشی کے لیے عربی زبان میں فضل اور تفاضل کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو ربا الفضل کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ربا الفضل کی حرمت کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن کو متعدد صحابہ کرام نے روایت کیا ہے۔ اور تقریباً تمام بڑے محدثین نے ان احادیث کو نقل کیا ہے۔ ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے کی خرید و فروخت سونے کے مقابلہ میں، چاندی کی خرید و فروخت چاندی کے مقابلے میں۔ گندم کی خرید و فروخت گندم کے مقابلے میں۔ جو کی خرید و فروخت جو کے مقابلے میں۔ کھجور کی خرید و فروخت کھجور کے مقابلے میں۔ اگر ہو تو ہاتھ در ہاتھ ہو، دست بدست ہو اور کمی بیشی کے ساتھ نہ ہو۔ اگر کمی بیشی ہوگی یا ہاتھ در ہاتھ نہیں ہوگی تو یہ ربا ہوگا۔ ان احادیث کی بنیاد پر فقہائے کرام نے بالاتفاق ربا الفضل کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح حرام قرار دیا ہے جس طرح ربا النسیئۃ حرام ہے۔

ان دونوں تعریفوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقی ربا تو ربا النسیئۃ ہی ہے۔ اور ربا الفضل کی حرمت اس کا راستہ روکنے کے لیے ہے۔ فقہائے کرام نے کوشش یہ کی ہے کہ ربا کی کوئی ایسی تعریف کی جائے کہ اس میں ربا کی دونوں قسمیں واضح ہوسکیں، ربا الدین یا ربا الجاہلیۃ یا ربا النسیئۃ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ اور ربا البیوع بھی اس کی تعریف میں آسکے۔ ربا البیوع کے بارے میں میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اس زمانے کے مقایضات یعنی

بارٹر سیل میں ہوتا تھا۔ اس لیے آج اس کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ آج بارٹر سیل کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس لیے اشیاء میں آپس میں تبادلے کا رواج اب نہیں رہا۔ اس لیے ربا کی قدیم فقہی تعریفیں آج زیادہ مانوس نہیں رہیں۔ اس لیے کہ فقہائے اسلام نے ربا کی دونوں قسموں کو ایک ہی تعریف کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔

چونکہ یہ تعریفیں جو درسی اور فنی مقاصد کی خاطر مرتب کی گئی تھیں۔ اس لیے ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو اس ایک جامع تعریف کے ذریعے ربا کی دونوں قسموں کا حرام ہونا واضح طور پر سمجھا دیا جائے۔ آج کل بعض متجددین ربا البیوع کا تذکرہ کر کے خلط مبحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ربا البیوع جس کو کہا جاتا ہے۔ آج وہ بہت محدود پیمانے پر رہ گیا ہے۔ ربا کی سب سے بڑی قسم ماضی میں بھی ربا النسیئۃ تھی اور آج بھی ربا النسیئۃ ہی ہے۔ اس لیے ربا کی کوئی ایسی تعریف جس میں ربا النسیئۃ شامل نہ ہو یا جس کے ذریعہ کسی لفظی بازگری کی بنیاد پر ربا النسیئۃ کو نکالا جا سکے، ایک منفی اور نامبارک کوشش ہے۔ ایسا کرنا شریعت کے منشاء کے خلاف ہے اور شارع کے مقصد کو ناکام بنانے کے مترادف ہے۔

مشہور حنفی فقیہ امام زیلعی نے ربا کی تعریف کی ہے کہ "**فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال**"۔ مال کے مقابلے میں جب مال وصول کیا جائے اور ایک طرف سے اس میں بغیر کسی اضافی عوض کے اضافہ ہو، اس کو ربا کہا جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ایک لاکھ روپے ادا کر کے کوئی چیز خرید لی، پرانی گاڑی خرید لی، کوئی پرانی مشینری آپ نے خرید لی۔

اب ایک طرف جو مال ہے وہ مشینری ہے جس کی مالیت آپ دونوں نے بازار کے بھاؤ کے مطابق ایک لاکھ روپے طے کی ہے۔ دوسری طرف کا مال ایک لاکھ روپے نقد ہے۔ اب جب ایک شخص اس ایک لاکھ روپے کی ایک مہینے بعد ادائیگی کی مہلت دیتے ہوئے اس ایک مہینے کے مقابلے میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ اضافی رقم وصول کرے گا تو یہ اضافہ ربا کہلائے گا۔ "**فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال**" کی تعریف کی رو سے یہ اضافہ ربا ہو جائے گا۔ اگر ایک من گندم کے مقابلے میں ڈیڑھ من گندم وصول کرے گا تو یہ بھی آدھے من کی زیادتی کی وجہ سے ربا کی اس تعریف میں آئے گا۔

ربا کی وہ تمام تعریفیں جو فقہائے اسلام نے کی ہیں وہ اسی سے ملتی جلتی ہیں۔ الفاظ میں

تھوڑا بہت اختلاف کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔لیکن مفہوم تمام تعریفوں کا یہی ہے۔ یہاں جس چیز کو زیادتی یا تفاضل کہا گیا ہے۔اس میں حقیقی تفاضل اور زیادتی بھی شامل ہے اور حکمی اور اعتباری تفاضل اور زیادتی بھی شامل ہے۔حکمی تفاضل اور زیادتی شریعت نے مہلت کو قرار دیا ہے۔اگر دو یکساں چیزوں کی ،سونے کی سونے کے ساتھ، چاندی کی چاندی کے ساتھ، گندم کی گندم کے ساتھ، بیع وشراء، لین دین ہوگا یا خرید وفروخت ہوگی،تو اس میں اگر ہاتھ در ہاتھ اور دست بدست نہ ہوتو یہ مدت کی جو چھوٹ ہے یہ بھی اعتباری لحاظ سے یا حکمی اعتبار سے اضافے کے مترادف ہے۔اس لیے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

ایک اور فقیہ نے ربا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "**بیع جنس بمثله بزيادة أو بتأ خير احد العوضين**" کہ کسی جنس کی خرید وفروخت اسی جنس کے ساتھ، زیادتی کے ساتھ یا ادائیگی میں تاخیر کے ساتھ کی جائے تو یہ ربا ہے۔ کچھ اور فقہاء نے بعض احادیث کو سامنے رکھ کر تعریف کی ہے کہ ربا سے مراد اس مال کا نفع ہے جس کے نقصان یا تاوان کا انسان ذمہ دار نہ ہو۔ "**هو ربح مال لا يضمن تلفه و لا خسارته**" ۔یہ براہ راست دو احادیث سے ماخوذ ہے۔ ایک تو مشہور حدیث ہے جو تمام فقہاء کے یہاں بنیادی قانونی اصول کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے "**الخراج بالضمان**"۔یعنی جس چیز کا انسان فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ اسی چیز کا اٹھا سکتا ہے جس کے نقصان کا بھی وہ ذمہ دار ہو۔اسی طرح جس چیز کے نقصان کا وہ ذمہ دار ہے اس کا فائدہ اٹھانے کا بھی حق رکھتا ہے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کسی چیز کا فائدہ اٹھانے کے لیے تو موجود ہوں اور اس کا تاوان یا نقصان اٹھانے کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ یا کسی چیز کا نقصان تو آپ پر ڈال دیا جائے اور اس کا فائدہ اٹھانے کی آپ کو اجازت نہ ہو۔ یہ شریعت کے تصور عدل اور مساوات کے خلاف ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر اس بیع کی ممانعت فرمائی ہے جس کے ذریعے ایسی چیز کا نفع وصول کیا جائے جس کا خسارہ یا تاوان انسان کے ذمے نہ ہو۔"**نهى رسول الله ﷺ عن ربح مالم يضمن**" ۔جس چیز کا ضمان، یا تاوان یا نقصان کسی انسان کے ذمے نہ ہو وہ اس کا نفع نہیں اٹھا سکتا۔

یہ ہے ربا کی حقیقت جو عرب میں معلوم اور متعین تھی۔ کفار مکہ بھی ربا کی اس حقیقت سے واقف تھے اور اس کو ناجائز اور ناپاک سمجھتے تھے۔ یہ سمجھنا کہ عرب میں ربا کو جائز اور حلال مانا

جاتا تھا اور اسلام نے پہلی مرتبہ اس کو حرام قرار دیا ہے، درست نہیں ہے۔ ربا اسلام سے پہلے بھی حرام تھا۔ عرب کے لوگ بھی اس کو حرام اور برا ہی سمجھتے تھے اور اسلام سے پہلے کی شریعتوں میں بھی ربا حرام تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی نوجوانی کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں سیلاب آیا اور بیت اللہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ اس وقت کفار قریش نے یہ طے کیا تھا کہ وہ بیت اللہ کی ازسرِ نو تعمیر کریں گے۔ اس تعمیر نو کے کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک نوجوان مکی کی حیثیت سے شریک تھے۔ اس مہم میں رسول اللہ ﷺ اپنے چچاؤں کے ہمراہ شریک ہوئے تھے۔

ابن ہشام جو صدر اسلام کے سب سے بڑے سیرت نگار ہیں راوی ہیں کہ جب قریش یہ فیصلہ کر رہے تھے تو انھوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ دیکھو کعبے کی تعمیر میں کوئی ناپاک آمدنی استعمال نہ ہو۔ صرف پاکیزہ آمدنی ہی اس نیک کام میں استعمال کی جائے۔ چنانچہ حرام کاری کے نتیجے میں کمائی جانے والی کوئی رقم، سودخوری کے ذریعے آنے والی آمدنی، کسی انسان پر ظلم کے نتیجے میں موصول ہونے والی رقم اس میں خرچ نہ کی جائے۔ یہ تین قسم کی آمدنیاں انھوں نے حرام اور ناپاک سمجھیں، ان کو ناجائز قرار دیا۔ حرام کاری کے ذریعے کمائی جانے والی رقم، سودخوری کے ذریعے ہونے والی آمدنی اور کسی انسان پر ظلم کر کے اس کی ہتھیائی ہوئی رقم، ان تینوں کو انھوں نے ناپاک قرار دیا اور بیت اللہ کی تعمیر میں ایسی رقم لگانے کو بیت اللہ کے احترام کے خلاف سمجھا۔

صرف کفار مکہ ہی نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے کی تمام شریعتوں میں بھی ربا کی حرمت کے احکام واضح طور پر ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ خود قرآن کریم کی گواہی موجود ہے۔ یہودیوں کے جرائم کا جہاں تذکرہ ہے وہاں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ "وأكلهم الربا وقد نهوا عنه" ان کے سودخوری یا ربا میں ملوث ہونے کی وجہ سے فلاں فلاں سزائیں ان کو دی گئیں۔ حالانکہ ان کو سودخوری سے روکا گیا تھا۔ "وقد نهوا عنه" حرمت سود کی واضح دلیل ہے۔ عیسائیوں میں ایک طویل عرصے تک ربا اور سود کی حرمت پر اتفاق بھی رہا ہے اور بیشتر عیسائی اس پر کاربند بھی رہے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی ربا کی حرمت متفق علیہ معاملے کی حیثیت رکھتی رہی ہے۔ ہندوؤں میں بیاج کے نام سے جو چیز مشہور تھی یہ وہی تھی جس کو عربی زبان میں ربا، اردو اور فارسی میں سود اور آج کل عرب دنیا میں فائدہ کہا جانے لگا ہے۔ شریعت موسوی میں، کتاب خروج اور کتاب تثنیہ میں، شریعت عیسوی میں لوقا کی انجیل میں واضح طور پر ربا کی

حرمت کے احکام آج بھی موجود ہیں۔ افلاطون اور ارسطو کی تحریروں میں ربا کے بارے میں انتہائی منفی باتیں موجود ہیں۔ مغرب کی مذہبی تاریخ کے بہت بڑے مصلح لوتھر کی تحریروں میں ربا کی حرمت کا تذکرہ واضح طور پر ملتا ہے۔

ربا کے باب میں ایک بنیادی اور اہم بات یاد رکھنی چاہیے، نہ صرف ربا کے باب میں بلکہ یہ حکم شریعت کے تمام معاملات اور لین دین سے متعلق ہر قسم کے کاروبار میں دیا گیا ہے۔ "**العبرة بالمضمون والجوهر و ليس بالصورة و المظهر**"۔ کسی کاروبار یا تجارت یا لین دین کے حلال وحرام ہونے میں اصل اعتبار اس کے مندرجات اور اس کے مضمون کا ہے۔ اس کی ظاہری صورت یا عنوان کا نہیں ہے۔ چنانچہ دائن اور مدیون کوئی بھی ہو۔ دینے والا فرد ہو یا انجمن ہو، ادارہ ہو یا حکومت ہو۔ رضامندی سے دے رہا ہو یا ناراضی سے۔ اس کا نام ربا رکھا جائے، منافع رکھا جائے، فائدہ رکھا جائے، Intrest رکھا جائے، کچھ بھی رکھا جائے، لینے والے ضرورت مند ہوں یا غنی ہوں۔ لینے والے کا مقصد تجارتی ہو یا صرفی ہو، ذاتی ہو یا کاروباری ہو، جہاں جب اور جس صورت میں ربا کی حقیقت یا صفت پائی جائے گی وہ ربا ہوگا۔

یہ کہنا کہ چونکہ اصل رقم پر یہ اضافہ تجارت کی غرض سے لیا جا رہا ہے لہٰذا ربا نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ دینے والا فقیر اور ضرورت مند نہیں ہے اس لیے یہ ربا نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ سود پر قرض لینے والا رضامندی سے لے رہا ہے، دینے والا رضامندی سے دے رہا ہے اس لیے ربا نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ سود لینے والا فرد نہیں ہے، بلکہ حکومت یا کوئی ادارہ ہے اس لیے ربا نہیں ہے۔ یہ تمام عذر عذر لنگ ہیں، اور یہ تمام خارجی چیزیں غیر متعلق ہیں۔ جو اصول ہے شریعت کا وہ یہ ہے کہ معاملات میں، لین دین اور تجارت میں اصل اعتبار حقیقت اور ماہیت کا ہوتا ہے، عنوان اور ظاہری الفاظ کا نہیں ہے۔ "اصل اہمیت عنوان کو نہیں مندرجات کو حاصل ہوتی ہے"۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ ربا کی حرمت کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، بنیادی طور پر یہ اللہ کا حق ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ چونکہ فریقین راضی ہیں اس لیے سودی کاروبار جائز ہونا چاہیے یہ درست نہیں ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں کہ جس میں اصل حق اللہ کا حق ہے۔ اللہ کے حق کو کوئی منسوخ نہیں کرسکتا، اللہ کے حق کو کوئی معاف نہیں کرسکتا، اللہ کے حق میں کوئی شخص کسی بھی قسم کی کمی بیشی نہیں کرسکتا۔ اس لیے کسی فریق کے راضی یا ناراض ہونے سے ربا

کی حرمت پر فرق نہیں پڑتا۔ اگر دونوں فریقوں میں رضا مندی کی وجہ سے ربا کا کاروبار جائز قرار پائے تو رضا مندی سے تو اور بھی بہت سے جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اور شدید طور پر ناپسند کیا ہے۔ سخت سخت سزائیں رکھی ہیں، وہ بھی لوگ رضا مندی سے ہی کرتے ہیں۔ جوا کھیلنے والے رضا مندی سے جوا کھیلتے ہیں۔ شراب پینے والے رضا مندی سے شراب پیتے ہیں۔ بہت سی بے حیائیوں کا ارتکاب کرنے والے رضا مندی سے بے حیائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بدکاری بھی عموماً فریقین کی رضا مندی ہی سے کی جاتی ہے۔ اگر رضا مندی سے حرمت حلت میں تبدیل ہوسکتی تو یہ تمام معاملات پہلے بھی حلال ہونے چاہیں تھے اور آج بھی حلال ہونے چاہئیں۔ اس لیے یہ دلیل انتہائی پوچ ہے، یہ عذر انتہائی عذر لنگ ہے کہ چونکہ آج کل سودی کاروبار فریقین کی رضا مندی سے ہوتا ہے اس لیے یہ حلال ہونا چاہیے۔ یہ انتہائی بے بنیاد، لغو اور مہمل بات ہے۔

تیسری بات ایک اور بھی یاد رکھنی چاہیے، جو کچھ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالتی ہے یا ڈال سکتی ہے اور بہت سے لوگ جان بوجھ کر اس کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ربا کی حرمت شریعت کے بہت سے احکام کی طرح بالتدریج نازل ہوئی ہے۔ شریعت کا یہ مزاج رہا ہے کہ بہت سی اصلاحات میں، بہت سے اہم معاملات میں، احکام کے نزول میں تدریج سے کام لیا گیا ہے۔ اگر کوئی عادت خاص طور پر عادت قبیحہ لوگوں میں بہت جاگزین تھیں تو اس کو یک بیک ختم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس تدریج کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کوئی غیر عملی نظام نہیں ہے۔ شریعت کی بنیاد محض جذبات واحساسات یا عواطف پر نہیں ہے۔ اگرچہ جذبات واحساسات وعواطف کی انسانی زندگی میں بہت اہمیت ہے، اور شریعت بھی اس اہمیت کا احساس اور ادراک رکھتی ہے۔ لیکن انسانی معاملات میں حقائق پر نظر رکھنا، واقعات اور انسانی زندگی کی نفسیات کو پیش نظر رکھنا، یہ شریعت کے اہم امتیازی اوصاف میں سے ہے۔ ان اہم امتیازی اوصاف میں تدریج کا طریقہ کار بھی ہے۔

چنانچہ اسی اصول تدریج کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی شریعت نے ربا کی حرمت کے احکام نازل فرمائے ہیں، اور مکہ مکرمہ کے زمانے سے صحابہ کرام کو اس کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ سورہ روم مکی سورت ہے اور بعثت نبوی کے چھٹے سال نازل ہوئی یعنی ابھی ہجرت میں

تقریباً سات سال باقی تھے۔ مکہ مکرمہ کے دور کے نصف اوّل میں نازل ہونے والی اس سورت میں واضح طور پر اشارہ فرمایا گیا کہ "**وما اتیتم من ربا لیربو فی اموال الناس فلا یربوا عند الله**"۔ تم جو ربا کا لین دین کرتے ہوتا کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو یہ اللہ کی نظر میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ لیکن جو تم زکوٰۃ دیتے ہو یا صدقات دیتے ہو جس کا مقصد اللہ کی رضامندی ہے، سو یہی لوگ ہیں جو اپنے مال میں حقیقی طور پر اضافہ کرتے ہیں۔ گویا یہاں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا کہ ربا اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، ربا کے نتیجے میں جو اضافہ مال میں محسوس ہوتا ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، اللہ کی نظر میں وہ اضافہ پسندیدہ ہے جو زکوٰۃ اور صدقات کے نتیجے میں اجر و ثواب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس کے بعد ہجرت کے فوراً بعد یہ بتایا گیا کہ یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے ربا کے لین دین سے روکا تھا، ربا کی حرمت کا حکم دیا تھا، لیکن انھوں نے اس کی نافرمانی کی۔ "**و اکلهم الربا و قد نهوا عنه**"۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ کی شریعت میں ربا پہلے بھی حرام تھا اور آج بھی حرام ہے۔ ناپسندیدگی پہلے ہی واضح کردی گئی تھی۔ شریعت میں حرمت کا پہلا مرحلہ بتا دیا گیا۔

اس کے بعد حرمت ربا کا دوسرا مرحلہ جب نازل ہوا تو اس میں بتایا گیا کہ چند در چند سود کا لین دین مت کرو۔ "**لا تا کلوا الربا اضعافا مضاعفه**"۔ یہ غزوہ احد کے فوراً بعد نازل ہونے والی آیت ہے۔ مرکب سود یعنی کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی حرمت اس آیت کے ذریعے واضح طور پر نازل کردی گئی۔ ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ جو صحابہ کرام دین کے خصوصی مزاج شناس تھے وہ تو مکہ مکرمہ ہی میں سمجھ گئے تھے کہ یہ چیز ناپسندیدہ ہے۔ کچھ اور حضرات ایسے تھے جنھوں نے ربا کا لین دین اس وقت سے ختم کر دیا جب یہودیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کو ربا سے روکا گیا تھا۔ بقیہ صحابہ کرام نے "**لاتأ کلوا الربا اضعافا مضاعفة**" والی آیت کے بعد سود کا لین دین بند کر دیا۔ اکا دکا لین دین اب بھی جاری تھا۔ خاص طور پر وہ لین دین جاری تھے جن میں سابقہ واجبات کی رقمیں واجب الادا موجود تھیں۔ یا جن میں فریقین کا خیال تھا کہ ان میں کمپاؤنڈ انٹرسٹ نہیں ہے۔

اس کے بعد آخری آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر (۲۷۵) دو سو پچھتر نازل ہوئی جس میں ہر قسم کے سود کی حرمت واضح طور پر نازل فرما دی گئی۔ "**احل اللّٰه البیع و حرم الربا**"۔ اللہ

تعالٰی نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ یہاں الربا کا لفظ استعمال ہوا ہے، ربا کے لفظ پر الف لام آیا ہے جو استغراق کا مفہوم رکھتا ہے، یعنی ربا کی ہر قسم کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہاں اب اضعافا مضاعفہ کی یا کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی قید نہیں ہے۔ اب ہر قسم کا ربا اور ہر قسم کا سود حرام قرار دے دیا گیا۔

اس کے بعد ایک قسم کا مرحلہ ابھی باقی تھا جو سابقہ واجب الادا دعاوی اور رقموں کے بارے میں تھا۔ سابقہ دعاوی اور واجب الادا رقوم کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے سے چند ماہ پہلے اس کی حرمت بھی واضح طور پر نازل کی گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ جتنے سابقہ دعاوی ہیں سب آج کے بعد کالعدم قرار دیے جاتے ہیں۔ آج کے بعد جس کا جو دعویٰ چلا آ رہا ہے وہ اصل رقم تک محدود تصور کیا جائے گا۔ "یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ و ذرو اما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین" یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللّٰہ سے ڈرو، اگر تم واقعتاً مؤمن ہو تو جو ربا باقی ہے، کسی کے ذمے واجب الادا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر اللّٰہ اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ اگر تم توبہ کرلو تو پھر تمھیں صرف اصل سرمایہ لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ اگر کوئی شخص جس کے ذمے تمھارا قرض واجب الادا ہے تنگ دست ہے تو پھر بہتر یہ ہے اس کو مہلت دو جب تک اسے خوشحالی میسر نہ آجائے اور اگر معاف کردو تو تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تمھیں اس کا علم ہو۔"

یہ آخری اعلان تھا جو سورہ بقرہ کی آیات دو سو اٹھتر ۲۷۸، ۲۷۹، اور ۲۸۰ پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک بار پھر حتمی اور واضح طور پر اعلان رسول اللّٰہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ خطبہ حجۃ الوداع کے بارے میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں، رسول اللّٰہ ﷺ کی زندگی کا آخری اہم ترین خطبہ تھا جو آپ ﷺ نے اپنے دنیا سے تشریف لے جانے سے تقریباً اسی دن پہلے ارشاد فرمایا۔

رسول اللّٰہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب شریعت کا کوئی حکم نازل ہوتا تھا تو سب سے پہلے آپ ﷺ اس پر خود عمل فرماتے تھے۔ ظاہر ہے جب ربا کی حرمت کا یہ آخری حکم آیا یا پہلا حکم آیا تو رسول اللّٰہ ﷺ سب سے پہلے اس پر بھی خود عمل کر کے دکھانا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی سودی کاروبار میں حصہ نہیں لیا تھا نہ اسلام سے پہلے اور نہ اسلام کے بعد۔ نہ آپ ﷺ کے قریبی اعزاء میں سے، آپ ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے، آپ ﷺ کے اپنے اہلِ خاندان

میں سے، ازواج مطہرات میں سے کسی نے سودی کاروبار نہ پہلے کیا تھا اور نہ بعد میں کیا۔ آپ کے قریب ترین اعزاء میں سے جن کی سودی رقمیں لوگوں کے ذمے واجب الادا تھیں وہ جناب عباس بن عبدالمطلب تھے۔ آپ کے عم محترم جناب عباس بن عبدالمطلب عرب کے انتہائی سخی اور دولت مند انسانوں میں تھے۔ وہ تجارت کے لیے لوگوں کو قرض دیا کرتے تھے اور اسلام سے پہلے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ وہ رقمیں مضاربہ پر بھی دیا کرتے تھے اور سود پر بھی دیا کرتے تھے۔ ان کا جو قرضہ ہوتا تھا، وہ تجارتی قرض ہوتا تھا، کمرشل انٹرسٹ ہوتا تھا، یہ صرفی قرضہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کی کچھ رقوم لوگوں کے ذمے واجب الادا تھیں جن میں سے بعض غیر مسلم بھی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ اعلان فرمایا کہ میں آج سے زمانۂ جاہلیت کے تمام دعووں کو کالعدم قرار دیتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام فوجداری نوعیت کے دعوے کالعدم قرار دیے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر آپ نے اپنے خاندان کے دو دعاوی کالعدم قرار دیے۔

آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلا ربا جو میں آج کالعدم قرار دے رہا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کا ربا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس اعلان کے بعد نہ کسی صرفی قرضے پر سود لینے کی گنجائش ہے، نہ کسی تجارتی قرضے پر سود لینے کی گنجائش ہے، نہ سابقہ واجب الادا قرضوں کو جاری رکھنے کی گنجائش ہے۔ یہ تمام کے تمام معاملات حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کالعدم قرار دے دیے۔

سود کی حرمت قرآن کریم کی ان آیات میں جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیں اتنے واضح طور پر آ گئی ہے کہ اب اس میں کسی تامل یا شک کی گنجائش نہیں رہی۔ جن محدثین نے ربا کی حرمت سے متعلق احادیث روایت کی ہیں ان میں تمام بڑے بڑے محدثین شامل ہیں۔ صحاح ستہ کی چھ کی چھ کتابیں، موطا امام مالک، مسند امام احمد، بیہقی کی جامع کتاب السنن الکبریٰ، امام طبرانی کی تینوں کتابیں، امام حاکم کی مستدرک اور جتنی مشہور کتب حدیث ہیں، خاص طور پر وہ کتب حدیث جو احادیث احکام کو خاص طور پر بیان کرتی ہیں، ان سب میں یہ احادیث موجود ہیں۔ ان احادیث کو روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد بھی ایک درجن کے لگ بھگ ہے۔ یہاں ان احادیث کو بیان کرنے کا تو موقع نہیں ہے۔ اگر ان کو بیان کیا جائے تو گفتگو بہت طویل ہو

جائے گی۔

یہ احادیث سینکڑوں نہیں تو درجنوں ضرور ہیں۔ لیکن یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ صحیح مسلم کی روایت کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے کو، سود کھلانے والے کو، سودی دستاویز لکھنے والوں کو، سودی کاروبار میں گواہ بننے والوں کو سب کو لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ اور فرمایا کہ "هم سواء" گناہ میں یہ سب برابر ہیں۔ سودی لین دین میں یہ سب شریک ہیں۔ ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جتنا زیادہ سودی کاروبار میں شریک ہوتا ہے انجام کار اسے قلت اور کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج دنیا کی بڑی بڑی تجارتیں بیٹھ رہی ہیں۔ بڑے بڑے تجارت اور کاروبار کے مراکز پریشانی کا شکار ہیں۔ دبی میں کیا ہو رہا ہے؟ کھربوں ڈالر کے قرضے جو سود اور انٹرسٹ پر دیے گئے تھے وہ ڈوب رہے ہیں۔ بڑے بڑے مغربی ممالک کے بنک ایک ایک کرکے بند ہو رہے ہیں۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں بند ہو رہی ہیں۔ بڑی بڑی ائرلائین ایک دوسرے میں ملحق ہو رہی ہیں یا ختم ہو رہی ہیں۔ یہ سب اس حدیث کے مظاہر ہیں جس میں آپ نے فرمایا کہ سودی کاروبار بظاہر جتنا بھی بڑھتا نظر آئے "كانت عاقبة امره الى قلة" انجام کار سودی کاروبار کرنے والے کو قلت اور نہوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں جو سود رائج تھا اس میں اور آج کے سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ جاہلیت کا سود اور تھا، آج کا سود اور ہے، یہ بہت بڑی ناواقفی بھی ہے اور اگر کچھ لوگ جان بوجھ کر یہ بات کہتے ہیں تو یہ بہت بڑی جسارت بھی ہے۔ جاہلیت کا سود کیا تھا؟ اس کے بارے میں امام طبری نے ایک روایت بیان کی ہے، جو مؤرخ بھی ہیں، مفسر بھی، وہ فقیہ بھی ہیں اور محدث بھی۔ ان کی تفسیر میں یہ روایت آئی ہے اور بہت سے دوسرے حضرات محدثین اور فقہاء نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ آج کل متعدد حضرات نے اور افسوس کہ اس میں بعض بڑے بڑے نام بھی شامل ہیں۔ کھینچ تان کے اس روایت سے بنک انٹرسٹ کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمے کوئی واجب الادادین یا رقم ہوتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ اگر تم ادائیگی کی مدت میں مہلت دے دو تو میں اصل واجب الادا رقم پر اتنا یا اتنا اضافہ دوں گا۔ اس پر قرضدار مزید مہلت دے دیا کرتا تھا۔ اس کا واضح طور پر یہی مطلب ہے کہ مدت کے مقابلے میں اصل رقم میں اضافہ کر دیا جاتا تھا، اور اس کو ربا کہا

جاتا تھا۔ یہ اضافہ چاہے جس نام سے کیا جائے، جس عنوان سے کیا جائے وہ سود ہے۔

امام مالک کا قول ان کی مشہور کتاب ''المدونۃ الکبری'' میں نقل ہوا ہے۔ ''المدونۃ الکبری امام مالک کے فتاویٰ پر مشتمل ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔ ایک طرح کا دائرۃ المعارف ہے جو ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے اجتماعی کوشش سے تیار کیا ہے۔ کئی حضرات نے اس کی تدوین اور تیاری میں حصہ لیا۔ اس کا آخری اور موجودہ ایڈیشن امام عبدالسلام سحنون کا مرتب کیا ہوا ہے۔ یہ کتاب فقہ مالکی کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ اور امام مالک کے فتاویٰ کا موطا امام مالک کے بعد سب سے بڑا مأخذ و مصدر ہے۔ اس کتاب میں امام مالک نے ربا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو ایک مقررہ مدت تک کسی کو قرض کے طور پر دی جائے یا مقررہ مدت کے بعد واجب الادا ہو اور اس مدت کے بعد جب وہ شخص وہ چیز ادا کرے اور اس کے ساتھ کوئی اضافہ بھی ہو تو یہ اضافہ ربا ہوگا۔ چاہے یہ اضافہ مشروط ہو یا متعارف ہو۔ مشروط سے مراد یہ ہے کہ دونوں یا ایک فریق نے شرط رکھی ہو کہ یہ اضافہ دیا جائے گا، یہ شرط تحریری ہو یا زبانی دونوں صورتوں میں ناجائز ہے۔ متعارف سے مراد یہ ہے کہ یہ بات عام طور سے رائج اور معروف ہو اور بغیر لکھے یا بغیر زبانی بات کیے لوگ اس کو ادا کریں۔

یہی بات امام ابوبکر جصاص نے جو مشہور حنفی فقیہ بھی ہیں۔ امام اصول ہیں، بڑے مفسر قرآن بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب احکام القرآن میں اس بات کو لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس ربا سے عرب لوگ واقف تھے اور جس میں وہ ملوث اور مبتلا تھے وہ نقد رقم دراہم و دنانیر کی لین دین کے بارے میں تھا۔ جس میں مدت کے مقابلے میں اصل رقم میں زیادتی کر دی جاتی تھی، اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ ''الربا الذی کانت العرب تعرفہ و تفعلہ انما کان فی قرض الدراھم و الدنانیر الی اجل بزیادۃ علی ما استقرض علی ما یتراضون بہ''۔ یہ امام جصاص کے اصل الفاظ ہیں۔ اس میں واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ مالی معاملات کے لین دین میں مدت کے مقابلے میں جو اضافہ کیا جائے گا وہ فریقین کی رضامندی سے کیا جائے یا بغیر رضامندی کے، وہ ربا ہے۔

امام قرطبی جو مشہور مفسر قرآن اور صف اوّل کے مالکی فقہاء میں سے ہیں انھوں نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر مکمل اتفاق رائے اور اجماع ہے اور یہ ان

کے نبی علیہ السلام کی سنت اور نقل پر مبنی ہے کہ قرض میں ہر وہ زیادتی یا واجب الادا رقم میں ہر وہ زیادتی جو مشروط طور پر لی جائے، چاہے وہ گندم کی ایک مٹھی ہو یا ایک دانہ ہو وہ بھی ربا ہے۔ "ولو كانت قبضة من علف" جانوروں کے چارے کی ایک مٹھی ہو یا ایک دانہ بھی ہوگا تو وہ زیادتی بھی ربا ہوگی۔ زیادتی کم ہو یا زیادہ ہو، فوری ہو یا ادھار ہو، یکمشت ہو یا بالاقساط ہو، یہ سب کی سب ربا ہی کی مختلف قسمیں ہیں۔

ربا کے سیاق وسباق میں فقہائے اسلام اور محدثین ومفسرین کی تحریروں میں قرض کا لفظ بھی ملتا ہے اور دَین کا لفظ بھی ملتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دَین ایک عام اصطلاح ہے، قرض اس کی ایک قسم ہے۔ ہر وہ مال یا مالی ذمہ داری جو کسی کے ذمے واجب الادا ہو وہ دَین کہلاتی ہے۔ قرض بھی ایک قسم کا دَین ہے۔ فقہاء نے دین کی تعریف یہ کی ہے "كل ما هو في ذمتك للغير فهو دين عليك له" کسی دوسرے کے لیے جو کچھ تمہارے ذمے واجب الادا ہو وہ اس کا تمھارے ذمہ دین ہے۔ چونکہ قرض دین کی ایک بہت نمایاں قسم ہے اس لیے فقہائے کرام میں بہت سے حضرات قرض کو دین کے مفہوم میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ اور یہ عربی زبان کا ایک عام اسلوب ہے جو بہت جگہ نظر آتا ہے کہ کسی چیز کی بہت سی اقسام میں سے کسی بڑی قسم کو اصل کے قائم مقام قرار دے دیا جاتا ہے اور مجازاً وہ لفظ اصل کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگتا ہے۔

قرض دین کی بہت بڑی قسم ہے۔ اس لیے دین کے لیے قرض کی اصطلاح استعمال ہو جاتی ہے۔ قرض کے لیے دین کی اصطلاح استعمال ہو جاتی ہے۔ اس لیے فقہ کی کتابوں سے چھانٹ چھانٹ کر محض ان عبارتوں کو نکال لینا جہاں قرض کا لفظ آیا ہو اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ ربا صرف قرض میں ہوسکتا ہے، فلاں فلاں معاملے میں قرض رقم نہیں لی گئی تھی یا واجب الادا رقم قرض نہیں تھی۔ اس لیے یہ سودی معاملہ نہیں ہے، یہ جہالت بھی ہے اور خلط مبحث بھی ہے۔ اگر کوئی رقم واجب الادا ہے تو وہ دین ہے اور دین میں جو اضافہ ہے یا دین کے نتیجے میں جو اضافی فائدہ ہو رہا ہے وہ ربا کہلاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "كل قرض جر نفعا فهو ربا"۔ کہ ہر وہ قرض جس کے نتیجے میں مزید کوئی اضافی نفع حاصل ہو وہ ربا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نفع نقد نفع ہو۔ یہ کسی بھی قسم کا نفع ہوسکتا ہے۔ بعض حضرات نے بڑی تحقیق اور

بہت کوشش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حدیث فنی اعتبار سے حدیث مرفوع نہیں ہے، یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والا ارشاد نہیں ہے، بلکہ کسی صحابی کا قول ہے۔ اگر بالفرض یہ کسی صحابی کا قول بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اپنے الفاظ مبارک نہیں ہیں۔ جب بھی تمام فقہائے کرام کے اتفاق رائے کے مطابق ایسے تمام ارشادات جو صحابہ کرامؓ سے منسوب ہوں اور جن کی بنیاد محض عقل اور اجتہاد پر نہ ہو، ان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر مبنی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے بہت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے اور دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ یہ مرفوع حدیث ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد ہے۔

ائمہ اسلام اور اہل تقویٰ اس اصول پر کس طرح عمل کرتے تھے اس کا اندازہ امام ابو حنیفہ کے اس طرز عمل سے لگائیں۔ ایک شخص نے آپ سے کوئی رقم قرض لی تھی یا امام صاحب کی کوئی رقم اس کے ذمہ کسی اور وجہ سے واجب الادا تھی۔ یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ امام صاحب اپنے زمانے کے بہت بڑے تاجر اور صنعت کار تھے۔ بڑے پیمانے پر لوگ ان سے قرض لیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے امام صاحب سے قرض لیا ہوا تھا۔ امام صاحب کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں کسی شخص نے روک کر مسئلہ پوچھنا چاہا۔ امام صاحب رک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ صاحب جو مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے وہ سورج کی تمازت اور گرمی کی وجہ سے ایک دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ امام صاحب کو بھی دعوت دی کہ دیوار کے سائے میں آ جائیں۔ امام صاحب دیوار کے سائے میں تشریف نہیں لائے۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے جواب دیتے رہے۔ جب خاصی دیر ہوئی تو ان صاحب نے پھر اصرار کیا کہ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے دیوار کے سائے میں آ جائیں۔ امام صاحب پھر بھی سائے میں تشریف نہیں لائے اور اسی طرح جواب دے کر تشریف لے گئے۔ کوئی شاگرد یا نیاز مند جو ساتھ تھے انھوں نے پوچھا کہ آپ ان صاحب کے بار بار کہنے کے باوجود دیوار کے سائے میں کیوں کھڑے نہیں ہوئے؟ امام نے جواب دیا کہ وہ مکان جس کی دیوار کا سایہ تھا وہ میرے فلاں مقروض کا مکان تھا، میں اس کی دیوار کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ میرے مقروض ہیں۔ مقروض کی دیوار سے اتنا سا فائدہ اٹھانا بھی کہ اس کے سائے میں کھڑے ہو جائیں امام صاحب نے اس حدیث کے خلاف سمجھا۔ اس

سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "کل قرض جر نفعاً فھو ربا" کے حکم پر عمل درآمد کے بارے میں ائمہ کرام کا طرز عمل کیا تھا، وہ کتنے محتاط تھے اور کتنی جزرسی اور باریک بینی کے ساتھ وہ ان معاملات پر نظر رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ربا کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک ربا الدیون کہلاتا ہے، دوسرا ربا البیوع کہلاتا ہے۔ ربا البیوع عموماً مقایضہ یا بارٹر سیل میں ہوا کرتا تھا۔ اب چونکہ ربا البیوع عموماً بہت شاذ و نادر ہوتا ہے اس لیے اس بحث کی اب زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ اس بحث کی اہمیت اگر ہے تو کرنسی کے باہمی لین دین میں ہے یا سونے چاندی کے باہمی لین دین میں ہے۔ زیادہ اہمیت اب ربا الدیون ہی کو حاصل ہے۔ یعنی اس رقم پر اضافے کو اہمیت حاصل ہے جو واجب الادا رقوم کے بارے میں لیا یا دیا جاتا ہے۔

ربا الدیون یا ربا الجاہلیۃ کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ امام طبری اور دوسرے بہت سے قدیم مفسرین اور محدثین نے بیان کیا ہے کہ ربا الدیون کی بہت سی صورتیں رائج تھیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ جب رقم کی واجب الادا ہونے کی مدت پوری ہوتی تھی تو قرض دینے والا کہتا تھا کہ یا تو اصل رقم ابھی ادا کردو، ورنہ پھر اس میں اضافہ قبول کرلو اور آئندہ کسی تاریخ کو ادا کردینا۔ "اما ان تربی و اما ان تقضی" یا تو اس میں اضافہ کردو یا رقم ادا کر دو۔ یہاں دو بنیادی عنصر ہوتے تھے۔ ایک تو اصل کاروبار کے آغاز میں اصل رقم پر زیادتی مشروط کر لی جاتی تھی۔ پھر مقروض کی طرف سے جب ادائیگی میں مزید تاخیر ہوتی تھی تو اس تاخیر کے بدلہ میں مزید اضافہ طلب کیا جاتا تھا۔

اس تشریح سے واضح ہوجاتا ہے کہ بنک انٹرسٹ میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں۔ جب اکاؤنٹ کھولنے والا اصل رقم جمع کراتا ہے، اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر جیسے جیسے سال گزرتا جاتا ہے تو اس رقم پر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر پہلے سال اضافہ پانچ فیصد تھا، دس فیصد تھا، سو روپے کے ایک سو دس ہو گئے تو ایک سال بعد اس ایک سو دس پر اضافہ ملے گا۔ تین سال کے بعد ایک سو بیس پر اضافہ ملے گا۔ تیس سال کے بعد ایک سو تیس پر اضافہ ملے گا۔ گویا مزید تاخیر کی صورت میں مزید زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ مزید برآں جو شارٹ ٹرم قرضے ہوتے ہیں جن میں بیشتر تجارتی قرضہ یا کمرشل لون ہوتے ہیں۔ ان میں تو یہ اضافہ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ ہر اعتبار سے اضعافا

مضاعفۃ کی تعریف میں آتا ہے۔ بنک سے رقم لینے والا عقد کے آغاز ہی میں زیادتی کی شرط تسلیم کرتا ہے۔ جب بنک سے لوگ قرض لیتے ہیں یعنی روایتی سودی بینکوں سے ایڈوانس لیتے ہیں تو پہلے ہی دن طے ہو جاتا ہے کہ اگر دس لاکھ روپے لینے ہیں تو دس لاکھ روپے پر بارہ لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے اور جو ادائیگی ہوتی ہے وہ اضافہ کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اور اگر رقم کی واپس ادائیگی میں تاخیر ہو تو پھر مزید اضافے کی شرط رکھی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ان دونوں کے درمیان تقابل کیا جائے۔ یعنی ربا الجاہلیۃ کی جو تفصیلات سیرۃ اور حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان کو اور بنک انٹرسٹ کو یا بنک سے قرض لینے والوں کے معاملات کو اگر تقابل کر کے دیکھا جائے تو وہ سارے عناصر جو ربا الجاہلیہ میں پائے جاتے تھے وہ سب مکمل طور پر موجود ہیں اور بنک انٹرسٹ میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔

شروع شروع میں بنک انٹرسٹ کے بارے میں اس کے بعض مظاہر کی وجہ سے بعض اہل علم کو اس باب میں تامل تھا کہ یہ سود ہے یا نہیں۔ بظاہر بنکوں کی رقوم سے کاروبار ہی ہوتا ہے، بظاہر بینکاری نظام کے نمائندگان یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کی رقمیں محفوظ رکھ کر ان کو کاروبار میں لگاتے ہیں۔ بینکاروں کے ان دعاوی کی بنیاد پر کچھ اہل علم نے شروع میں اس کو سود ماننے میں تامل کیا۔ لیکن اہل علم کی غالب ترین اکثریت کا بیسویں صدی کے آغاز سے ہی یہ طے شدہ فیصلہ تھا کہ یہ ربا ہے اور اس کے ربا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

ہمارے برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل سے بلکہ انیسویں صدی کے اواخر سے جید ترین اہل علم نے جو فتوے دیے ان میں بنک انٹرسٹ کو سود ہی قرار دیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جو غلط فہمیاں تھیں وہ سب ایک ایک کر کے دور ہوتی گئیں اور اب اس پر تقریباً اتفاق رائے ہے کہ بنک انٹرسٹ سود ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرب دنیا میں بعض حضرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بنک انٹرسٹ کو سود نہیں سمجھتے۔ کچھ کے بارے میں تو یہ خیال درست ہے۔ مثلاً سید رشید رضا، جن کی تحریریں بہت کثرت سے یہاں ہندوستان اور پاکستان میں پھیلائی گئیں۔ موجودہ شیخ الازہر، شیخ محمد سید طنطاوی بھی بنک انٹرسٹ کو ربا نہیں سمجھتے۔ یہ دو نمایاں لوگ ہیں جو بنک انٹرسٹ کو ربا سمجھنے میں تامل کرتے ہیں۔ تیسرا بڑا نام ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری کا لیا جاتا ہے جو واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے انتہائی بالغ نظر فقہاء میں سے تھے۔ ان کا شمار دور

جدید کے جید ترین اہل علم میں سے ہوتا ہے۔ انھوں نے فقہ اسلامی پر ایک نئے انداز سے بہت مجددانہ کام کیا ہے۔ ان کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ بار بار دہرایا ہے کہ وہ بنک انٹرسٹ کو سود نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ انھوں نے واضح طور پر اپنی کتاب ''مصادر الحق فی الفقہ الاسلامی'' کی جلد سوم میں لکھا ہے کہ بنک انٹرسٹ اور اس سے ملتے جلتے دوسرے منافع وہی ربا ہے جس کو قرآن کریم میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ سب منافع ربا کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔ انھوں نے جو یہ بات کہی تھی (اور یہ بات انھوں نے انیس سو پچاس کے لگ بھگ کہی تھی) کہ موجودہ حالات میں بنک انٹرسٹ چونکہ بہت عام ہو گیا ہے اس لیے فوری طور پر اس کو بالکلیہ ختم کرنا مشکل ہے۔ یقیناً اس وقت مشکل تھا۔ آج تک بہت سے مسلم ممالک بنک انٹرسٹ کو ختم نہیں کر سکے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا تھا، اس میں سود کو ختم کرنے کی بار بار کوشش ہوتی رہی ہے اور ہر کوشش بالکل آخری مرحلے پر جا کر ناکام بنا دی گئی۔ سودخواری کے علمبرداروں نے اور جدید بینکاری نظام کے پروردہ لوگوں نے اپنی کوششوں اور سازشوں سے ان کوششوں کو ناکام بنایا۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ اب دنیائے اسلام میں اس پر اتفاق رائے قائم ہو چکا ہے کہ بنک انٹرسٹ ربا ہی کی ایک قسم ہے۔ بنک انٹرسٹ کو مضاربہ سمجھنا یا مضاربہ کی کوئی قسم سمجھنا یہ ربا کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل بھی ہے اور مضاربہ کی حقیقت سے بے خبری کی بھی۔ قرض، مضاربہ، دین، بنک انٹرسٹ، یہ سب قانونی یا فقہی اصطلاحات ہیں۔ ان سب کے الگ الگ متعین مفہوم ہیں۔ ان متعین مفہوموں کا تعین قانون اور فقہ کی کتابوں کے ذریعے بارہا سینکڑوں مرتبہ کیا جا چکا ہے۔ اس سب کو نظر انداز کر کے کوئی صاحب محض اپنے منصب کی دھاک سے، محض اپنے زور بیان یا اپنے زور قلم سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ بنک انٹرسٹ ربا نہیں ہے۔ نہ صرف بہت بڑی جسارت ہے، بلکہ یہ ایک غیر علمی انداز ہے۔

قرض اور دین کو اس سیاق وسباق میں سمجھنا بہت ضروری ہے۔ قرض سے مراد ہر وہ رقم ہے جو کسی دوسرے شخص کو اس ذمے داری پر دی جائے کہ وہ مقررہ مدت کے بعد واپس کر دے گا۔ اور وہ واپس کر دینے کا ہر صورت میں ذمے دار ہے۔ اگر وہ رقم اس کے پاس سے ضائع ہو جائے، گم ہو جائے، چوری ہو جائے تو بھی وہ واپس کرنے کا پابند ہو۔ اس رقم کو قرض کہا جاتا ہے۔ اس معاملے کا جو نام بھی رکھا جائے گا یہ قرض ہی کہلائے گا۔ علامہ ابن قدامہ جو ایک مشہور حنبلی فقیہ ہیں،

انھوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ یہ مال میں تمھیں دے رہا ہوں تم اس سے تجارت کرو، اور اس کا نفع سارا کا سارا تمھارا ہوگا تو یہ قرض کہلائے گا، اس کو مضاربہ ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ اس لیے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شریعت کا بنیادی قاعدہ اور اصول ہے کہ ''**العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا الألفاظ و المباني**''۔ معاملات میں اور انسانوں کے درمیان لین دین میں اصل اعتبار مقاصد اور معانی کا ہوتا ہے، الفاظ اور عبارتوں کا نہیں ہوتا۔

لہٰذا جو رقم بنک کو دی جاتی ہے وہ قرض ہے۔ اس لیے کہ بنک اس کو ادا کرنے کا پابند ہے۔ بنک یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہماری برانچ میں ڈاکہ پڑ گیا، لہٰذا آپ کے پیسے ضائع ہو گئے۔ چونکہ بنک یہ نہیں کہہ سکتا اس لیے اس کو امانت نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ امانت کا لفظ بنکوں میں بار بار استعمال کیا جاتا ہے اور امانت کے لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ربا ہونے کے بارے میں شکوک پیدا کیے جاتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کسی چوری، ڈاکہ، آفت سماوی وغیرہ کے نتیجے میں اگر رقم ضائع ہو جائے اور اس حالت میں واجب الادا نہ ہو تو وہ امانت ہے، واجب الادا ہو تو قرض ہے۔ لہٰذا قرض اور دین میں اضافہ ہی اصل اور قدیم ربا ہے جو ہمیشہ سے ناجائز اور حرام سمجھا گیا۔ جب بھی ربا، سود، یا بیاج کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے یہی ربا مراد ہوگا۔

ربا ربا البیوع یا ربا الفضل، یہ اسلام کی اصطلاح ہے، اور اصل ربا کا راستہ روکنے کے لیے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ شریعت نے سد ذریعہ کا اصول ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی بڑی برائی کا راستہ روکنے کے لیے اس طرف جانے والے راستوں کی بھی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ اس اصول کو سد ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ اسلامی شریعت کا ایک طے شدہ اصول ہے۔

ربا الدیون یا ربا النسیئۃ چونکہ جاہلیت کے زمانے میں متعارف تھا، مشہور تھا، لوگ اس کو خوب اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے شریعت نے اس کی تفصیلات اور حقیقت کو بیان کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ سنت میں زیادہ توجہ ربا البیوع کی تفصیلات اور حقیقت کی وضاحت اور تشریح کرنے پر دی گئی۔ اس لیے کہ وہ نئی چیز تھی، ایک نئی حرمت نازل ہو رہی تھی۔ اس لیے احادیث میں جا بجا اس کی وضاحت کی گئی۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ربا الدیون یا ربا النسیئۃ، وہی معاملہ ہے جو

جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھا اور لوگ اس کو جانتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ ایک مقررہ رقم کسی شخص کو بطور قرض دے دیا کرتے تھے۔ اصل رقم باقی رہتی تھی اور ایک مقررہ ادائیگی ہر مہینے کر دی جاتی تھی۔ یہی آج کل بھی ہو رہا ہے، بنکوں کے بیشتر معاملات میں یہی ہوتا ہے۔ آپ پانچ لاکھ روپے جمع کروا دیں تو پانچ ہزار روپے آپ کو گھر بیٹھے ملیں گے، پانچ لاکھ آپ کے محفوظ رہیں گے۔ یہی چیز ہے جس کو ربا النسیئۃ کے طور پر امام رازی نے بیان کیا ہے۔ "**وذلك انهم كانوا يدفعون المال على ان ياخذوا كل شهر قدرا معينا و يكون راس المال باقيا**"۔ وہ لوگ کسی کو اپنا مال دے دیا کرتے تھے اس شرط پر کہ ہر مہینے مقررہ رقم ان کو ملتی رہے گی اور اصل سرمایہ یا قرض جوں کا توں باقی رہے گا۔ پھر جب اصل سرمایے کی ادائیگی کا وقت آتا تھا تو وہ شخص یا تو وہ اصل سرمایہ واپس کر دے۔ اور اگر واپس نہ کر سکے تو پھر واجب الادا رقم میں بھی اضافہ ہو جاتا اور مدت میں بھی اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہی وہ ربا ہے جو جاہلیت میں متعارف تھا اور اہل جاہلیت اسی کے مطابق سودی کاروبار کیا کرتے تھے۔

اس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ حلت اور حرمت کا تعلق معاملات کی حقیقت سے ہے، الفاظ اور عنوان سے نہیں۔ میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور یہ جملہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کا ہے کہ "اصل اہمیت عنوان کو نہیں مندرجات کو ہوتی ہے"۔ یہی بات علامہ ابن قیم نے ایک جگہ لکھی ہے۔ انھوں نے کہا ہے "**لقد تظاهرت ادلة الشرع و قواعده على ان القصود في العقود معتبرة**" کہ شریعت میں اور شریعت کے قواعد میں اس بات پر بے شمار دلائل اور شواہد و براہین موجود ہیں کہ معاملات میں نیت اور قصد ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ "**وانها تؤثر في صحة العقدو فساده و في حله و حرمته**"۔ قصد اور ارادے کا براہ راست کسی معاملے کی صحت اور فساد پر۔ کسی معاملے کے جائز اور ناجائز ہونے پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

ربا البیوع جس کو کہا گیا تھا، جس کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ربا السنۃ یا ربا الحدیث بھی کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ احادیث کے ذریعے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ ربا ہے جس کو ان مشہور احادیث میں حرام قرار دیا گیا۔ جن کے بموجب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**الذهب بالذهب و الفضة بالفضة و البربا لبر و الشعير بالشعير و التمر بالتمر و الملح بالملح يدا بيد مثلاً بمثل و الفضل ربا**"۔ اس مضمون کے بہت سے

الفاظ اور عبارتیں حدیث میں آئی ہیں۔ اس بات کو رسول اللہ ﷺ نے بار بار مختلف مجالس میں، مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا۔ اس لیے احادیث کی کتاب میں یہ مضمون بہت سے الفاظ میں آیا ہے کہ سونے اور چاندی، گندم، جو، کھجور اور نمک کی آپس کی لین دین صرف اس صورت میں جائز ہے جب ہاتھ در ہاتھ ہو اور بغیر کمی بیشی کے ہو۔ اس لیے کہ اگر کمی بیشی ہوئی یا مدت میں تاخیر ہوئی، واجب الادا مدت بعد میں رکھی گئی تو یہ ربا ہو جائے گا۔

فقہائے کرام میں اس پر تفصیلی گفتگو ہوتی رہی ہے کہ ان چھ اشیاء میں کیا خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ان کا آپس کا لین دین ان شرائط تک محدود رکھا گیا۔ سونے اور چاندی کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے مابین اتفاق رائے ہے کہ ان میں قدر مشترک ان دونوں کا قیمت اور زر ہونا ہے۔ ثمنیت یعنی ان دونوں کا زر ہونا اصل بنیاد ہے۔ ہر وہ چیز جو زر کی حیثیت رکھتی ہو اور لین دین کا ذریعہ ہو اس میں اس طرح کی کمی بیشی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ کرنسی یا کرنسی کے قائم مقام دستاویزات قابل بیع و شراء اور وہ تمام صکوک اور تمسکات جو دراہم و دنانیر کی حیثیت رکھتے ہوں ان سب میں قدر مشترک ثمنیت ہے اور ہر وہ چیز جو زر کی حیثیت رکھتی ہو اس میں کمی بیشی اور مدت میں تاخیر جائز نہیں ہے۔

اختلاف بقیہ چار چیزوں کے بارے میں ہے۔ اس پر بھی تقریباً اتفاق رائے ہے۔ ایک آدھ رائے جو اہل ظاہر کی ہے وہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ کم از کم ائمہ اربعہ کا اور تمام بڑے فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حرمت ان چار چیزوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام چیزوں میں پائی جائے گی جن میں وہ اوصاف پائے جائیں گے جو ان چار چیزوں میں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ چار چیزیں مدینہ منورہ میں بارٹر لین دین کا بہت بڑا اور اہم ذریعہ تھیں۔ یہی وہاں کی پیداوار بھی تھیں۔ اور مدینہ منورہ مین بارٹر لین دین اکثر انھی چار چیزوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس لیے احادیث میں خاص طور پر ان کا ذکر کیا گیا۔

امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل ان دونوں حضرات کے نزدیک اور تمام حنفی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک ہر وہ چیز جو تول کر یا گن کر بکتی ہو یا ناپ کر بکتی ہو اس پر یہی شرائط عائد کی جائیں گی۔ ہر وہ چیز جو مکیل اور موزون ہو اس کی آپس کی لین دین کمی بیشی کے ساتھ اور مدت کی تاخیر کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ امام مالک کے نزدیک ان چار چیزوں میں جو قدر مشترک ہے وہ ان کا

ذخیرہ کیا جا سکنا اور خوراک ہونا ہے۔ یعنی امام مالک کے نزدیک ہر وہ چیز جس کا انسان ذخیرہ کر سکے، آنے والے وقت کے لیے محفوظ رکھ سکے اور وہ انسان کی روزی کا ذریعہ بھی ہو، اس کی آپس کی لین دین کمی بیشی کے ساتھ اور مدت کی تاخیر کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ آج کل زر کی تعریف میں ادخار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کیل اور وزن سے مراد standard ہو گیا۔ گویا آج کل کی اصطلاح میں جو چیز standardized ہو اور ادخار یعنی جس کو store کیا جا سکتا ہو، store of value ہو، وہ بھی اس میں شامل ہے۔ امام شافعی ان تینوں فقہاء سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ اصول تمام کھانے پینے کی چیزوں پر منطبق ہوگا اس لیے کہ ان چار چیزوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب کھانے کی چیزیں ہیں۔ اس لیے ہر وہ چیز جو مطعومات میں شامل ہو، اشیائے خوردنی سے تعلق رکھتی ہو ان کی آپس میں خرید وفروخت کمی بیشی کے ساتھ اور مدت کی تاخیر کے ساتھ جائز نہیں ہوگی۔ جو چیزیں اشیائے خوردنی نہیں ہیں اور ان میں ثمنیت یا زر کی حیثیت بھی نہیں پائی جاتیں ان کی آپس کی خرید وفروخت یعنی بارٹر سیل امام شافعی کے نزدیک کمی بیشی کے ساتھ درست ہے۔

ربا کو شریعت نے کیوں حرام قرار دیا ہے؟ حرمت ربا کی حکمت کیا ہے؟ یہ سوال اگرچہ ایک مسلمان کو نہیں پوچھنا چاہیے۔ لیکن چونکہ کسی چیز کی حکمت اور مصلحت کو سمجھ لینے سے اس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے ائمہ اسلام نے ربا کی خرابیوں پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ربا کی خرابیاں اخلاقی بھی بیان کی ہیں، برائیاں معاشرتی بھی گنوائی ہیں اور قباحتیں معاشی بھی بتائی ہیں۔ ان خرابیوں پر سب سے زیادہ جامع کتاب جس شخصیت نے لکھی ہے اس کا تعلق خوش قسمتی سے ہمارے پاکستان سے ہے۔ پروفیسر شیخ محمود احمد مرحوم پاکستان کے مشہور ماہر تعلیم تھے اور اسلامی معاشیات سے ان کی دلچسپی بہت قدیم تھی۔ ان کی دلچسپی کے میدان دو تھے۔ معاشیات اور اقبالیات۔ ان دونوں موضوعات پر ان کا وقیع علمی کام ہے۔ اسلامی معاشیات کے موضوعات میں سود کے مسئلے سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور یہ بات ذاتی طور پر میرے علم میں ہے کہ وہ سود کے مسئلے پر کم وبیش چالیس سال غور کرتے رہے، مطالعہ بھی کرتے رہے۔ دوسرے اہل علم سے تبادلہ خیال بھی کرتے رہے۔ مجھے بھی ان سے ایک دو بار تبادلہ خیال کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس طویل غور وخوض اور مطالعے کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی Man and

Money جو بڑی جامع کتاب ہے۔اس کتاب کا ایک خلاصہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے چند سال قبل شائع کیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع پر انتہائی عالمانہ اور فاضلانہ کتاب ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تاریخ، مذہب، معاشیات، فلسفہ، ریاضی، غرض ہر فن کے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ربا کی تمام قسمیں اور شکلیں وہ تمام خرابیاں رکھتی ہیں جو اسلامی معاشرے کی اساس کو مختل کرنے کے مترادف ہیں۔ میں پوری دیانت داری سے علی وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ پروفیسر شیخ محمود احمد مرحوم کی یہ کتاب جدید اسلامی معاشیات کی تاریخ میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو امام غزالی کی کتاب ''تہافتۃ الفلاسفہ'' فکر اسلامی کی قدیم تاریخ میں رکھتی ہے۔

سود کی خرابیاں متقدمین نے بھی بیان کی ہیں، متاخرین نے بھی بیان کی ہیں۔قرآن کریم کی آیت ''یمحق اللّٰہ الربا و یربی الصدقات'' کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ سود کو ختم کرتا اور مٹاتا ہے۔سود کی نتیجے میں جو اضافی دولت حاصل ہوتی نظر آتی ہے اللّٰہ تعالیٰ اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور صدقات میں اضافہ کرتا ہے۔اس کی تفسیر میں مفسرین نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سود بالآخر زوال کا باعث ہوتا ہے۔سود کے نتیجے میں عارضی ترقی تو بہت ہو جاتی ہے۔ بظاہر خوشحالی قائم ہو جاتی ہے۔لیکن بالآخر معیشتیں تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یہ تباہی کبھی تو بہت جلدی آجاتی ہے، چالیس پچاس سال بعد ہی آجاتی ہے۔کبھی اس کے ظہور میں عرصہ لگتا ہے، سو دو سو سال لگتے ہیں۔آج کل چونکہ بہت بڑی بڑی معیشتیں ہوگئی ہیں۔کھربوں ڈالر پر مبنی معیشتیں قائم ہیں بلکہ اتنے ڈالر اور پونڈوں پر مبنی ہیں جن کو گننے کے لیے اردو میں ہندسہ نہیں ہے۔سینکڑوں ہزاروں کھرب ڈالر پر مبنی معیشتیں ہیں۔اس لیے ان بڑی بڑی معیشتوں کے بیٹھنے میں وقت لگتا ہے۔چھوٹی کشتی یا ناؤ جلدی ڈوب جاتی ہے۔ بڑا جہاز ڈوبنے میں بھی مہینے اور ہفتے لگاتا ہے۔لیکن ڈوبنا بالآخر سودی معیشت کے بادبانوں سے چلنی والی کشتی کا مقدر ہوتا ہے۔

سود معاشی انصاف کے راستے میں بہت بڑی بلکہ شاید سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا تھا کہ دولت کا ارتکاز ایک طبقے میں نہیں ہونا چاہیے ''کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم''۔سود اس حکم کے راستے میں واضح طور پر رکاوٹ ہے۔سود کے نتیجے میں دولت کا ارتکاز ہوتا ہے۔سود قرآن کریم کے اس واضح حکم سے ٹکراتا ہے۔سود کے نتیجے میں معاشی

انصاف ختم ہو جاتا ہے۔ معاشی انصاف کے راستے میں جو بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں ان میں سے ایک سودی کاروبار اور لین دین بھی ہے۔ سودی کاروبار میں ٹریڈ سائکل ناگزیر ہے۔ ہر نظام میں جو سود پر چلتا ہو ایک ٹریڈ سائیکل یعنی تجارتی چکر کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ چکر پورا ہوتا ہے اور تباہی آ جاتی ہے۔ پھر دوسرا چکر شروع ہوتا ہے پھر اس کا نتیجہ خرابی کی شکل میں نکلتا ہے۔ پھر تیسرا چکر شروع ہوتا ہے۔

خود مغربی معاشیات کی تاریخ ترقی کے ان سارے دعووں کے باوجود اور اتنی بڑے حجم کے باوجود اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اس میں پچھلے سو پچاس سالوں میں جو جو چکر آئے ہیں وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ مزید خرابی جو پیدا ہوتی ہے وہ fiat money کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ فیٹ منی یعنی کاغذی کرنسی یا فرضی زر، زر کاغذی اور سود، یہ دونوں مل کر قیامت برپا کر ڈالتے ہیں۔ زر کاغذی ایک تو وہ ہوتا ہے جو ریاست جاری کرتی ہے۔ وہ پھر غنیمت ہے۔ اس کی خرابیاں بھی نسبتاً کم ہیں۔ لیکن ایک زر کاغذی وہ ہوتا ہے جو ریاست جاری نہیں کرتی۔ لیکن اس کی حیثیت بھی عملاً زر کاغذی کی ہو جاتی ہے۔ جو کاغذات قابل بیع وشراء ہوتے ہیں۔ جن کے پیچھے اصل رقم تو صرف برائے نام ہوتی ہے۔ بعض اوقات پانچ فیصد بھی نہیں ہوتی۔ پانچ فیصد رقم کے مقابلے میں سو فیصد محض کاغذوں اور تجارتی دستاویزات کی بنیاد پر کاروبار ہو رہا ہوتا ہے اگر کہیں سے اس پانچ فیصد کو نقصان ہو جائے تو وہ 95 فیصد کاروبار فوراً بری طرح بیٹھ جاتا ہے۔ چونکہ ساری رقم فرضی رقم ہوتی ہے۔ کاغذی طور پر دوگنی سے چارگنی، چارگنی، آٹھ گنی، سولہ گنی اور اس طرح سینکڑوں گنا ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے ڈوبتی بھی بہت جلدی ہے۔ لوگوں کو یہ ترقی تو بہت نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اس ترقی کے غبارے میں کہیں سوراخ ہو جائے تو اس کے نتیجے میں چشم زدن میں قرآن کے الفاظ میں "بین عشية و ضحاها" یہ سارہ غبارہ بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی اس آیت کی واضح تفسیر ہے۔ "یمحق الله الربا و یربی الصدقات"۔

پھر ربا کی خرابیاں محض معیشت تک محدود نہیں ہیں۔ اس کے نتیجے میں۔ اگر افراد کے درمیان ہو خاص طور پر۔ آپس میں جو بغض اور عناد پیدا ہوتا ہے وہ ایک واضح حقیقت ہے۔ جہاں افراد کے درمیان کشاکش اور بغض اور عناد کا پیدا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو سود خوری میں انتہا تک پہنچ گیا ہو۔

قرآن کریم نے جس معروف کا حکم دیا ہے وہ معروف سود کے نتیجے میں ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم جس لین دین کا حکم دیتا ہے اس کی بنیاد آپس میں بھائی چارے پر، محبت پر، تکافل پر، ہمدردی اور مساوات پر ہونی چاہیے۔ یہ تصورات سودی معیشت میں بے معنی ہیں۔ دنیائے سود میں ان تصورات کو عرصہ ہوئے دیس نکالا دیا جا چکا ہے۔ برادرانہ تعاون خودغرضی کے اس ماحول میں ناقابل تصور ہوتا ہے۔ سودخوار کا رویہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے۔ اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی۔ نہ ماضی کے ہندو سودخوار بنیے کو بحث ہوتی تھی، نہ موجودہ دور کے اداراتی یعنی institutional سودخوار کو بحث ہوتی ہے کہ مقروض پر کیا گزر رہی ہے اور اس کا کاروبار کس حال میں ہے۔ انسانی رویہ اس پورے کاروبار میں بے معنی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر ایک خاص بات جو بہت سے ماہرین معیشت نے لکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سودی معیشت کے نتیجے میں بے روزگاری اور بے کاری بڑھ جاتی ہے۔ جہاں کوئی تجارت کام کر رہی ہو، کوئی صنعت حقیقی طور پر لگائی جا رہی ہو، کوئی واقعی ترقی ہو رہی ہو، جس کے نتیجے میں اصل اثاثہ جات پیدا ہو رہے ہوں وہاں تو تجارتی سرگرمی پھیلتی ہے اور بڑھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت کی گردش بھی تیز ہوتی ہے، دولت کا پھیلاؤ بھی عام ہوتا ہے اور روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں ساری ترقی فرضی اور کاغذی ہو وہاں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جہاں نہ حقیقی صنعت ہے، نہ حقیقی تجارت ہے۔ نہ حقیقی خدمات پیدا ہو رہی ہیں تو وہاں روزگار کہاں سے پیدا ہوگا۔

پھر جو شخص سودی رقم کھانے کا عادی ہو جاتا ہے اس کے مزاج میں کام اور محنت سے فرار کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر سودخوار کو گھر بیٹھے دولت مل رہی ہو تو اس کو محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو دماغ سوزی کی کیا ضرورت ہے۔ اسے نئی صنعتیں اور انڈسٹری لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب دردسر کے کام ہیں۔ وہ جوئے سے اور سودخوری سے مزید دولت پیدا کرتا چلا جائے گا۔ اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتا چلا جائے گا۔

پھر سودی معیشت جہاں جہاں پھیلتی ہے وہاں تجارت سے بے توجہی پیدا ہوتی ہے۔ صنعت اور زراعت سے بے توجہی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی واضح مثال ہے کہ جو لوگ سود خواری میں زیادہ نمایاں ہیں وہ نہ زراعت میں دلچسپی رکھتے ہیں، نہ صنعت میں، نہ تجارت میں۔

اس لیے کہ ان کو زراعت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی، صنعت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی، تجارت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی، جتنی آمدنی گھر بیٹھے سود کے نتیجے میں ہو جاتی ہے۔

مزید برآں یہ تو ہر شخص مانتا ہے کہ سودی معیشت ضرورت مند کی ضرورت کا استحصال ہے۔ خاص طور پر اگر سودی قرضہ صرفی قرضہ ہو، ذاتی اور شخصی ضروریات کے لیے ہو۔ اس میں تو استحصال کے ہونے پر خود سود خوار بھی متفق ہیں اور مانتے ہیں کہ یہ استحصال کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن جو تجارتی قرضے ہیں وہاں بھی شدید استحصال کا عنصر پایا جاتا ہے۔

شریعت کا مزاج یہ ہے کہ تجارت اور کاروبار لوگوں کی آپس کی رضامندی سے ہو۔ شفاف انداز سے ہو۔ عدل وانصاف کے ساتھ ہو۔ ہر شخص کو اس کی محنت کا مکمل پھل ملے۔ جو جتنا سرمایہ لگائے اتنا اجر اس کو ملے۔ ایک شخص اپنی محنت داؤ پر لگائے، دوسرا شخص اپنا سرمایہ داؤ پر لگائے۔ دونوں کی کوئی نہ کوئی چیز داؤ پر لگی ہو اور دونوں کی کوششوں سے جو تجارت یا کاروبار یا مشینری چلے۔ پھر اس کا نفع اعتدال اور عدل کے ساتھ مناسب انداز میں تقسیم ہونا چاہیے۔

شریعت نے غبن فاحش کو حرام قرار دیا ہے۔ غبن فاحش سے مراد نفع خوری کی وہ صورت ہے جو بازار کے عام رواج اور بھاؤ سے اتنی مختلف ہو کہ اس کا اندازہ لگانے والے اندازہ نہ لگا سکیں۔ "**مالا یدخل فی تقویم المقومین**" اس کی مختلف وضاحتیں فقہائے اسلام نے اپنے اپنے زمانے کے عرف کے لحاظ سے کی ہیں۔ مثلاً زمین اور جائداد کی قیمت میں اگر اضافہ بیس فیصد سے زائد ہو تو سمجھا جائے گا کہ یہ غبن فاحش ہے۔ ایک زمین کسی جگہ ایک لاکھ روپے کی کنال ملتی ہے۔ وہاں کوئی شخص ایک لاکھ بیس ہزار کی فروخت کرے گا تو سمجھا جائے گا کہ غبن فاحش ہے۔ ایک لاکھ پانچ ہزار، ایک لاکھ دس ہزار کا فرق گوارا سمجھا گیا۔ اس لیے کہ اتنا فرق تو فطری ہے اور اس طرح کے کاروبار میں ہوتا ہے۔ اس مثال سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غبن فاحش سے مراد منافع خوری کی وہ صورت ہے جو عدل وانصاف کے رائج الوقت تصورات اور شریعت کے احکام سے متعارض ہو۔

موجودہ ربوی نظام میں اور سودی نظام میں جگہ جگہ غبن فاحش کی برائی پائی جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بنک سے قرض لیتا ہے اور اس کا کاروبار یا صنعت خوب چلتی ہے۔ لیکن وہ بنک کو دس فیصد، بارہ فیصد سود دے رہا ہے، تو یہ بھی غبن فاحش ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ شراکت ہے تو شراکت

میں دونوں فریقوں کے نفع میں کوئی مناسبت ہونی چاہیے۔ ایک شخص سو روپے کے دو سو کما رہا ہے۔ خود نوے رکھتا ہے دوسرے کو دس دیتا ہے۔ یہ یقیناً غبن فاحش ہے۔

صنعت کی بعض قسمیں وہ ہیں جس میں منافع کی شرح اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ چمڑے کے ایک بڑے ماہر نے مجھے بتایا تھا۔ وہ پاکستان میں چمڑے کے بہت بڑے ماہر تھے، دنیا بھر چرم سازی کے امور میں مشورے کے لیے بلائے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ پاکستان میں جو جوتا بنتا ہے، باٹا کمپنی بناتی ہے۔ اس کی مالیت پاکستان میں ڈیڑھ یا دو روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ بات مجھے انھوں نے سن انیس سو اسی میں بتائی تھی۔ باٹا کمپنی اس جوتے کو پاکستان میں اس زمانے میں کم از کم چالیس پچاس روپے سے لے کر سو ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرتی تھی۔ اگر ان کا یہ اندازہ صحیح تھا، اس طرح کے اور اندازے بھی میں نے سنے ہیں جو ماہرین نے بتائے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غبن فاحش کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بنک اور بنک کے ہزاروں کھاتہ داروں کو ان کے دس بارہ فیصد سود پر مطمئن کر کے بٹھا دیا جائے اور باقی جتنا منافع ہو وہ سارا کا سارا ایک فریق کے پاس چلا جائے۔

یہ غبن فاحش کی محض ایک قسم ہے۔ دوسری قسمیں اور صورتیں غبن فاحش کی اور بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ وہ چند اہم خرابیاں ہیں جو سود میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے شریعت نے سود کو ناجائز اور تجارت کو جائز قرار دیا ہے۔

ربا اور بیع دونوں کو شریعت نے ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ جہاں ربا کو حرام قرار دیا ہے وہاں بیع کو اس کے متبادل کے طور پر بیان کیا ہے۔ گویا ربا کا اصل متبادل تجارت ہے۔ تجارت میں لین دین اور کاروبار کی وہ تمام شکلیں شامل ہیں جو عدل و انصاف کے مطابق ہوں۔ اور جن کی شریعت نے اجازت دی ہو۔ جن میں نفع نقصان میں یکساں مشارکت پائی جاتی ہو۔ جن میں کسی فریق کا حق مجروح نہ ہو۔ کسی فریق کو ناجائز ذخیرہ اندوزی یا ناجائز نفع خوری کا موقع نہ ہو۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں حقیقی تجارت، حقیقی صنعت یا حقیقی اثاثہ جات پیدا ہو رہے ہوں۔ جس کے نتیجے میں معاشی سرگرمی فروغ پا رہی ہو۔ جس کے نتیجے میں معاشی ترقی ہو رہی ہو اور ہوتی نظر آ رہی ہو۔

یہ سب معاملات تجارت اور بیع میں یقینی طور پر ہوتے ہیں۔ ربا اور بیع میں زمین آسمان

کا فرق ہے۔قرآن کریم میں ایک جملے میں ان تمام خرابیوں کو ناجائز قرار دیا جن میں سے بعض کی میں نے نشاندہی کی۔اوران تمام خوبیوں کی پسندیدگی بیان فرمائی جو تجارت میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے قبل تجارت پر گفتگو کرتے ہوئے میں یہ بات کہہ چکا ہوں کہ تجارت انبیاء علیہم السلام کا پیشہ رہا ہے۔رسول اللہ ﷺ تاجر امین تھے۔آپ کے کبار صحابہ تاجر امین تھے۔ چونکہ آپ کی شریعت کو ایک ایسے دور میں عالمگیر نظام کی صورت میں سامنے آنا تھا، جہاں عالمگیر تجارت اور عالمگیر معیشت کا دور ہوگا۔ جہاں globalized economy کا دور دورہ ہوگا۔ وہاں تجارت کی بنیاد پر جو معاشی ترقی جنم لے گی وہی کامیاب رہے گی۔ربا کی بنیاد پر جو معیشت بنے گی وہ ناکام رہے گی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت نے روزِ اوّل سے تجارت کو اہمیت دی اور اس کے عادلانہ احکام تفصیل سے عطا کیے۔

یہی خلاصہ ہے آج کی گفتگو کا۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

آٹھواں خطبہ

ربا اور سود کے اسلامی متبادلات

آٹھواں خطبہ

ربا اور سود کے اسلامی متبادلات

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلي على رسوله الكريم و علىٰ اله و اصحابه اجمعين

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''ربا اور سود کے اسلامی متبادلات''۔ جہاں تک سود اور ربا کے متبادل کا سوال ہے۔ یہ اتنا مشکل اور اہم مسئلہ نہیں ہے جتنا اس کو سمجھ لیا گیا ہے، یا بعض حضرات نے بنا دیا ہے۔ آج اگر دنیا میں ہر جگہ سودی نظام کارفرما نظر آتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسانیت سودی نظام کے علاوہ کسی اور نظام سے کبھی مانوس ہی نہیں تھی۔ دنیا کے بیشتر علاقوں میں، انسانی تاریخ کی بیشتر تہذیبوں میں غیر سودی نظام ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ تاریخ کے ہر دور میں سود خوری کی عادت بد بھی موجود رہی ہے یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد سود اور ربا سے اجتناب کرتی چلی آرہی ہے۔ اور اس اجتناب کے ساتھ ساتھ تجارت اور کاروبار کے تمام تقاضے بھی پورے کرتی آئی ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ سود کا متبادل تلاش کرنا کوئی ایسا کار مشکل ہے کہ جو بہت کوشش کا متقاضی ہے درست نہیں ہے۔ نہ سود کا متبادل کوئی ایسا عنقا ہے کہ جس کی تلاش ایک بہت دشوار کام ہو۔

خود اسلام کی تاریخ میں کم از کم ابتدائی بارہ سو سال کا زمانہ بلا سودی معیشت کا دور ہے۔ مسلمانوں نے برصغیر کے مشرقی صوبوں سے لے کر مراکش تک اور سائبیریا کی حدود سے لے کر سوڈان اور زنجبار تک حکومت کی۔ اس پورے علاقے کا نظام چلایا اور یہ سارا نظام غیر سودی

بنیادوں پر کارفرما رہا۔ مسلمانوں کے حلقوں میں سود خوری کی شکایت اگر کبھی رہی تو عموماً یہودیوں سے ہوئی یا ہندوستان کے بنیوں سے ہوئی۔ لیکن عمومی طور پر اسلامی تاریخ سے یہی پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کا نظام غیر سودی طریق کار پر کار بند رہا ہے۔

قرآن مجید نے ایک مختصر سے جملے میں سود کا متبادل واضح کر دیا ہے۔ ''احل اللّٰه البیع و حرم الربا'' ۔ اللّٰہ تعالیٰ نے تجارت، کاروبار اور خرید وفروخت کو جائز ٹھہرایا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سود کے معاشی متبادلات میں وہ تمام امور شامل ہیں جن کا تعلق تجارت کے فطری اور آزادانہ طریقے سے ہو۔ آزاد اور فطری طریقے سے عدل وانصاف کے مطابق جو بھی تجارت کی جائے گی وہ سود کا متبادل قرار پائے گی۔ قرآن کریم نے بیع کا لفظ استعمال کیا ہے جو تسمیۃ الکل باسم الجزء کی ایک مثال ہے۔ چونکہ کاروبار اور تجارت کی بہت بڑی شکل بیع ہے۔ بلکہ شاید سب سے بڑی شکل بیع ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے بیع یعنی خرید وفروخت کو بطور عنوان کے اختیار فرمایا۔

ائمہ احناف نے بیع کی تعریف کی ہے ''مبادلة المال بالمال بالتراضی'' ۔ جب دو فریق آپس کی رضامندی سے ایک مال کا تبادلہ دوسرے مال سے کرتے ہیں تو اس کو بیع کہا جاتا ہے۔ اسی کا نام تجارت ہے۔ اسی کا نام کاروبار ہے۔ اسی کا نام بزنس ہے۔ اسی کا نام سرمایہ کاری ہے۔ آپ ایک شخص کو نقد رقم دے رہے ہیں جو آپ کا مال ہے، اس سے انڈسٹری خرید رہے ہیں جو اس کا مال ہے۔ آپ انڈسٹری سے نیا مال تیار کر رہے ہیں، لوگ آ کر آپ سے خرید رہے ہیں۔ وہ اپنا مال آپ کو دے رہے ہیں، آپ اپنی پیداوار ان کو دے رہے ہیں۔ غرض سرمایہ کاری اور تجارت کی جتنی بڑی بڑی صورتیں ہیں ان سب میں خرید وفروخت کا عنصر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے بیع کا لفظ استعمال کر کے یہ واضح اشارہ بھی دیا ہے کہ تجارت اور لین دین کی بنیاد مال پر یعنی حقیقی اثاثہ جات پر ہونی چاہیے۔ محض وہمی بنیاد پر، محض قرضوں کی بنیاد پر کاروبار اور سرمایہ کاری کا عمل نہیں ہونا چاہیے۔

بیع کی جو تعریف ائمہ احناف نے کی ہے بقیہ فقہاء کی تعریفیں بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔ الفاظ کا اختلاف ہے۔ مفہوم اور مدعا سب کا ایک ہے۔ مثال کے طور پر مشہور شافعی فقیہ علامہ رملی نے جن کو الشافعی الصغیر بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بیع تعریف یہ کی ہے کہ بیع

سے مراد وہ عقد ہے جس میں متعلقہ شرائط کے ساتھ مال کا مقابلہ مال سے کیا جائے۔

احادیث میں تجارت اور کاروبار کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں، جو بہت تفصیلی ہدایات ہیں۔ان میں زیادہ زور بیع پر ہی دیا گیا ہے۔محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں بیوع کا عنوان اختیار کیا ہے۔لیکن مراد ان کی تجارت اور کاروبار ہی ہے۔بعض محدثین نے مثلاً امام ابن ماجہ نے تجارات کا عنوان اختیار کیا ہے اور اس میں بیع کے احکام کو بیان کیا ہے۔

تجارت، بیع اور کاروبار کے بارے میں ایک بنیادی بات جو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس کو یہاں بھی یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ لین دین، میں تجارتی اور دیوانی معاملات میں، اصل جواز ہے۔''الأ صل في المعاملات الا باحة''۔اس کے معنی یہ ہیں کہ کاروبار کی ہر قسم، لین دین کی ہر قسم جائز ہے۔بشرطیکہ وہ ان حرام عناصر سے پاک ہو جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔اس لیے جدید نوعیت کے جتنے معاملات ہیں چاہے وہ کسی روایتی عربی اسلامی اصطلاح کے تحت آسکتے ہوں یا نہ آسکتے ہوں۔وہ سب جائز ہیں، بشرطیکہ وہ قرآن کریم اور احادیث کی نصوص سے متعارض نہ ہوں۔اور ان متفق علیہ قواعد سے متعارض نہ ہوں جو فقہائے اسلام قرآن کریم اور سنت سے اخذ کیے ہیں۔

یہ بات کہ معاملات میں اصل اباحت ہے تجارت اور کاروبار میں بہت آزادی فراہم کرتی ہے۔اس سے تجارت اور کاروبار سے وابستہ لوگوں کو اتنا کھلا میدان مل جاتا ہے کہ وہ اپنی تجارت کے لیے جو جو صورتیں فرض کرنا چاہیں، جو جو شکلیں تجویز کرنا چاہیں، دنیا میں رائج طریق کار جہاں جہاں سے بھی حاصل کرنا چاہیں وہ حاصل کرنے میں آزاد ہیں۔شریعت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بشرطیکہ وہ ان محرمات سے پاک ہوں جن کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر اس میں ربا نہ ہو، اس میں قمار نہ ہو، غرر نہ ہو، وغیرہ وغیرہ یہ اصول فقہائے اسلام نے قرآن کریم کی متعدد ہدایات سے اور متعدد احادیث سے اخذ کیا ہے۔ایک مشہور حدیث جس کو امام بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے، اور بھی متعدد محدثین کے یہاں وہ روایت ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا''المسلمون علی شروطهم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما''مسلمان آپس میں جو شرائط طے کرنا چاہیے وہ کر سکتے ہیں، جس طرح کا معاملہ اور جو کاروبار کرنا چاہیں، جن شرائط کے ساتھ طے کرنا چاہیں طے کر سکتے ہیں، ان کو اجازت ہے۔البتہ

وہ کوئی ایسی شرط نہیں رکھ سکتے جو شریعت کے کسی حلال کو حرام کردے یا شریعت کے کسی حرام کو جائز قرار دے دے۔ یعنی شریعت کے محرمات اور منہیات کا لحاظ رکھتے ہوئے، شریعت کے واجبات کو سامنے رکھتے ہوئے تجارت اور کاروبار کی ہر صورت جائز ہے۔ مثلاً خرید وفروخت کے لیے ضروری ہے کہ مال متقوم ہو۔ مال متقوم میں شراب اور خنزیر شامل نہیں ہیں۔ اس لیے شراب اور خنزیر کے علاوہ جس چیز کی بیع ہوگی، جس چیز کو مسلمان مال سمجھتے ہوں اور اس کو حاصل کرنا چاہتے ہوں، جس کی طرف لوگوں کی توجہ اور میلان ہو، وہ تجارت اور کاروبار کی بنیاد بن سکتی ہے۔

تجارت اور کاروبار کی جو صورتیں تجارتی حلقے وضع کرنا چاہیں وہ وضع کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے محرمات کی خلاف ورزی نہ کرتی ہوں۔ ان محرمات سے بچنے کے لیے شریعت کے احکام کی پابندی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان عمومی قواعد کا لحاظ رکھا جائے جو فقہائے اسلام نے پیش نظر رکھے ہیں۔ ان قواعد کی تفصیل تجارت کے احکام کے عنوان سے اور قرآن کریم اور احادیث کے نصوص کے حوالے سے بیان کی جا چکی ہیں۔

دوسرا اصول معاملات میں یہ ہے کہ شریعت نے جتنے احکام دیے ہیں وہ، جتنے محرمات بیان فرمائے ہیں وہ، اور جن جن چیزوں کی مسلمانوں سے توقع کی جا سکتی ہے وہ، یہ سب وہ امور ہیں جن کی بنیاد انسانوں کی مصلحتوں اور انسانوں کے فائدے پر ہے۔ "**المعاملات تبنی علی مراعاة العلل والمصالح**"۔ جن چیزوں کو شریعت نے مصلحت قرار دیا ہے، جو جو چیزیں انسانوں کے مفاد اور مصلحت کے مطابق ہیں اور شریعت سے متعارض نہیں ہیں ان کا لحاظ معاملات میں رکھنا چاہیے۔ یعنی عامۃ الناس کی جان کو محفوظ رکھنے والے معاملات، عامۃ الناس کو تحفظ فراہم کرنے والے معاملات، عامۃ الناس کے لیے وسائل زرق مہیا کرنے والے معاملات، عامۃ الناس کی زندگی میں سہولتیں پیدا کرنے والے معاملات، لوگوں کے معیار زندگی کو جائز حدود کے اندر بہتر بنانے والے معاملات، ان سب کی رعایت، تجارت اور کاروبار کے طور طریقوں میں رکھی جائے گی۔ اور کوئی ایسا کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جن سے ان مقاصد کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی طبقہ ایسا کوئی کاروبار کرنا چاہے، کوئی ایسی چیز فروخت کرنا چاہے، جو عامۃ الناس کی صحت کے لیے مضر ہو تو یہ درست نہیں ہوگا اور ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ

اس کو کنٹرول کرے۔ اگر کچھ لوگ ایسے مشروبات رائج کرنا چاہتے ہیں اور ان کی تجارت کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی ریاست کے باشندوں کی صحت پر اثر پڑتا ہو یا ریاست کی معاشی خودمختاری متاثر ہوتی ہو تو ریاست مداخلت کر کے ان معاملات کو روک سکتی ہے۔ مصلحت اور علت کی مثالیں بیان کی جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لیے میں ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

تیسرا بڑا اصول یہ ہے کہ معاملات اور لین دین کے قواعد طے کرتے ہوئے اس علاقے اور اس زمانے کے عرف و عادت کو سامنے رکھا جائے گا۔ ہر علاقے کے لوگوں کا ایک عرف اور ایک رواج ہوتا ہے۔ کاروباری طبقے کا ایک رواج ہوتا ہے۔ وہ رواج اگر شریعت اور عدل و انصاف سے متعارض نہیں ہے، اخلاق اور حیا کے تقاضوں کے منافی نہیں ہے تو شریعت اس کو تسلیم کرتی ہے۔ لہٰذا ایسے ہر رواج کو تسلیم کیا جائے گا اور احکام اسی کی بنیاد پر مرتب کیے جائیں گے۔ مثال کے طور پر قواعد شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر خرید و فروخت واضح طور پر ایجاب اور قبول کی بنیاد پر ہو۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ قرآن کریم میں تراضی کا جو اصول دیا گیا ہے اس کا عملی تقاضا بھی یہی ہے کہ واضح طور پر ایجاب و قبول فریقین کے درمیان پایا جانا چاہیے۔ لیکن جب فقہائے اسلام نے یہ دیکھا کہ بازار کا عرف اور رواج ہر جگہ یہ ہے کہ جن سودوں کی قیمتیں متعین ہوتی ہیں، جن میں کوئی بھاؤ تاؤ نہیں کرنا پڑتا، وہاں خریدار آتا ہے، قیمت دوکاندار کے سامنے رکھتا ہے اور چیز اٹھا کر چلا جاتا ہے۔ نہ دوکاندار خریدار سے کچھ کہتا ہے اور خریدار دوکاندار سے کچھ بولتا ہے۔ اس لیے فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا۔ اس لیے کہ یہ بیع فریقین کی مکمل باہمی رضامندی سے ہو رہی ہے۔ شریعت کا جو اصول تراضی کا ہے وہ یہاں مجروح نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے اس اصول کو یقینی بنانے کے لیے جو قواعد فقہاء نے مقرر کیے تھے ان قواعد کی یہاں ضرورت نہیں پڑی۔

فقہی احکام و قواعد فقہاء نے شریعت کے اصولوں پر عمل درآمد کے لیے مرتب کیے ہیں۔ شریعت کے اصولوں کو مجروح یا نظر انداز کرنے کے لیے فقہی احکام و قواعد مرتب نہیں کیے گئے۔ یہ بڑی اہم بات ہے، اور اس کو یاد رکھنا چاہیے، کہ اصل چیز شریعت کے اصول اور احکام ہیں۔ شریعت کے اصول اور احکام پر عمل درآمد کے لیے، ان کو یقینی بنانے کے لیے اور ان احکام کی پشت پر کارفرما مقاصد کو روبہ عمل لانے کے لیے فقہائے اسلام نے مسائل مدون فرمائے ہیں۔ یہ مسائل اسی وقت تک کارآمد ہیں جب تک ان کے ذریعہ احکام شریعت پر عمل ہو سکے اور شریعت

کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ جب یہ تفصیلی مسائل جو فقہاء نے مرتب کر کے کتابوں میں اور اپنے فتوؤں کے ذریعہ کتب فتاویٰ میں مدون کیے ہیں شریعت کے احکام پر عمل درآمد نہ کرا سکیں، ان کے ذریعے شریعت کے مقاصد کی تکمیل نہ ہو سکے تو پھر ان مسائل پر نظر ثانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

بعض اوقات عرف و عادت کے بدل جانے سے مسائل بدل جاتے ہیں۔ رواج کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ وہ احکام نہیں بدلتے جن کا صراحت کے ساتھ قرآن مجید یا سنت میں ذکر ہے۔ بلکہ وہ احکام بدل جاتے ہیں جن کی بنیاد انسانوں کی فہم یا کسی مقامی عرف و رواج پر ہے۔ اسی لیے فقہائے اسلام کو تجارتی عرف و رواج سے آگاہ ہونا چاہیے۔ تجارت کے عرف و رواج سے آگاہی حاصل کیے بغیر جو مسائل مرتب کیے جائیں گے، وہ مسائل عملی مسائل نہیں ہوں گے۔ ان کی حیثیت ایک نظری رائے سے زیادہ نہیں ہوگی اور ان پر عمل درآمد میں کاروباری حضرات کو مشکل پیش آئے گی۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے جب تجارت اور کاروبار کے احکام مرتب فرمائے تو پہلے انھوں نے تجارت اور کاروبار کے طریقوں سے واقفیت حاصل کی۔ امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طرز عمل اور رویہ میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ جس زمانے میں وہ بیوع اور کاروبار کے احکام مرتب فرما رہے تھے، اس زمانے میں وہ روزانہ ایک مقرر وقت پر بازار تشریف لے جایا کرتے تھے اور بازار میں کچھ دیر بیٹھ کر تاجروں کو تجارت کرتے دیکھتے تھے۔ خریداروں کو خریداری کرتے دیکھتے تھے۔ بیچنے والوں کو اپنی چیزیں بیچتے ہوئے ملاحظہ فرماتے تھے۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے کہ تاجر تجارت کیسے کرتے ہیں۔ بازار میں کون کون سے طریقے رائج ہیں اور سرمایہ کاری کے کون کون سے انداز بازار میں مروج ہیں۔

آج کل کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ تجارت اور سرمایہ کاری کے اسلامی احکام مرتب کریں ان کو دور جدید کا علم تجارت یعنی کامرس، دور جدید کے انتظامی معاملات یعنی بزنس ایڈمنسٹریشن، معاشیات اور ملک کے مالیاتی اور تجارتی قوانین سے بقدر ضرورت واقفیت ہونی چاہیے۔ اسی لیے میں وقتاً فوقتاً یہ گزارش کرتا رہتا ہوں کہ دینی تعلیم کے نصاب میں، وہ دینی تعلیم مدارس میں ہو رہی ہو، یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہو یا کالجوں میں ہو رہی ہو۔ دینی تعلیم کے متخصصانہ نصاب میں رائج الوقت قانون، معاشیات، رائج الوقت سیاسیات اور دستوری تصورات،

علم تجارت اور علم انتظامیات کو بقدر ضرورت شامل کیا جانا چاہیے۔ بقدر ضرورت کی قید اس اس لیے لگانی ضروری ہے کہ ان اداروں کا اصل تخصص اسلامی علوم وفنون ہیں۔ یہاں علوم حدیث، علوم تفسیر اور علوم فقہ ہی میں تخصص کے لیے لوگ آنا چاہتے ہیں اور اسی کے لیے آنا چاہیے۔ لیکن حدیث، فقہ اور تفسیر کے تخصص کو دور جدید میں روبہ عمل لانے کے لیے، پاکستان کے مسلمانوں کی زندگیاں اس کے مطابق ڈھالنے میں مدد دینے کے لیے، ضروری ہے کہ آج کے علمائے قرآن، آج کے علمائے حدیث اور آج کے فقہاء کو آج کل کے محاورے سے واقفیت ہو۔ آج کل کے مسائل اور مشکلات سے کماحقہ آگاہی ہو۔

معاملات کی چوتھی بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ شریعت کے دوسرے احکام کی طرح معاملات میں بھی دو پہلو پائے جاتے ہیں۔ ان معاملات میں خالص قانونی اور عدالتی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ اور خالص دینی، مذہبی اور اخلاقی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ وہ بات جس کو فقہائے اسلام دیانتاً اور قضاءً کی اصطلاحات سے ادا کرتے ہیں وہ معاملات میں پورے طور پر موجود ہے۔ معاملات کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ جو دیانتاً قابل اعتراض ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ عدالت اور قانون ظاہری معاملات پر فیصلہ کرنے کے پابند ہیں اس لیے وہ ظاہری معاملات کی بنیاد پر ہی فیصلہ کریں گے اور ہوسکتا ہے کہ ان کا فیصلہ حقیقت کے اعتبار سے مختلف ہو۔ یہ نازک اور لطیف فرق تمام فقہاء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس فرق کو زیادہ وضاحت کے ساتھ فقہائے احناف نے ملحوظ رکھا ہے۔ اسی لیے بہت سے ظاہر بین اور حرفیت پرست اہل علم نے فقہائے احناف کے موقف کو سمجھنے میں مشکل محسوس کی ہے اور فقہائے احناف کے نقطہ نظر کو بعض جگہ نص یعنی قرآن کریم کی آیت اور احادیث کے ظاہری الفاظ سے متعارض قرار دیا ہے۔

فقہ المعاملات کی پانچویں بنیادی بات یہ ہے کہ شریعت فقہ المعاملات کو ایک اجتماعی اور ملی معاملہ سمجھتی ہے۔ تجارت اور کاروبار محض کسی فرد کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ اگر چہ یہ ایک پہلو سے فرد کا ذاتی معاملہ بھی ہے۔ لیکن اس کی حیثیت صرف کسی ذاتی یا شخصی معاملے کی نہیں ہے۔ بلکہ ہر تجارت کے اجتماعی اثرات ہوتے ہیں۔ پورے معاشرے کی اجتماعی زندگی پر کاروبار اور تجارت کی نوعیت سے فرق پڑتا ہے۔ اگر کاروبار جائز طریقے سے ہو رہا ہو تو معاشرے کا رنگ اور ہوتا ہے۔ اگر کاروبار ناجائز طریقے سے ہو رہا ہو تو معاشرے کا انداز اور ہوتا ہے۔ اس لیے شریعت نے

معاملات کے بارے میں جو احکام دیے ہیں اس میں معاشرے کے اسلامی کردار، معاشرے کی اخلاقی تشکیل اور معاشرے کے روحانی رنگ کے تحفظ کے مقصد کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

یہ وہ چند بنیادی اعتبارات ہیں جن کو فقہ اسلامی میں معاملات کے احکام ومسائل مرتب کرتے ہوئے پیش نظر رکھا گیا ہے اور آئندہ بھی رکھا جانا چاہیے۔ گویا سب سے پہلے قرآن کریم کے نصوص، پھر سنت ثابتہ کے احکام، پھر امت کے اہل علم کے نزدیک متفقہ قواعد وضوابط اور پھر یہ اعتبارات جن کا میں نے ذکر کیا۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے ان حدود کے اندر جو متبادل بھی کوئی شخص تجویز کرے گا وہ جائز طور پر شرعی متبادل ہوگا اور اس پر عمل درآمد شریعت کے احکام پر عمل درآمد سمجھا جائے گا۔

یہ بات میں بار بار اس لیے کہنا چاہ رہا ہوں کہ بعض حضرات کے ذہن میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ سود کے اسلامی متبادل کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ان گنے چنے طریقہ ہائے تجارت یا طریقہ ہائے استثمار کے سو فیصد مطابق ہونا چاہیے۔ اور اگر وہ ان میں سے کسی ایک کے سو فیصد مطابق نہ ہو تو پھر وہ ناجائز ہوگا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فقہائے احناف نے جب مشارکہ کی کچھ قسمیں بیان کی ہیں۔ شرکت عنان، وجوہ اور مفاوضہ وغیرہ وغیرہ، تو وہ اس لیے نہیں بیان کیں کہ قرآن کریم میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ قرآن کریم میں شرکت عنان کا ذکر ہے، نہ مفاوضہ کا ذکر ہے، نہ وجوہ کا ذکر ہے۔ احادیث میں بھی ان میں سے کسی کا ذکر نہیں ہے۔ فقہائے احناف نے ان عنوانات کو اس لیے مرتب کیا ہے، یہ اصطلاحات اس لیے استعمال کی ہیں کہ ان کے زمانے میں مشارکہ کے جو رائج الوقت طریقے تھے وہ یہی تھے۔ ان طریقوں کا فقہائے احناف نے جائزہ لیا۔ جائزہ لینے کے بعد جو طریقے جائز تھے۔ ان کو ان عنوانات کے تحت بیان کیا۔ ان میں جو پہلو ناجائز محسوس کیے، ان کی نشاندہی کی اور ان کے جائز پہلوؤں کے احکام مرتب کر دیے۔ جو پہلو جائز تھے ان کو برقرار رکھا اور ان کو مزید آسان بنانے کے لیے ان کی تفصیلات مرتب کر دیں۔

آج اگر شرکت عنان اور مفاوضہ وغیرہ کے علاوہ مشارکہ کا کوئی ایسا نیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو ربا، غرر، اور قمار وغیرہ سے پاک ہو تو اس کی وہی حیثیت ہوگی جو شرکت عنان اور مضاربہ یا مفاوضہ کی اُس زمانہ میں قرار دی گئی تھی۔

تجارت اور لین دین کے احکام میں بنیادی چیز افراد کے درمیان لین دین اور معاہدہ ہے۔ جس کو فقہاء نے عقد کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ دراصل عقد اس تعلق کا نام ہے جو ان دو پارٹیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جو آپس میں کسی قسم کا لین دین کر رہی ہوں۔ کسی قسم کا بھی لین دین جس کی بنیاد کسی مال یا منفعت پر ہو، یا خدمات پر یا جائز منافع پر ہو۔ اس کو عقد کہا جاتا ہے۔ فقہاء نے رائج الوقت عقود کو سامنے رکھ کر ان کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں، اور ان کے بہت سے احکام مرتب کیے ہیں۔ عقد کی تقسیمیں یوں تو بہت سی ہیں۔ لیکن ایک تقسیم بہت آسان ہے اور اہم ہے، جس سے عقد کے بہت سے احکام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس تقسیم کے اعتبار سے عقد کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم تو وہ ہے جو طرفین کے لیے لازم ہو۔ عقد لازم للطرفین، جیسے عقد بیع۔ آپ نے ایک چیز خریدی، بیچنے والے کو قیمت ادا کر دی۔ اس نے سودا آپ کے سپرد کر دیا۔ اب یہ دونوں کے لیے لازمی ہے۔ نہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر اپنا سودا واپس لے سکتا ہے، نہ آپ اس کی اجازت کے بغیر سودے کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ جب سودا حتمی طور پر طے ہو جائے، خیار اور شرائط وغیرہ تمام پوری ہو جائیں تو یہ عقد لازم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے اجارہ ہے، یا صلح، یا حوالہ، مزارعہ، یہ سب عقد لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقد لازم ایک مرتبہ جب منعقد ہو جائے تو پھر کوئی فریق یکطرفہ طور پر اس سے باہر نہیں آ سکتا۔

دوسری قسم عقد جائز کہلاتی ہے جو دونوں فریقین کے لیے جائز ہوتا ہے۔ دونوں فریق جب چاہیں اس کو ختم کر سکتے ہیں اور اس بندش سے باہر آ سکتے ہیں۔ مثلاً مشارکہ عقد جائز ہے۔ دو فریق مل کر مشارکہ کرتے ہیں۔ ایک فریق جب چاہے واپس آ جائے۔ مثلاً دس آدمیوں نے مل کر ایک کمپنی بنائی۔ جب کمپنی نے کام کرنا شروع کر دیا تو ایک فریق اپنا سرمایہ لے کر الگ ہونا چاہتا ہے، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، جب چاہے الگ ہو جائے۔ دو فریق الگ ہونا چاہیں دو الگ ہو جائیں۔ اس طرح کے عقود میں مشارکہ، مضاربہ، وکالہ وغیرہ شامل ہیں۔

عقد کی تیسری قسم وہ عقد ہے جو کسی ایک فریق کے لیے لازم ہو۔ دونوں کے لیے نہیں ایک کے لیے لازم ہو۔ مثلاً کفالۃ، رہن۔ رہن ایک کے لیے لازم ہے۔ ظاہر ہے جس فریق نے اپنے قرضے کی واپسی یا رقم کی وصولی کو یقینی بنانے کے لیے رہن لے کر اپنے پاس رکھا ہے وہ اگر ختم کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ جس نے رہن رکھوایا ہے، جس نے اپنی چیز رہن رکھی ہے اس کو یہ

آزادی نہیں ہے کہ جب چاہے یک طرفہ طور پر اپنا رہن شدہ مال واپس لے لے۔ ظاہر ہے اس نے تو اپنی مرضی سے رہن نہیں رکھا۔ مرتہن کے مطالبے پر ہی اس نے رہن رکھا ہے۔ لہٰذا مرتہن کے لیے یہ راستہ کھلا ہے کہ جب چاہے رہن کو ختم کردے۔ یہ عقد صرف راہن کے لیے لازم ہے۔ وہ یکطرفہ طور پر ختم نہیں کرسکتا۔

ان تینوں قسم کے عقود میں یہ ضروری ہے کہ متعاقدین یعنی دونوں فریق کچھ شرائط پر پورے اترتے ہوں۔ عاقل بالغ ہونا تو دنیا کے بقیہ قوانین میں ضروری بھی مانا جاتا ہے۔ کہ عقد کے لیے عاقل ہونا بھی ضروری ہے اور بالغ ہونا بھی۔ شریعت نے اس کے لیے کچھ اور احکام بھی رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے تصرّفات پر کوئی پابندی، عدالت یا قانون کی طرف سے نہ لگائی گئی ہو، اس پابندی کو حجر کہا جاتا ہے۔ شریعت میں حجر کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں۔ یہ احکام خود قرآن کریم نے دیے ہیں۔ ''ولا تؤتوا السفھاء اموالکم''۔ یہ ہدایت خاص طور پر یتیموں کے ان متولیوں کے لیے ہے یا یتیموں کے ان اوصیاء کے لیے ہے، جن کے تصرف یا انتظام میں کسی یتیم کا مال ہو۔ ان کو ہدایت ہے کہ اس وقت تک ان کا مال ان کے حوالے نہ کرو جب تک ان میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے۔ گویا سمجھ بوجھ کے پیدا ہونے تک ایک کم فہم اور ناسمجھ بچے پر پابندی ہے، وہ اپنے مال میں، اپنے باپ، دادا سے ملی ہوئی جائداد میں تصرف نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ شریعت نے مال کو ضائع کرنے کی ممانعت کی ہے۔ مال کو ضائع کرنا حرام ہے۔ ایک شخص جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا، جب اس کو بیٹھے بٹھائے باپ دادا کی دولت ملے گی تو وہ اس کو ضائع کرے گا۔ مال کو ضائع کرنا شریعت کے منشا کے خلاف ہے۔ اس لیے شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ مال کو ضائع ہونے سے بچانے کے لے اس کا انتظام اس وقت تک اس کے مالک کو نہ دیا جائے جب تک اس میں سمجھ بوجھ پیدا نہ ہو جائے۔ اس پابندی کو فقہ کی اصطلاح میں حجر کہا جاتا ہے۔ اس لیے عقد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کے کسی فریق پر حجر نہ لگایا گیا ہو۔ یعنی کوئی ایک فریق زیر پابندی یا زیر حجر نہ ہو۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ دونوں فریقوں کی رضامندی پورے طور پر موجود ہو۔ یہ اصول خود قرآن کریم میں آیا ہے، تراضی کے اصول کی تصریح قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہر وہ چیز جس کے نتیجے میں تراضی کی شرط مجروح ہو وہ عقد کے جواز کو متاثر کرتی ہے۔ فقہائے اسلام نے ان

چیزوں کے لیے عیوب تراضی یا عیوب رضا کا لفظ استعمال کیا ہے۔مثال کے طور پر اکراہ کو فقہاء نے تراضی کے منافی قرار دیا ہے، جبر اور زبردستی سے کسی شخص نے کسی کی چیز اونے پونے داموں خرید لی۔اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ سیاسی اثر رسوخ اور اقتدار کے زور پر فریق مخالف کی زمینیں ، جائدادیں، فیکٹریاں، کمپنیاں اونے پونے داموں خرید لیں اور اپنے اہالیوں موالیوں کو فروخت کر دیں۔ یہ اکراہ ہے اور عیوب تراضی میں سے ہے۔اس کے نتیجے میں جو خرید و فروخت یا تجارت ہوگی وہ جائز نہیں ہوگی۔ نہ ملکیت جائز ہوگی، نہ انتقال ملکیت کو تسلیم کیا جائے گا۔

عیوب تراضی میں عقد کی عدم اہلیت بھی شامل ہے۔کوئی ایک فریق اہلیت کا حامل نہ ہو تو اس کے نتیجے میں بھی سمجھا جائے گا کہ تراضی موجود نہیں ہے۔مثلاً ایک طرف بچہ ہے یا پاگل ہے، زمین بچے کے نام ہے اور بچے کو بہلا پھسلا کر اس کی رضامندی حاصل کر لی جائے تو یہ معتبر نہیں ہے۔

غلط فہمی کے نتیجے میں حاصل کی جانے والی رضامندی معتبر نہیں ہے۔ یہ اور اس طرح کی معاملات عیوب تراضی کہلاتے ہیں۔

بیع کے جواز کی شرطیں کیا ہیں۔کچھ شرائط کا تذکرہ تو انھی میں آ گیا۔ایک شرط میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ وہ مال متقوم ہو۔دوسری شرط احادیث کے ضمن میں بیان ہوئی تھی کہ شے مبیعہ بائع کی ملکیت میں ہو۔حدیث میں غیر مملوکہ اور غیر مقبوضہ شے کی فروخت کی ممانعت آئی ہے کہ ''لا تبع مالیس عندک''۔کسی ایسی چیز کی فروخت نہ کرو جو تمھاری ملکیت میں نہ ہو۔ جب کوئی چیز خریدو تو جب تک تمہارے قبضے میں نہ آ جائے اس کو آگے فروخت نہ کرو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کو آپ بیچ رہے ہیں وہ آپ خریدار کے سپرد کرنے پر قادر ہوں۔ آج سپرد کر سکیں یا آئندہ کسی مقررہ تاریخ پر سپرد کر سکیں۔خرید و فروخت کے جائز ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قیمت اور جو چیز خرید و فروخت کی جا رہی ہے، یہ دونوں واضح طور پر واضح اور متعین ہوں۔خریدنے والے کو پتا ہو کہ وہ کیا خرید رہا ہے، بیچنے والے کو علم ہو کہ وہ کیا بیچ رہا ہے۔ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ بیع حتمی اور قطعی ہو۔کسی شرط سے مشروط یا کسی آئندہ ہونے والے واقعے پر موقوف نہ ہو، کہ اگر فلاں کام ہو گیا تو میں یہ بیچ دوں گا۔ یہ بیع نہیں ہے، یہ وعدہ بیع

ہے۔ بیچنے کا وعدہ ہے، اگر بیچنے والا اس وعدہ کی پابندی کرے تو اچھی بات ہے، نہ کرے تو آپ اس کو قانوناً وہ چیز بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ وعدے کی خلاف ورزی کا مرتکب مانا جائے گا اور وعدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو بھی سلوک کرے گا، یہ شخص بھی اس کا مستحق ہوگا۔ لیکن اس دنیا کے معاملات کی حد تک یہ وعدۂ بیع ہے، بیع نہیں ہے۔

ایک اور شرط یہ ہے جو قرآن کریم کے واضح الفاظ سے ماخوذ ہے کہ ہر شخص اپنی ملکیت میں جو تصرف کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے۔ آپ کے پاس گاڑی ہے، آپ اس کو بیچنا چاہتے ہیں، بیچ سکتے ہیں۔ خود استعمال کرنا چاہیں خود استعمال کر سکتے ہیں۔ کسی کو ہدیہ دینا چاہیں تو آپ ہدیہ دے سکتے ہیں۔ کرایے پر چلانا چاہیں تو آپ کرایے پر چلا سکتے ہیں۔ جائز استعمال کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں اس میں آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ لیکن اس استعمال کا ایک قاعدہ اور ایک حد ہے۔ وہ حد یہ ہے کہ آپ اپنی جائز ملکیت میں آنے والی کسی چیز کا اس انداز سے استعمال نہیں کر سکتے کہ اس سے کسی دوسرے شخص کا نقصان ہو۔

تمام فقہائے اسلام نے بالاتفاق یہ اصول بیان کیا ہے جو بعض احادیث سے ماخوذ ہے۔ علامہ ابن عابدین جو متاخر حنفی فقہاء میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بنیادی اصول یہ ہے کہ فرد کو اپنی خالص ملکیت میں تصرف کرنے کی پوری آزادی ہے۔ لیکن اگر اس تصرف کے نتیجے میں کسی دوسرے کو واضح طور پر کوئی نقصان ہو رہا ہو یا کوئی دقت یا مشکل پیش آ رہی ہو، یا کوئی ضرر پہنچ رہا ہو تو اس تصرف کی ممانعت کر دی جائے گی اور اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ احادیث میں چھپن قسم کے کاروباروں اور بیوع کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ وہ بیوع ہیں جن میں یا تو ربا پایا جاتا ہے یا ربا کا شائبہ ہے یا ربا کا امکان ہے یا غرر ہے یا قمار ہے یا غرر اور قمار کا شائبہ ہے یا امکان پایا جاتا ہے یا ان کے نتیجے میں ربا، غرر یا قمار وغیرہ کا راستہ کھلتا ہے۔ ان تمام قسم کی بیوع کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے۔

مثال کے طور پر ان میں سے ایک بیع العینہ ہے۔ بیع العینہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے سودے کو ادھار قیمت پر بیچ دے اور اس کے بعد کم قیمت پر اسی بائع سے نقد خرید لے۔ بظاہر یہ دو الگ الگ معاملات ہیں اور الگ الگ ان دونوں معاملات کو دیکھا جائے تو یہ جائز ہی معلوم

ہوتے ہیں۔ آپ اپنی کوئی چیز ادھار قیمت پر فروخت کرنا چاہیں تو آپ کو اس کی اجازت ہے۔ کسی دوسرے شخص سے کوئی چیز آپ خریدنا چاہیں اور بازار سے کم قیمت پر لینا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔ لیکن یہاں ان دونوں جائز معاملات کو ملایا گیا ہے یوں ملائے جانے کا محرک یا جذبہ یہ ہے کہ سود کا ایک بالواسطہ حیلہ فراہم کیا جائے۔ سود میں کیا ہوتا ہے؟ سود میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی سے سال یا دو سال یا مثلاً چھ مہینے کے لیے رقم ادھار لیتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ جب واپس کروں گا تو ایک لاکھ کے ایک لاکھ پچیس ہزار واپس کروں گا۔ یہ پچیس ہزار کا اضافہ ربا ہے۔

بیع العینہ اسی سود کا ایک حیلہ ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی پرانی گاڑی یا موٹر سائیکل ایک لاکھ پچیس ہزار روپے میں فروخت کرتا ہے۔ یہ ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ادھار ہیں اور ایک سال کے دوران بالاقساط واجب الادا ہوں گے۔ اب معاملے کی صورت یہ بنی کہ اس شخص کے ذمے جس نے یہ موٹر سائیکل خریدی ہے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے واجب الادا ہیں۔ اب یہ موٹر سائیکل اپنے قبضے میں لینے کے بعد دوبارہ اسی بیچنے والے کو ایک لاکھ روپے نقد میں فروخت کر دیتا ہے۔ اور ایک لاکھ روپے اس سے فوراً وصول کر لیتا ہے۔ اب خلاصہ یہ ہوا کہ اس شخص کو ایک لاکھ روپے ملے اور ایک لاکھ روپے ملنے کے بعد جو اس کو ادا کرنے ہیں وہ ایک لاکھ پچیس ہزار ہیں۔ اسی کا نام سود ہے۔ موٹر سائیکل تو درمیان میں محض ایک وسیلہ یا ذریعہ کے طور پر استعمال ہوئی، اصل مقصد ایک لاکھ وصول کر کے ایک لاکھ پچیس ہزار واپس کرنا ہے۔ اس لیے یہ حیلہ شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے اور یہ بات بھی میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لین دین کے معاملات میں، عقود میں، تجارت کے امور میں اصل اعتبار حقیقت اور معنی کا ہوتا ہے، الفاظ اور عبارت کا نہیں ہوتا۔ اس ایک مثال سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شریعت میں جس طرح کے چھپن معاملات کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ کیوں حرام قرار دیا گیا ہے اور ان کے حرام کیے جانے کی حکمت یا مصلحت کیا ہے۔

اسی طرح سے حدیث میں بیع مزابنہ کی ممانعت ہے۔ بیع المزابنہ کے نام سے خرید و فروخت کا ایک طریقہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جاری تھا۔ مدینہ منورہ میں تھا تو غالباً دوسرے زرعی شہروں میں بھی ہو گا۔ ہوتا یہ تھا کہ ایک شخص اپنی کھجور یا اپنا گندم یا کوئی زرعی پیداوار جو اس کے پاس تولی ہوئی مقررہ وزن کے ساتھ موجود ہوتی تھی وہ دوسرے کسی شخص کی

درخت پر لگی ہوئی چیز کو اس تولی ہوئی چیز کے مقابلے میں فروخت کرتا تھا۔ اور جو درخت پر لگی ہوتی تھی اس کی کمیت اور مالیت کا محض اندازہ کرلیا جاتا تھا۔ اس کو مزابنہ کہتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کا کھجوروں کا باغ ہے۔ ابھی اس کی کھجور پکی نہیں ہے، کچی ہے۔ اس کے پکنے میں ابھی تین چار مہینے یا چھ مہینے باقی ہیں۔ اس کو ابھی فوری طور پر گھر کے استعمال کے لیے کھجوریں درکار ہیں۔ اب وہ یہ کرتا تھا کہ کھجوروں کے ایک تاجر کے پاس جائے، اس کے یہاں سے دس من کھجور اٹھالے۔ اب دس من کھجور تو متعین طور پر دس من ہے۔ اس نے لے لی۔ اور اس کے مقابلے میں یہ طے کیا کہ میرے باغ میں جو کھجور لگی ہوئی ہے یہ تم لے لو۔ یہ بھی اندازاً دس من ہوگی، جب فصل اترے گی تو یہ آپ اتار لیجیے گا۔ یہ مزابنہ کہلاتا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جو کھجور درخت پر سے اترے وہ دس من نہ ہو بلکہ نو من ہو۔ ممکن ہے دس کے بجائے بارہ من ہو۔ دونوں صورتوں میں اس کا امکان ہے کہ یہ کاروبار ربا کی شکل اختیار کرلے اور ربا الفضل بن جائے۔ ایک اعتبار سے تو یہ ربا الفضل ہے ہی ہے۔ اس لیے کہ میں کل کی گفتگو میں عرض کرچکا ہوں کہ ربا الفضل میں اگر لین دین ہاتھ در ہاتھ نہ ہو اور برابر سرابر نہ ہو، دونوں صورتوں میں یہ ربا الفضل ہو جائے گا۔ بیع مزابنہ میں یہ حقیقی ربا بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ آج ایک شخص کھجوریں فروخت کررہا ہے۔ چھ مہینے یا چار مہینے کے بعد ان کی قیمت کے طور پر زیادہ مقدار میں کھجوریں وصول کرے گا۔ اس میں ربا الفضل بھی پایا جاتا ہے اور ربا النسیئۃ بھی پایا جاتا ہے۔ اسی نوعیت کی ایک مثال وہ ہے جس کو حدیث میں بیع الکالئ بالکالئ کہا گیا ہے۔ یعنی دین کی خرید وفروخت دین کے ساتھ۔ اس سے بھی چونکہ ربا کا راستہ کھلتا ہے۔ اس لیے شریعت نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

ان محرمات سے اجتناب کرتے ہوئے جن میں سے اکثر کی تفصیل ان گفتگوؤں میں آگئی ہے، تجارت کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ ربا کا متبادل سمجھا جائے گا اور شریعت کی رو سے قابل قبول ہوگا۔ بیع یا عقد میں ایجاب وقبول بھی ضروری ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایجاب اور قبول کی تفصیلات فقہائے اسلام نے بہت کثرت سے بیان کی ہیں۔ ان تفصیلات کو بیان کرنے میں کچھ جزوی اور لفظی اختلافات بھی فقہاء کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان اختلافات کی کوئی بنیادی یا حقیقی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ یہ محض جزوی یا لفظی اختلافات ہیں۔

اصل کلی قواعد اور تصورات و احکام پر جو قرآن کریم اور احادیث سے ماخوذ ہیں، فقہائے کرام کا اتفاق ہے۔

فقہائے کرام نے ربا کے جو متبادلات اپنے اپنے زمانے میں تجویز کیے تھے یا آج تجویز کیے گئے ہیں ان کو پندرہ عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ پندرہ عنوانات ہیں:

۱۔ مشارکہ
۲۔ مضاربہ
۳۔ مرابحہ
۴۔ بیع مؤجل
۵۔ اجارہ
۶۔ مزارعہ
۷۔ مساقاۃ
۸۔ سلم
۹۔ استصناع
۱۰۔ اجارہ منتہیۃ بالتملیک
۱۱۔ تورق
۱۲۔ بیع بالتقسیط
۱۳۔ مرابحہ للآمر بالشراء
۱۴۔ مشارکہ متناقصہ
۱۵۔ وقف

ان تمام طریقوں کا دور جدید کے تقاضوں کے مطابق سرمایہ کاری میں انتہائی مؤثر اور مفید استعمال کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے بیشتر کا استعمال مختلف اسلامی بینکوں میں شروع بھی ہو گیا ہے۔ عام طور پر اہل علم کا خیال یہ ہے کہ ان تمام طریقوں میں جو انتہائی مناسب، مفید اور اسلامی احکام کے قریب ترین طریقے ہیں وہ مضاربہ اور مشارکہ ہیں۔

مضاربہ اور مشارکہ پر دور جدید میں خاصا کام ہوا ہے۔ اہل علم نے ہزاروں مقالات

اور سینکڑوں کتابیں ان موضوعات پر تالیف کی ہیں ۔جن میں بہت سی تحریروں میں مضاربہ، مشارکہ، اجارہ وغیرہ کے جدید استعمالات کے بارے میں شریعت کی ہدایات کو نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مضاربہ کی روح یہ ہے کہ سرمایہ ایک شخص کا ہو اور اس سرمایے سے محنت کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہو۔ یہ اشخاص افراد بھی ہو سکتے ہیں، گروہ بھی ہو سکتے ہیں اور ادارے بھی ہو سکتے ہیں۔

مضاربہ کا یہ طریقہ اسلام سے بہت پہلے سے رائج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی نوجوانی میں نبوت سے بہت پہلے مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کا آغاز فرمایا۔ حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کا مال لے کر آپ تجارت کے لیے تشریف لے گئے، یہ مضاربہ ہی کی ایک شکل تھی۔ بعد میں بھی خود رسول اللہ ﷺ نے اور بہت سے صحابہ کرام نے مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کیے۔ مضاربہ میں اوّل تو کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو شریعت کے احکام سے متعارض ہو۔ اور اگر بالفرض اس کا امکان تھا بھی تو رسول اللہ ﷺ نے مختلف ہدایات کے تحت جن میں سے اکثر کا ذکر کیا جا چکا ہے مضاربہ پر اثر انداز ہونے والے ان منفی اسباب وعناصر کا راستہ بند کر دیا۔

مضاربہ کی بنیادی روح یہ ہے کہ سرمایہ دار یا جس کے پاس سرمایہ یا سامان تجارت ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ تجارت اور کاروبار میں بھی مہارت رکھتا ہو۔ دوسری طرف جو شخص تجارت اور کاروبار کے گُروں سے واقف ہے اور تجارت کا تجربہ رکھتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سرمایہ بھی رکھتا ہو۔ اس لیے ان دونوں کے وسائل سے بیک وقت فائدہ اٹھانے کے لیے مضاربہ کا طریق کار دنیا میں بہت پہلے سے رائج ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کو برقرار رکھا، اس کو جائز قرار دیا۔ فقہائے اسلام نے اس کے احکام مرتب فرمائے۔

بیسویں صدی کے وسط میں جب اسلامی بینکاری پر گفتگو اور بحث ومباحثہ کا آغاز ہوا تو اہل علم کی نظر سب سے پہلے مضاربہ پر پڑی۔ اس لیے کہ مضاربہ وہ طریق کار ہے جس کو بہت آسانی کے ساتھ جدید بینکاری کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرات بینکوں میں اپنی رقوم رکھتے ہیں ان کی حیثیت رب المال کی قرار دی جا سکتی ہے۔ گویا وہ رب المال ہیں اور وہ اپنا سرمایہ کاروبار اور تجارت کے لیے دے رہے ہیں۔ بنک کی حیثیت اس مضارب کی ہوگی جو اپنے سرمایے کو آگے مضاربہ پر دے دیتا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس عنوان کے تحت اس

موضوع پر بحث ہوتی ہے" باب المضارب یضارب"۔ مضارب اگر آگے مضاربہ کرنا چاہے تو اس کو اجازت ہے اور رب المال کی اجازت سے کچھ شرائط کے تحت وہ آگے دوسرے کاروباریوں سے مضاربہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ بنک ان تمام رقوم کو لے کر کچھ رقوم کو تو خود کاروبار میں لگاتا ہے اور بقیہ رقوم کو وہ آگے کاروبار کے لیے تجارت کرنے والوں کو دے دیتا ہے۔ یہ انٹر پرینئر جو بنک سے سرمایہ لے کر تجارت کرتے ہیں، صنعت لگاتے ہیں یا کوئی اور کاروبار کرتے ہیں۔ یہی دراصل مضارب ہیں، بنک کی حیثیت درمیانی کارندے کی ہے۔ یہاں بنک کی دو حیثیتیں ہیں۔ اصل رقم دینے والوں کے لیے اس کی حیثیت مضارب کی ہے اور اصل مضارب کے مقابلے میں اس کی حیثیت رب المال کی ہے۔ اس عمل کو اگر شریعت کے احکام کے مطابق انجام دیا جائے تو یہ جدید بینکاری کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے موزوں ترین اور مفید ترین طریق کار ہے۔

مضاربہ کے احکام میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہے۔ فقہائے کرام نے اپنے اجتہاد سے جو احکام مرتب فرمائے ان کے اجتہاد میں مختلف اسباب سے فرق پیدا ہوا۔ آج یہ فرق ہمارے لیے ایک ایسے تنوع کا ذریعہ ہے جس سے ہم دورِ جدید میں مستفید ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک قرآن کریم اور احادیث کی نصوص کا تعلق ہے، فقہائے اسلام کے متفق علیہ قواعد کا تعلق ہے وہ تو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ لیکن اگر اجتہادی معاملات میں ایک سے زائد آراء پائی جاتی ہوں تو آج ان آراء کی وجہ سے ہمارے لیے یہ آسانی ہے کہ یہ دیکھ سکیں کہ دورِ جدید کے تقاضے کس رائے پر عمل کرنے سے زیادہ پورے ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ کاری اور معاشی ترقی کے مقاصد کو کس فقیہ کے اجتہاد پر عمل کرنے سے زیادہ بہتر انداز میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس اصول کے تحت دورِ جدید میں مضاربہ کے جو قواعد اور احکام مرتب ہوئے ہیں ان پر پوری دنیا میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔ یہ احکام اور قواعد آیوفی نے مرتب کیے ہیں جو بحرین میں ایک بین الاقوامی اسلامی ادارہ ہے۔ اور مختلف ملکوں کے اسٹیٹ بنک اس کے قیام میں شریک ہیں۔ رکن ممالک کے اسٹیٹ بینکوں کے سربراہ یا ان کے نمائندگان اس کے رکن ہیں۔ یہ ادارہ اسی کام کے لیے قائم کیا گیا ہے کہ اسلامی طرق تمویل یا اسلامی طرق سرمایہ کاری کے لیے شریعت کے قواعد و احکام کو نئے انداز، نئی زبان، نئی ضروریات اور نئی اصطلاحات کے تحت مرتب کرے۔ اس ادارے نے انتہائی مفید کام کیا ہے اور مضاربہ، مشارکہ، اجارہ اور دوسرے متعدد

عقود کے بہت سے احکام آج کل کی زبان اور رائج الوقت اصطلاحات میں مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ خود مغربی دنیا میں مضاربہ سے ملتا جلتا ایک طریق کار رائج ہے جس پر وہاں بہت کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ طریق کار venture capital کہلاتا ہے۔ وینچر کیپیٹل کی روح بھی یہی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا ایک شخص ہو، جس کو وہاں خاموش شریک یعنی sleeping partner کہا جاتا ہے۔ وہ براہ راست کاروبار میں حصہ نہیں لیتا۔ دوسری طرف کاروبار کرنے والا شخص ہوتا ہے جو دراصل کاروبار کرتا ہے۔ یہی دراصل مضارب ہے۔ وینچر کیپیٹل کو بہت آسانی کے ساتھ بغیر کسی بڑی تبدیلی کے مضاربہ کے احکام کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

یہ بات میں اس لیے بار بار عرض کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں ایک عام تاثر یہ پیدا ہو گیا ہے کہ آج کی دنیا میں صرف وہ چیز قابل عمل ہے جو مغرب میں ہو رہی ہے۔ اس تاثر کے بموجب آج کے مسلمان کوئی نئی چیز سوچنے کے سرے سے اہل ہی نہیں رہے، اور اگر سوچیں تو اس پر عمل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ جو لوگ یہ منفی ذہن رکھتے ہوں ان کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ مضاربہ پر عمل درآمد ممکن ہے۔ وینچر کیپیٹل کا حوالہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جو جو اعتراضات مضاربہ پر کیے جاتے ہیں وہ وینچر کیپیٹل کے طریق کار پر غور کرنے سے دور کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مضاربہ پر کسی کو مال دیں گے تو وہ لازماً کاروبار میں نقصان ظاہر کرے گا اور یہ دعویٰ کرے گا کہ مضاربہ میں کوئی نفع نہیں ہوا۔ لہٰذا جو گھر بیٹھا شریک (sleeping partner) ہے اس کو نقصان ہی نقصان ہوگا۔ یہ اعتراض بلاشبہ وزن رکھتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا تجربہ اس طرح کی سرمایہ کاری کے بارے میں خوش آئند نہیں رہا۔ ماضی میں فائنانس کمپنیوں کے حالات اور کارکردگی سے ہم سب واقف ہیں۔ تاج کمپنی جیسے ادارے میں جو مسائل پیدا ہوئے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس لیے بعض لوگ مضاربہ پر عملدرآمد کے بارے میں واقعتاً اس لیے تامل کرتے ہیں کہ اگر لوگوں کے اعتماد پر بھروسہ کر کے ان کو بھاری رقمیں سرمایہ کاری کے لیے دے دی جائیں تو اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ وہ واقعتاً

اصل حسابات مالکان سرمایہ کے سامنے پیش کریں اور ان کو ان کا جائز حق ادا کریں۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر وینچر کیپیٹل کے قواعد وضوابط کو سامنے رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ مغربی دنیا میں اس پر کیسے عمل ہو رہا ہے، وہاں کے تجربات اور طریقۂ کار سے استفادہ کیا جائے تو مضاربہ کو درپیش بہت سی مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ دنیائے اسلام کا تاجر تو دھوکے باز ہے اور مغرب کا تاجر دھوکے باز نہیں ہے۔ دھوکہ دہی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کا نفس دھوکہ دہی اور جھوٹ بولنے پر اس کو آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اگر شیطان پاکستان کے تاجر کو بہکا سکتا ہے تو امریکہ کے تاجر کو بھی بہکا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ امریکہ کا تاجر شیطان کے بہکاوے سے محفوظ و مامون ہے، پاکستان کا تاجر شیطان کے وسوسوں سے محفوظ نہیں ہے، یہ درست نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان ممالک میں قوانین سخت ہیں۔ قوانین پر عمل درآمد کرانے والے ادارے انتہائی مؤثر ہیں اور رائے عامہ کے ذریعے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کے لیے شیطان کے ان وساوس پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ کام دنیائے اسلام میں بھی کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے اور جلد سے جلد کیا جانا چاہیے۔

مضاربہ کے احکام جو فقہاء نے بیان کیے ہیں وہ بہت مفصل ہیں۔ لیکن ان کا خلاصہ اس دستاویز میں آ گیا ہے جو آیوفی نے تیار کی ہے اور عربی اور انگریزی میں دستیاب ہے۔ یہ دستاویزات دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کے اسلامی تمویل کے پروگراموں میں بطور نصابی کتاب کے پڑھائی بھی جارہی ہیں۔ دنیائے اسلام میں متعدد ایسے ادارے موجود ہیں جہاں اسلامی بینکاری یا اسلامی تمویل کی تعلیم ہو رہی ہے اور اسلامی بینکاری اور اسلامی تمویل کے کورسز میں یہ دستاویزات Standards یا معیاری وثائق بطور نصابی کتاب کے پڑھائے جارہے ہیں۔

فقہائے اسلام نے مضاربہ کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ پاکستان کے قانون میں بھی مضاربہ کی ان دو قسموں کو شامل کیا گیا ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ پاکستان میں سنہ 1980ء میں ایک مضاربہ آرڈیننس جاری کیا گیا تھا جس کی رو سے مضاربہ کی وہی دو بڑی بڑی قسمیں بتائی گئی تھیں جو فقہ کی کتابوں میں عام طور پر ملتی ہیں۔ ایک مضاربہ عامہ یا مضاربہ مطلقہ کہلاتا ہے اور

دوسرا مضاربہ خاصہ یا مضاربہ مقیدہ کہلاتا ہے۔یعنی ایک General Purpose مضاربہ اور Specific Purpose مضاربہ۔جنرل مضاربہ میں مضارب کو یعنی کاروبار اور تجارت کرنے والے کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس کاروبار اور تجارت میں پیسہ لگانا چاہے لگا سکتا ہے۔جس علاقے میں، جس نوعیت کے کاروبار کو مناسب اور مفید سمجھے اس علاقے میں اسی کاروبار کو اختیار کرسکتا ہے۔اس کے برعکس specific مضاربہ یعنی مضاربہ خاصہ کسی متعین مقصد اور متعین کاروبار کے لیے ہوتا ہے۔مثلاً ایک شخص چمڑے کے کاروبار کا ماہر ہے۔آپ نے اس کو چمڑے کے کاروبار میں روپیہ لگانے کے لیے دیا ہے۔اب وہ صرف چمڑے کے کاروبار میں، ان شرائط کے مطابق، اس علاقے میں کاروبار کرنے کا پابند ہے جو سرمایہ فراہم کرنے والوں کے اور اس کے درمیان طے ہوئی ہے۔یہ Specific Purpose مضاربہ کہلاتا ہے۔ان دونوں کے تفصیلی احکام میں تھوڑا سا فرق ہے۔بنیادی قواعد اور کلیات ان سب کے ایک ہی ہیں۔مضاربہ پر دور جدید کے اہل علم نے الگ کتابیں بھی لکھی ہیں اور فقہ المضاربہ کے عنوان سے بہت سے مقالات بھی علمی اور فنی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

مضاربہ کے بعد دوسری اہم صورت شرکت یا مشارکت کی ہے۔شرکت یا مشارکت ایک عام اصطلاح ہے۔ایک اعتبار سے مضاربہ بھی شرکت کی ایک شکل ہے۔لیکن چونکہ مضاربہ بہت اہم قسم ہے۔بہت مقبول ہے، بہت عام ہے۔اس لیے فقہائے اسلام اس کو الگ سے بیان کرتے ہیں۔مشارکہ یا شرکت سے مراد ہر وہ کاروبار ہے جو دو یا دو سے زائد افراد مل کر کریں۔آج کل کی اصطلاحات کی رو سے پارٹنرشپ، جوائنٹ اسٹاک کمپنی اور کارپوریٹ فائنانسنگ کی ساری قسمیں۔یہ سب مشارکہ ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

جہاں تک پارٹنرشپ کا تعلق ہے، اس کے قواعد بہت آسان ہیں۔اور چونکہ اس کا تعلق کارپوریٹ فائنانسنگ کے میدان سے نہیں ہے اس لیے اس پر زیادہ بحث بھی عموماً نہیں ہوتی۔پارٹنرشپ کے قوانین جو پاکستان میں رائج ہیں وہ عموماً شریعت کے احکام سے متعارض نہیں ہیں۔اس لیے پارٹنرشپ کی حد تک شریعت کے احکام پر عمل کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔یعنی پاکستان میں قانونی اعتبار سے پارٹنرشپ کی سرگرمیوں کو شریعت کے مطابق انجام دینے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی۔

بینکاری اور کارپوریٹ فائنانسنگ نظام کے علاوہ شراکتی کاروبار کی جتنی صورتیں ہیں ان سب پر پارٹنرشپ کے قوانین اور شریعت کے احکام مشارکہ کی حدود کے اندر رہ کر بہت آسانی سے عمل کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن میں سے کچھ سے میں ذاتی طور پر بھی واقف ہوں جو شراکتی بنیاد پر بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی بینکوں کے ساتھ کوئی لین دین نہیں رکھا۔ اس لیے کہ ان کو بینکوں سے سودی لین دین کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ ان کے یہ شراکتی کاروبار شریعت کے احکام مشارکہ کے بالکل مطابق ہیں۔

فقہائے اسلام جس زمانے میں مشارکہ کے احکام مرتب فرمارہے تھے اس زمانے میں مشارکہ کی جو جو شکلیں رائج تھیں ان کا انھوں نے جائزہ لیا اور شریعت کے قواعد کی روشنی میں ان کے احکام مرتب کردیے۔ اس زمانے میں شرکت عنان، شرکت مفاوضہ وغیرہ قسم کی شراکتیں رائج تھیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آج کل کارپوریٹ فنانسنگ کے نظام کے تحت جو کمپنیاں بنائی جاتی ہیں ان کی نوعیت شرکت عنان سے بہت مشابہ ہے۔ اس لیے ان علماء کے خیال میں شرکت عنان کے احکام کے تحت کمپنیوں کے نظام کو بہت آسانی کے ساتھ شریعت کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ اگر آج کل کی کمپنیوں کو شرکت عنان کے مطابق بنایا جاسکے تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن میں یہ عرض کرنے کی ایک بار پھر اجازت چاہتا ہوں کہ بالفرض اگر شرکت عنان کی تفصیلات کسی کمپنی کے طریق کار پر پوری نہیں اترتیں تو بھی اس کمپنی کے کاروبار کے جائز ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ شرکت عنان کے سو فیصد مطابق ہو۔ اگر کوئی کمپنی ایسی ہے کہ اس کے قواعد وضوابط اور طریق کار میں کوئی چیز شریعت کے قواعد اور احکام سے متعارض نہیں ہے تو وہ جائز ہے۔ چاہے اس کو شرکت عنان کہا جاسکے یا نہ کہا جاسکے۔ یہی کیفیت مشارکہ کی دوسری قسموں کی ہے۔

مشارکہ اور مضاربہ کے بعض احکام مشترک ہیں اور بعض احکام الگ الگ ہیں۔ مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر بہت سے اسلامی بنک کام کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے فیصل اسلامک بنک نے مشارکہ کی بنیاد پر کام شروع کیا تھا۔ فیصل اسلامک بنک مصر میں بھی قائم ہے، سوڈان میں بھی قائم ہے اور کئی دوسرے اسلامی ممالک میں قائم ہے۔ یہ بنک شاہ فیصل مرحوم کے صاحبزادگان نے قائم کیا تھا۔ اور ایک زمانے میں یہ صف اوّل کا اسلامی بنک تھا۔ اس کی کامیابی

اور تجربے سے متاثر ہو کر دوسرے مختلف بینکوں نے بھی اسلامی خطوط پر کام شروع کیا۔ جن کی تفصیل آئندہ ایک گفتگو میں انشاء اللہ پیش کی جائے گی۔

مشارکہ کی بہت سی صورتیں آج کل کے اہل علم نے تجویز کی ہیں۔ یہ وہ شکلیں ہیں کہ جو دور جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر بعض علمائے اسلام نے تجویز کی ہیں۔ ان کا قدیم فقہی کتابوں میں تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن ان کے جائز ہونے میں کوئی شک اس لیے نہیں ہے کہ یہ شریعت کی عمومی حدود کے اندر ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو شریعت کے احکام سے براہ راست متعارض ہو۔ چنانچہ انھی میں سے ایک مشارکہ متناقصہ بھی ہے جس کو شرکت متناقصہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ایک مشارکہ منتہیہ بالتملیک بھی ہے۔ یہ جو نئی نئی شکلیں دور جدید میں تجویز ہو رہی ہیں ہیں ان کو بعض لوگوں نے فقہی انجنیئرنگ engineering کا نام دیا ہے۔ فقہی **انجنئیرنگ** میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر شریعت کے عمومی قواعد اور ضوابط کی پابندی کی جائے فقہائے اسلام کے متفق علیہ اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو فقہی انجنیئرنگ کے طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے نئے نئے طریقے اور کاروبار کے نئے نئے انداز سوچنا اور ان پر عمل کرنا ایک مفید اور پسندیدہ بات ہے۔ لیکن عمل میں ایک قاعدہ کلیہ پیش نظر رکھنا چاہیے جو علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی انتہائی فاضلانہ کتاب "قواعد الاحکام فی مصالح الانام" میں بیان کیا ہے۔ علامہ عزالدین نے لکھا ہے "**کل تصرف تقاعد دون تحصیل مقصودہ فهو باطل**"۔ ہر وہ تصرف یا سرگرمی جس سے اس کا اصل مقصود پورا نہ ہو وہ باطل ہے۔ لہٰذا مشارکہ متناقصہ ہو، مشارکہ منتہیہ بالتملیک ہو یا اور نئی شکلیں ہوں، اگر ان کے نتیجے میں شریعت کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں، اگر ان کے نتیجے میں عامۃ الناس نفع نقصان کے تحت کاروبار میں آزادانہ شریک ہو رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی طریق کار میں شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی تو پھر یہ سب جائز ہیں۔ لیکن اگر یہ مقاصد ان سے پورے نہیں ہو رہے تو محض عربی میں نام رکھ لینے کی وجہ سے کوئی طریق کار جائز نہیں قرار دیا جا سکے گا۔

مشارکہ منتہیہ بالتملیک کی بہت سی صورتیں دور جدید کے فقہاء نے تجویز کی ہیں۔ اسی طرح سے مشارکہ متناقصہ کی شکلیں بھی تجویز کی ہیں۔ بعض حضرات نے ان دونوں کو ملا کر ایک اور شکل تجویز کی ہے۔ کچھ حضرات نے اجارہ اور مشارکہ کو ملا کر ایک نئی صورت تجویز کی ہے۔ ان

سب صورتوں پر اگر ان تمام تفصیلات کے تحت عمل کیا جائے جو آج فقہائے کرام نے مرتب کی ہیں، اور خاص طور پر جو آیوفی کے اسٹینڈرڈز میں بیان ہوئی ہیں تو پھر ان پر عمل درآمد شریعت کے احکام کے مطابق ہے۔ اور یہ طریقے ویسے ہی اسلامی طریقے ہیں جیسے شرکت عنان یا شرکت مفاوضہ ہیں۔ لیکن اگر ان شرائط کی پابندی نہیں کی جارہی ہے، تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب کچھ محض الفاظ کا الٹ پھیر ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ نئے طریقہ ہائے تمویل شریعت کے احکام کے مطابق نہیں ہیں۔

جس طرح سے بینکوں کو مضاربہ پر عمل درآمد میں شروع میں بعض مشکلات پیش آئیں اسی طرح مشارکہ پر عمل درآمد میں بھی شروع شروع میں کئی مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اب مضاربہ اور مشارکہ کے اس تجربے کو کم از کم بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں ان مشکلات پر مسلسل غور وخوض ہوا ہے۔ بہت سے اہل علم نے ان مسائل پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا ہے۔ اب یہ مسائل ناقابل حل نہیں رہے۔ مختلف اسلامی بینکوں نے مشارکہ پر کام شروع کیا ہے۔ مشارکہ سرٹیفیکیٹ بھی شروع کیے ہیں۔ خود پاکستان میں بہت سے بنک مشارکہ کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں اور مشارکہ صکوک اور سرٹیفیکیٹ بھی جاری کر رہے ہیں۔ مشارکہ ٹرم سرٹیفیکیٹ بھی اب ایک عام اور رائج طریقہ ہو گیا ہے، جس پر مختلف بینکوں میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔

مشارکہ اور مضاربہ کے علاوہ خود براہ راست خرید وفروخت یعنی بیع وشراء بھی ایک ایسا صاف ستھرا، سیدھا سادہ اور پاکیزہ طریق کار ہے جس پر اگر بنک عمل درآمد شروع کر دیں تو بہت آسانی کے ساتھ، شریعت کے مطابق، کاروبار اور بزنس کو منظم کیا جا سکتا ہے۔ خرید وفروخت اور بیوع کے احکام بنیادی طور پر تو خود قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ احادیث میں ان کی تفصیل آئی ہے۔ جس کا خلاصہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ لیکن بیع سے متعلق بعض تفصیلی اجتہادی معاملات میں فقہائے کرام کے مابین اختلاف رہا ہے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ خرید وفروخت اور عقود کے معاملات میں امام احمد بن حنبل کا نقطہ نظر بہت آسان اور وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے امام احمد بن حنبل کے اجتہادات سے اگر خاص طور پر استفادہ کیا جائے تو بیع کے احکام کو زیادہ آسانی کے ساتھ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ بیوع کے بارے میں امام مالک کے وضع کردہ اجتہادی قواعد بہت پختہ اور بہتر

ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ بیوع کے بارے میں امام مالک کے اصول دوسرے فقہاء کے اصول وقواعد کی نسبت زیادہ پختہ اور زیادہ بہتر ہیں۔ اس لیے کہ امام مالک نے بیوع کے قواعد مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیب کے ذریعے اخذ کیے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب مدینہ منورہ کے مشہور فقہاء میں تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "ھو افقہ الناس فی البیوع"۔ بیع اور خرید وفروخت کے معاملات میں وہ فقہاء میں سب سے نمایاں اور گہری نظر کے مالک ہیں۔

بہرحال امام مالک کے اجتہادات ہوں، امام احمد بن حنبل کے اجتہادات ہوں یا دوسرے ائمہ فقہ کے اجتہادات ہوں اجتہادی معاملات میں ائمہ اربعہ کے نقطہ نظر سے یکساں طور پر استفادہ کیا جانا اب دور جدید کا ایک عام رجحان ہو گیا ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل، اعلیٰ عدالتیں، او آئی سی کی فقہ اکیڈمی، رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی، مصر کا مجمع البحوث الاسلامیہ، اور اس طرح کے متعدد ادارے جو اجتماعی اجتہاد کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کا رویہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ملکی قوانین، دیوانی معاملات، اور خاص طور پر بین الاقوامی تجارت کے مسائل واحکام کی تقنین اور تدوین نو میں کسی متعین فقہی اجتہاد کی پیروی کو لازمی نہ سمجھا جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بین الاقوامی تجارت ایک ایسے عالمگیر دور میں داخل ہوگئی ہے جہاں پوری دنیا کی سطح پر قریب قریب ایک ہی انداز سے کاروبار ہو رہا ہے۔ آج شاید دنیا یہ مان سکتی ہے اور دنیا سے منوایا جا سکتا ہے اور منوایا جانا چاہیے کہ اگر وہ دنیائے اسلام کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتی ہے تو اس کو شریعت کے احکام کے مطابق ہی دنیائے اسلام کے ساتھ کاروبار کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ ماضی میں کم وبیش بارہ سو سال تک دنیا مسلمانوں کے ساتھ شریعت اسلامی کے قواعد اور احکام مطابق ہی تجارت وکاروبار کرتی رہی ہے۔ یہ کام آج بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن ماضی کے مقابلہ میں اب صورتِ حال کئی اعتبار سے تبدیل ہوگئی ہے۔ ماضی میں یہ ممکن تھا اور ایسا ہوتا بھی تھا کہ اگر کوئی تاجر عثمانی ترکوں کے ساتھ تجارت کر رہا ہے تو اس کو فقہ حنفی کے مطابق تجارت کرنی ہوگی۔ یورپ کا کوئی تاجر شمالی افریقہ کے ممالک کے ساتھ تجارت کر رہا ہے تو اس کی تجارت فقہ مالکی کے مطابق ہوگی۔ مصر اور شام کے تاجروں کے ساتھ تجارت کر رہا ہے تو اس کی تجارت فقہ شافعی کے مطابق ہوگی۔ آج ایسا کرنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ بڑی بڑی ملٹی

نیشنل کمپنیاں جو بیک وقت دنیا میں سینکڑوں ملکوں میں کام رہی ہیں وہ پوری دنیا میں تقریباً ایک جیسے نظام اور قریب قریب یکساں قوانین کے تحت کام کر رہی ہیں۔ اس صورتِ حال میں ان سے یہ کہنا بہت سے غیر ضروری مسائل پیدا کرے گا کہ اسلامی قانون پاکستان میں اور ہوگا، سعودی عرب میں اور ہوگا، مصر اور شام میں اور ہوگا، مراکش میں اور ہوگا۔ یہ اصرار نہ مناسب ہے نہ اس پر عملدرآمد ممکن ہے۔ اس لیے دنیائے اسلام میں آج کا رجحان یہی ہے، اور یہ بہت مفید اور مثبت رجحان ہے کہ فقہ اسلامی کے پورے ذخیرے کو سامنے رکھ کر اجتہادی معاملات میں یہ دیکھا جائے کہ ائمہ فقہ کا کون سا اجتہاد ہے جو آج کل کے تقاضوں کے زیادہ مطابق ہے اور آج کل کے مسائل کو زیادہ آسانی کے ساتھ حل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بیوع، مضاربہ، مشارکہ، ان سب کے قواعد جو مرتب ہوئے ہیں یا ہونے چاہئیں وہ اسی بنیاد پر مرتب ہو رہے ہیں کہ ائمہ اربعہ کے اجتہادات کو بالخصوص اور بقیہ کبار فقہاء کے اجتہادات کو بالعموم بیک وقت سامنے رکھا جائے۔

بیوع میں یوں تو ہر قسم کی بیع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جن قسموں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اٹھایا جا رہا ہے وہ بیع مرابحہ اور بیع مؤجل ہیں۔ بعض بینکوں میں ان دونوں کو ملا کر ایک نیا طریق کار اختیار کیا گیا ہے۔ بعض جگہ بیع مرابحہ پر عمل ہو رہا ہے، بعض جگہ بیع مؤجل پر عمل ہو رہا ہے۔ بیع مرابحہ پر اردو میں، انگریزی میں، عربی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں میں، سپریم کورٹ کے فیصلوں میں بھی بیع مرابحہ پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔

بیع مرابحہ کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ یہ سرمایہ کاری کا کوئی آئیڈیل طریقہ نہیں ہے۔ یہ تو تجارت کی ایک شکل ہے جس سے جزوی طور پر سرمایہ کاری کا فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ بیع مرابحہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو اپنا کوئی سودا فروخت کرنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ اس کو کسی سودے کے حصول میں جو قیمت یا لاگت پڑے گی، اس پر وہ اتنے فیصد کے حساب سے نفع لے گا۔ مثلاً ایک شخص امپورٹ، ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں انڈسٹری کے لیے فلاں ملک سے مشینری درآمد کروں گا۔ مشینری درآمد کرنے پر جو ٹوٹل اخراجات ہوں گے وہ لگانے کے بعد پانچ فیصد یا دس فیصد یا پندرہ فیصد کے حساب سے میں نفع وصول کروں گا۔ اس صورت میں خریدار کو یہ حق ہے کہ وہ یہ چیک کرے اور اس بات کو یقینی بنائے

کہ جو قیمت بیچنے والا بیان کرتا ہے، واقعی وہی قیمت اس کو پڑی ہے یا کوئی اور ہے۔ جب یہ طے ہو جائے کہ یہی قیمت پڑی ہے اور یہ کام آج کوئی مشکل نہیں ہے، آسان کام ہے۔ دستاویزات ہر جگہ موجود ہوتی ہیں اور چونکہ مختلف ملکوں کے بینکوں سے گزرتی ہیں اس لیے اس میں کسی ردو بدل کا امکان نہیں ہوتا۔ جعل سازی کا امکان بھی برائے نام رہ گیا ہے۔

اس لیے بیع مرابحہ کو امپورٹ ایکسپورٹ میں خاص طور پر اور انڈسٹری کے دوسرے معاملات میں عام طور پر آسانی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کوئی انڈسٹری لگانا چاہتا ہے، اس کے لیے ایک کروڑ روپے کی مشینری اس کو جرمنی سے درکار ہے۔ اس کے پاس ایک کروڑ روپیہ نہیں ہے۔ اب روایتی بینکاری کے طریق کار میں تو یہ ہوتا تھا کہ وہ بنک کے پاس جائے اور ایک کروڑ روپیہ قرض لے اور اس پر دس فیصد سود دینے کا وعدہ کرے اور وقت آنے پر ایک کروڑ کے بجائے ایک کروڑ دس لاکھ روپے کی رقم ادا کرے۔ اور قرض کی یہ رقم لے کر اپنی مشینری منگوا لے، یہ تو یقیناً سود ہے۔ اس کے مقابلہ میں بیع مرابحہ کا طریقہ یہ تجویز کیا گیا کہ بنک ایک کروڑ روپیہ سودی قرض دینے کے بجائے از خود وہ انڈسٹری درآمد کرے۔ اس کے بعد خریدار کو بتائے کہ یہ مشینری بنک کو ایک کروڑ روپے میں پڑی ہے۔ اس پر دس فیصد بنک کا نفع ہوگا۔ یوں وہ خریدار ایک کروڑ دس لاکھ روپیہ ادا کر کے مشینری بنک سے خرید لے۔ یہاں قرضوں کا لین دین نہیں ہے۔ یہاں حقیقی اصول کا یعنی اثاثہ جات کا اور tangible assets کا کاروبار ہے، اور شریعت کے احکام کے مطابق بیع کی ایک شکل ہے۔ اس لیے یہ جائز ہے۔

اس میں اور پہلی صورت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں محض قرضوں کا نہیں، بلکہ ایک حقیقی اثاثہ کا لین دین ہو رہا ہے۔ وہ مشینری جو درآمد ہو رہی ہے، جب سے خریدی گئی اس وقت سے لے کر جب تک جرمنی سے پاکستان پہنچی اور خریدار کے ہاتھ فروخت کی گئی، اس وقت تک وہ بنک کے ضمان میں ہے۔ اس کے تمام اخراجات، اس کے تاوان، اس میں پیدا ہونے والے نقصانات اس پر پڑنے والے خرچے، یہ سب کے سب بنک کو ادا کرنے پڑیں گے۔ اس لیے کہ "الخراج بالضمان" کا اصول شریعت میں طے شدہ ہے۔ چونکہ بنک اس مشینری پر منافع لے رہا ہے اس لیے بنک کو اس کا نقصان بھی برداشت کرنا چاہیے۔ یہ بیع مرابحہ ہے۔ اس کی تفصیلات پاکستان میں بھی طے ہوئیں۔ آیوفی کی دستاویزات میں بھی طے شدہ ہیں۔ اور اس پر

وقتاً فوقتاً اہل علم اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔

پاکستان میں جب بیع مرابحہ شروع ہوا، یہ 1980، 1981 کی بات ہے۔تو بعض بینکوں کے بارے میں یہ شکایات ملیں کہ وہ بیع مرابحہ کی ان تفصیلات کے مطابق عمل نہیں کر رہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے طے کی تھیں۔ یہ شروع کی بات تھی، ممکن ہے واقعتاً بعض مشکلات ہوں، ممکن ہے بعض بینکاروں کو بیع مرابحہ کی حقیقت کو سمجھنے میں دقت ہوئی ہو۔یا کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ صورتحال میں بہتری آئی ہے۔قواعد وضوابط بھی بہتر ہوئے ہیں۔ اسٹیٹ بنک کی طرف سے نگرانی کا عمل بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوا ہے۔اس لیے اب صورتحال بہتری کی طرف جا رہی ہے۔

بیع مرابحہ چونکہ نسبتاً آسان ہے اور جو طریق کار پاکستان میں بعض اہل علم نے تجویز کیا، اس میں ضرورت سے زیادہ آسانیاں بینکاروں کے لیے فراہم کر دیں۔اس کی وجہ سے بینکوں نے بڑے پیمانے پر مرابحہ ہی کو سودی کاروبار کے واحد متبادل کے طور پر کو اختیار کر لیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشارکہ اور مضاربہ پر عمل درآمد کی رفتار رک گئی۔اس وقت بھی صورتحال یہ ہے کہ بینکوں کے معاملات کا بیشتر حصہ بیع مرابحہ کی بنیاد پر چل رہا ہے اور مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر کیا جانے والا کام بہت تھوڑا ہے۔حالانکہ اس کا عکس ہونا چاہیے۔بینکوں کے معاملات کا بیشتر حصہ مضاربہ یا مشارکہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور تھوڑا بہت حصہ چند فیصد اگر بیع مرابحہ کی بنیاد پر بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔بیع مرابحہ کی دو ہم تقسیم صورتیں بیع تولیہ اور وضیعہ بھی ہیں۔ چونکہ بیع تولیہ اور بیع وضیعہ بینکوں کے معاملات میں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔اس لیے آج کل کے فقہاء نے اس سے بحث زیادہ نہیں کی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے اور یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بیع کی کوئی بھی قسم ہو، مرابحہ، یا تولیہ ہو یا کوئی اور صورت ہو، بیع مؤجل ہو، اس میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرض اور بیع دونوں کو ایک ساتھ ملانے سے منع فرمایا ہے۔''**نهى رسول الله ﷺ عن بيع و سلف**'' یہ حدیث متعدد محدثین نے بیان کی ہے۔متعدد صحابہ کرام نے اس کو روایت کیا ہے۔نہ صرف بیع یا بلکہ کسی بھی قسم کے عقد معاوضہ اور قرض کو ایک عقد میں جمع کرنا درست نہیں ہے۔یعنی کوئی بھی ایسا عقد جو عقود المعاوضہ کی قسم میں شامل ہو، مثلاً بیع، اجارہ، اس

میں قرض اور عقد معاوضہ کو یکجا کر کے کوئی نئی شکل بنانا درست نہیں ہے۔

امام مالک نے اس کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ بیع ہے جس میں ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میں تمھارا فلاں سودا، مثلاً میں تمھاری گاڑی دس لاکھ روپے میں خریدنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھے پانچ لاکھ روپے قرض دے دو۔ یہ جائز نہیں ہے۔ میں تمھاری زمین خریدنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تم مجھے اتنی رقم قرض دے دو یا مجھ سے اتنی رقم قرض لے لو۔ قرض اور بیع، ان دونوں کو ملا کر کوئی تیسری شکل بنانا، درست نہیں ہے۔ لہٰذا فقہی انجینیرنگ کے کام میں ان ہدایات کو سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔ جو عقود عقود معاوضہ کہلاتے ہیں، یہ وہ ہیں جن میں مال کا تبادلہ یا تو مال کے ساتھ ہو رہا ہو، جیسے عام خرید و فروخت کے معاملات ہیں۔ یا مال کا تبادلہ منفعت کے ساتھ ہو رہا ہو جیسے اجارہ ہے۔ اجارہ میں ایک طرف سے تو مال ہے، پیسہ ہے، کرایہ ہے، دوسری طرف مال نہیں ہے بلکہ مال سے پیدا ہونے والی منفعت ہے۔ آپ مکان کرایے پر لیتے ہیں، مکان کے آپ مالک نہیں ہو جاتے۔ آپ کچھ عرصے کے لیے صرف اس کی منفعت کے مالک ہوتے ہیں۔ یا ایسا تبادلہ جس میں منفعت کا تبادلہ منفعت کے ساتھ ہو۔ یہ وہ ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں مہایاۃ کہتے ہیں اور جدید قانون کی اصطلاح میں بھی یہ set off کی ایک شکل ہے۔

معاوضات کے ساتھ ساتھ جو مالی معاملات ہیں ان میں ایک شکل توثیقات کہلاتی ہے۔ ان کو عقود التوثق بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ عقد جس میں ایک شخص اپنے حق کو مزید پختہ بنانے کے لیے کوئی ذیلی معاملہ کرتا ہے۔ مثلاً رہن کا معاملہ، مثلاً کفالہ یا حوالہ کا معاملہ، یہ عقود التوثق یا توثیقات کہلاتے ہیں۔ یہ سب وہ معاملات ہیں جن سے دور جدید میں بینکاری کے عمل میں اہل علم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

جہاں تک اجارہ کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اجارہ کا ادارہ اور اجارہ کا قانون سب سے پہلے فقہائے اسلام نے مرتب فرمایا۔ اجارے کے احکام فقہائے اسلام کی عطاء ہیں۔ مغربی دنیا میں آج سے ستر اسی سال پہلے اجارے کا وہ تصور نہیں تھا جو آج پایا جاتا ہے۔ لیزنگ کو بطور سرمایہ کاری کے ایک طریقے کے مغربی دنیا میں بہت آخر میں شروع کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ مغرب میں غالباً ساٹھ ستر سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں اجارہ کا طریق کار

شروع سے رائج رہا ہے اور اجارہ کے احکام فقہائے اسلام نے دوسری صدی ہجری میں مرتب کرنے شروع کر دیے تھے۔ آج اجارہ کی ایک اہم شکل وہ ہے جس کو اجارہ منتہیہ بالتملیک کہتے ہیں۔ خاص طور پر جائداد، زمین، گاڑیوں اور اس طرح کی ضروریات کی خرید وفروخت میں اجارہ منتہیہ بالتملیک کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

یہ وہ چند بڑے بڑے متبادلات ہیں جو سودی کاروبار کی جگہ اہل علم نے تجویز کیے ہیں۔ ان پر دنیا کے بیشتر اسلامی بینکوں میں عمل ہو رہا ہے۔

نواں خطبہ

ربا کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شبہات اور ان کی وضاحت

نواں خطبہ

ربا کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شبہات اور ان کی وضاحت

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلى على رسوله الكريم و علىٰ اله و اصحابه اجمعين

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''ربا کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شبہات اور ان کی وضاحت''۔ یہ گفتگو کل اور پرسوں کی گفتگو ہی کا خاتمہ اور تتمہ ہے۔ چونکہ ربا کے بارے میں بہت سے سوالات اور شبہات آج پیدا ہو گئے ہیں یا پیدا کر دیے ہیں۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات عامتہ الناس کے ذہن میں ربا کی حقیقت اور اس کی حرمت کے بارے میں بعض الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان شبہات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے۔ ان کا حقیقی منشا اور سبب کیا ہے، اس کا پتا چلایا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ کیا واقعی ان شبہات کی بنیاد پر ربا کے احکام میں کوئی ابہام یا غموض پایا جاتا ہے۔

یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ربا جس کو اردو اور فارسی میں سود، ہندی میں بیاج اور قدیم انگریزی میں usury کہا جاتا تھا۔ یہ قدیم زمانے سے رائج رہا ہے۔ ہر قوم، ہر زمانے اور ہر علاقے میں جہاں سود خوری رائج رہی وہاں ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس کو بہت بُرا اور مکروہ جرم بھی سمجھا گیا۔ دنیا کے قدیم مذہبی اور اخلاقی ادب میں اس جرم کی برائی کا تذکرہ مختلف انداز میں

ملتا ہے۔ قدیم مصری تہذیب ہو، بابلی اور آشوری یا سمری تہذیبیں ہوں۔ ہندوؤں کی قدیم آرین تہذیب ہو۔ یونانی اور رومیوں کی قدیم تاریخ ہو۔ ان سب میں ربا اور سود کی حرمت کا کوئی نہ کوئی تصور ہمیشہ پایا جاتا رہا ہے۔ یہودی اور عیسائی مذاہب کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ان دونوں مذاہب میں سود کی حرمت آج بھی ان کی کتابوں میں موجود ہے اور نظری اعتبار سے ان کا مذہب آج بھی سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب، ہر قوم اور ہر مذہب میں سود کی حرمت کا ایک واضح تصور ہمیشہ موجود تھا۔ جو چیز اتنی کثرت اور تواتر سے بری سمجھی جاتی رہی ہو، جس کو ہمیشہ حرام سمجھا گیا ہو، اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ دنیا بغیر کسی واضح تصور کے اس کو حرام سمجھتی تھی ایک انتہائی مہمل اور لایعنی بات ہے۔ آخر چوری، قتل، دھوکہ، یہ ساری برائیاں دنیا میں ہمیشہ برائیاں سمجھی گئیں اور ان میں سے کسی کے بارے میں کبھی یہ ابہام پیدا نہیں ہوا کہ چوری کیا ہے، قتل کیا ہے، دھوکہ کیا ہے۔ اسی طرح سے سود اور ربا کے بارے میں بھی کبھی کوئی الجھن یا غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہیے اور نہ کبھی پیدا ہوئی ہے۔ یہ الجھن یا غلط فہمی تو اب گزشتہ سو پچاس سال کے دوران ان طبقوں نے پیدا کی ہے جن کے مفادات جدید سودی نظام سے وابستہ ہیں یا جو جدید بینکاری نظام سے منتفع ہو رہے ہیں۔ ان شبہات میں بڑے بڑے شبہات چار ہیں۔

سب سے بڑا شبہ قرآن کریم ہی کی اس آیت سے پیدا کیا جاتا ہے جس کا پچھلی گفتگو میں تذکرہ کیا جا چکا، جس میں اضعافا مضاعفۃ کی قید کے ساتھ سود کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اگر سود اضعافا مضاعفۃ نہ ہو، چند در چند نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت نے صرف مرکب سود یا کمپاؤنڈ انٹرسٹ کو حرام قرار دیا ہے۔ مفرد اور سادہ سود گویا حلال و طیب ہے۔

کچھ حضرات صرفی اور تجارتی قرضوں کا فرق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سود اگر صرفی قرضوں پر دیا جائے یا لیا جائے تو ناجائز ہے۔ تجارتی قرضوں پر اگر سود لیا جائے تو وہ ناجائز نہیں ہے۔ کچھ اور حضرات ضرورت اور اضطرار کا حوالہ دیتے ہیں۔ کہ ضرورت اور اضطرار میں بہت سے ناجائز کام جائز قرار پاتے ہیں۔ چونکہ آج کل ضرورت اور اضطرار کا زمانہ ہے، اس لیے ربا کو جائز ہونا چاہیے۔

ان شبہات پر میں ابھی آتا ہوں لیکن اس آخری شبہے سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ جولوگ اضطرار کا حوالہ دیتے ہیں وہ سود اور ربا کو فی نفسہ حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جب سود حرام اور ناجائز ہی ہوگا تبھی اضطرار کی حالت میں اس کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات پیدا ہوگی۔ اگر سود حرام ہی نہ ہو تو پھر اس کے جواز کے لیے اضطرار کا حوالہ بے معنی ہے۔

کچھ حضرات یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنک انٹرسٹ وہ ربا نہیں ہے جس کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا تھا۔ اس شبہ کا کچھ تذکرہ پچھلی ایک گفتگو میں کیا جا چکا ہے۔ آج اس کی مزید وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جن حضرات کی رسائی اسلامی فقہ اور حدیث کے ذخائر تک ہے ان کو حضرت عمر فاروقؓ کا ایک قول مل گیا ہے جس کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے منسوب ایک جملہ حدیث کی بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے جس میں انھوں نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ میں رسول اللہ ﷺ سے سود کے معاملے میں بعض معاملات کی وضاحت نہیں کرا سکا اور رسول اللہ ﷺ اس سے پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور مجھے وہ سوالات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اس جملے سے کچھ حضرات یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ربا اور سود ایک مبہم اور غیر متعین چیز تھی، واضح نہیں تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اس کو غیر واضح اور مبہم قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو پورے طور پر بیان نہیں فرمایا، اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور یوں گویا ایک بہت ضروری چیز کو غیر واضح، غیر متعین اور مبہم چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے۔

دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی سزا کہ اللہ اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو، محض یہ ایک مبہم اور غیر متعین چیز پر دے دی۔ گویا شارع نے جرم کا تعین نہیں کیا، جرم کی پورے طور پر وضاحت نہیں کی، لیکن سزا بہت سخت پہلے ہی سنا دی۔

دنیا کے کسی قانون میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ انتہائی لغو اور مہمل بات ہے۔ انسانی قانون جو دنیا کے مختلف ممالک میں بنتے ہیں وہاں بھی کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی چیز کی وضاحت کیے بغیر، اس کی تعریف کیے بغیر، اس کی حدود متعین کیے بغیر اس کو جرم قرار دے دیا گیا ہو اور اس جرم کی بہت بڑی سزا رکھ دی گئی ہو۔ اللہ کی شریعت سے اس طرح کی نامعقول اور غیر حکیمانہ باتیں منسوب کرنا، واقعہ یہ ہے کہ بہت بڑی جسارت ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد اگر ثابت ہو جائے کہ واقعی درست ہے، اور انھوں نے واقعتاً ایسا ہی فرمایا تھا تو یہ ربا الفضل کے بارے میں ہے۔ ربا النسیئۃ کے بارے میں نہیں ہے۔ ربا النسیئۃ کے بارے میں صحابہ کرام میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ صحابہ کے مابین اس امر پر کلی اتفاق رہا ہے کہ ربا النسیئۃ کی حرمت قطعی ،یقینی ، ابدی اور دائمی ہے۔ ربا الفضل کے بارے میں، اس کی بعض صورتوں اور شکلوں کے بارے میں، بعض صحابہ کرام کی شروع شروع میں رائے یہ تھی کہ ان میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ دوسرے صحابہ کرام ان کو بھی حرام سمجھتے تھے۔ یہ احتیاط کے رویے کی بات ہے جو صحابہ کرام میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔

سیدنا فاروق اعظمؓ چونکہ غیر معمولی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ ان کی نگاہ انتہائی دوررس اور دور بین تھی۔ اس لیے وہ ان تمام ممکنہ راستوں کا اندازہ فرما رہے تھے جن کے ذریعے سودی کاروبار کا راستہ کھل سکتا ہے۔ اس لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے تمام معاملات کی قطعی صراحت اور مکمل وضاحت کرالیں جو بہت مستقبل بعید میں بھی کسی وقت سود کے فروغ کا ذریعہ بن سکتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے نادر الوقوع امکانات کی وضاحت کرکے ان کو منصوص قرار دینا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ ان معاملات کو امت کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑ دیا۔ شریعت کا یہ مزاج ہے کہ وہ جس معاملے کی حرمت کا حکم دیتی ہے تو وہ حکم صراحت کے ساتھ یا تو قرآن کریم میں بیان کیا جاتا ہے یا سنت ثابتہ میں آجاتا ہے، پھر اس کی مزید تحدید اور حدود و قیود بقیہ احادیث کے ذریعے ہو جاتی ہیں۔ تفصیلی وضاحت صحابہ کرام کے اجتماعی طرز عمل سے ہو جاتی ہے۔ اور جزوی تفصیلات کی بات امت کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑ دی جاتی ہے۔ ایسے جزوی معاملات میں امت اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لے کر نئی ممکنہ صورتوں کا حل خود تلاش کر لیتی ہے۔

یہی معاملہ ربا کے سلسلے میں بھی اختیار کیا گیا کہ ربا جو معروف و مانوس تھا، اس کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ ربا کی وہ شکلیں جن سے عرب مانوس نہیں تھے، لیکن ان کی وجہ سے حقیقی ربا کا راستہ کھل سکتا تھا، یا جن کے نتیجے میں یہودی مسلمانوں کا استحصال کر رہے تھے، یا جن کی وجہ سے ایک منصفانہ معیشت کی تشکیل میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔ ان سب کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف احادیث کے ذریعے منع فرمایا، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ چھپن قسم کے کاروباروں کو

احادیث میں ممنوع قرار دیا گیا۔ اس سے اس اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو تجارت کو پاک صاف کرنے کے لیے، کاروبار اور رزق کو ستھرا بنانے کے لیے اسلامی شریعت میں دی گئی ہے۔

ان تمام تفصیلات کے باوجود بعض ایسے حالات ہو سکتے ہیں، بعض ایسے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہو کہ یہ ان حدود کے اندر ہیں جو شریعت نے جائز قرار دی ہیں یا ان حدود سے باہر ہیں۔ شریعت کا مزاج ان جزوی اور نئے پیش آمدہ معاملات میں امت پر عمومی بصیرت پر اعتماد کرنے کا ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کے بعض معاملات کی بھی وضاحت ہو جانی چاہیے اور اگر ان کو امت کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑا گیا تو شاید اس سے آگے چل کر کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔

یہ پس منظر ہے سیدنا عمر فاروقؓ کے اس جملے کا، جو ربا کے بارے میں ان سے منسوب ہے، اور حدیث کی بعض کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ سیدنا عمر فاروقؓ کا یہ جملہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اور سنن اربعہ یعنی امام ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ مصنف عبدالرزاق اور سنن بیہقی میں یہ جملہ ملتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ اس طرح کی کوئی بات دوسرے صحابہ سے منقول نہیں ہے۔ یعنی جس غموض کا حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے سے تذکرہ کیا جاتا ہے وہ غموض نہیں تھا، وہ ابہام یا اجمال نہیں تھا۔ بلکہ محض ایک ایسی بات تھی جس کا تعلق حکمت تشریع سے ہے۔ سوال صرف اتنا تھا کہ کیا اس پہلو کو صراحت کے ساتھ نص کے ذریعے واضح کر دینا چاہیے تھا یا امت کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

ربا کے حوالہ سے ایک جملہ سیدنا عبداللہ بن عباس سے بھی منسوب ہے۔ جس سے بنک انٹرسٹ کے حامیوں نے بہت فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ جملہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے "لا ربا الا فی النسیئة"، کہ اصل ربا تو صرف نسیۂ میں ہی ہوتا ہے۔ اس جملے کے دونوں ترجمے ممکن ہیں۔ ربا صرف نسیئہ میں ہوتا ہے، اصل ربا نسیئہ ہی میں ہے اور نسیئہ کے علاوہ کہیں ربا نہیں ہے۔ لیکن سیدنا عبداللہ بن عباس سے منسوب اس جملے کے یہ معنی کبھی کسی نے نہیں سمجھے کہ ربا کی وہ صورتیں بھی جائز قرار دے دی جائیں جو کھلی کھلی ربا النسیئہ میں شامل ہیں اور آج بنک انٹرسٹ کے دائرے میں آتی ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس ربا

الفضل کو جائز مانتے تھے تو اس سے بنک انٹرسٹ کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ بنک انٹرسٹ نہ بارٹر سیل ہے، نہ اس میں گندم اور اشیاء کی لین دین آپس میں ہو رہی ہے، نہ اس میں تفاضل ہو رہا ہے۔ بنک انٹرسٹ تو سارا کا سارا سو فیصد ربا النسیئۃ ہے، جیسا کہ کل کی گفتگو میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے نہ سیدنا عبداللہ بن عباس کا یہ جملہ کام آ سکتا ہے اور نہ سیدنا عمر فاروق سے منسوب اس بیان سے کوئی تائید سود خوری کے حق میں نکالی جا سکتی ہے۔ پھر بہت سے ائمہ محدثین نے سیدنا عبداللہ بن عباس کا رجوع بھی ثابت کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو شروع شروع میں بیشک تامل تھا کہ ربا الفضل کی بعض صورتیں واقعی ربا ہیں کہ نہیں ہیں۔ لیکن بالآخر انھوں نے اپنے اس قول سے اس وقت رجوع کر لیا، جب ان کو کبار صحابہ سے بقیہ احادیث کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔

جہاں تک قرآن کریم کی آیت ''اضعافا مضاعفۃ'' کا تعلق ہے۔ اس کو بھی بہت سے حضرات نے بنیاد بنایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے وہ صرف وہ ہے جو چند در چند ہو۔ کل کی گفتگو میں میں قرآن کریم کی آیات کے نزول کی ترتیب کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جس سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ربا کے احکام ایک تدریج کے نتیجے میں نازل ہوئے ہیں۔ اور شریعت نے اپنی حکمت کے تحت ربا جیسی عام اور رائج الوقت چیز کو بیک جنبش قلم ختم نہیں کیا، بلکہ تدریج کے ساتھ پندرہ بیس سال کے عرصے میں اس برائی کا خاتمہ کیا۔ اس تدریج میں ایک مرحلہ وہ بھی تھا جب اضعافا مضاعفہ کو حرام قرار دیا گیا۔ کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی ممانعت کی گئی۔ لیکن کمپاؤنڈ انٹرسٹ کی اس ممانعت کے کئی سال بعد بالآخر سود کی تمام قسموں یعنی ''الربا'' کو حرام قرار دے دیا گیا۔ ''واحل اللہ البیع و حرم الربا''۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن کریم کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ بعض اوقات وہ کوئی ایسی قید کسی لفظ کے ساتھ لگا دیتا ہے جو محض بیان واقعہ کے لیے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں (اور احادیث میں بھی) بعض جگہ کسی فعل کو جرم قرار دیتے وقت اس کی برائی کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے اس جرم کی اضافی برائیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ یہ قید اس جرم کی مزید برائی بیان کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس قید کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ حکم اس قید سے وابستہ ہے یا اس شرط سے مشروط ہے۔ اس کی مثالیں حدیث کی کتابوں میں بھی بے شمار ملتی ہیں اور قرآن کریم میں بھی بہت ہیں۔

مثلاً قرآن کریم میں ایک جگہ آیا ہے کہ "ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا" "اگر تمھاری یہ زرخرید لونڈیاں پاکیزہ زندگی گزارنا چاہیں تو تم انھیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اس آیت کا یہ مطلب کوئی معقول آدمی قرار نہیں دیتا کہ اگر وہ لونڈیاں خود بدکاری کرنا چاہیں تو ان کو بدکاری کی اجازت دے دو۔ یہاں صرف یہ بات یاد دلانے کے لیے ہے کہ تمھاری طرف سے یہ برائی دوچند ہو جاتی ہے کہ ایک تو تم کسی کو بدکاری پر مجبور کرو جبکہ وہ خود پاکیزہ زندگی گزارنا چاہتا ہو۔ یہ اشارہ ہے بعض منافقین کی طرف جو اپنی باندیوں سے ناجائز آمدنی کے حصول کی خاطر، ناجائز دولت کی ہوس میں اس طرح کی حرکتیں کرایا کرتے تھے۔

خود احادیث میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جن میں کسی حکم کے ساتھ ایک قید لگائی گئی۔ وہ قید کوئی شرط نہیں ہے، نہ حکم اس سے مشروط ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی صورتحال کو بیان کرنے کے لیے لگائی گئی جس سے اس جرم کی برائی مزید نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ لہٰذا اضعافا مضاعفہ کی یہ قید اتفاقی ہے، احترازی نہیں ہے۔

بالآخر جب قرآن کریم نے حکم دے دیا کہ "وذروا ما بقی من الربا"، ربا کا جو حصہ باقی ہے اس کو چھوڑ دو، اس حکم اور الربا کے اس لفظ میں ہر طرح کا ربا شامل ہے۔ اس میں سادہ سود بھی شامل ہے اور مرکب سود بھی شامل ہے۔ پھر قرآن کریم کی اسی آیت میں اگلا جملہ ہے "فلکم رؤوس اموالکم" "تمھارا حق صرف اصل سرمایہ تک ہے۔ یہاں راس المال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے یہ بھی اشارہ مقصود ہے کہ یہاں جس سود کی حرمت بیان کی جا رہی ہے وہ تجارتی قرضوں پر لیا جانے والا سود ہے۔ تجارت اور انڈسٹری کے سیاق وسباق میں ہی راس المال کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ذاتی اور صرفی قرضوں کی لین دین میں راس المال یا سرمایہ کی اصطلاح عام طور پر استعمال نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے قرض دینے والے کا حق صرف یہ ہے کہ وہ اپنا راس المال واپس لے سکتا ہے۔ نہ اس کو ظلم کرنے کی اجازت ہے، نہ فریق مخالف کو ظلم کرنے کی اجازت ہے۔ اگر وہ زیادہ لے گا تو وہ ظلم کر رہا ہوگا۔ اسے کم ملے گا تو اس پر ظلم ہوگا۔ اس لیے نہ کمی کی اجازت اِس طرف ہے نہ اُس طرف ہے۔ صرف راس المال کی اجازت ہے۔ اس آیت کے الفاظ "اضعافا مضاعفة" سے اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو بھی رہی تھی تو وہ اگلی آیت دور ہو جاتی ہے۔

یہ بات تمام مفسرین نے لکھی ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، امام ابن جریر طبری سے لے کر، ہمارے زمانے کے تمام مفسرین قرآن تک، سب یہی لکھتے چلے آئے ہیں کہ ''اضعافا مضاعفة'' کی قید حرمت ربا کی شرط نہیں ہے۔ یہ صرف بیان واقعہ کے لیے ہے۔ پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عرب میں دونوں طرح کا ربا رائج تھا۔ سادہ ربا بھی رائج تھا اور مرکب ربا بھی رائج تھا۔ سود تجارتی اور پیداواری قرضوں پر بھی لیا جاتا تھا اور صرفی اور ذاتی قرضوں پر بھی لیا جاتا تھا۔ اس لیے عرب میں جب ربا کا لفظ بولا جاتا تھا تو وہ ہر طرح کے ربا کے لیے بولا جاتا تھا۔ اور جب ربا کو حرام قرار دیا گیا تو ہر طرح کا ربا خود بخود حرام ہو گیا۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ ''اضعافا مضاعفة'' ربا کی صفت ہے، دَین کی صفت نہیں ہے۔ اس لیے کہ دَین تو یہاں مذکور ہی نہیں ہے۔ ''لاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفة'' ۔ چند در چند سود مت کھاؤ۔ اس سے پتا چلا کہ ربا اگر مفرد ہو تو بھی ''اضعافا مضاعفة'' ہو سکتا ہے۔ اور ایک طرح سے تو ہر ربا ''اضعافا مضاعفة'' ہوتا ہے۔ مفرد سود اگر ایک سال کے لیے ایک شخص نے دس فیصد پر لیا، مثلاً ایک لاکھ روپے لیے، دس فیصد سود ملا کر ایک لاکھ دس ہزار واجب الادا قرار پائے۔ ایک سال بعد وہ ادا نہیں کر سکا اور مزید ایک سال کے لیے اس نے سودی قرضے میں توسیع کرالی۔ اب جو وہ مزید سود ادا کرے گا تو وہ ایک لاکھ پر نہیں کرے گا، ایک لاکھ دس ہزار پر کرے گا۔ اس لیے اس اضافی دس ہزار کی حد تک تو سود مرکب ہو گیا۔ لہٰذا ''اضعافا مضاعفة'' تو مفرد ربا میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ مفرد ربا ''اضعافا مضاعفة'' سے بالکل خالی ہے درست نہیں ہے۔

پھر ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے جو بہت اہم ہے، جس سے شریعت کی حکمت تشریع کا گہرا اندازہ ہوتا ہے۔ شریعت کے محرمات پر ایک ایک کر کے نظر ڈالی جائے، چوری، ڈاکہ، بدکاری، جھوٹ، دھوکہ، جھوٹی گواہی، شراب نوشی، قتل، یہ سب وہ جرائم ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور یہ سب گناہ کبیرہ میں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی جرم ایسا نہیں ہے کہ شریعت نے اس میں تھوڑے سے جرم کی تو اجازت دے دی ہو اور زیادہ کو حرام قرار دیا ہو۔ شریعت نے ایسا ہرگز نہیں کہا کہ بیشک چوری جرم ہے، سزا سخت ہے، ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ لیکن تھوڑی بہت چوری جائز ہے، مفرد چوری کی اجازت ہے، مرکب چوری کی اجازت نہیں ہے۔

ڈاکہ معمولی ہو تو اجازت ہے، بڑا ڈاکہ ہو تو جرم ہے۔ چھوٹی موٹی دھوکہ دہی جائز ہے، بڑی دھوکہ دہی ناجائز ہے۔ چھوٹا موٹا قتل جائز ہے، مفرد قتل جائز ہے، مرکب قتل ناجائز ہے۔ جتنی مضحکہ خیز یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ربا کی بات بھی مضحکہ خیز ہے۔ جو چیز حرام ہے اور شریعت نے حرام قرار دے دی اس میں کمی بیشی کا فرق پیدا کرنا نہ صرف انتہائی غیر عقلی اور غیر علمی بات ہے بلکہ یہ ایک ناممکن العمل چیز بھی ہے۔

ایسے امور میں کمی بیشی کی تحدید محض داخلی سی چیز ہے، یہ بہت subjective چیز ہے۔ کس چیز کو آپ کم کہیں گے، کس کو زیادہ کہیں گے۔ نہ صرف اسلامی شریعت بلکہ کوئی بھی معقول نظام قانون اس طرح کی مبہم اور subjective باتوں پر اپنا دارومدار نہیں رکھا کرتا۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ قوانین دوٹوک اور واضح معاملات پر دارومدار رکھتے ہیں۔ جو چیز حرام قرار دی جاتی ہے اس میں پھر حرمت میں کمی بیشی نہیں ہوتی، سزا میں تو ہو سکتی ہے کہ کم قسم کا جرم ہو تو کم سزا ہوگی، زیادہ جرم ہو تو زیادہ سزا ہوگی۔ لیکن یہ بات کہ شریعت کہہ دے کہ قتل تھوڑا سا ہو تو جائز ہے، زیادہ ہو تو ناجائز ہے۔ دھوکہ دہی تھوڑی سی ہو تو جائز ہے، زیادہ ہو تو ناجائز ہے۔ یہی حال ڈاکے اور چوری کا ہے۔ جس طرح سے ان جرائم میں کمی بیشی کی بنیاد پر فیصلہ نہیں بدل سکتا اسی طرح سود کے بارے میں نہیں بدل سکتا۔

یہاں ایک اور بحث بھی قابل غور ہے جس کا تعلق اصول فقہ سے ہے۔ اصول فقہ کے مباحث میں یہ مسئلہ ائمہ احناف اور غیر احناف کے نزدیک اختلافی رہا ہے کہ مفہوم مخالفہ کا اعتبار ہے کہ نہیں ہے۔ مفہوم مخالف سے مراد یہ ہے کہ شریعت میں کسی چیز کا کوئی حکم دیا گیا ہو اور جس چیز کا حکم دیا گیا اس کے ساتھ کوئی صفت، کیفیت یا حالت بھی بیان کی گئی ہو۔ اس صفت، کیفیت یا حالت کا جو مخالف مفہوم نکلتا ہے کیا اس اعتبار ہے؟ کیا کوئی مختلف حکم اس قید یا وصف سے نکالا جا سکتا ہے۔ احناف اور بہت سے متکلمین اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک مفہوم مخالفہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جس چیز کا شارع نے حکم دیا ہے وہ حکم اسی چیز تک محدود ہے۔ اس کے عکس یا اس کی نفی کا حکم اس سے نکالنا، جب کہ اس کی کوئی اور براہ راست دلیل نہ ہو، درست نہیں ہے۔

جو فقہاء مفہوم مخالفہ کے قائل ہیں مثلاً امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وہ بھی تین شرائط کے ساتھ قائل ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جو قید یا کیفیت وارد ہوئی ہے، جس کی بنیاد پر

مفہوم مخالف مراد لیا جا رہا ہے وہ کسی عام اور کثیر الوقوع صورتحال کو بیان کرنے کے لیے نہ آئی ہو۔ اس لیے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شریعت کے احکام میں کوئی ایسی اضافی صفت آ جاتی ہے جو بطور شرط کے نہیں آئی ہوتی۔ لیکن چونکہ وہ فعل اس صفت کے ساتھ ہی عام طور سے موصوف ہوتا ہے۔ اس لیے اس صفت کا تذکرہ ضمناً یا استطراداً آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں ہے۔ ''وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن''۔ یعنی تمھاری وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمھاری گود میں پلی ہوں اور تمھاری ان بیویوں کی اولاد ہوں جن کے ساتھ تمھاری رخصتی ہو چکی ہے وہ تم پر حرام ہیں۔ یہاں سوتیلی بیٹی کے ساتھ یہ صفت یا قید بیان ہوئی ہے ''فی حجورکم'' (تمھاری گود میں ہوں)۔ اب بالاتفاق تمام فقہائے کرام کی رائے ہے اور مفسرین کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ فی حجورکم کی یہ صفت یا قید محض اتفاقی ہے۔ یہاں یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ اگر سوتیلی بیٹی تمھاری گود میں نہ پلی ہو تو اس سے نکاح جائز ہے۔ یہ کوئی مسلمان نہیں سمجھتا۔ ہر مسلمان اس پر ایمان رکھتا ہے کہ سوتیلی بیٹی محرمات میں سے ہے اور ہمیشہ کے لیے محرم ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر سوتیلی بیٹیاں سوتیلے باپ کی گود میں پلی ہوتی ہیں اس لیے یہ صفت اس بات کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ بچی جو تمھاری گود میں پلی ہے اس کو بھی تم محرم نہیں سمجھو گے تو بہت بری بات ہوگی۔ گویا اس بات کی اہمیت اور اس کی معنویت کا گہرا احساس پیدا کرنے کے لیے فی حجورکم کی قید لگائی گئی ہے۔ لہٰذا پہلی شرط ان حضرات کے نزدیک بھی یہی ہے کہ وہ جو قید یا صفت جو بیان ہوئی ہے وہ کسی عام اور کثیر الوقوع کیفیت یا صورتحال کو بیان کرنے کے لیے نہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس قید سے کسی امر واقعہ کی نشاندہی نہ ہوتی ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ جو قید یا صفت آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے بطور اپنی نعمت یا احسان کے بیان نہ فرمائی ہو۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں ایک جگہ آیا ہے ''سخر لکم البحر لتاکلوا منہ لحما طریا''۔ اللہ تعالیٰ نے سمندروں اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر سمندر کا شکار تازہ نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ یا دریا کی مچھلی اگر تازہ نہ ہو تو وہ جائز نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں طریا کا لفظ آیا ہے۔ یہاں طریا کا لفظ اللہ تعالیٰ کے احسان کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص احسان کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ کہ

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سمندروں سے، دریاؤں سے تازہ تازہ گوشت کا انتظام کر رکھا ہے۔

یہ تین شرائط ان حضرات نے پیش نظر رکھی ہیں جو مفہوم مخالفہ کے قائل ہیں۔ اگر ان تینوں شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے ''اضعافا مضاعفۃ'' کو دیکھا جائے تو ان حضرات کی دلیل کی کمزوری پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو ''اضعافا مضاعفۃ'' کی شرط کو حرمت ربا کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔

''اضعافا مضاعفۃ'' کی ہی طرح کی ایک غلط فہمی یہ بھی ہے جو بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ ربا اگر بہت اونچی شرح پر ہو، سود کی شرح بہت زیادہ ہو، (یعنی جس کو exhorbitant rate کہتے ہیں) تو وہ تو ناجائز ہے۔ exhorbitant نہ ہو تو جائز ہے۔ یہ شبہ بھی اتنا ہی کمزور اور بے بنیاد ہے جتنا ''اضعافا مضاعفۃ'' والا شبہ بے بنیاد تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ شریعت نے ایسی کوئی تقسیم نہیں کی کہ سودی لین دین میں فلاں حد تک اگر شرح سود ہو تو معقول ہے اور فلاں حد سے زائد ہو جائے تو غیر معقول ہے۔ قرآن کریم میں، احادیث میں، صحابہ کرام کے اجتہادات میں کہیں کوئی ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا جس میں اس بات کا اشارۃ یا کنایۃ کوئی تذکرہ ہو کہ حرمت کا تعلق سود کی شرح سے ہے۔ شرح ایک فیصد ہو، صفر ایک فیصد ہو، صفر صفر ایک فیصد ہو وہ ربا ہی سمجھا جائے گا اور حرام ہی ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ کس شرح کو غیر معقول شرح یا exorbitent شرح کہا جائے گا اور کس شرح کو معقول شرح کہا جائے گا۔ یہ بہت داخلی سی چیز ہے۔ شریعت کے معاملات کا فیصلہ خاص طور پر قانونی اور عدالتی معاملات کا فیصلہ داخلی اور غیر معروضی بنیادوں پر نہیں ہوتا۔ یہ فیصلہ تو خالص موضوعی اور معروضی یعنی Objective بنیادوں پر ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ربا کی جو خرابیاں ہیں، اخلاقی، اجتماعی، اقتصادی، وہ دونوں قسم کے ربا میں پائی جاتی ہیں۔ سود کی شرح کم ہو یا زیادہ ہو، معقول ہو یا نامعقول ہو، جو خرابیاں ہیں وہ دونوں قسم کے ربا میں پائی جاتی ہیں۔ جن خرابیوں کو ختم کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ربا کی ہر صورت کو ناجائز اور حرام سمجھا جائے۔

کچھ حضرات صرفی اور تجارتی قرضوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ربا کی

حرمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں استحصال پایا جاتا ہے اور استحصال ان حضرات کے خیال میں صرف صرفی یا ذاتی قرضوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے ذاتی قرضوں پر اگر سود مانگا جائے تو وہ تو استحصال ہے اور جائز نہیں ہے۔ لیکن تجارتی قرضوں پر اگر سود لیا جائے تو وہ جائز ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت نے ایسا کوئی فرق نہیں رکھا۔ نہ قرآن کریم میں یہ فرق بتایا گیا، نہ احادیث میں اس کا کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ نہ صحابہ کرام نے ایسا کوئی فرق کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو ربا رائج تھا، جس سے عرب اور عجم ہر طرح مانوس تھے وہ صرفی اور تجارتی دونوں قسم کے قرضوں پر لیا اور دیا جاتا تھا۔

کل یا پرسوں کی گفتگو میں میں نے سیدنا عباس بن عبدالمطلب کے دعاوی کا ذکر کیا تھا۔ سیدنا عباس بن عبدالمطلب بڑے پیمانے پر تجارت کیا کرتے تھے اور وہ عرب میں سب سے سخی انسان مشہور تھے۔ آخر سخی ترین انسان کے پوتے تھے، جناب ہاشم بن عبد مناف کے پوتے تھے جو مکہ مکرمہ میں اطرف عرب سے آنے والے حجاج کی اپنی جیب سے ضیافت کیا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا لقب ہاشم پڑ گیا تھا۔ سیدنا عباس بن عبدالمطلب بھی اپنی جیب سے حجاج کرام کے لیے بہت سے ضروریات کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ وہ لوگوں کو ذاتی ضروریات پر بھی قرض دیا کرتے تھے تو سود لیا کرتے تھے، یہ درست نہیں ہے۔ ان کے تمام سودی معاملات، اسی طرح سے قریش کے دوسرے بڑے بڑے سرداروں کے سودی معاملات سب تجارتی قرضوں سے وابستہ تھے۔ اس لیے جس چیز کو شریعت نے حرام قرار دیا وہ بنیادی طور پر تجارتی قرضوں ہی کا سود تھا۔ بعض صورتوں میں یہ سود صرفی قرضوں پر بھی وصول کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ قباحتیں دونوں میں یکساں ہیں۔ اگر سود کے نتیجے میں اخلاقی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ دونوں قسم کے قرضوں پر لیے جانے والے سود سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرفی قرضوں پر سود دیا جائے اور لیا جائے، تجارتی قرضوں پر سود لیا اور دیا جائے، دونوں کی قباحتیں، دونوں کے نتائج ایک جیسے ہیں۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج بھی سارے زبانی جمع خرچ کے باوجود بنک انٹرسٹ کے حامی حضرات عملاً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ بنک کے پاس قرضہ

لینے کے لیے کوئی اپنی جائز ضروریات کے لیے جائے تو بنک اس سے بھی اُس شرح اوراسی انداز سود وصول کرتا ہے جس طرح تجارتی قرضے لینے والوں کے وصول کیا جاتا ہے بلکہ ہمارے ملک میں تجارتی قرضوں میں نرمی اور معافی کی مثالیں تو بے شمار ملتی ہیں ہر سال حکومتوں کے منظور نظر لوگوں کے کروڑوں اور اربوں کے قرضے معاف ہوتے قوم دیکھ رہی ہے صرفی یا ذاتی قرضے کی معافی کی شاید ہی کوئی مثال ملے۔ ایسا کوئی بنک میری معلومات کی حد تک موجود نہیں ہے، نہ دنیائے اسلام میں، نہ دنیائے اسلام سے باہر جو روایتی بینکاری کے طریقے کے مطابق کام کرتا ہو اور لوگوں کو جائز ذاتی ضروریات کے لیے بغیر کسی سود کے قرضے دیتا ہو۔ لہٰذا جب عملاً ایسا نہیں ہے تو پھر صرفی اور تجارتی قرضوں کا فرق روا رکھنا اوراس کی بنیاد پر سود کو جائز قرار دینا، محض خلط مبحث ہے۔

ایک اور بات یہ کہی جاتی ہے کہ پرانے زمانے میں ربا کو حرام قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ ضرورت مندی کی وجہ سے سود دینے پر مجبور تھے۔ اور سود لینے والا لوگوں کی ضروریات سے نا جائز فائدہ اٹھایا کرتا تھا۔ اس لیے سود کو حرام قرار دیا گیا۔ اگر بالفرض مجبوری کی اس بات کو درست مان لیا جائے تو سود دینا تو مجبوری تصور کیا جا سکتا ہے، سود لینے میں تو کوئی مجبوری نہیں تھی۔ سود لینے والا نہ پہلے مجبور تھا، نہ آج مجبور ہے۔ پھر صحیحین کی حدیث ہے، متفق علیہ ہے، جس کے الفاظ ہیں ''الاخذ والمعطی فیه سواء'' سود لینے والا اور دینے والا گناہ میں دونوں برابر ہیں۔ اس لیے سود دینے والے کی مجبوری اور ضرورت کا حوالہ دے کر اس کی ضرورت مندی کی بنیاد پر سود وصول کرنے کو جائز قرار دینے کی بات اتنی ہی بے بنیاد بلکہ مضحکہ خیز ہے جتنی بقیہ باتیں بے بنیاد ہیں۔

دوسری بڑی اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ آج قرضہ لینے والے عموماً دولت مند اور بڑے بڑے سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ جو قرض دینے والے ہیں، جن کا سرمایہ قرض کے طور پر دیا جا رہا ہے وہ عموماً کم آمدنی والے لوگ ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرض لوگ ضرورت کی خاطر لیتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی تھا۔ جو لوگ تجارتی قرض لیا کرتے تھے ان میں سے بہت سے بڑے بڑے تاجر ہوتے تھے۔ بعض بڑے بڑے دولت مند بھی ہوا کرتے تھے۔ اور قرض دینے والے ہر طرح کے لوگ تھے۔ کم آمدنی والے لوگ بھی تھے۔ اور زیادہ آمدنی والے لوگ بھی تھے۔

سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ لوگوں سے قرض لیا کرتے تھے، پھر اس کو کاروبار میں لگایا کرتے تھے۔ دراصل لوگ ان کے پاس جب اپنی امانت رکھنے کے لیے آیا کرتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ اس کو امانت مت سمجھو، اس کو قرض کے طور پر مجھے دے دو۔ اس لیے کہ اگر یہ رقم امانت کے طور پر رکھی گئی اور کسی وجہ سے وہ ضائع ہوگئی تو میں اس کی ادائیگی کا پابند نہیں ہوں گا۔ ممکن ہے میرے بعد میرے ورثاء اس کی ادائیگی میں تامل کریں۔ لیکن اگر تم مجھے قرض کے طور پر دو گے تو پھر میں اور میرے ورثاء اور میرے کارندے ہر شخص اس کی مکمل ادائیگی کا پورے طور پر پابند ہوگا۔ اس لیے مدینہ منورہ کے بہت سے عام باشندے ان کو قرض کے طور پر رقم دے دیا کرتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کی رقم محفوظ رہے۔ جب سیدنا زبیر کا انتقال ہوا تو وہ بائیس لاکھ درہم کے مقروض تھے۔ گویا بائیس لاکھ درہم لوگوں نے ان کو دیا ہوا تھا جو بطور قرض ان کے پاس تھا اور انھوں نے اس کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگایا ہوا تھا۔ یہ تقریباً وہی کام ہے جو آج کل بنک کرتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ بنک اس پر سود بھی ادا کرتے ہیں۔ سیدنا زبیر ابن عوام سود ادا نہیں کرتے تھے، لیکن اصل سرمایہ ان کے پاس محفوظ رہتا تھا اور اس کی ادائیگی کے وہ ذمہ دار تھے۔

شریعت کا اصول "الخراج بالضمان" میں پہلے بیان کر چکا ہوں جس چیز سے آپ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس کا تاوان اٹھانے کے بھی آپ ذمہ دار اور پابند ہیں۔ جس چیز کا آپ تاوان اٹھا رہے ہیں، اس کا فائدہ اٹھانے کے بھی آپ حق دار ہیں۔ لہٰذا سیدنا زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس رقم کی ادائیگی کے پابند تھے، جو رقم ان کے لیے واجب الاداتھی، وہ اس کا فائدہ بھی اٹھا سکتے تھے۔ اگر وہ روپیہ ان کے پاس امانت کے طور پر ہوتا تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نہ اس کو کاروبار میں لگا سکتے تھے اور نہ تجارت میں لگا سکتے تھے۔ اور کسی حادثہ کے نتیجہ میں ضائع ہو جانے کی صورت میں اس کی واپسی کے بھی پابند نہ تھے۔ اس لیے اس قرض داروں کا مفاد محفوظ رکھنے کی خاطر، ان کا روپیہ محفوظ رکھنے کی خاطر وہ اس رقم کو امانت سمجھنے کے بجائے قرض کے طور پر لیا کرتے تھے۔

قرض کے لفظ سے قدیم لٹریچر میں فقر و فاقے کا تصور وابستہ ہے۔ آج قرض کا تصور بدل چکا ہے۔ اب قرض کے ساتھ نہ محتاجی ضروری ہے، نہ فقر و فاقہ ضروری ہے۔ حکومتیں بھی قرض

لیتی ہیں، بنک قرض لیتے ہیں، بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں قرض لینے کی مہم چلاتی ہیں۔ آج کی پوری مغربی معیشت قرضوں کی معیشت بن کر رہ گئی ہے۔ قرضوں کی اس معیشت کی اساس سود خواری پر ہے۔ اس لیے سود خواری اور بنک انٹرسٹ کا نظام موجودہ مغربی معیشت کی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس کے رگ و پے میں خون کی طرح بستا اور دوڑتا ہے۔

قرض کی اس ساری اہمیت کے باوجود بعض حضرات اس کے بارے میں شبہے کا اظہار کرتے ہیں کہ بنک انٹرسٹ جس چیز پر دیا جا رہا ہے وہ قرض ہے کہ نہیں ہے۔ چونکہ بینکوں میں عام طور پر ڈپازٹ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور ڈپازٹ کا اردو ترجمہ امانت کیا جانے لگا ہے جو غلط ہے۔ دراصل یہ ڈپازٹ کی اصطلاح بھی بے محل ہے، اور اس کا ترجمہ امانت بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ اس رقم پر جو اضافہ دیا جا رہا ہے وہ امانت میں اضافہ نہیں ہے بلکہ قرض میں اضافہ ہے۔ اس لیے کہ امانت پر اضافے کا کوئی تصور شریعت میں تو در کنار دنیا کی کسی قوم میں آج بھی موجود نہیں ہے۔ آپ کسی پڑوسی کے پاس امانت رکھوا کر چلے جائیں۔ وہ آپ کی امانت کی حفاظت بھی کرے اور بعد میں آ کر آپ اس سے مطالبہ کریں کہ میری اصل امانت بھی واپس کر دو اور اس کے ساتھ پانچ سو روپے بھی لاؤ تو اس بات کو ہر شخص نا قابل قبول اور مضحکہ خیز قرار دے گا۔

لہٰذا یہ رقم جو بنک میں رکھی جاتی ہے، اس کی حیثیت صرف قرض کی ہے۔ چاہے اس میں قرض کا لفظ استعمال کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ قرض کی تعریف یہ ہے کہ قرض سے مراد ہر وہ رقم ہے جو کسی شخص نے کسی سے لی ہو اور ایک مدت کے بعد لازمی طور پر جوں کی توں واپس کرنی ہو، اس دوران رقم لینے والے کو اس میں ہر قسم کے تصرّف کا پورا پورا اختیار ہو۔ اگر یہ رقم کسی وجہ سے واجب الادا نہیں ہے تو وہ قرض نہیں ہے۔ فقہائے اسلام کا یہ اصول میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ انسانی معاملات اور لین دین میں اصل اعتبار مقاصد اور معانی کا ہوتا ہے۔ الفاظ اور عبارت کا نہیں ہوتا۔ الفاظ اور عبارت میں آپ امانت کا لفظ رکھیں deposit کا رکھیں، کھاتے کا لفظ لکھیں یا جو جی چاہے لکھیں۔ اگر اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ رقم دوسرے کے ذمے واجب الادا ہے تو وہ دَین ہے اور قرض ہے۔

فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ قرض کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرض ہی کے

الفاظ کے ساتھ لیا گیا ہو۔ کسی بھی لفظ یا عبارت کے ذریعہ یہ معاملہ ہوا ہو، اس میں دین کا لفظ استعمال کیا گیا ہو، عطیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہو یا کوئی اور لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ اگر وہ واجب الادا ہے تو وہ قرض ہے۔ علامہ ابن عابدین جو مشہور حنفی فقہاء میں سے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ قرض کا لین دین قرض کے لفظ سے بھی ہوسکتا ہے دین سے بھی ہوسکتا ہے اور بغیر کسی اصطلاح کے استعمال کے بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کہے کہ مجھے ایک درہم ادا کردو میں ایک مہینے بعد ایک درہم تمھیں ادا کردوں گا۔ یہ بھی قرض ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عاریہ کا لفظ یعنی ادھار کا لفظ استعمال کرے یا borrow کا لفظ استعمال کرے جو انگریزی میں آج کل کثرت سے قرض کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، ان سب صورتوں میں یہ معاملہ قرض ہی سمجھا جائے گا۔ یہی بات فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ میں بھی کہی گئی ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہ نے بھی کہی ہے۔ اور تمام فقہائے کرام شروع سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بینکوں کا لین دین قرض کی تعریف میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر قرض کے احکام جاری نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ شبہ اتنا بے بنیاد اور اتنا کمزور ہے کہ شاید اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جو حضرات بینکوں کے طریق کار اور کام سے واقف ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ بینکوں کا اصل کام ہی قرضوں اور دیون کا لین دین کرنا ہے۔ بنک کی تعریف ہی جدید قوانین میں یہ کی گئی ہے کہ بنک سے مراد وہ ادارہ ہے جو قرضوں کا لین دین کرتا ہو، دیون اور کاغذات زر کا کاروبار کرتا ہو۔ حتیٰ کہ مغربی ممالک میں بینکوں کو براہ راست کاروبار یا تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر بینکاری کا کوئی ادارہ براہ راست کسی تجارت یا کاروبار میں مبتلا یا ملوث پایا جائے تو اس کو بینکاری کی فہرست سے خارج کردیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک کے بڑے بنک اس ادارہ سے بطور بنک معاملہ کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ بینکوں کا لین دین قرض نہیں ہے، یہ شریعت سے بھی ناواقفیت کی دلیل ہے، بینکاری سے بھی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بنک نہ تو خود کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ اور نہ براہ راست کسی کاروبار میں ان کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ صرف قرض لیتے ہیں اور قرض دیتے ہیں۔ جو رقومات لوگ ان کے پاس رکھواتے ہیں وہ بھی قرض ہیں اور جو رقومات وہ دوسروں کو بطور ایڈوانس یا loan دیتے ہیں وہ بھی قرض ہے۔ اس رقم کے لیے borrow کا لفظ استعمال ہو یا advance کا لفظ ہو

یا کوئی اور لفظ ہو۔ ان کی حقیقت قرض رقم کی ہے۔ جب بنک لوگوں سے قرض لیتے ہیں تو سود کی شرح کم ادا کرتے ہیں، جب وہ دوسروں کو رقومات قرض دیتے ہیں تو ان سے زیادہ سود وصول کرتے ہیں اور ان دونوں شرحوں میں جو فرق ہوتا ہے وہی بنک کی آمدنی ہوتی ہے۔ کم شرح سود پر قرض لینا اور زیادہ شرح سود پر آگے قرض دے دینا، یہ شروع سے یہودی ساہوکاروں کا طریقہ رہا ہے۔ اور ہر زمانے کے سود خوار، ساہوکار ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ بنک بھی ایسا کرتے ہیں۔ بینکاری کے تمام مستند ماہرین یہی لکھتے چلے آرہے ہیں۔ بینکوں کے قوانین اسی بنیاد پر مرتب ہوئے ہیں اور بنک بنیادی طور پر دَین کی تجارت کرتے ہیں۔ تجارت دین یعنی trade in debts ہی بنک کا اصل کاروبار ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ بینکوں کے معاملات پر قرض کے احکام جاری نہیں ہونے چاہئیں، یہ بہت بڑی کم فہمی اور سادہ لوحی ہے۔

کچھ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ شریعت نے آسانی کا حکم دیا ہے اور مشکل اور مشقت کو ختم کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ''یرید اللّٰہ بکم الیسر''۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔ ''ولا یرید بکم العسر''۔ تمہارے لیے مشکل نہیں چاہتا۔ چونکہ شریعت آسانی چاہتی ہے، اس لیے آسانی کا تقاضا ہے کہ سود کو حرام قرار نہ دیا جائے۔ یہ بات کہنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ جس شریعت نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ قانون میں آسانی ہونی چاہیے۔ اسی شریعت نے یہ قاعدہ بھی مقرر کیا ہے کہ محرمات میں کوئی آسانی نہیں ہوتی۔ یسر کا یہ قاعدہ، آسانی پیدا کرنے کا یہ اصول، حرام کاموں میں نہیں چلتا۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو یہ دوسرے محرّمات میں بھی جاری ہونا چاہیے۔ ایسا ہونے لگے تو پھر کسی نادار اور بے سہارا انسان کے لیے چوری جائز ہونی چاہیے، ڈاکہ جائز ہونا چاہیے، بدکاری جائز ہونی چاہیے، کیا دنیا کا کوئی قانون اس کی اجازت دیتا ہے؟ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یسر کا اصول جائز معاملات میں ہوتا ہے۔ اگر دو معاملات جائز ہوں، اور دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہو تو پھر آسان معاملے کو اختیار کرنا چاہیے۔ کسی فرض کی انجام دہی کے دو راستے ہوں، ایک راستہ آسان ہو اور دوسرا مشکل ہو تو آسان راستے کو اختیار کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب دو راستے ہوتے تھے، ایک آسان اور دوسرا مشکل، تو آپ آسان راستے کو اختیار فرماتے تھے۔ ''اختار ایسرھما

مالم یکن اثما "اگر وہ گناہ نہ ہو یا اس میں کوئی نامناسب بات نہ ہو تو پھر آپ آسان راستے کو اختیار فرمایا کرتے تھے۔

یہ بات کہ فلاں فلاں محرمات کو اس لیے جائز قرار دے دیا جائے کہ اس کی وجہ سے آسانی پیدا ہو جائے گی، تو یہ پورے نظام اور قانون کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ دنیا کا کوئی قانون اس سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ چونکہ ایک شخص کے وہم میں اور اس کے خیال میں اگر وہ فلاں فعل حرام کا ارتکاب نہ کرے تو یہ اور یہ مشکل پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا اس کے لیے حرام کو حلال کر دینا چاہیے۔ یہ اصول اگر مان لیا جائے تو دنیا کا کوئی قانون باقی نہیں رہ سکتا۔

مزید برآں شریعت نے یسر کے بہت سے احکام دیے ہیں۔ قرآن کریم نے یسر کا حکم دیا ہے۔ رفع ضرر کا حکم دیا ہے، رفع حرج کا حکم دیا ہے۔ ان قواعد اور ان تصورات پر تفصیل سے فقہائے اسلام نے بحث کی ہے۔ امام شاطبی اور امام قرافی، علامہ ابن عابدین اور اس درجے کے دوسرے فقہائے کرام نے بہت تفصیل سے ضرر، یسر، اور حرج کے تصورات کو بیان کیا ہے۔ ان تمام قواعد اور مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت کے محرمات کو حلال قرار دینا یا شریعت کے مباحات کو حرام کر دینا یا واجبات کی ترتیب بدل دینا کسی کے دائرۂ کو اختیار میں نہیں ہے اور نہ یسر کے یہ معنی ہیں کہ شریعت کے احکام کو بدل دیا جائے۔ جو لوگ بنک انٹرسٹ کے جواز کے قائل ہیں وہ ضرورت اور حاجت پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ وہ اضطرار اور ضرورت کے بارہ میں شریعت کے دوسرے احکام کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یقیناً شریعت نے ضرورت اور اضطرار کو تسلیم کیا ہے۔ اضطرار اور ضرورت کی صورت میں بعض ناجائز کاموں کو بھی گوارا کرنے کی اجازت دی ہے۔ قرآن کریم سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، احادیث میں ان قواعد کی وضاحت موجود ہے۔ ضرورت کے احکام، ضرورت کی قسمیں اور اضطرار کی تفصیلات بھی قرآن کریم اور احادیث میں آئی ہیں۔

ضرورت سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے وہ مقاصد جن کی خاطر سارے احکام دیے گئے ہیں، خود دین کا تحفظ، انسانی جان کا تحفظ، انسان کے مال کا تحفظ، انسان کی عقل کا، نسل کا تحفظ، ان مقاصد میں سے اگر کوئی مقصد براہ راست خطرے کا نشانہ بن جائے اور اس کی تباہی کا شدید خطرہ اور امکان پیدا ہو جائے تو اس صورت میں اس مقصد کو بچانے کی خاطر کسی حرام کا

ارتکاب کر لینے کی اجازت ہے۔ مثال کے طور پر شریعت نے مردہ جانور کا گوشت کھانے کی ممانعت کی ہے، ''حرمت علیکم المیتة'' مردہ جانور تمہارے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص خود بھوک سے اتنا لاچار ہو کہ اس کی جان خطرے میں ہو اور وہ مرنے کے قریب ہو تو اس کے لیے مردہ جانور کا گوشت کھا لینا اور جان بچا لینا جائز ہے۔ لیکن ضرورت کا حکم یہ بھی ہے، قرآن کریم کی نص صریح سے نکلتا ہے کہ ''الضرورات تقدر بقدرها'' ضرورت کے اس اصول پر اتنا ہی عمل کیا جائے جتنا فوری طور پر ناگزیر ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے ''غیر باغ ولا عاد''۔ جہاں اضطرار کی اجازت ہے، جہاں اضطرار کی صورت میں بعض محرمات کی اجازت دی گئی ہے وہاں یہ شرط صراحت کے ساتھ آئی ہے ''غیر باغ ولا عاد'' اس حرام کا ارتکاب کرنے میں نیت حدود سے نکلنے کی اور اللہ کی شریعت کی خلاف ورزی کی نہ ہو، ان الفاظ سے فقہائے کرام نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے ''الضرورات تقدر بقدرها''۔ یعنی ضرورت کی صورت میں جب حرام کام کا ارتکاب کیا جائے تو اس کو صرف ضرورت کی حد تک ہی کیا جائے، جس حد تک ضرورت پوری ہو جائے۔

مثال کے طور پر ایک شخص پیاس سے مر رہا ہے، ریگستان میں ہے، پیاس کا شکار ہے، پانی کہیں سے بھی دستیاب نہیں ہے۔ اس کے کسی رفیق کے پاس شراب کی بوتل موجود ہے، ایسے شخص کو اجازت ہے کہ شراب سے اپنی پیاس بجھا لے۔ لیکن اگر ایک گھونٹ سے پیاس بجھ سکتی ہو، جان بچ سکتی ہو تو دو گھونٹ پینا جائز نہیں ہوگا۔ اس اجازت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شراب نوشی کی محفل میں جا کر بیٹھے اور جام پر جام لنڈھانا شروع کر دے۔ یا کسی شخص کو بھوک کی وجہ اس کا خطرہ ہے کہ اس کی جان ضائع ہو جائے گی اور وہاں کہیں سور دستیاب ہے، وہاں جا کر بیٹھے اور دستر خوان کے مزے لوٹے، یہ درست نہیں ہے۔ اگر ایک لقمے سے جان بچ سکتی ہے تو دو لقمے لینا جائز نہیں ہوگا۔ دو لقموں سے جان بچ سکتی ہے تو تین لقمے لینا جائز نہیں ہوگا۔

اضطرار کے ان احکام کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ بنک انٹرسٹ کو جو لوگ اضطرار کی بنیاد پر جائز قرار دینا چاہتے ہیں ان کو ایسا کوئی اضطرار درپیش نہیں ہے اور اگر بالفرض درپیش ہو تو پھر ''الضرورات تقدر بقدرها'' کے تحت ایک بار یا دو بار ایسا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پوری زندگی سود خوری میں گزار دی جائے، عیاشی اور آرام طلبی کی خاطر گھر بیٹھے سودی

آمدنی سے لوگ مستفید ہوں۔ یہ شریعت کے اضطرار اور تصور ضرورت کا کھلا کھلا استحصال ہے۔

یہاں ایک بات عرض کرنی ضروری ہے، وہ یہ کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بلاشبہ موجود ہے، مثلاً بیوہ خواتین ہیں، بوڑھے لوگ ہیں، بے گھر لوگ، یتیم بچے، جن کے پاس نہ تو اتنی مہارت، اتنا وقت اور فرصت ہے کہ خود کوئی کاروبار کر سکیں، نہ ان کے پاس کوئی ایسے وسائل ہیں نہ ایسی عمر ہے کہ جا کر نوکری کریں یا مزدوری کریں۔ ایسے لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ ان کے پاس رقم موجود ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس رقم کو کسی ایسے کاروبار میں لگا دیا جائے۔ جہاں ان کو گھر بیٹھے آمدنی ہوتی رہے۔ ایک اسی سالہ بوڑھا آدمی ہے، وہ اب کوئی نوکری نہیں کر سکتا، مزدوری بھی نہیں کر سکتا۔ کاروبار کی مہارت بھی اس کو حاصل نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو اس کی عمر اور صحت اب کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دیتی، یا مثلاً بوڑھی بیوہ خواتین ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے حکومتوں کو کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ اس طرح کے لوگوں کی ضروریات کا حوالہ دے کر بنک انٹرسٹ کو عمومی طور پر جائز قرار دینا، یہ بھی شریعت کے مقاصد اور مزاج کے خلاف ہے۔ اگر بالفرض بنک انٹرسٹ جائز ہو تو پھر اس جواز کی حقدار وہ بیوہ خواتین ہیں جن کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ وہ بوڑھے پنشن یافتہ حضرات ہیں جن میں محنت کرنے کی صلاحیت اور سکت موجود نہیں رہی۔ وہ خود براہ راست تجارت نہیں کر سکتے۔ یا ایسے یتیم بچے ہیں جن کے ورثاء پیسہ چھوڑ گئے اور کوئی ایسا جائز ذریعہ نہیں ہے جس میں اس پیسے کو لگایا جا سکے۔

اگرچہ آج پاکستان میں ایسے جائز ذرائع الحمد للہ موجود ہیں جہاں اس طرح کی رقم لگائی جا سکتی ہے اور جائز طریقے سے گھر بیٹھے آمدنی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے ملک میں بد قسمتی سے بد دیانتی اور دھوکہ دہی کا دور دورہ ہے، اس لیے بہت سے لوگ اپنا پیسہ لگاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ بینکوں کا نظام چونکہ شروع سے چلا آ رہا ہے، دو سو ڈیڑھ سو سال سے ایک خاص نہج پر قائم ہے، وہاں دھوکہ دہی کے امکانات نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگوں کی واقعی ضرورت ہے کہ ان کے لیے ایک ایسا نظام وضع کیا جائے، جن کو گھر بیٹھے ماہانہ مقررہ رقم مل سکے۔ اب چونکہ پاکستان میں بہت سے بینکوں نے اسلامی شعبے بھی قائم کر دیے ہیں، اسلامی برانچیں بھی بنائی ہیں، اس لیے اب یہ کام نسبتاً آسان ہو گیا ہے اور اسلامی بینکوں کو یا روایتی بینکوں کے جو اسلامی شعبے ہیں یا اسلامی شاخیں ہیں ان کو یہ کام کرنا چاہیے اور بیوہ خواتین، بوڑھے پنشنرز، بے گھر لوگ، یتیم

بچے، بیمار اور بے سہارا، ایسے حضرات کے لیے شریعت کے مطابق کوئی ایسی اسکیمیں بنانی چاہئیں جہاں وہ پیسہ لگا سکیں اور ان کو گھر بیٹھے آمدنی ہو سکے۔

ربا کے بارے میں ایک بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ ربا کی جتنی بھی صورتیں ہیں، وہ بنک انٹرسٹ ہو یا کوئی اور صورت ہو، یہ سب کی سب شریعت کے ان احکام سے متعارض ہیں جن کی بنیاد پر اسلام کی معیشت تشکیل پاتی ہے۔ میں پہلے تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کریم میں ایک جگہ واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی حکمت معیشت کا ایک پہلو یہ ہے کہ دولت کا ارتکاز کسی خاص طبقے میں نہ ہو۔ بلکہ دولت ہر طبقے میں گردش کرے۔ ربا اور سود کی جتنی شکلیں ہیں وہ ارتکاز دولت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس لیے شریعت کا یہ بنیادی اصول "**کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم**" ربا کی موجودگی میں روبہ عمل نہیں آ سکتا۔ اگر معاشرے میں معیشت وتجارت کا نظام سود پر مبنی ہے تو ارتکاز دولت ناگزیر ہے۔ اگر ارتکاز دولت کو ختم کرنا مقصود ہے جیسا کہ قرآن کریم کا حکم ہے تو پھر سودی کاروبار کو ختم کرنا پڑے گا۔

اسی طرح ایک حدیث نبوی کا میں کئی بار حوالہ دے چکا ہوں، جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "**الخراج بالضمان**" کہ فائدہ اسی چیز کا اٹھایا جا سکتا ہے جس کا تاوان تمہارے ذمے ہو۔ شریعت کا یہ اصول زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں میں کارفرما ہے۔ شریعت کے تمام احکام میں اس اصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ربا سے اس اصول کی نفی ہوتی ہے۔ سود دینے والا ایک ایسے سرمایے کا فائدہ اٹھا رہا ہے جس کے نقصان کا وہ پابند نہیں ہے۔ اس کو ہر صورت میں اپنا اصل سرمایہ واپس ملے گا۔ چاہے قرضہ لینے والے نے اس سے جائز کاروبار کیا ہو یا ناجائز کیا ہو۔ قرضہ لینے والے کو تجارت میں فائدہ ہو ہو یا نقصان ہوا ہو۔ سودی قرضہ دینے والا اپنا اصل سرمایہ ہر صورت میں محفوظ رکھتا ہے، اور مقررہ وقت پر اس کو واپس لے لیتا ہے۔ جب اصل محفوظ ہے اور اس کے نقصان اور تاوان کا یہ ذمہ دار نہیں ہے تو اس کا فائدہ اٹھانے کا بھی اس کو اختیار نہیں ہے۔

ربا کے بارے میں غلط فہمی کی ایک اور بڑی وجہ میرے خیال میں انگریزی کے بعض الفاظ ہیں۔ عربی زبان میں عاریہ اور قرض، یہ دو الفاظ الگ الگ استعمال ہوتے ہیں اور دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ایک گفتگو میں جہاں مال کی قسمیں بیان کی تھیں

وہاں یہ بھی بتایا تھا کہ مال استعمالی بھی ہوتا ہے اور استہلا کی بھی ہوتا ہے۔ مال کی ایک قسم تو وہ ہے کہ آپ نے اس کو اپنے تصرّف میں لیا، استعمال کیا، آپ کے استعمال کرنے کے نتیجے میں اصل چیز جوں کی توں موجود رہی، اس میں کوئی فرق نہیں پڑا اور آپ نے اصل چیز جوں کی توں واپس کر دی۔ مثلاً آپ کہیں جا رہے تھے، یا سفر پر تھے، آپ نے کسی دوست سے اس کا موبائل فون لے لیا، موبائل فون استعمال کیا، سفر سے واپس آ کر اس کا موبائل فون ویسا کا ویسا ہی اس کو واپس کر دیا۔ موبائل فون جوں کا توں موجود ہے، نہ خرچ ہوا، نہ کم ہوا، اور نہ آپ نے اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اس کا وجود ختم ہو گیا ہو۔ یہ عاریۃ کہلاتا ہے، اس کے احکام الگ ہیں۔ یہ استعمالی چیزوں میں ہوتا ہے۔

مال کی دوسری قسم ہے استہلا کی، استہلا کی چیز قرض کے طور پر دی جاتی ہے، اس کا عاریہ نہیں ہوتا۔ استہلا کی مال وہ ہوتا ہے کہ جب آپ اس کو ایک بار اپنے مصرف میں لے آئیں گے تو اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ مثلاً ایک پڑوسن نے دوسری پڑوسن سے چینی منگوائی کہ مہینے کے شروع میں جب چینی آئے گی تو واپس کر دیں گے۔ اب جب وہ پڑوسن چینی کو استعمال کرے گی تو وہ چینی ختم ہو جائے گی۔ اب وہ اصل موجود نہیں رہے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ چینی استعمال بھی ہو جائے اور ویسی کی ویسی ہی باقی بھی رہے اور اس کو جوں کی توں واپس کر دیا جائے۔ اگر لینے والی اس کو خرچ کرے گی تو وہ چینی تو ختم ہو جائے گی اور اس کا استہلاک ہو جائے گا، یعنی وہ consume ہو جائی گی اور پھر اس جیسی، اتنی ہی مقدار اور اتنی ہی وزن کی چینی واپس کر دی جائے گی۔

یہ فرق اگر پیش نظر رہے تو پھر یہ اندازہ ہو جائے گا کہ قرض صرف استہلا کی چیزوں کا ہوتا ہے، استعمالی چیزوں میں صرف عاریہ ہوتا ہے۔ زر یا نقد رقم استہلا کی چیز ہے۔ جب آپ کسی سے قرض لیتے ہیں، تو وہ دَین ہوتا ہے۔ اور پھر جب اس کو خرچ کرتے ہیں تو اصل رقم آپ کے پاس سے چلی جاتی ہے، وہ آپ کے قبضہ میں موجود نہیں رہتی۔ آپ نے کسی سے سو روپے لیے اور سو روپے خرچ کر دیے، وہ سو روپے آپ کے پاس سے چلے گئے۔ اب جب آپ قرض دار کو سو روپے واپس کریں گے تو وہ سو روپے واپس نہیں کریں گے جو اس نے آپ کو دیے تھے، کوئی اور سو روپے، اتنی ہی مالیت کے سو روپے آپ اس کے ادا کر دیں گے۔ یہ دین کہلاتا ہے۔

انگریزی میں دونوں کے لیے borrow کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آپ نے کتب خانے سے کتاب borrow کر لی اور بنک سے رقم بھی borrow کر لی۔ حالانکہ عربی اور اسلامی اصطلاح کی رو سے کتاب بطور عاریہ کے لی ہے اور رقم بطور قرض یا دین کے لی ہے۔ لہٰذا عاریہ پر دین کے احکام جاری نہیں ہوں گے، دین پر عاریہ کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ چونکہ انگریزی میں دونوں کے لیے ایک ہی لفظ رائج ہے اس لیے اس سے خلط مبحث بھی ہوتا ہے اور ایک پر دوسرے کے احکام، اور دوسرے پر پہلے کے احکام کو منطبق کرنے میں جہاں سادہ لوحوں کو غلط فہمی ہوتی ہے وہاں سود خوروں کو آسانی ہو جاتی ہے۔

جہاں تک استعمالی چیزوں کا تعلق ہے، ان کا کرایہ لیا جا سکتا ہے اور استعمال کرنے والا کرایہ دینے کا پابند ہے۔ اس لیے کہ کرایہ اس چیز کا دیا اور لیا جائے گا جس کے نقصان یا تاوان کا اصل مالک پابند ہو۔ ایک شخص نے اپنی گاڑی آپ کو کرایے پر دے دی۔ آپ نے گاڑی استعمال کی اور پھر اصل گاڑی جوں کی توں اس کو واپس کر دی۔ اور اس استعمال کا معاوضہ ایک ہزار روپے روز یا پانچ سو روپے روز کے حساب سے گاڑی کے مالک کو ادا کر دیا۔ یہ اس صورت میں جائز ہے کہ گاڑی کے نقصان کا ذمہ دار مالک ہو۔ اگر ایکسیڈنٹ ہو جائے، خدانخواستہ گاڑی کو نقصان ہو جائے، تو یہ اصل مالک کا نقصان سمجھا جائے، کرایے پر لینے والے کا نقصان نہ سمجھا جائے۔

بہت سے لوگ اس اجارے کو یا اس کرائے کو سود کے ساتھ خلط کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر گاڑی کا کرایہ لینا جائز ہے تو پیسے کا کرایہ لینا کیوں جائز نہیں ہے۔ مکان کا کرایہ جائز ہے، زمین کا کرایہ جائز ہے تو سرمایہ کا کرایہ کیوں جائز نہیں ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قرض میں اصل سرمایہ واپس نہیں ہوتا۔ اصل سرمایہ تو خرچ ہو گیا اور جب قرض لینے والے نے سرمایہ قرض لیا تھا تو وہ پہلے دن سے قرض لینے والے کے ضمان میں تھا۔ جو چیز کسی کے ضمان میں ہو اس کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قرض لینے والے کے ضمان میں اگر وہ روپیہ تھا تو پھر اس کا فائدہ بھی قرض لینے والا اٹھائے گا۔ اس کے برعکس اگر قرض دینے والا اس روپے کا ضمان رکھتا ہے، نقصان کی صورت میں رقم کے ضائع ہونے کو برداشت کرتا ہے اور تاوان کی ذمہ داری لیتا ہے تو یہ مضاربہ ہے، یہ جائز ہے۔ شریعت کا یہ اصول اتنا واضح اور دوٹوک ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی قسم کے ربا یا سود کی حلت یا جواز کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے میں علامہ ابن قیم کا ایک جملہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے اس پوری صورتحال کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ حیلے سے بحث کی ہے۔ اور خاص طور پر پر سودی حیلہ کاری کا ذکر کیا ہے۔ اس سیاق وسباق میں انھوں نے لکھا ہے کہ ربا کی حرمت کو کسی متعین صورت یا متعین الفاظ تک محدود کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ربا کی حرمت کا تعلق اس حقیقت کی وجہ سے ہے جس سے وہ تجارت اور خرید وفروخت سے ممیّز ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ربا جہاں بھی پائی جائے گی وہاں حرمت کا حکم بھی منطبق ہوگا۔ چاہے اس میں الفاظ کوئی بھی اختیار کیے جائیں۔ شریعت کے احکام کا دارو مدار حقائق پر ہوتا ہے، الفاظ اور عنوانات پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا کاروبار اور سرمایہ کاری کے تمام معاملات میں بنیادی سوال جو طے کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے تجارت اور بیع میں شامل ہے یا نہیں ہے۔ اگر یہ معاملات اپنی حقیقت کے اعتبار سے بیع اور تجارت میں داخل ہیں تو پھر یہ جائز ہیں اور اگر یہ بیع اور تجارت میں داخل نہیں ہیں تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا یہ معاملات کی ناجائز فہرست میں تو شامل نہیں ہیں۔ اگر ان میں غرر، قمار، ربا یا اس طرح کی کوئی اور برائی پائی جاتی ہے تو پھر ان کو بھی ناجائز قرار دینا ہوگا۔ اور محض اس بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کو جائز قرار دے دینا درست نہیں ہوگا کہ یہ رائج الوقت طریق کار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور عامتہ الناس اس سے مانوس ہیں۔

ربا کے بارے میں شبہات کے سیاق وسباق میں دو معاملات کی نشاندہی ضروری ہے جو ربا کے معاملات کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ جس طرح شریعت نے مثبت طور پر ربا کو حرام قرار دیا ہے۔ وہاں منفی ربا کی بھی حوصلہ شکنی کی ہے۔ منفی ربا سے مراد یہ ہے کہ وقت کی قیمت مقرر کر کے وقت اگر کم ہو جائے تو اصل سرمائے میں کمی کر دی جائے۔ یہ بھی ربا کا راستہ کھولنے کے مترادف ہے۔ اس لیے ائمہ اربعہ کی متفقہ رائے کے مطابق یہ جائز نہیں ہے۔ یہ معاملہ چونکہ ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شریعت نے تمام معاملات بالخصوص لین دین، تجارت اور بقیہ دیوانی امور میں صلح کی اجازت دی ہے، صلح کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی کاروبار کے دو فریقوں کے مابین کسی لین دین میں اختلاف پیدا ہو جائے اور اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے وہ آپس میں راضی نامہ یا مصالحت کرنا چاہیں تو مصالحت کر سکتے ہیں، اس مصالحت کے دوران اگر ایک فریق اپنے کسی حق سے دستبردار ہونا چاہے تو اس کو اپنے حق

سے دستبردار ہونے کی بھی اجازت ہے۔ اس کو صلح اسقاط بھی کہا جاتا ہے اور صلح ابراء بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت سے فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ معاملہ کسی پیشگی شرط کے ساتھ کیا جائے، مثلاً قرض لیتے وقت یہ شرط رکھ لی جائے کہ اگر واجب الاداء رقم ایک سال کے بعد ادا کی تو ایک لاکھ کے ایک لاکھ دس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے۔ اور اگر قرض دار وقت سے پہلے وصول کرنا چاہیے مثلاً سال بھر کے بجائے چھ مہینے بعد وصول کرنا چاہیے تو قرض لینے والے کو اختیار ہوگا کہ اس چھ مہینے کی اضافی مدت کی قربانی دینے کے مقابلے میں اصل رقم میں سے کوئی حصہ وضع کر لے، یہ جائز نہیں ہے۔

یہ معاملہ حدیث اور فقہ کے ادب میں ''ضع وتعجل'' یا ضعوا وتعجلوا کے عنوان سے مشہور ہے۔ ''ضعوا وتعجلوا'' صیغہ جمع میں ہے اور ضع وتعجل صیغہ مفرد میں ہے۔ ضع وتعجل کے لفظی معنی یہ ہیں کہ اصل مطالبے میں سے کمی کر دو اور بقیہ رقم پیشگی وصول کر لو۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بنو النضیر کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی۔ اس موقعہ پر یہ طے ہوا تھا کہ بنو النضیر کے یہودیوں کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کر دیا جائے۔ جب وہ جلاوطن ہونے لگے اس وقت یہ اندازہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے بہت سے لوگوں کی رقمیں بنو نضیر کے یہودیوں کے ذمے واجب الادا ہیں۔ اس طرح کے ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسئلے کو حل کرنے کے لیے فرمایا ''ضعوا و تعجلوا''۔ جو رقم ایک مدت کے بعد واجب الادا ہوگی وہ ابھی وصول کر لو اور اصل مطلوبہ رقم میں سے کچھ حصہ کم کر دو۔

یہ مسئلہ غزوہ بنی النضیر کے دوران پیش آیا جو مدینہ منورہ کے ابتدائی سالوں کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک ربا کی متعدد آیات نازل نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے ائمہ اربعہ کا یہ خیال ہے کہ ربا کی آیات کے نازل ہونے کے بعد اس طرح کی اجازت اگر شریعت میں تھی تو وہ منسوخ ہو چکی ہے۔ اور اب ''ضع وتعجل'' کے اصول پر عمل کرنا درست نہیں ہے۔ کچھ دوسرے حضرات کا شروع سے یہ خیال رہا ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا، تابعین میں حضرت امام نخعی اور بعد کے فقہاء میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی یہی رائے ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ضع وتعجل کا اصول باقی ہے اور اس پر بعد میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ دو اصول پیش نظر رکھے جائیں۔ ایک یہ کہ اس طرح کی کوئی شرط قرض یا لین دین کے آغاز میں پہلے سے نہ رکھی جائے۔ دوسرے

یہ معاملہ صرف قرض دار اور مقروض کے درمیان ہو، کوئی تیسرا فریق اس میں شامل نہ ہو۔ یوں عملاً یہ صلح کی ایک قسم ہو جاتی ہے جس کے جواز پر اب بھی بہت سے حضرات قائم ہیں۔ آج بعض حضرات ضع وتعجل کی اس وقتی اجازت کو discounting کے معاملے میں اختیار کرنا چاہتے ہیں اور علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم اور حضرت ابراہیم نخعی کی رائے پر بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی رائے بھی اگر ان دونوں شرائط کو ملحوظ رکھا جائے تو اس معاملے میں مدد معاون نہیں ہوسکتی اور discounting of bills کا جو رواج آج پایا جاتا ہے اس کو ضع وتعجل کے اصول کے تحت جائز قرار دینا مشکل ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کسی معاملے کے ربا ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ جہاں نصوص کی بنیاد پر کیا جائے گا، قرآن کریم اور احادیث کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا وہاں معاملات کے بارے میں عمومی قواعد کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔ معاملات کے بارے میں شریعت کے عمومی قواعد میں کچھ تو وہ ہیں جن کا قرآن کریم اور احادیث میں صراحت کے ساتھ تذکرہ ہے کچھ وہ ہیں کہ جن کا تذکرہ صراحت کے ساتھ تو نہیں ہے لیکن فقہائے اسلام نے قرآن مجید کی متعدد نصوص سے اور متعدد احادیث سے ان اصولوں کا استنباط کیا ہے۔ اس لیے ان کی حیثیت بھی منصوص اصولوں کی ہے۔

ان میں سب سے پہلا اصول رضا اور طیب نفس ہے۔ تراضی کا لفظ قرآن کریم میں آیا ہے۔ ہر قسم کی تجارت اور ہر قسم کے لین دین میں فریقین کی مکمل رضامندی ناگزیر ہے۔ احادیث میں اس کے لیے طیب نفس کی اصطلاح بھی آئی ہے۔ یعنی انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے پوری رضامندی اور آمادگی کے ساتھ کسی چیز کا فیصلہ کرے تو سمجھا جائے گا کہ وہ راضی ہے۔ اوپری اوپری رضامندی، ظاہری رضامندی اور دل سے ناپسندیدگی تراضی کے خلاف ہے۔

آج بہت سے ربوی معاملات ایسے ہیں کہ جن میں متعلقہ فریق پوری رضامندی سے شامل نہیں ہوتا۔ مجبوراً لوگ سودی قرضہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے مسائل اور پریشانیاں اور مشکلات ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے ان کو سودی قرضہ لینا پڑ جاتا ہے۔ یہ طیب نفس بھی نہیں ہے اور تراضی بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس طرح کے معاملات میں جہاں اور نصوص کے پیش نظر اس معاملے کو ناجائز قرار دیا جائے گا وہاں طیب نفس اور رضا کی عدم موجودگی

بھی اس کو نا جائز بنائے گی۔

پھر دوسرا اصول جیسا کہ میں نے عرض کیا جو متعدد احادیث میں آیا ہے وہ غرر کی ممانعت ہے۔غرر کی وضاحت کی جا چکی ہے۔کہ غرر وہ ہے جو مستور العاقبۃ ہو یا مجہول العاقبہ ہو۔ یعنی جس کا انجام یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ کیا ہوگا۔آج بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں غرر پایا جاتا ہے۔ان معاملات میں فریقوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بالآخر دونوں فریقوں کا حق کیا بنے گا، ان کو کیا ملے گا، یہ آج کے بہت سے معاملات میں پایا جاتا ہے۔خاص طور پر فیوچر سیلز کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بہت بڑا حصہ غرر پر مشتمل ہے۔اس لیے جہاں غرر پایا جاتا ہو۔فریقین میں سے کسی ایک کا حق غیر واضح اور غیر متعین ہو وہ معاملہ بھی جائز نہیں ہوگا۔

تیسرا اصول میسر کی ممانعت ہے۔میسر اور قمار کا تذکرہ پہلے تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ آج کل بہت سے معاملات جو بینکوں کے ذریعے ہو رہے ہیں یا کاروباری حلقے میں ہو رہے ہیں ان میں میسر یا قمار پایا جاتا ہے۔ یہ طرح طرح کی لاٹریاں اور یہ ریفل کی اسکیمیں، قرعہ اندازیاں، ان میں سے ممکن ہے کچھ معاملات جائز بھی ہوں۔لیکن ان کا بڑا حصہ نا جائز معاملات پر مشتمل ہے۔اوران سے احتراز کیا جانا ناگزیر ہے۔

قرآن کریم نے ایک اور اصول جو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے اور ربا کے سیاق و سباق میں بھی اس کا تذکرہ قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔وہ ظلم کی ممانعت ہے۔"**الظلم ظلمات یوم القیامۃ**"۔ظلم قیامت کے دن ظلمات اور تاریکیوں کی شکل میں سامنے آئے گا۔قرآن کریم میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ سودی دعاوی سے دستبردار ہو جاؤ، سودی واجبات کو ختم کر دو وہاں یہ بات صراحت سے کہی گئی ہے کہ تمھارا حق صرف تمہارے اصل سرمائے تک محدود ہونا چاہیے۔ "**لکم رؤوس اموالکم**"۔اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا کہ "**لاتظلمون ولا تظلمون**"۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس ظلم اور استحصال کا بعض حضرات بہت کثرت سے حوالہ دیتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ ظلم اور استحصال کے بار بار حوالے کے باوجود ربا کی بعض قسموں کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں۔ بنک انٹرسٹ کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس میں اس مفہوم میں ظلم اور استحصال نہ پایا جاتا ہو جس مفہوم میں قرآن مجید نے ظلم اور استحصال کو نا جائز قرار دیا ہے۔قرآن مجید کی رو سے ظلم یہ

ہے کہ اصل سرمائے سے زیادہ کا مطالبہ کیا جائے اور یہ بھی ظلم ہے کہ اصل سرمائے سے کم واپس کیا جائے۔

شریعت کا ایک اور اصول جو ظلم کی ممانعت کا لازمی تقاضا بلکہ اس کی شرط ہے وہ عدل و انصاف سے مکمل، گہری اور حقیقی وابستگی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے آسمانی شریعتوں کا بنیادی ہدف اور اساسی مقصد عدل وانصاف پر انسانوں کو قائم کرنا ہے۔ عدل وانصاف کا لازمی تقاضا اور مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان کا جان و مال محفوظ ہو۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہ ہو کہ دوسرے کا مال اس کی اجازت اور طیب نفس کے بغیر استعمال کرے۔ اس لیے بھی موجودہ سودی کاروبار کی بہت سی صورتیں ناجائز قرار پائیں گی۔ اس لیے کہ ان میں عدل کا وہ تصور پیش نظر نہیں ہے جو شریعت کا مقصد ہے۔

پھر ایک اہم اور بڑا اصول جس کا پہلے بھی کئی بار تذکرہ کیا جا چکا ہے وہ اصول سودی معاملات میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ فقہائے اسلام کے الفاظ میں ''**الغرم بالغنم**'' کا متفق علیہ اصول ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں ''**الخراج بالضمان**'' کے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ فقہاء نے اس کو 'الغرم بالغنم' کے الفاظ سے بھی یاد کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے الفاظ اور عبارتیں اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں عدل کا تقاضا یہ ہے کہ فائدہ اور نقصان دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ جس چیز کا آپ نقصان اٹھانے کے پابند ہیں اس کا فائدہ اٹھانے کا آپ کو پورا استحقاق ہے۔ اور جس چیز کا آپ فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اٹھانا چاہتے ہیں اس کا نقصان اور تاوان بھی آپ کو اٹھانا چاہیے۔

یہ اصول اسلامی شریعت کے بنیادی قواعد اور احکام میں سے ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ شریعت کی حکمت تشریع کا بنیادی حصہ ہے۔ اسلامی شریعت کے بہت سے احکام حتی کہ عائلی قوانین کے احکام، احوال شخصیہ کے بہت سے مسائل، بین الاقوامی معاملات، دیوانی قوانین ان سب میں ''**الغرم بالغنم**'' کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ آج اگر تجارتی معاملات میں ''**الغرم بالغنم**'' کے اصول کو مکمل طور پر اپنا لیا جائے اور اس حکم پر اس کی حقیقی روح کے مطابق عمل کیا جائے تو ربا کی بہت سی قسموں سے آسانی کے ساتھ بچا جا سکتا ہے۔

اسی اصول کے پیش نظر اشیائے استعمال کا اجارہ جائز ہے اور زر کا اجارہ جائز نہیں

ہے۔اشیائے استعمال کی واپسی اس شخص کی ذمہ داری ہوتی ہے جس نے اس کو کرائے پر لیا ہے۔ لیکن اس کرائے پر لینے کے باوجوداوران اشیاء کے منافع سے مستفید ہونے کے باوجودان اشیاء کا اگر کوئی نقصان یا تاوان یا ذمہ داری، یعنی غنم آن پڑے تو وہ اصل مالک کے ذمے ہے۔ چونکہ اصل مالک اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے اس لیے وہ اس کا تاوان اورضمان برداشت کرنے کا بھی پابند ہے۔ان مثالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سودی معیشت اور اسلامی احکام دو بالکل متضاداور متعارض چیزیں اوران دونوں کوایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرنا آگ اور پانی کوجمع کرنے سے مترادف ہے۔

واخردعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

دسواں خطبہ

اسلامی بینکاری: ماضی، حال اور مستقبل

دسواں خطبہ

اسلامی بینکاری: ماضی، حال اور مستقبل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''اسلامی بینکاری: ماضی، حال اور مستقبل''۔ اس گفتگو میں بینکوں کی ضرورت واہمیت، موجودہ دور میں نظام بینکاری اور بینکوں کا کردار اور اسلام بینکاری کے ضمن میں جو پیش رفت اب تک ہوئی ہے اس کا ایک مختصر جائزہ لینا، اسلامی بینکاری کی موجودہ صورتحال کی وضاحت کرنا، اور آئندہ درپیش مشکلات کا مختصر سا جائزہ لینا مقصود ہے۔

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ آج کے معاشی نظام میں بینکوں کی اہمیت روزافزوں ہے، بینکوں کی حیثیت موجودہ معاشی نظام میں نظام اعصاب کی ہے۔ بینکوں ہی کے ذریعے پوری دنیا کی معیشت چل رہی ہے۔ بینکوں ہی کے ذریعے تجارتی سرگرمی فروغ پا رہی ہے۔ بینکوں ہی کے ذریعے صنعتی اور پیداواری سرگرمیاں فروغ پا رہی ہیں۔ بین الاقوامی تجارت کو جو ادارے کنٹرول کررہے ہیں وہ بڑے بڑے بنک ہیں۔ سرمایہ کار اور کاروبار کرنے والے فریق عامل کے درمیان رابطے کا سب سے مؤثر اور آسان ذریعہ بینکاری کا نظام ہے۔ اگر بنک یہ کام نہ کریں تو نہ صرف بڑے بڑے سرمایہ داروں کے لیے، بلکہ چھوٹی بچتیں رکھنے والوں کے لیے بھی ممکنہ فریق عامل تک پہنچنا اور فریق عامل کا انتخاب کرکے اپنا سرمایہ یا بچت اس کے کام یا منصوبہ میں لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ قابل اعتماد مضارب یا قابل اعتماد شریک کا حصول ہر ایک کے بس کی بات نہیں

ہے۔ بینکوں کے ذریعے یہ کام بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔

پھر عالمی سطح پر جو تجارتی اور اقتصادی سرگرمیاں ہیں مثلاً درآمد اور برآمد کا نظام ہے، مختلف ممالک کے آپس میں معاشی روابط ہیں، تجارتی لین دین ہے، ان سب کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا ادارہ موجود ہو جو اس پورے عمل میں رابطے کا فریضہ انجام دے۔ رابطے کا یہ فریضہ بڑی حد تک بنک انجام دیتے ہیں اور بینکوں کے ذریعے یہ کام بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔ پھر جو لوگ بین الاقوامی سطح پر لین دین کرنا چاہتے ہیں یا جن کا درآمد و برآمد کا کاروبار ہوتا ہے، ان کو مختلف ممالک کے قوانین سے واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ہر ملک کے ٹیکسوں کا نظام جاننا پڑتا ہے۔ یہ مہارتیں حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ نہ ہر شخص یہ مہارتیں حاصل کر سکتا ہے۔ پاکستان کے کسی شہر میں مثال کے طور پر سیالکوٹ یا گوجرانوالہ میں بیٹھا ہوا ایک تاجر جب جرمنی یا کینیڈا سے کوئی سامان منگوانا چاہتا ہے یا جاپان اور سنگاپور کا کوئی تاجر گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کا بنا ہوا سامان خریدتا ہے تو نہ سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے تاجر کے لیے ممکن ہے کہ جرمنی، جاپان اور دوسرے ممالک کے قوانین سے کماحقہ واقفیت حاصل کرے اور نہ یہاں بیٹھے بیٹھے وہاں کے ٹیکسوں کے نظام سے واقفیت حاصل کرنا آسان کام ہے۔ بینکوں کے پاس یہ مہارتیں پہلے سے دستیاب ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے یہ کام بہت آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

بیرون ملک رقوم کی ادائیگی اور بیرون ملک سے رقوم کی ترسیل آج کل بین الاقوامی تجارت کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ بینکوں کے ذریعے یہ منتقلی اور ادائیگی کی سہولت بہت آسان ہو گئی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ موجودہ معاشی نظام جس انداز سے کام کر رہا ہے اس میں بینکوں کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بینکوں کے کردار کو اگر ختم کر دیا جائے اور یہ ذمہ داری کسی اور ادارے یا اداروں کے سپرد نہ کی جائے، تو بین الاقوامی تجارت کا نظام چشم زدن میں درہم برہم ہو سکتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت کا نظام درہم برہم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پوری دنیا کا نظام معیشت، درآمد و برآمد کا سارا سلسلہ چشم زدن میں زمین بوس ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کوئی ملک بھی ایسا نہیں ہے جو ہر اعتبار سے خود کفیل ہو اور دنیا کے کسی ملک سے اس کو کسی قسم کے لین دین کی ضرورت نہ ہو۔ آج روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں پایا جاتا جس کو بیرون ملک سے مثلاً پٹرول، مثلاً گیس، مثلاً مشینری، مثلاً کمپیوٹر کا ساز و سامان

، ٹیلی فون کا ساز و سامان، موبائل فون کا ساز و سامان اور اس طرح کی بے شمار چیزیں خریدنے کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ سارا کام انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا اگر بینکاری کے نظام کو ختم کر دیا جائے۔

مغرب میں رائج بینکاری کا موجودہ نظام ایک دو دن میں نہیں سامنے آیا۔ نہ کبھی کسی نے با قاعدہ بیٹھ کر یہ سوچا تھا کہ بینکاری کا ایک نظام بنانا چاہیے اور اس کے خد و خال یہ اور یہ ہونے چاہئیں۔ وہاں یہ نظام طویل عرصے کے دوران ایک خود کار انداز میں وجود میں آیا ہے۔ تجارتی مصلحت، وقت اور تجربے نے جو تبدیلیاں تجویز کیں وہ تبدیلیاں اس میں آتی گئیں۔ اور ان تبدیلیوں اور بین الاقوامی تجارتی قوتوں کے مفادات کے مطابق اس نظام میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ بعض مغربی مصنفین بینکاری کی تاریخ کا آغاز قبل مسیح سے کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا دعویٰ ہے کہ ایک ہزار قبل مسیح بلکہ پندرہ سو قبل مسیح میں بھی بینکاری کا ادارہ موجود تھا۔ لیکن اگر بینکاری سے مراد، جیسا کہ بعض مغربی مصنفین اس کے آغاز کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لیتے ہیں، یہ ہے کہ یہ وہ ادارہ ہے جو قرضوں کا کاروبار کرتا ہو، تجارت کے لیے قرض پر سرمایہ فراہم کرتا ہو تو اس مفہوم میں بینکاری کا ادارہ اس سے بھی قدیم ہے۔ سود خوری، قرض اور تجارت میں سود پر سرمایہ لگانے کا کام ہندو بنیے اس سے بھی بہت پہلے سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں کئی ہزار برس سے سودی قرضے دینے کا اور مختلف تجارتوں میں سودی رقوم لگانے کا رواج چلا آ رہا ہے۔

لیکن موجودہ مفہوم میں، جس مفہوم میں آج بنک کا لفظ بولا جاتا ہے، اس مفہوم میں اس کا آغاز سولہویں صدی میں اٹلی میں ہوا۔ اور جیسے جیسے بین الاقوامی تجارت بڑھتی گئی، اہل مغرب کے تجارتی مفادات پھیلتے چلے گئے، مغربی بینکاری کا نظام بھی اسی رفتار اور اسی نسبت سے بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک بینکوں کی وہ حیثیت نہیں تھی، بین الاقوامی تجارت میں بینکوں کا وہ کردار نہیں تھا، جو بیسویں صدی کے وسط سے سامنے آنا شروع ہوا۔

ایک اعتبار سے بیسویں صدی کو بینکاری کی توسیع اور ترقی کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بینکاری میں تنوعات، بینکوں کے وظائف میں توسیع اور بینکاری کے کام میں پیچیدگی زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آج بینکوں کے کام بہت فنی اور پیچیدہ

ہو گئے ہیں۔ اتنے فنی اور پیچیدہ کہ اس فن کو سیکھنے کے لیے با قاعدہ تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بینکاری کے ادارے اور اسکول یا شعبے قائم ہیں، جہاں بینکاری کے علم اور فن پر تحقیق بھی ہو رہی ہے اور اعلیٰ تعلیم بھی ہو رہی ہے۔

بینکوں کی سرگرمیاں یوں تو بے شمار ہیں۔ لیکن ان کو سمجھنے کی خاطر ہم چند عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مشاورتی خدمات

۲۔ سرمایہ کاری میں مدد اور تعاون

۳۔ بچتوں کی حفاظت

۴۔ قرضوں کی فراہمی

۵۔ براہ راست سرمایہ کاری

۶۔ محفوظ امانت خانوں کی فراہمی

۷۔ کاروبار میں تعاون

۸۔ جائدادوں کا نظم ونسق

یہ آٹھ قسم کی وہ بڑی بڑی خدمات ہیں جو بنک انجام دیتے ہیں۔ مشاورتی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ مختلف بینکوں کے پاس مختلف قسم کی مہارتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ بنک مختلف لوگوں کو مشورے بھی دیتے ہیں۔ درآمد و برآمد کے معاملات میں مشورے دیتے ہیں۔ بہت سے مالی معاملات میں بینکوں کے مشوروں کی بنیاد پر بڑی بڑی سرمایہ کاریاں ہوتی ہیں۔ پھر بنک سرمایہ کاری یا استثمار میں مدد کرتا ہے۔ بنک کو معلوم ہے کہ کہاں کس قسم کی سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ کس سرمایہ کاری میں نفع کے امکانات زیادہ ہیں، کس سرمایہ کاری میں نفع کے امکانات کم ہیں۔

بچتوں کی حفاظت کا کام تو سب جانتے ہیں کہ بینکوں میں ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی بچت اور ضرورت سے زائد رقم بینکوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ بینکوں میں رقوم رکھنے کا سب سے بڑا اور بنیادی مقصد حفاظت ہوتا ہے۔ گھروں میں، دوکانوں میں، دفتروں میں نقد رقم کی حفاظت نسبتاً مشکل کام ہے۔ لیکن بینکوں کے پاس جمع کرانے سے یہ رقم محفوظ ہو جاتی ہے۔ پھر سرمایہ کاری کا کام بہت سے بنک براہ راست بھی کرتے ہیں اور بینکوں کے ذریعے مختلف افراد خود کرتے ہیں۔

بینکوں کے پاس ایسے محفوظ امانت گھر موجود ہوتے ہیں جہاں اگر کوئی شخص اپنی قیمتی دستاویزات، زیورات یا دیگر قیمتی اشیاء حفاظت سے رکھنا چاہے تو بنک اس کا معاوضہ لے کر جگہ فراہم کر دیتا ہے۔ وہاں آہنی صدوق بنے ہوتے ہیں، ان آہنی صندوقوں میں سے ایک صندوق کرائے پر لینے والا اپنی قیمتی اشیائی محفوظ رکھ سکتا ہے۔

پھر بنک مختلف کاروباروں میں معاونت کرتے ہیں۔ جائداد کا نظم ونسق بھی بینکوں کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کی کوئی جائداد کسی غیر ملک میں ہے، آپ نے وہاں کوئی صنعت خریدی، یا کوئی بڑی تجارت آپ نے شروع کی تو بنک اس میں آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں سے بیٹھ کر آپ اس کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ یہ ذمہ داری بعض بنک سنبھال لیتے ہیں اور آپ کے وکیل کے طور پر آپ کی جائداد کا نظم ونسق کرتے ہیں۔ اور اس کی اجرت وصول کرتے ہیں۔

ان خدمات میں ایک اہم خدمت اور اہم کام بینکوں کا یہ ہے کہ وہ رقوم کی منتقلی، واجبات کی وصولی اور اس کے علاوہ بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ آپ کو یہاں سے بیرون ملک رقم بھیجنی ہے تو آپ بنک کے ذریعے بھیج سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے واجبات وصول کرنے ہیں، آپ کی جائداد کراچی میں ہے، جو وہاں آپ نے کرایے پر دی ہوئی ہے، ہر مہینے اس کا کرایہ وصول کرنا ہے۔ آپ یہ ذمہ داری بنک کے سپرد کر دیں، بنک اس کا کرایہ وصول کرے گا، آپ کے حساب میں جمع کرتا رہے گا۔ اس خدمت کی اجرت آپ سے وصول کرے گا۔ ایل سی کھولنا بھی بنک کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ درآمد برآمد کا کاروبار کرتے ہیں تو آپ کو بیرون ملک رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس کے لیے آپ بنک کے پاس ایل سی کھولتے ہیں جس کے ذریعے آپ بیرون ملک رقم بھیج سکتے ہیں۔ پھر بنک گارنٹی کی ضرورت پڑتی ہے جو کفالہ کی ایک قسم ہے اور کفالہ کے قواعد کے تحت اس کو منضبط کر دیا جائے تو یہ شریعت کے بالکل مطابق ہے۔ آپ کسی شخص سے بہت بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور آپ کا فریق ثانی جو آپ سے واقف نہیں ہے اس بات کو جاننا چاہتا ہے کہ آپ کی مالی حیثیت کیا ہے، کیا آپ اتنے بڑے کاروبار میں ہاتھ ڈالنے کے اہل بھی ہیں کہ نہیں۔ یہ کام بنک کر دیتا ہے اور گارنٹی کر دیتا ہے۔ بنک گارنٹی کی بنیاد پر دوسرے فریق کو اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ آپ کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بنک گارنٹی فراہم

کرنے کا کام بڑے بڑے ٹھیکے دار بھی کرتے ہیں، صنعت کار بھی کرتے ہیں، سرمایہ کار بھی کرتے ہیں۔ گویا بنک گارنٹی کی ضرورت ہر شخص کو ہر وقت پیش آسکتی ہے۔

بنک کریڈٹ کارڈ کا اجراء بھی کرتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ گویا بنک کی طرف سے ایک اجازت نامہ ہے۔ آپ جب چاہیں، جتنی رقم چاہیں بنک سے ادھار لے لیں اور اس کی بنیاد پر خریداری کر لیں۔ اگر ادھار کا یہ کام شریعت کے قواعد کے مطابق ہو، اگر اس میں شرعاً کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو تو یہ ایک سہولت ہے جو بنک کی طرف سے فراہم ہوتی ہے۔

گویا یہ وہ بڑے بڑے وظائف اور خدمات ہیں جو بنک فراہم کرتا ہے۔ بینکوں کے فرائض میں سب سے بنیادی اور اہم فریضہ جو دراصل بینکوں کے لیے سب سے بڑے فریضے کی حیثیت رکھتا ہے وہ کریڈٹ creation کہلاتا ہے۔ یعنی قرضوں کی فراہمی اور قرضوں کی تشکیل، قرضے وجود میں لانے کا کام بنک کرتے ہیں۔ حتی کہ بینکوں کی تعریف ہی یہ ہے کہ بنک سے مراد وہ ادارہ ہے جو قرضوں کا کاروبار کرتا ہو، اور اوراق تجاریہ سے اعتناء کرتا ہو۔ اوراق تجاریہ اور قرضوں کا کاروبار اور قرضوں کی تجارت ہی بینکوں کا بنیادی کام ہے۔ بقیہ تمام کام جن میں سے بعض بہت مفید ہیں، جن میں سے بعض کے شرعاً جائز ہونے میں کوئی تامل نہیں، وہ بینکوں کے جزوی کام ہیں۔

بنک کئی طرح کے قرضے جاری کرتے ہیں۔ ان میں قلیل المیعاد قرضے بھی ہوتے ہیں، اور طویل المیعاد قرضے بھی ہوتے ہیں۔ پیداواری اور تجارتی قرضے بھی ہوتے ہیں اور ذاتی اخراجات کے لیے صرفی قرضے بھی ہوتے ہیں۔ بنک ان تمام قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں۔ یہی بینکاری نظام پر سب سے بڑا اعتراض ہے کہ وہ اپنا بہت سا اہم اور مفید کام سود میں ملوث ہونے کی وجہ سے ناجائز کر دیتے ہیں۔ اگر بینکوں کے نظام سے سود اور چند ایک اور خرابیاں مثلاً غرر، اور قمار وغیرہ کو ختم کر دیا جائے تو بینکوں کے تمام کام نہ صرف انتہائی مفید اور ضروری ہیں بلکہ ملک وملت کی معاشی اور مادی ترقی کے لیے ناگزیر ہیں۔ بینکوں کے قلیل المیعاد قرضے ایک ہفتے سے سولہ ہفتے تک کی مختصر مدت کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ قرضے عموماً وہ ہوتے ہیں جس کی ضرورت خود بینکوں کو یا بڑے تاجروں کو پیش آتی ہے۔ طویل المیعاد یا پیداواری قرضے وہ ہوتے ہیں جو عموماً صنعتیں لگانے کے لیے یا ترقیاتی کاموں کے لیے دیے جاتے ہیں یا بڑی تجارتوں کے لیے دیے

جاتے ہیں۔ صرفی قرضے وہ ہوتے ہیں جو انفرادی یا ذاتی ضروریات کے لیے دیے جاتے ہیں۔ بینکوں کے معاملات کا بیشتر حصہ انہی قرضوں کے انتظام اور لین دین سے عبارت ہے۔

اس مختصر تشریح سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ بینکاری نظام کی اقتصادی نظام میں انتہائی اہمیت ہے۔ یہ اقتصادی نظام کے لیے عصبی ڈھانچے کی حیثیت رکھتے ہیں، بین الاقوامی تجارت کا سب سے اہم اور سب سے مؤثر وسیلہ ہیں، اور ترسیل زر کا سب سے آسان اور سب سے محفوظ ذریعہ ہیں۔ ترسیل زر کی ضرورت ہر انسان کو ہر زمانے میں پیش آتی رہی ہے۔ پرانے زمانے میں یہ کام بڑے بڑے تاجر کیا کرتے تھے جن کی طرف سے ہنڈیاں جاری ہوتی تھیں۔ ایک تاجر جو مکہ مکرمہ سے تجارت کے لیے شام جا رہا ہے وہ حجاز کے کسی ایسے معروف اور قابل اعتماد تاجر سے جس کی دوسرے ملکوں میں بھی ساکھ قائم ہو ہنڈی لے کر چلا جایا کرتا تھا۔ اور شام کے جس تاجر کے نام ہنڈی ہوتی تھی اس کو دکھا کر مطلوبہ رقم وصول کر لیا کرتا تھا۔ ہنڈیوں کا یہ سلسلہ بھی زمانہ نامعلوم سے جاری ہے اور جب سے بین الاقوامی تجارت ہو رہی ہے اسی وقت سے ہنڈیوں کا کاروبار بھی ہو رہا ہے۔ آج بھی ذاتی اور شخصی ہنڈیاں ہر جگہ جاری ہیں۔ خود پاکستان میں بہت سے حضرات ہنڈیوں کا کام کرتے ہیں۔ جو کام پہلے انفرادی تاجر ذاتی ہنڈیوں کے ذریعے کرتے تھے وہ کام آج کل وسیع پیمانے پر بنک کر رہے ہیں اور ترسیل زر کے لیے ان کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔

بینکاری اور مالیاتی نظام کی یہ ذمہ داریاں خاص طور پر مالی امور میں توسط یعنی financial intermediation، جس کے مختلف انداز اور مختلف طریقے رائج ہیں، یعنی پس انداز کرنے والوں کے اور رقم استعمال کرنے والوں کے درمیان رابطہ، مالیاتی خدمات کی فراہمی، رقوم کی منتقلی، فنڈز کا بندوبست، مختلف اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کی تشکیل، ترغیبات و خدمات کی فراہمی۔ یہ سب تقاضے اگر اسلامی احکام کے مطابق انجام دیے جائیں تو وہ اسلامی بینکاری کہلائے گی اور یہی دراصل اسلامی بینکاری کا اصل امتحان ہے، کہ کیا یہ سارے تقاضے بدرجہ اتم اور بطریق احسن شریعت کے احکام کے مطابق انجام دیے جا رہے ہیں۔ اگر یہ سب کام شریعت کے احکام کے مطابق انجام دیے جائیں تو بینکاری کے وہ نتائج نکلنے چاہئیں جو اسلامی احکام کا تقاضا ہیں۔

اس وقت بینکاری کا نظام اس انداز کا ہے کہ اس کی ساری اٹھان، اس کے مقاصد اور

اہداف اور طریق کار، یہ سب کا سب مغربی ممالک کی بڑی بڑی معیشتوں کے حق میں جاتا ہے۔ بینکاری نظام جو پوری دنیا میں رائج ہے اس کو چند بڑے بڑے بنک کنٹرول کرتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے بنک مغربی ساہوکاروں کی ملکیت ہیں۔ یوں وہ ساری دنیا کے بینکوں کو اور ساری دنیا کے بینکوں کے ذریعے ساری دنیا کی دولت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا کی اٹھاسی فیصد سے زائد دولت چوبیس ملکوں کے شہریوں کے پاس ہے، اور بقیہ گیارہ فیصد کے قریب، جو باقی ماندہ دولت ہے وہ دنیا کے بقیہ ایک سونوے ممالک کے شہریوں کے پاس سمجھی جاتی ہے۔ یہ چوبیس ممالک جن کے پاس دنیا کی اٹھاسی فیصد سے زیادہ دولت ہے، یہ پوری دنیا کی آبادی کا چودہ فیصد سے کچھ زائد ہے۔ گویا دنیا کی پندرہ فیصد سے کم آبادی، دنیا کی اٹھاسی فیصد سے زیادہ دولت کی مالک ہے۔ اور بقیہ پچاسی فیصد آبادی جس باقی ماندہ دولت کی مالک بتائی جاتی ہے وہ بھی دراصل اس دولت کی حقیقی مالک نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اس دولت کے استعمال کرنے میں نہ خودمختار ہے، نہ اس دولت کو رکھنے کے اس کے پاس وسائل ہیں، نہ اس دولت کی منتقلی یا ترسیل بڑے بڑے مغربی بینکوں کی مرضی کے بغیر ہوسکتی ہے۔ دنیا کے بڑے مغربی ممالک اور ان کے بنک جب چاہتے ہیں ترسیل زر پر پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں ترسیل زر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ روایتی بینکاری کی کمزوریوں کا اب احساس مغربی دنیا میں بھی ہورہا ہے۔ مغربی دنیا میں بھی آخر صحیح الخیال لوگ ہیں، باکردار، بااخلاق انسان پائے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص ذاتی مفاد یا علاقائی یا ملکی عصبیت کے نقطہ نظر سے ہر چیز کو دیکھتا ہو۔ جو لوگ وہاں ان عصبیات سے نسبتاً آزاد ہیں ان کو ان کمزوریوں کا احساس ہورہا ہے۔ وہاں اب اخلاقی سرمایہ کاری کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ آوازیں کہ سرمایہ کاری اور استثمار کا عمل اخلاق کے قواعد کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ بات اب وہاں کثرت سے کہی جارہی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اجتماعی طور پر ذمہ دار بینکاری ہونی چاہیے۔ یعنی socially resopnsible اور socially desirable انداز کی بینکاری ہونی چاہیے، دراصل ان اصطلاحات کے ذریعے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اخلاق اور مذہب کو دیس نکالا دینے کے بعد جو مالی نظام قائم کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں بہت سی اخلاقی خرابیاں اور قباحتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان اخلاقی خرابیوں اور قباحتوں کو

دور کرنے کے لیے اخلاقی سرمایہ کاری کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔

لیکن مغرب کے یہ حضرات یہ بات بھول جاتے ہیں اور یہ بات ان کو یاد لانے کی ضرورت ہے کہ جب تک وہ جدید بینکاری نظام کی اصل اساس پر کاربند رہیں گے، اور بنیادی وظیفہ یعنی قرضوں کے کاروبار اور اوراق قابل بیع وشراء یا دستاویزات قابل بیع وشراء کی بنیاد پر کاروبار کرتے رہیں گے اس وقت تک اخلاقی بینکاری کے وہ نتائج نہیں نکلیں گے جو ان کے پیش نظر ہیں۔ بیشتر مسائل جو معاشی زندگی میں پیش آتے ہیں وہ قرضوں کی تجارت کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے قرضوں کی تجارت اور قرضوں کی آپس میں خرید وفروخت کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ اور وہ احکام جن کا تذکرہ پہلے کئی بار کیا جاچکا ہے وہ سب اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہیں کہ تجارت اور کاروبار کی اساس اور بنیاد قرض نہ ہو بلکہ حقیقی خدمات یا اثاثہ جات یا real asets ہوں۔ حقیقی جائداد ہو، حقیقی تجارت ہو، حقیقی صنعت اور انڈسٹری ہو۔ تاکہ جیسے جیسے زر میں توسیع ہوتی جائے اسی حساب سے اصل اور حقیقی ترقی میں بھی توسیع ہوتی جائے، اصل صنعت میں بھی توسیع ہوتی جائے، اصل تجارت بھی اسی حساب سے پیدا ہو، اسی حساب سے خدمات سامنے آئیں، اسی حساب سے assets اور اثاثے قائم ہوں۔

اس وقت کیا ہورہا ہے؟ اس وقت یہ ہورہا ہے کہ توسیع زر یا credit creation تو تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ لیکن جتنی تیزی سے زر میں توسیع ہورہی ہے، اتنی رفتار، اتنے تناسب اور اتنی تیزی کے ساتھ اصل جائداد میں یا اصل متلکات میں، اصل پیداوار میں اور اصل خدمات میں توسیع نہیں ہورہی ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بنک قرضے دینے کا کام بند کردیں۔ بنک جن مقاصد کے لیے قرضے دیتے ہیں وہ مقاصد فی نفسہ شریعت میں ناجائز نہیں ہے۔ اگر ایک شخص بنک سے قلیل المیعاد یعنی ایک ہفتے سے چار ہفتے تک کا قرضہ لینا چاہتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک تاجر کو فوری طور پر ادائیگی کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ اس کو رقم چند ہفتے بعد ملنے والی ہے، ایک مہینے بعد ملنے والی ہے۔ اگر وہ قلیل المیعاد قرضہ لینا چاہتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ایسا نظام اور بندوبست ہونا چاہیے کہ قلیل المعیاد قرضہ لینے والا اپنی ضرورت کے مطابق قرضہ لے سکے۔ یہ قرضے بہت آسانی سے بلاسودی بنیادوں پر دیے جاسکتے

ہیں۔ ان پر اضافہ نہیں لیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ قرضوں پر اضافہ ربا ہے۔ البتہ بنکوں کے واقعی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے سروس چارج لگایا جا سکتا ہے۔ سروس چارج کے جائز ہونے پر عام طور پر اس دور کے علمائے کرام کا اتفاق ہے۔ سروس چارج کے قواعد وضوابط بہت سے علمائے کرام نے مرتب فرمائے ہیں۔

جہاں تک طویل المیعاد قرضوں کا تعلق ہے تو اگر یہ پیداواری یا تجارتی قرضے ہیں، صنعت اور انڈسٹری لگانے کے لیے ہیں، کسی بڑی تجارت کے لیے ہیں، کسی بڑے منصوبے کے لیے رقم فراہم کرنے کی خاطر ہیں تو پھر ان کو مشارکہ، مضاربہ، اجارہ وغیرہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ذاتی اور صرفی قرضے جو مثلاً علاج کے لیے کوئی شخص لینا چاہتا ہے، بچوں کی شادی یا تعلیم کے لیے بہت سے لوگ قرضے لینا چاہتے ہیں، گھر بنانے کے لیے لینا چاہتا ہے، حج کرنے کے لیے کوئی قرضہ لینا چاہتا ہے۔ یہ کام یا تو بنک کریں اور اس کے لیے غیر سودی قرضوں کا کوئی مناسب انتظام کریں۔ اور اگر بنک یہ کام نہ کر سکتے ہوں تو یہ کام بیت المال کو، وقف کو اور اس طرح کے اداروں کو کرنا چاہیے۔ اگر ایسے اوقاف قائم کر دیے جائیں جو لوگوں کو ذاتی ضروریات کے لیے بلاسود قرض دیا کریں تو بینکوں کا بہت سا بوجھ بھی کم ہو جائے گا اور عام لوگوں کی ایک حقیقی ضرورت کی تکمیل کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ یہ اوقاف حکومت پاکستان بھی قائم کر سکتی ہے، مختلف بنک بھی قائم کر سکتے ہیں، افراد بھی قائم کر سکتے ہیں۔ وقف کی یہ رقم سرمایہ کاری میں لگا دی جائے، اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں جو آمدنی ہو، اس آمدنی کو بھی وقف سمجھا جائے اور جس شخص کو بلاسود قرضے کی ضرورت ہو، مثلاً علاج کے لیے، شادی، تعلیم، حج وغیرہ کے لیے تو وہ وہاں سے بلاسودی قرضہ لے لے۔

اسی طرح بیت المال میں اس بات کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پاکستان بیت المال الحمد للہ موجود ہے۔ یہ ادارہ پندرہ بیس سال سے کام کر رہا ہے۔ اگر بیت المال میں ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ ایک ریوالونگ فنڈ ہو، اس کو کسی کامیاب اور جائز سرمایہ کاری میں لگا دیا جائے۔ مثلاً اس کے حصص خرید لیے جائیں اور اس فنڈ کی آمدنی سے ذاتی مقاصد کے لیے لوگوں کو غیر سودی بنیادوں پر صرفی قرضے دیے جائیں تو یہ بیت المال کے مقاصد کے عین مطابق ہوگا اور عامۃ الناس کی بہت بڑی تعداد اس سے فائدہ اٹھا سکے گی۔ اس وقت ہوتا یہ ہے کہ بیت المال کی رقوم

مستحقین میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ضرورت مندوں کی ضرورت اس سے پوری کی جاتی ہے۔لیکن عوامی سطح پر جو شکایات پائی جاتی ہیں وہ اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ بیت المال ابھی تک اپنے مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سرکاری وسائل کے ضیاع کا عام رواج ہو گیا ہے، سیاسی مداخلت، کرپشن، اقرباء پروری، ذاتی پسند ناپسند کا کلچر بہت مضبوط ہے۔ان مسائل کی وجہ سے بیت المال کے ادارے کو وہ اعتماد حاصل نہیں ہو سکا جو حاصل ہونا چاہیے۔اگر قرضوں کی یہ اسکیم بیت المال میں شروع کر دی جائے تو بڑے پیمانے پر لوگ اس سے مستفید ہوں گے، جو بیت المال سے قرضہ لے کر حج کر کے آئے گا وہ زندگی بھر بیت المال کا شکر گزار رہے گا۔

یہ وہ کام ہیں جو اسلامی بینکوں کو بھی کرنے چاہییں۔بعض جدید اہل علم نے اسلامی بینکوں کے قیام کو شرعاً فرض کفایہ قرار دیا ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ شریعت کا اصول ہے "مالا یتم الواجب الابہ فھو واجب"۔جو چیز شرعاً واجب ہو اور کسی اور چیز کو اختیار کیے بغیر اس پر کما حقہ عمل درآمد نہ ہو سکے تو اس چیز کو اختیار کرنا بھی واجب ہو جاتا ہے۔اس لیے بہت سے ایسے دینی مقاصد ہیں، شرعی احکام ہیں، جن پر عمل درآمد کے لیے اسلامی بینکوں کا قیام ضروری ہے یا بینکاری کے اسلامی اداروں کی تاسیس ضروری ہے۔

ربا سے اجتناب فرض عین ہے اور ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری ہے۔اسلامی بینکوں کا قیام ربا سے اجتناب کے لیے ضروری ہے۔لہٰذا جو حضرات اسلامی بینکوں کے قیام کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں ان کی بات وزن رکھتی ہے۔اسلامی بینکوں کے قیام پر کم وبیش ساٹھ ستر سال سے غور ہو رہا ہے۔یہ بات ہمارے لیے خوش نصیبی کی ہے کہ اسلامی بینکاری پر غور کرنے والے اہل علم میں برصغیر کے اہل علم کا بالعموم اور پاکستان کے اہل علم کا بالخصوص نام اور کام سب سے نمایاں رہا ہے۔ پاکستان میں شیخ احمد ارشاد مرحوم نے پاکستان بننے کے فوراً بعد آزاد دنیائے اسلام میں سب سے پہلے اسلامی بینکاری کا تصور دیا، کتابیں لکھیں۔خود ایک اسلامی بنک قائم کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ڈاکٹر محمد عزیر نے پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں اس پر کتابیں لکھیں۔ڈاکٹر انور اقبال قریشی مرحوم نے اس پر وقیع علمی کام کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور استاد ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اس پر وقیع علمی کام کیا۔برصغیر سے باہر بھی ڈاکٹر احمد النجار اور ڈاکٹر محمود ابوالسعود کے

نام اس معاملے میں بہت نمایاں ہیں۔

یہ حضرات تو وہ ہیں جنھوں نے بلاسود بینکاری کے موضوع علمی کام کیا۔ جن حضرات نے عملاً اسلامی بینکوں کے قیام کا بیڑا اٹھایا ان میں سب سے نمایاں نام پرنس محمد الفیصل کا ہے جو شاہ فیصل کے صاحبزادے ہیں اور انھوں نے یہ بیڑا اس وقت اٹھایا جب بہت کم لوگ اس طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ خاص طور پر مسلم حکومتوں کے ارباب حل وعقد میں خاصا تأمل اور تردد پایا جاتا تھا اور وہ اسلامی بینکوں کے قیام کی طرف آنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ پرنس محمد الفیصل نے دنیا کے مختلف ممالک کے دورے کیے۔ حکمرانوں سے ملاقاتیں کیں۔ ذمہ داروں سے تبادلہ خیال کیا اور بڑے پیمانے پر رائے عامہ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان تمام علمی کاوشوں اور عملی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی بینکاری کا تصور نمایاں طور پر لوگوں کے سامنے آ گیا۔ بڑے پیمانے پر اسلامی بنک قائم ہونے شروع ہوئے اور آج اسلامی بینکاری ایک حقیقت بن چکی ہے۔ اب یہ محض ایک تصور نہیں ہے۔ اب یہ محض نظری بحث نہیں ہے کہ اسلامی بینکاری ہونی چاہیے یا نہیں ہونی چاہیے۔ بعض شدت پسند اہل علم یا بعض آئڈیلسٹ اہل فکر کے تحفظات کے باوجود۔ اور ان کے یہ تحفظات بے بنیاد نہیں ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلامی بنک قائم ہو رہے ہیں اور اسلامی بینکاری کے عمل میں شدت کے ساتھ تیزی آ رہی ہے۔

جب ہم اسلامک بنک کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ اسلامی بینکاری کی کوئی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس گفتگو سے اسلامی بنک کا تصور خود بخود واضح ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسلامی بنک کی فنی تعریف کرنی ضروری ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی بنک سے مراد وہ ادارہ ہے جو دورِ جدید کے جائز مالی اور مصرفی معاملات کو حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے انجام دیتا ہو۔ حلال وحرام کے قواعد کا پابند ہو۔ ناجائز اور حرام تجارت مثلاً ربا، غرر اور قمار وغیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔ ہماری بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ایک سابق استاد اور عرب دنیا کے صف اوّل کے ماہر معاشیات ڈاکٹر عبدالرحمٰن یسری نے ایک تحریر میں اسلامک بنک کی تعریف یہ کی ہے کہ اسلامی بنک سے مراد بینکاری کا وہ ادارہ ہے جو اپنے تمام معاملات میں، سرمایہ کاری کی تمام سرگرمیوں میں، اپنے انتظامی امور میں اسلامی شریعت کے احکام کا مکمل التزام کرے، شریعت کے مقاصد کی تکمیل کو اپنا ہدف سمجھے اور ایک مسلم معاشرے کی مالی اور مصرفی ضروریات کا اندرون

ملک اور بیرون ملک اہتمام کرے۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ جب سے بہت سے اسلامی بنک قائم ہوئے ہیں، اس وقت سے اسلامی بینکوں کا ایک اتحاد بھی وجود میں آ گیا ہے۔ اس کا نام ہے "الاتحاد الدولی للبنوک الا سلامیۃ" یہ اتحاد 1977ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ ایک معاہدہ کیا گیا تھا۔ بہت سے اسلامی بینکوں نے مل کر ایک دستاویز تیار کی۔ اس دستاویز پر بہت سے بینکوں کے ذمہ دار نمائندوں نے دستخط کیے اور یوں اسلامی بینکوں کا ایک اتحاد وجود میں آیا۔ اس دستاویز میں جو اسلامک بینکوں کا اتحاد قائم کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی، اسلامی بنک کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اسلامی بنک سے مراد وہ ادارے یا بنک ہیں جن کے بنیادی قوانین اور اساسات میں اس بات کی صراحت موجود ہو کہ وہ شریعت کے احکام کے مطابق عمل کریں گے اور کسی قسم کا سودی لین دین بالواسطہ یا بلا واسطہ نہیں کریں گے۔ آج اس تصور کے مطابق بہت سے اسلامی بنک قائم ہیں۔

اسلامی بینکاری کا یہ تجربہ ایک دو دن میں سامنے نہیں آیا۔ یہ تقریباً ستر اسّی سال کا تجربہ ہے۔ اسلامی بنکاری کا تجربہ سب سے پہلے جنوبی ہند کی مشہور مسلم ریاست مرحوم حیدر آباد میں ہوا تھا جس کو خود حیدر آباد کے لوگوں نے بھی بھلا دیا، اہل پاکستان نے بھی بھلا دیا اور تقریباً ہر اس شخص نے بھلا دیا جسے حیدر آباد کی ریاست کو یاد رکھنا چاہیے تھا۔

سب سے پہلا تجربہ اسلامی بینکاری کا اسی فراموش شدہ سلطنت خداداد حیدر آباد دکن مرحوم میں ہوا۔ اس تجربے سے کم از کم یہ بات سامنے آئی کہ اسلامک بینکنگ کے تصورات محض نظری مباحث نہیں ہیں، کوئی خیالی تصورات نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک حقیقی اور عملی ضرورت کے غماز ہیں، اور اس پر عملاً کام کیا جا سکتا ہے۔ حیدر آباد دکن کے اس تجربے کے بعد ایک ہلکی سی کاوش پاکستان میں ہوئی، 1950، 1951 میں۔ ابھی میں نے شیخ احمد ارشاد مرحوم کا ذکر کیا۔ وہ بھی اس معاملے میں پیش پیش رہے۔ اور ایک طویل عرصہ اسلامی بینکوں کے قیام کے لیے سرگرم رہے۔

عام طور پر جس اسلامی بنک کا تذکرہ اسلامی بینکاری کی تاریخ میں کیا جاتا ہے وہ مصر میں میت غمر کا اسلامک بنک ہے۔ جو 1963 میں قائم ہوا۔ اس بنک کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور چند

سال کے اندر اندر اس کی مختلف شاخیں مختلف شہروں میں قائم ہوگئیں۔ اس سلسلے میں مصر کے ممتاز ماہر معیشت اور اسلامی اسکالر ڈاکٹر احمد النجار کی کوششیں بہت نمایاں تھیں، ان کی کوششوں سے 1961 میں اس بات کی سرکاری منظوری حاصل ہوئی کہ ایک اسلامی بنک قائم کیا جائے۔ پھر 1963 میں یہ بنک قائم ہوا اور چار سال کے اندر اندر اس کی نو برانچیں پورے ملک کے اندر قائم ہوگئیں۔ دو سو کے قریب کارکنان اس سے وابستہ تھے۔ ایک لاکھ اس کے گاہک اور معاملہ کنندگان تھے۔

لیکن اس بنک کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ سرکاری اداروں کی طرف سے اس کو نہ صرف عدم تعاون کا سامنا تھا بلکہ شدید قسم کی رکاوٹیں پیش آتی رہتی تھیں تھیں۔ عدم تعاون کا یہ مسئلہ ہر اس ملک میں پیش آتا ہے جہاں بیورکریسی کا عمل دخل معاملات میں بہت زیادہ ہو۔ مصر میں بھی سرکاری اداروں کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ اس بنک کو اپنے کنٹرول میں رکھیں، کنٹرول ان کا ہو، کڑی سرکاری نگرانی میں ان بینکوں کو اور ان کی برانچوں کو کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسری طرف ان بینکوں کی کامیابی کا دارو مدار اس پر تھا کہ ان کی نوعیت مقامی ہو اور مقامی شاخیں خود مختار ہوں۔ جب تک یہ مقامی شاخیں خود مختار رہیں اور بنک پر بیوروکریسی کا کنٹرول نہیں تھا اس وقت تک یہ تجربہ کامیاب رہا۔ جب ان سب چیزوں کو مرکزی کنٹرول میں لے لیا گیا تو بنک کی کارکردگی بہت متاثر ہوئی اور بہت جلد یہ بنک کمزوری کا شکار ہونے لگا۔

اس کے بعد باقاعدہ پہلا اسلامی بنک بھی مصر ہی میں قائم ہوا۔ سنہ 1971 میں مصری وزارت خزانہ نے بنک ناصر الاجتماعی کے نام سے ایک بنک قائم کیا۔ یہ ایک سرکاری بنک تھا، جو سرکاری وسائل سے وجود میں آیا تھا۔ ہر قسم کے ٹیکس اور ڈیوٹی سے مستثنیٰ تھا اور اہم بات یہ تھی کہ اس پر قانون بینکاری لاگو نہیں ہوتا تھا۔ قانون بینکاری کے لاگو ہونے کے کچھ فوائد بھی تھے اور کچھ نقصانات بھی تھے۔ اسی طرح سے قانون بینکاری کے اس بنک پر منطبق نہ ہونے کے بھی کچھ فوائد تھے، کچھ نقصانات تھے۔ بہر حال یہ بنک کسی نہ کسی حد تک کام کرتا رہا اور کامیاب رہا۔ اسی اثناء میں پرنس محمد الفیصل سرگرم ہوئے۔ اسلامی ترقیاتی بنک 1975ء میں قائم ہوا۔ پھر دبی اسلامک بنک قائم ہوا۔ پھر ایک ایک کر کے اسلامی ترقیاتی بینکوں کا قیام شروع ہوا۔ اور سرمایہ کاری کی بہت سی اسلامی کمپنیاں بھی وجود میں آگئیں۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سنہ 70 کا عشرہ اسلامی بینکاری کے جنم لینے کا عشرہ ہے۔اس عشرے میں دبئی، سوڈان، مصر، کویت اور بحرین میں متعدد اسلامی بنک وجود میں آئے۔ ان ممالک میں ان بینکوں کو بعض مراعات بھی دی گئیں۔بعض ممالک میں ان بینکوں کو قواعد اور پابندیوں سے مستثنیٰ کیا گیا۔سوڈان میں 1977 میں قائم ہونے والے اسلامی بنک کو بینکاری احکام کے مطابق بعض قوانین سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔اسی سال یعنی 1977 سے ہی مصر میں جب اسلامک بنک قائم ہوا۔تو یہ بنک قانون کے ذریعے وجود میں آیا۔اس کو بھی متعدد مراعات دی گئیں اور کئی قوانین سے استثناء دیا گیا۔اس بنک کے قیام میں مصری وزارت اوقاف کا بہت اہم کردار تھا اور شیخ الازہر اور وزیر اوقاف کو اس بنک کے ذریعے زکوٰۃ کی تقسیم کی نگرانی کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا۔ یہ ایک اچھا کام تھا کہ زکوٰۃ کی تقسیم کا کام بھی وزارت اوقاف کی طرف سے اس بنک کے سپرد کیا گیا۔اس کے بعد شرعی نگرانی کی ایک کمیٹی بنائی گئی جو اس کے معاملات کی شرعی طور پر نگرانی کرتی تھی۔لیکن افسوس کہ یہ بنک ابھی پورے طور پر بننے نہیں پایا تھا کہ 1981 میں ان میں سے کئی مراعات واپس لے لی گئیں۔ان مراعات کے واپس لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنک جس زور شور سے شروع ہوا تھا اس میں کمی آ گئی اور پھر وہ بات پیدا نہیں ہوسکی جس کی لوگ توقع کر رہے تھے۔

یہ بات صرف مصر میں ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی مسلم ممالک میں ہوئی کہ سرکاری رویہ آغاز میں سردمہری اور غیر جانبداری کا تھا۔شروع شروع میں سرکار کا، وزارت اوقاف، وزارت خزانہ وغیرہ کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ دور دور سے دیکھو۔ اگر تجربہ کامیاب ہوتا نظر آئے تو اس کو اپنی کامیابی قرار دو اور اگر ناکام ہوتا نظر آئے تو یہ کہو کہ دیکھو ہم پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ یہ نہیں چل سکتا۔اس رویے سے کوئی بامعنی اور مؤثر اور نئی تبدیلی نہیں آسکی۔شروع شروع میں ان ممالک کے اسٹیٹ بینکوں نے اسلامی بینکوں کے امور میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔نہ قواعد بنائے، نہ نگرانی کرنے کی کوشش کی اور یہ بڑی حد تک یہ سارا کام ایک پرائیویٹ کوشش کے طور پر ہی جاری رہا۔

اس کے بعد جب 1980 کا عشرہ آیا تو 1980 کے عشرے سے اسلامی بینکاری پر توجہ نسبتاً زیادہ ہوئی اور ہوتے ہوتے یہ کام بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا۔جب 1990 کا عشرہ شروع ہوا، مثلاً 1992 میں ہم کہہ سکتے ہیں تو پوری دنیائے اسلام میں پچپن اسلامک بنک کام کر رہے تھے۔چونتیس سرمایہ کاری کی اسلامی کمپنیاں کام کر رہی تھیں اور تین مالیاتی ہولڈنگ کمپنیاں

تھیں۔ گویا 92 ادارے اسلامی بینکاری کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان میں 56 ادارے مسلم ممالک میں تھے اور 36 ادارے غیر مسلم ممالک میں۔ لیکن افسوس یہ ہے، اور یہ بات دکھ سے کہنی پڑتی ہے کہ ان مسلم ممالک میں جو 56 ادارے کام کر رہے تھے ان میں پاکستان شامل نہیں تھا۔ پاکستان میں اسلامی بینکاری کے سارے چرچے کے باوجود 1990 کے عشرے کے اواخر تک کوئی باقاعدہ اسلامی بنک قائم نہیں ہوا تھا۔ البرکہ بنک نے ایک برانچ قائم کی جو محدود انداز میں کام کرتی رہی۔ پھر اس کی ایک دو برانچیں اور بھی بنیں۔ اب پچھلے چند سالوں سے، اکیسویں صدی کے اوائل سے، اسلامک بینکاری کے ادارے میں نسبتاً تیزی آئی ہے۔

اس وقت اسلامی بینکاری کے بارے میں عام طور پر دو متضاد رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک رویہ تو ان لوگوں کا ہے جو ان بینکوں سے وابستہ ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا کام سو فیصد معیاری ہے۔ ہر اعتبار سے مثالی ہے اور مکمل اسلامی طریق کار کے مطابق بینکاری کا سارا کام ہو رہا ہے۔ کم از کم ان بینکوں کے شائع کردہ پبلسٹی کے مواد سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف کچھ ناقدین کا رویہ ہے جو اسلامی بینکاری کے سارے کام کو مکمل فراڈ قرار دیتے ہیں۔ جو اسلامی بینکاری کی اس ساری کوشش کو ایک ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں۔ نہ موجودہ اسلامی بینکاری سو فیصد معیاری ہے اور نہ بالکل ڈھکوسلہ ہے۔ اس کو احکام شریعت کے مطابق سو فیصد معیاری ہونے میں وقت لگے گا۔ یہ کام ایک دو دن کا نہیں ہے۔ اس کام میں سالہا سال لگیں گے۔ کتنے عشرے لگیں گے، اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن یہ کام مختلف مرحلوں اور مختلف مدارج سے گزر کر ہی اپنی مثالی اور مکمل شکل میں سامنے لایا جا سکے گا۔ بشرطیکہ حکومتوں کی طرف سے رکاوٹیں نہ ہوں، بشرطیکہ بیوروکریسی کی طرف سے رویہ مخالفانہ نہ ہو، بشرطیکہ اسٹیٹ بینکوں کا رویہ دوستانہ ہو۔ بشرطیکہ تاجر برادری بلاسودی بینکاری کو اختیار کرنا چاہتی ہو۔ یہ تمام شرائط بڑی اہم ہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر کے یہ توقع کرنا کہ اسلامی بینکاری ایک جنبش قلم سے قائم ہو جائے گی ایک بہت بڑی اور افسوسناک سادہ لوحی ہے۔ سب سے پہلے تاجر اور کاروباری برادری کو احکام شریعت پر عملدرآمد کے لیے آمادہ کرنا ضروری ہے۔ جب تک وہ آمادہ نہیں ہوں گے بلاسودی تجارت اور بینکاری کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان کو آمادہ کرنے اور قائل کرنے کا کام علمائے کرام کا ہے۔ یہ کام حکومتوں یا اسٹیٹ بنک کا نہیں ہے۔ حکومتوں کا کام فیصلہ کرنا اور سہولتیں فراہم کرنا

ہے۔ اسٹیٹ بنک کا کام قواعد وضوابط فراہم کرنا اور نگرانی کرنا ہے اور وہ سہولتیں پیدا کرنا ہے، جو وہی پیدا کرسکتا ہے۔

موجودہ اسلامی بینکاری کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلام کے مثالی ہدف اور منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ کتنا مرحلہ سفر کا طے ہو چکا ہے؟ اور کتنا مرحلہ باقی ہے۔ اس کے بارے میں اندازے متفاوت ہو سکتے ہیں۔ آراء مختلف ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس سے کوئی صاحب بصیرت اختلاف نہیں کرسکتا کہ ابھی ہمیں بہت آگے جانا ہے۔

یہ بات کہ آپ اپنے ذہن میں ایک آئیڈیل اور مثالی تصور رکھتے ہیں۔ جو چیز اس معیاری اور مثالی تصور کے مطابق نہ ہو اس کو مکمل فراڈ، دھوکہ بازی اور ڈھکوسلہ قرار دیں تو یہ صحیح اسلامی رویہ نہیں ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جن کا اسلام سے وابستگی کا دعویٰ بہت حد تک معیاری اور مثالی ہے؟ جن کی زندگی بہت حد تک اسلامی اعتبار سے مثالی ہے؟ ظاہر ہے ایسے خوش نصیب اصحاب ایمان بہت کم ہیں۔ کیا محض اس وجہ سے کہ مخلص کامل اہل ایمان بہت کم ہیں، ایک عام اور سیدھے سادے مسلمان کے دعویٰ اسلام کو دھوکہ اور فراڈ قرار دیا جائے گا، کیا عامۃ الناس کے دعویٰ اسلام کو ڈھکوسلہ قرار دیا جائے گا؟ نہیں۔ یہ ایک جذباتی بات ہے۔ چونکہ عامۃ الناس کو جلدی اپیل کرتی ہے اس لیے یہ غیر ذمہ دارانہ الفاظ اور اصطلاحات بعض لوگ استعمال کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ کام کتنا بڑا ہے، جن لوگوں نے شروع کیا ہے ان لوگوں نے کتنے اخلاص سے شروع کیا تھا۔ اس کام کے شروع کیے جانے میں کتنے مخلص انسانوں کی علمی اور فکری کاوشیں اور کتنے لوگوں کی شبوں کی تپش اور دنوں کا گداز اس میں شامل ہے۔ اور کن مشکلات سے وہ اس قافلے کو اس مرحلہ تک لائے ہیں۔ اس کا احساس نہ کرنا اور طنز وتشنیع سے ان مخلص کارکنوں کو نوازنا کوئی اسلامی رویہ نہیں ہے۔

دوسری طرف حکومتوں کا معاملہ بھی مختلف مسلم ممالک میں مختلف ہے۔ کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں دوہرا نظام چل رہا ہے۔ مصر، اردن اور کئی مغربی ممالک میں دونوں قسم کے نظام رائج ہیں۔ جدید روایتی بنک بھی پورے زور شور سے کام کر رہے ہیں۔ اور ان کے پہلو بہ پہلو اسلامی بینکوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ کچھ ممالک وہ ہیں کہ جو بینکاری کے پورے نظام کو مکمل اسلامی خطوط کے مطابق ڈھالنے کے دعویدار ہیں۔ یہ ممالک ایران اور سوڈان ہیں اور

یہ کہتے ہوئے شدید دکھ ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں پاکستان بھی ان ممالک میں شامل تھا۔ اسّی کا عشرہ وہ تھا جب پاکستان میں زور شور سے اس پورے نظام کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی بات کی جارہی تھی۔ اور تیزی کے ساتھ اس کام میں پیش رفت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ رک گیا اور وہ تبدیلی جو متوقع تھی وہ عمل میں نہیں آسکی۔ اب پاکستان میں بھی کم از کم سرکاری سطح پر دوغلے یا دوہرے نظام کی بات ہو رہی ہے۔ اسٹیٹ بنک کی نگرانی میں روایتی بنک بھی حسب سابق کام کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اسلامی بینکوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ اجازت جو پاکستان میں پہلی بار دی گئی اس کا کریڈٹ اسٹیٹ بنک کے سابق گورنر ڈاکٹر عشرت حسین کو جاتا ہے جنھوں نے سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ کوشش کی کہ پاکستان میں اسلامی بینکاری کو فروغ دیا جائے۔

غیر مسلم ممالک میں جہاں جہاں اسلامی بینکاری شروع ہوئی ہے وہاں بہت سے ممالک تو ایسے ہیں جہاں کا بینکاری نظام اسلامی بینکاری کو اب تسلیم کرنے لگا ہے اور وہاں کے قوانین اور نظام میں اس کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ اسلامی بینکاری کے ادارے قائم کیے جائیں۔ مثلاً برطانیہ میں یہ گنجائش قانوناً پیدا کر دی گئی ہے۔ لیکن جن ممالک میں اسلامی بینکاری کے تقاضوں کو وہاں کا قانون تسلیم نہیں کرتا جو بڑی تعداد میں ہیں وہاں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے ذاتی طور پر تمویل اور تجارت کے اسلامی احکام پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کے لیے ادارے بنائے اور وہ ادارے بہت کامیاب رہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے امریکہ میں بعض مسلمانوں نے مسلمانوں کی رہائشی ضروریات اور مشکلات کا احساس کرتے ہوئے ایک ادارہ بنایا جس کو غیر سودی بنیادوں پر چلایا۔ اور بہت سے لوگ اس سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے اسلامی احکام کے مطابق اس میں سرمایہ کاری کی اور اپنا ایک سینٹر بنانے میں کامیاب ہوئے۔

حال ہی میں متعدد مشہور مغربی بینکوں نے بھی اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ اور کئی اسلامی طریقے یعنی پروڈکٹس بنا کر جاری کیے ہیں۔ ان بینکوں میں سٹی بینک، ہونگ کونگ شنگھائی بنک وغیرہ اور امریکہ کی ایک مشہور فاونڈیشن بھی شامل ہے۔ ان سب نے اپنی اپنی اسلامی برانچیں، اسلامی ذیلی ادارے یعنی کمپنیاں قائم کی ہیں اور ان کے لیے جو دستاویزات جاری کی ہیں وہ اکثر و بیشتر اسلامی احکام کے مطابق ہیں اور مسلمان علماء کے مشورے سے تیار کی گئی ہیں۔

اسلامی بینکاری میں جو رکاوٹیں ہیں وہ قوانین کے راستے سے بھی آ رہی ہیں اور بعض دوسرے اسباب سے بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ بینکوں کے جو رائج الوقت قوانین ہیں وہ روایتی بینکاری کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اسلامی بینکاری کے لیے ان قوانین کے تحت کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بعض فقہی آراء بھی جن کا اظہار بعض علمائے کرام نے کیا ہے وہ بھی رکاوٹ ہیں۔ بعض فتاویٰ جو بینکاری کے نظام کو سمجھے بغیر، بینکاری نظام کو جانے بغیر، جاری کر دیے گئے ہیں ان کے ذریعے بھی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ توقعات اتنی بلند ہیں کہ ان کا نیم دلانہ کوششوں سے جلدی پورا ہو جانا بہت مشکل بات ہے۔ ان توقعات کی تکمیل کے لیے بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ چشم زدن میں یہ سب توقعات پوری ہو جانی چاہئیں۔ اگر آج اسلامی بینکاری شروع ہو جائے تو کل یہ پایہ تکمیل تک پہنچ جانی چاہیے۔ جب وہ توقعات کو پورا ہوتے نہیں دیکھتے تو تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غلط فہمیاں پیدا کرنے میں روایتی بینکاری کے لوگوں کا بھی دخل ہے۔ بہت سے روایتی بنک اسلامی بینکاری کو پنپتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس پورے عمل کو دھوکہ قرار دیتے ہیں۔ بظاہر کچھ معاملات ایسے ہیں کہ روایتی اور اسلامی بینکاری کے معاملات میں فرق زیادہ نمایاں طور پر محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن شریعت کے بہت سے احکام میں ایسا ہے کہ جائز اور ناجائز میں جو فرق ہے۔ وہ طریق کار کا فرق ہوتا ہے۔ بہت سے معاملات شریعت میں جائز ہیں، بہت سے ناجائز ہیں۔ ایک ہی کام کو ایک طریقے سے کیا جائے گا تو جائز ہوگا دوسرے سے کیا جائے گا تو ناجائز ہوگا۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ چونکہ کام وہی ہے جو روایتی بینکوں میں ہو رہا ہے لہٰذا یہ ناجائز ہونا چاہیے یہ بات ہر جگہ اور ہر صورت حال میں درست نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جو رکاوٹیں ہیں وہ حکومتی پالیسیوں کی، نظام تعلیم کی، تاجر اور کاروباری طبقے میں اسلامی بینکاری اور شریعت سے ناواقفیت اور رائج الوقت ادارے بنک اور کمپنیاں ہیں۔ ان چار رکاوٹوں کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ بعض علمائے کرام کا رویہ بھی اس راستے میں رکاوٹ ہے۔

1977 سے 1985 تک پاکستان میں اسلامی بینکاری کے عمل میں تیزی

آئی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے 29 ستمبر 1977 کو اسلامی نظریاتی کونسل کو یہ ہدایت کی کہ وہ سود کے خاتمے کے لیے تجاویز اور دستاویزات پیش کرے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے نومبر 1978 میں ایک ابتدائی رپورٹ پیش کی اور فروری 1979 میں انسداد ربا کا ایک تین سالہ منصوبہ تیار کر کے صدر کو پیش کر دیا۔ اس تین سالہ منصوبے کا مدعا یہ تھا کہ بالتدریج تین سال کے اندر اندر سودی معاملات کو ملک کی معیشت سے نکال دیا جائے اور ملک کی معیشت کو مکمل طور پر بلا سودی بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس پر عمل درآمد کا آغاز ہوا اور اگست 1979 میں یعنی رپورٹ کی منظوری کے چند مہینے کے اندر اندر ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن کے معاملات کو سود سے پاک کر دیا گیا۔ کارپوریشن کی طرف سے غیر سودی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یکم جولائی 1979 کو مزار عین کو غیر سودی قرضے دیے جانے لگے۔ اس طرح سے تیزی کے ساتھ اس منصوبہ پر عمل درآمد ہوتا نظر آنے لگا۔ 1980 کے وسط میں کمپنیز آرڈیننس میں ترمیم ہوئی۔ مضاربہ آرڈیننس آیا اور ایک ایک کر کے یہ تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کا پس منظر جاننے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔

پاکستان میں اسلامی بینکاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی پاکستان کی تاریخ۔ سنہ 1935، 1936، 1937 کے سالوں میں قائداعظم اور علامہ اقبال کے درمیان جب مراسلت ہو رہی تھی اور مجوزہ مسلم ریاست کے بہت سے معاملات پر ان دونوں شخصیتوں کے درمیان تبادلہ خیال ہو رہا تھا تو اس میں اسلامی معیشت کے موضوعات پر بھی اظہار خیال ہوا۔ اس دور کی اس اہم مراسلت میں علامہ اقبال نے قائداعظم کے ایک سوال کے جواب میں یہ لکھا کہ پاکستان میں مسلمانوں کی معیشت کا مسئلہ، روٹی اور فقر و فاقہ کا مسئلہ کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ شریعت کے احکام کا نفاذ اگر مناسب انداز میں کیا جائے تو یہ مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔

قائداعظم نے اپنی زندگی کی جو آخری تقریر کی تھی وہ یکم جولائی 1948 کو کراچی میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی۔ اس میں انھوں نے مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونسٹ نظام دونوں کی خرابیوں کی نشاندہی کی تھی اور یہ ہدایت کی تھی کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان اسلامی خطوط کے مطابق ایک نئے معاشی نظام کا ڈھانچہ تیار کرے جس کی بنیاد پر پاکستان کا نظام استوار کیا جائے۔ اس سے بہت پہلے 1942، 1943، 1944 کے سالوں میں آل

انڈیا مسلم لیگ نے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں معیشت کے ماہرین بھی شامل تھے اور علمائے کرام بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کی ذمہ داری یہ تھی کہ آیندہ قائم ہونے والی آزاد مسلم ریاست کے لیے تعلیم، معیشت اور معاشرت کے تینوں اہم شعبوں کے احکام مرتب کرے۔ اس نئی ریاست کی تعلیمی سرگرمیوں کو اسلامی خطوط پر کیسے ڈھالا جائے۔ وہاں کی سیاست اور نظام کو اسلام کے مطابق کیسے تشکیل دیا جائے اور وہاں کی معیشت اور اقتصاد کو کیسے نئے انداز سے مرتب کیا جائے۔

اس کے بعد جب پاکستان میں دستور سازی کا عمل شروع ہوا، 1952 میں ملک کے درویش صفت وزیراعظم خواجہ ناظم الدین مرحوم نے اپنا مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا، 1954 میں محمد علی بوگرہ مرحوم کا مسودہ سامنے آیا (جو موجودہ دور میں پاکستان کے لیے بہترین آئینی مسودہ تھا۔ اس کو ایک سازش کے تحت غلام محمد نے ناکام بنایا۔ اسمبلی عین وقت پر توڑ دی اور تیار شدہ دستور نافذ العمل نہیں ہوسکا۔) پھر 1956 کے دستور میں، پھر 1962 کے بڑی حد تک سیکولر دستور میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے یہ بات لکھی۔ ان سب دساتیر میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان کی معیشت سے سود کا خاتمہ کیا جائے گا۔ 1973 کے متفقہ دستور میں بھی یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ ربا کو جتنی جلدی ممکن ہو ملکی معیشت سے ختم کیا جائے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے 1973 میں، 1980 میں، اور اس کے بعد بھی کئی بار سودی نظام کے خاتمے کی تجاویز اور سفارشات پیش کی ہیں۔

پھر 1984 میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے سرکلر نمبر 13 جاری کیا جو بیس جون 1984 کو جاری ہوا۔ اس سرکولر میں یہ بات کہی گئی تھی کہ یکم جولائی 1985 سے ملک کے تمام معاملات اور بینکاری کی تمام سرگرمیاں مکمل طور پر اسلامی خطوط کے مطابق ہوں گی۔ گویا اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے اور حکومت پاکستان نے 1977 سے لے کر اور 1984 تک تمام ضروری تیاری کر لی تھی۔ یکم جولائی 1985 سے یہ پورا نظام تبدیل کیے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ درمیان میں جمہوریت کی وہ نیلم پری سامنے آگئی جس کے منتظر ہمارے یہاں بہت سے حضرات رہتے ہیں۔ 1985 میں انتخابات ہوئے۔ سیاسی حکومت وجود میں آگئی، جس نے اس پورے عمل کو عملاً نظر انداز کر دیا۔ اور جو تبدیلی سنہ 1985 کے جولائی سے

ہونی چاہیے تھی وہ رک گئی۔ اور پھر آج تک وہ عمل دوبارہ شروع نہیں ہوسکا۔

سنہ 1980 میں جب وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی تو اس وقت وفاقی شرعی عدالت کے اختیار میں مالیاتی توانین کا معاملہ نہیں تھا۔ 1990 میں مالیاتی قوانین وغیرہ کی عدالتی نظر ثانی کا معاملہ ان کے اختیار میں آیا۔ 16 نومبر 1991 کو وفاقی شرعی عدالت نے ملک کے بائیس سودی قوانین کے بارے میں اپنا مشہور فیصلہ دیا۔ اس کے خلاف اس حکومت نے سپریم کورٹ نے اپیل دائر کردی جو اسلام کا نام لے کر اقتدار میں آئی تھی۔ 23 دسمبر 1999 کو سپریم میں اس اپیل کا فیصلہ ہوا اور اس فیصلے کو برقرار رکھا گیا جو وفاقی شرعی عدالت نے کیا تھا۔ پھر 2002 میں سپریم کورٹ کا اپنا فیصلہ سپریم کورٹ کے ہی ایک بینچ نے کالعدم کردیا اور پھر ہنوز روز اوّل ہے۔ آج ہم اسی مرحلے پر کھڑے ہیں جس مرحلے پر 1980 کے شروع وغیرہ میں تھے۔

پاکستان کے اس تجربے کے نتائج وثمرات دیکھنے کے لیے دنیائے اسلام میں ہر جگہ بہت سے لوگ منتظر تھے کہ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ پاکستان میں بہت زور شور سے اسلام کا نعرہ بلند کیا گیا تھا۔ ان نعروں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کردی تھی۔ اسلامی معیشت کے ماہرین نے پاکستان کے تجربے پر اپنی نظریں مرکوز کی ہوئی تھیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے تجربے کی روشنی میں پوری دنیائے اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس پورے تجربے میں قائدانہ کردار پاکستان کا تھا۔ پاکستان نے قیادت کے اس مقام کو خود ہی کھودیا۔ اللہ تعالیٰ نے قیادت اور رہنمائی کا جو منصب اہل پاکستان کو دیا تھا، اہل پاکستان از خود اس سے دستبردار ہوگئے۔ اور اب یہ پرچم دوسرے ممالک کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ ان ممالک کے ہاتھ میں جن کے پاس آج بھی اتنی افرادی قوت نہیں ہے جتنی پاکستان میں ہے۔ آج بھی وہ اہل پاکستان کے علمی اور فکری کام سے استفادہ کررہے ہیں۔ آج بھی وہ پاکستانی ماہرین سے کام لینے پر مجبور ہیں۔ جہاں جہاں اسلامک بینکنگ کے کام ہورہے ہیں وہاں پاکستانی اہل علم، پاکستانی ماہرین اور پاکستانی افراد کار پیش پیش ہیں۔

حکومتوں کی اس کوتاہی اور غفلت کے باوجود اسلامی بینکاری کا کام تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ آج سے بارہ تیرہ سال قبل 1997 میں دنیا بھر میں اسلامی بینکاری میں لگے ہوئے سرمائے کا کل حجم ایک کھرب ساٹھ ارب ڈالر تھا۔ اور اس میں دس سے پندرہ فیصد تک سالانہ

اضافہ ہورہا تھا۔ 1999 میں اسلامی بینکاری کا کام کرنے والے بنک ایک سوستر 170 سے زائد تھے۔ اس تعداد میں ایران اور سوڈان کے بنک شامل نہیں ہیں۔ سوڈان اور ایران کے بنک اس کے علاوہ تھے۔ سنہ 2000 میں اسلامی بینکاری کا کام کرنے والے اداروں کی تعداد کا اندازہ دوسو سے زائد تھا۔ 2004، 2005 کے سالوں میں ان دوسو سے زائد بینکوں کی پانچ ہزار سے زائد شاخیں دنیا بھر میں وجود میں آچکی تھیں۔

اب بھی یہ پورا تجربہ انتہائی خوش آئند ہے۔ اس کام میں تیزی آرہی ہے اور نئے نئے اسلامی مالیاتی اور مصرفی ادارے آئے دن قائم ہو رہے ہیں۔ اسلامی بینکاری کی اس کامیابی کا اندازہ اس کے نتائج اور اسلامیت سے کرنا چاہیے۔ اگر اسلامی بینکاری کے نتائج معاشی اعتبار سے مفید ہیں، فنی اعتبار سے کارآمد ہیں، ملکی ترقی میں مؤثر حصہ لے رہے ہیں اور شریعت کے احکام کے مطابق ہیں تو پھر اسلامی بینکاری کامیاب ہے۔ امام شاطبی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "**النظر فی مآلات الافعال معتبر شرعا**"۔ کہ کسی بھی معاملے کے انجام کی بنیاد پر اس معاملے کا فیصلہ کرنا شریعت کا ایک طے شدہ اصول ہے۔ لہٰذا اسلامی بینکاروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کے معاملات جہاں فنی اعتبار سے سو فیصد درست ہوں وہاں اسلامی اعتبار سے بھی مکمل طور پر شریعت کے احکام کے پابند ہوں۔

یہ بات کہ کسی فنی ناکامی کی وجہ سے کوئی اسلامی بنک ناکام ہو اور اس کو اسلام کے کھاتے میں ڈال لیا جائے، اس کا خاصا خطرہ موجود ہے۔ اس لیے اسلامی بینکاروں کو چاہیے کہ بینکاری کے جدید فنی تقاضوں سے پوری واقفیت حاصل کریں اور بینکاری کے جو جدید ترین طریقے ہیں، اس سب سے بھرپور اور مکمل استفادہ کیا جائے، تا کہ کسی تجربے کی فنی ناکامی اسلام کے کھاتے میں نہ ڈالی جا سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جو رائج الوقت پروڈکٹس ہیں ان کے اسلامی متبادلات پر زور دیا جائے اور آئندہ اصل زور اس پر ہونا چاہیے کہ جو تمویل ہے وہ اصول یعنی اثاثہ جات اور assets کی بنیاد پر ہو دیون کی بنیاد پر نہ ہو۔ یعنی اثاثہ جات اور asset-based تمویل ہونی چاہیے۔ debt-creating تمویل نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اسلامی بینکاری کو چاہیے کہ وہ مائیکروفائنانسنگ پر خاص توجہ دے۔ چھوٹے لوگوں کو قرضے دینا مللکی معیشت کا تقاضا بھی ہے، عامۃ الناس کی ضرورت بھی ہے اور

اسلامی بینکاری جتنی تیزی سے اور جتنے مؤثر انداز میں چھوٹی معیشت میں کامیاب ہوسکتی ہے اتنی تیز رفتار کامیابی بڑی معیشت میں مشکل ہے۔ بڑی معیشت میں اسلامی اصلاحات کے کامیاب ہونے میں خاصا وقت لگے گا۔مبنی بر شراکت تمویل کو یعنی participatory financing کو ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ یہ اسلامی بینکاری کا وہ کام ہے۔ جو اسلامی بینکار کو کرنا چاہیے۔

روایتی بینکاری کی خرابیاں اسی سطح سے کم ہونی چاہئیں۔اسی تناسب سے روایتی بینکاری کی کمزوریوں کو دور کیا جانا چاہیے۔سٹہ، جوا، عدم استحکام اور مسلسل بحران اور تجارتی چکر جو روایتی بینکاری کی پرانی خرابیاں ہیں۔ یہ اسلامی بینکاری میں نہیں ہونی چاہئیں۔اسلامی بینکاری میں نفع اگر آئے تو وہ دو طریقے سے آنا چاہیے۔یا تو وہ نفع اس چیز کا نفع ہو جس کے نتیجے میں کوئی جائداد یا اثاثہ جات assets وجود میں آئے ہیں، یا کوئی ویلیو value وجود میں آئی ہے۔یعنی value creation ہوئی ہے یا asset creation ہوئی ہے۔محض opportunity cost یا وقت کی قیمت کی بنیاد پر آمدنی نہیں ہونی چاہیے۔اگر آمدنی محض وقت کی قیمت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو چاہے اس کا جو بھی نام رکھا جائے اور کسی بھی تاویل سے کھینچ تان کر اس کا جواز دریافت کر لیا جائے وہ اسلام کی روح اور مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔اسلام کی روح اور تقاضوں سے ہم آہنگ وہی تمویل اور سرمایہ کاری ہے جس کے نتیجے میں عملاً کوئی تجارت پیدا ہو، کوئی صنعت وجود میں آئے، کوئی خدمت وجود میں آئے، کوئی جائداد وجود میں آئے۔لہٰذا جتنی وسعت زر میں ہو اتنی ہی وسعت اثاثہ جات یا صنعتوں یا تجارت میں ہونی چاہیے۔توسیع زر اور توسیع اثاثہ جات یہ دونوں ایک ساتھ اور متناسب انداز میں ہونے چاہئیں۔ جب مثالی اسلامی بینکاری وجود میں آئے گی تو اس کے ثمرات بھی نظر آنے چاہئیں۔اس کے ثمرات میں سب سے بڑا ثمرہ عدل ہے، دولت کی منصفانہ تقسیم ہے۔ معاشی ترقی میں تیزی ہے۔ ہر طبقہ ان ثمرات سے مستفید ہوتا نظر آنا چاہیے۔ربا، غرر اور قمار سے مکمل طور پر نجات حاصل ہونی چاہیے۔

یہ وہ ثمرات ہیں جو اسلامی بینکاری کے نتیجے میں سامنے آنے چاہئیں۔اسلامی بینکاری کو جو بڑے بڑے چیلنجز اور مشکلات درپیش ہیں ان میں سے کچھ کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ یہ بات میں پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ کسی تجربے کی فنی خرابی کا ذمہ دار اسلامی بینکاری کو یا اسلامی شریعت کے

احکام کو نہ ٹھہرایا جائے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلامی اصلاحات کی کامیابی کے لیے محض دینی جذبہ کافی نہیں ہے۔ اس کام کے لیے دنیا میں رائج الوقت تجربات سے واقفیت بھی از حد ضروری ہے۔ جرمنی میں مرچنٹ بینکنگ کا تجربہ بہت کامیاب بتایا جاتا ہے۔ مرچنٹ بینکنگ کا تصور اسلامی بینکاری کے احکام سے خاصا قریب ہے۔ لہٰذا اگر جرمنی میں مرچنٹ بینکنگ کامیاب ہے تو اس سے استفادہ کر کے اس کو اسلامی بینکاری کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

مقابلہ اور منافست کی اس فضا میں اسلامی بینکوں کے لیے اسلامی احکام کی سختی سے پابندی اور حدود کی پاسداری میں بعض اوقات بینکوں کو دشواری محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات درست ہے۔ آپ کا مقابلہ ایک ایسے بنک سے ہے جو شریعت کی حدود کا پابند نہیں ہے۔ اخلاق کے قواعد کا پابند نہیں ہے۔ اس کو دولت کمانے کے سینکڑوں راستے میسر ہیں۔ آپ کو جو راستے میسر ہیں وہ محدود ہیں، حلال و حرام کی پابندی آپ کو کرنی ہے۔ حرام سے اجتناب کرنا ہے۔ ربا سے بچنا ہے۔ اس لیے مقابلہ مشکل تو ہے، لیکن اس مقابلہ میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عامتہ الناس کو تیار کیا جائے۔ کارکنوں کو، محاسبین کو، مشیران قانون کو، ذہنی طور پر آمادہ کیا جائے۔ ان میں سے بہت سے حضرات۔ بینکوں کے کارکن بھی، محاسبین، مشیران قانونی اور فیصلہ ساز بھی۔ ابھی تک روایتی سودی بینکاری کے نفسیاتی ماحول سے نہیں نکل سکے۔ اس روایتی نفسیاتی ماحول نے ان کا ایک خاص ذہن بنا دیا ہے۔ اس ذہن سے جب وہ اسلامی بینکاری میں آتے ہیں تو قدم قدم پر الجھنیں محسوس ہوتی ہیں۔ ان الجھنوں سے نکلنے کا حل یہی ہے کہ ان تمام افراد کے لیے ایسے پروگرام تربیتی اور توجیہی ترتیب دیے جائیں جن کے ذریعے ان کو اسلامی احکام اور اسلامی بینکاری کے قواعد سمجھنا آسان ہو۔

مغربی بینکاری اور اسلامی بینکاری کے درمیان ربط اور تعلق کی ممکنہ نوعیت کیا ہے؟ اس پر بھی غور ہونا چاہیے۔ ایک ممکنہ تعلق تو دشمنی اور دعوت مبارزت کا ہو سکتا ہے۔ ایک اور نوعیت مقابلہ اور منافرت کی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں جو تعلق مناسب تر اور بہتر معلوم ہوتا ہے وہ تعاون اور تکامل کا ہے۔ اگر اسلامی بینکاری کے ادارے مغربی بینکاری کے اداروں سے شریعت کے احکام اور اخلاقی ضوابط کی مکمل پابندی کے ساتھ انسانی مقاصد میں تعاون کریں، عامتہ الناس کی بہبود اولین ترجیح ہو اور ان میدانوں پر توجہ دی جائے جو ابھی خالی ہیں، جن میں کام نہیں ہوا، تو اسلامی

بینکاری کے لیے مغربی دنیا میں پنپنا نسبتاً آسان ہوسکتا ہے۔ دشمنی اور دعوت مبارزت کا نتیجہ سوائے تباہی اور مشکلات کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

اسلامی بینکاری کی کامیابی کو جانچنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ نفع اور نقصان میں براہ راست شرکت کا تناسب کیا ہے۔ یعنی مضاربہ اور مشارکہ پر کس حد تک عمل ہو رہا ہے۔ اور شریعت کے احکام یعنی حرمت ربا، حرمت قمار، حرمت غرر اور الخراج بالضمان وغیرہ پر کتنا عمل ہو رہا ہے۔ کاروبار میں ترقی اور پھیلاؤ کے مواقع نسبتاً بہتر ہوئے ہیں یا پہلے جیسے ہیں۔ کاروباری عمل میں شریک لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یا کمی ہوئی ہے۔ فرضی کاروباروں کا خاتمہ ہوا ہے کہ نہیں ہوا۔ فرضی کاروباروں سے مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ (پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد دوسرے ممالک کے مقابلہ میں خاصی زیادہ ہے جو بہت دکھ کی بات ہے) بینکوں سے فرضی کاروباروں کے نام پر قرضہ لیتے ہیں۔ پھر فرضی اور نامکمل کاغذات کے ذریعے بینکوں کو مطمئن کر دیتے ہیں۔ پھر اس میں نقصان ظاہر کر کے پوری رقم معاف کرا لیتے ہیں۔ یہ کھیل پاکستان میں پچاس سال سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہر آنے والی حکومت جو بڑے بلند بانگ دعووں سے سامنے آتی ہے، جب وہ جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مزید کئی کھرب روپے کے قرضے معاف کر کے چلی گئی ہے۔ یہ قرضے سیاسی اثر رسوخ کی بنیاد پر حاصل کر لیے جاتے ہیں، سیاسی دباؤ ڈال کر کروڑوں، اربوں اور کھربوں روپے عامتہ الناس کے ضائع کر دیے جاتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ عامتہ الناس کی رقم کہاں گئی۔

یہ سب اس لیے ممکن ہو رہا ہے کہ بنک قرضوں کا اور زر کا کاروبار کرتے ہیں۔ اگر بینکوں کے پورے نظام کی اٹھان اس پر ہو کہ وہ اصل نفع نقصان میں شریک ہوں تو اس طرح کی چوری کا راستہ بہت حد تک روکا جا سکتا ہے۔ پھر ہمارے یہاں بیمار صنعتوں کا ایک افسانہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ بیمار صنعتوں کی یہ بیماری یا سرطان، تو اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب اس ملک کے بعض تیز طرار حکمرانوں نے صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا اور اپنے سیاسی مقاصد اور اقتدار میں اضافے کی خاطر پورے ملک کی معیشت کی کمر توڑ دی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہزاروں صنعتیں بیمار صنعتیں چلی آ رہی ہیں اور ان کو صحت مند بنانے کے نام پر مزید کروڑوں، بلکہ اربوں اور کھربوں روپیہ ضائع ہو چکا ہے۔

اس پورے معاملے کو از سر نو فنی اعتبار سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ بینکوں کو مضاربہ کی طرف آنے پر آمادہ کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مضاربہ کو جو واقعی مشکلات در پیش ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ جو لوگ مضاربہ سے وابستہ ہیں یا مضاربہ کرنا چاہتے ہیں وہ بعض مشکلات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ دو حسابات رکھنے کو اپنی ضرورت قرار دیتے ہیں۔ بینکوں سے بات کی جائے تو وہ مہارتوں کی کمی کا اظہار کرتے ہیں۔ دیانت کی کمی کا شکوہ کرتے ہیں۔

فیزیبلٹی رپورٹ کی قانونی حیثیت کیا ہے، اس پر عرب دنیا میں خاصا غور ہوا ہے۔ بینکوں کے براہ راست کاروبار میں حصہ لینے میں مشکلات ہیں، قانونی بھی، انتظامی بھی اور فنی بھی جن کی وجہ سے مضاربہ کی کوششوں میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر Venture capital، مرچنٹ بینکنگ اور ہولڈنگ کمپنیوں کے تجربات کو جو مغربی دنیا میں کامیابی سے ہوئے ہیں سامنے رکھا جائے اور ان تجربات سے مضاربہ کے سلسلے میں فائدہ اٹھایا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ ان معاملات کو حل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی بینکاری اور روایتی بینکاری میں فرق یوں تو کئی اعتبار سے ہے۔ لیکن ایک اہم فرق کی نشاندہی کر کے یہ گفتگو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ روایتی بینکوں میں بنک اور کھاتہ داروں کے درمیان دائن اور مدیون کا تعلق ہوتا ہے۔ بنک اور کھاتے دار، دائن اور مدیون، دو اجنبی فریق کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک دوسرے سے لاتعلق ہیں۔ اسلامک بینکوں میں ان کی حیثیت شریک کاروبار کی ہوگی جو ایک دوسرے کے شعوری طور پر رفیق ہوں گے اور نفع اور نقصان میں ایک دوسرے کے حصہ دار بھی ہوں گے۔

اسلامی بینکوں کا بنیادی کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ جائز سرمایہ کاری کے راستے تلاش کریں، جائز سرمایہ کاری کے وسائل اور ذرائع زیادہ سے زیادہ پیدا کریں۔ ملک کی معاشی ترقی میں روایتی بینکوں سے زیادہ حصہ لیں۔ مسلم ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کریں۔ بینکاری کا نیا نظام اور انداز متعارف کرائیں۔ اخلاق اور تجارت کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو از سر نو استوار کریں۔ ربا کے خاتمے میں مدد دیں۔ جائز تجارت کے فروغ میں مؤثر کردار ادا کریں۔ متعلقہ مسلم ملک کی معاشی ترقی میں حصہ لیں۔ ارتکاز دولت کو روکنے میں مدد دیں۔ غریب

تاجروں کی حوصلہ افزائی کریں۔ نفع اور نقصان میں حصہ دار بنیں اور عدل اجتماعی کے قیام میں مدد دیں۔ اگر یہ سارے کام اسلامی بنک کررہے ہوں اور سب کو ہوتے نظر بھی آرہے ہوں تو پھر اسلامی بینکاری فروغ پا رہی ہے۔ اور اگر یہ مقاصد پورے نہیں ہو رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی بینکاری ابھی شروع نہیں ہوئی اور حقیقی اسلامی بینکاری کا کام ابھی سامنے نہیں آیا۔ وہ جب بھی سامنے آئے گا اس کی یہ برکات اور ثمرات لازماً سامنے آنے چاہئیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

گیارہواں خطبہ

اسلامی معیشت، تجارت اور بینکاری، دورِ جدید میں

گیارہواں خطبہ

اسلامی معیشت،تجارت اور بینکاری،دور جدید میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے''اسلامی معیشت،تجارت اور بینکاری دور جدید میں''۔ یہ گفتگو اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ کی نقشہ کشی کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ اسلامی معیشت پر عمل درآمد کے باب میں ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں۔اسلام میں تجارت کے احکام پر آج عمل درآمد کی صورت حال کیا ہے اور اسلامی بینکاری کے قیام کا خواب کہاں تک شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔جب تک موجودہ صورتحال کا صحیح ادراک نہ ہو،ان مسائل کا صحیح صحیح اندازہ نہ ہو جو آج اس سلسلے میں ہمیں درپیش ہیں اور ان مشکلات سے پوری طرح واقفیت نہ ہو جن کا آج ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو آئندہ کی منصوبہ بندی کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ جدید مغربی معیشت کا نفاذ دنیائے اسلام میں مغربی استعمار کے ہاتھوں ہوا۔مغربی استعماری قوتیں جیسے جیسے دنیائے اسلام پر قابض ہوتی گئیں،وہ اپنے تصورات کے مطابق دنیائے اسلام کے نظام کو بدلتی رہیں۔اسلامی قوانین ایک ایک کر کے منسوخ کیے گئے،ان کی جگہ نئے مغربی قوانین نافذ کیے گئے۔تعلیمی اداروں سے سرکاری سرپرستی ختم ہوگئی یا ان کو بند کر دیا گیا۔ان کی جگہ مغربی طرز کے تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی گئی۔اسی طرح معیشت اور تجارت کے باب میں بھی قوانین بھی تبدیل ہوئے،رویے اور طرز عمل میں بھی تبدیلی

لانے کی کوشش کی گئی۔ اور نئے ادارے بھی قائم کیے گئے جو خالص مغربی تجربات پر مبنی تھے اور مغربی تصورات کے مطابق ان کو ڈھالا گیا تھا۔

اگرچہ دنیائے اسلام میں عامتہ الناس کی ایک بہت بڑی تعداد نے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ غالب ترین اکثریت نے، ان نئے تصورات کو آسانی سے قبول نہیں کیا۔ ان نئے اداروں اور نئے تصورات کی ہر جگہ مزاحمت ہوئی۔ کہیں یہ مزاحمت شدید تھی، کہیں شدید تر تھی اور کہیں معمولی تھی۔ عامتہ الناس کی بڑی تعداد نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی اس مزاحمت کے مطلوبہ نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں تو انھوں نے ان نئے تصورات، نئے قوانین، نئے نظاموں اور نئے اداروں سے لاتعلقی اختیار کرلی اور ایک رویہ یہ پیدا ہوگیا کہ نئے اداروں سے الگ رہ کر، حکومت اور حکومتی کاوشوں سے دور رہ کر، ایک ایسا جزیرہ بنالیا جائے جہاں ہم اپنی شریعت کے مطابق، اپنی خواہشات اور تصورات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ یہ رویہ کتنا کامیاب رہا۔ اس کے نتائج کیا نکلے۔ یہ موضوع ایک طویل گفتگو کا متقاضی ہے۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد بہت سے ایسے معاملات میں ملوث ہونے سے بچ گئی جو شریعت سے متعارض تھے یا اسلامی روایات ۔سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہیے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کو یاد نہیں رہتی۔ ایک عام تاثر ہمارے ہاں یہ پیدا ہوگیا ہے کہ مغربیت کے دنیائے اسلام میں آنے کا واحد سبب مغربی استعمار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ مسلمانوں کے نظام کا ڈھیلا پن ہے۔ دنیائے اسلام میں مغربی استعمار کی آمد سے خاصا پہلے سے اسلام کے احکام پر عمل درآمد میں شریعت کی روح کے بجائے محض روایت پرستی کا جذبہ نمایاں ہونے لگا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بے جان اور کمزور روایت پرستی تیزی سے جنم لے رہی تھی۔ جس میں نہ اسلام کی حقیقی تعمیری روح موجود تھی، نہ اسلامی تہذیب کی وہ اٹھان نظر آتی تھی جو اسلامی تاریخ کے ابتدائی ایک ہزار سال میں محسوس ہوتی تھی۔ اب نہ مسلمانوں میں فکر و تہذیب میں جدت پسندی یا نئے نئے تجربات کی کوئی امنگ باقی رہی تھی اور نہ زوال و انحطاط کی اس تیزی سے پھیلتی ہوئی رَد کا زیادہ ادراک و احساس تھا۔

یہ رویہ جو خالص فکری کمزوری کا اور تہذیبی انحطاط کا غماز تھا، یہ دسویں صدی کے لگ

بھگ شروع ہوا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے ادارے کمزور ہوتے گئے۔ شریعت کے احکام پر عمل درآمد کی کیفیت ظاہر پرستی کے قریب قریب پہنچ گئی اور شریعت کے مقاصد، اصل اہداف اور محرکات پر توجہ دینے کے بجائے، قرآن وسنت کی ہمہ گیر اور عالمگیر نصوص پر توجہ ملحوظ رکھنے کے بجائے، بعض متاخرین کے فتاوی ہی کو شریعت کا قائم مقام سمجھا جانے لگا اور تمام معاملات مختلف علاقوں میں دنیائے اسلام کے مختلف ممالک میں رائج الوقت فقہی مسالک کے متاخر اہل علم کے فتاوی کے مطابق انجام دیے جانے لگے۔

شروع شروع میں تو اس غیر ضروری تقلیدی رویے کے اثرات زیادہ محسوس نہیں ہوئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شریعت کے اصل مصادر یعنی قرآن مجید اور سنت سے تعلق کا احساس کمزور ہوتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن وسنت کی تعلیم بھی اس توجہ کی مستحق قرار نہ پائی جتنی توجہ اس پر ہونی چاہیے۔ نظام تعلیم کی کمزوری اور کھوکھلے پن نے بھی ایسے علماء پیدا کرنے بند کر دیے جو اس صورتحال میں عامتہ الناس کی مؤثر اور فعال مجتہدانہ رہنمائی کر سکتے۔

دوسری طرف مغربی دنیا میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، نئے نئے قوانین مرتب ہو رہے تھے۔ دنیائے مغرب صنعتی انقلاب کے دور سے گزر رہی تھی۔ نئی نئی صنعتی پیداوار کو دنیا میں فروغ دینے کے لیے ان کو کھلے بازار اور لامحدود منڈیاں درکار تھیں۔ منڈیوں کی تلاش میں مغربی دنیا کے ملاح اور تاجر نکلے اور دنیا پر قابض ہو گئے۔ اس پوری صورتحال کے مقابلے میں دنیائے اسلام کا رویہ خالص مقلدانہ رہا۔ کسی نے اس نئے دور کو، اس کے محرکات کو، اس کے تصورات اور فلسفے کو سمجھنے کی کوئی بھرپور اور سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس نئے دور کے بارے میں شریعت کے احکام کیا ہیں؟ اس دور کے مسائل کے بارے میں علمائے شریعت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ مسلمانوں کو اس نئے دور کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ یہ فہم وبصیرت دنیائے اسلام میں قریب قریب ناپید تھی۔

گویا ایک خلا تیزی سے پیدا ہو رہا تھا جس سے مغربی دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ مغربی دنیا نے ایک ایک کر کے اپنے ادارے دنیائے اسلام میں قائم کیے۔ اپنے قوانین نافذ کرائے۔ یہاں تک کہ بظاہر آزاد مسلم ممالک میں اپنے تاجروں کے مفاد اور اپنے شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر اپنی عدالتیں قائم کرائیں۔ جہاں مغربی قوانین کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے۔ یہ کام ترکی

میں بھی ہوا، مصر میں بھی ہوا، اور متعدد دوسرے مسلم ممالک میں بھی ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا سے تجارت کرنے والے تاجروں نے ضرورت محسوس کی کہ ان کو مغربی قوانین، تصورات اور اداروں سے واقفیت ہو۔ چنانچہ بینکوں سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی۔ تجارتی معاملات اور رویوں سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ یوں ایک ایک کر کے دنیائے اسلام میں پہلے مغربی تصورات عام ہونا شروع ہوئے اور پھر ایک ایک کر کے مغربی ادارے بھی قائم ہونے شروع ہو گئے۔

جن ممالک پر استعمار کا قبضہ براہ راست ہو گیا تھا وہاں تو لوگ یہ کہہ کر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ مغربی استعمار نے یہ سب کر دیا۔ لیکن جن ممالک پر براہ راست مغربی استعمار کا قبضہ نہیں ہوا، یا اس وقت تک نہیں ہوا تھا وہاں بھی اس طرح کے نئے مغربی ادارے اور نئے قوانین آنا شروع ہو گئے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نئی تبدیلی کا اصل سبب اور محرک محض مغربی استعمار نہیں تھا۔ بلکہ وہ خلا، وہ کمزوری اور وہ ڈھیلا پن اس کا اصل سبب تھا جو مسلمانوں کے نظام میں پیدا ہوا۔ اس کے مقابلے میں بعض ظاہر بینوں نے جب مغربی دنیا کے فعال اداروں کو، مغربی دنیا کے زندگی سے بھرپور قوانین اور اداروں کو دیکھا تو اس سے متاثر ہوئے اور ان کے دلوں میں مغربی اداروں اور قوانین کو اپنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یوں دنیائے اسلام میں مغربی تصورات وقوانین کی طلب پیدا ہوئی۔ مغربی دنیائے نے اس طلب سے فائدہ اٹھایا اور اپنے ادارے، اپنے تصورات، اپنے قوانین اور اپنے طور طریقے دنیائے اسلام کو برآمد کیے۔

چنانچہ مصر میں سودی بینکوں کا آغاز 1855 میں ہو گیا تھا۔ 1855 میں نظری اور آئینی اعتبار سے مصر ایک آزاد ملک تھا۔ مغربی دنیا کے کسی ملک کا اس وقت تک براہ راست قبضہ مصر پر نہیں تھا۔ لیکن وہاں 1855 میں آرمینیا کے ایک شخص نے اسکندریہ میں پہلا بنک قائم کیا۔ 1856 میں قاہرہ میں اس کی شاخ قائم کی اور گویا انیسویں صدی کے وسط میں مغربی بینکاری مصر جیسے مرکزی اور قائدانہ کردار رکھنے والے مسلم ملک میں شروع ہو گئی۔ اسی سال یعنی 1856 میں عثمانی حکومت نے انگریزوں کو سلطنت عثمانیہ میں پہلا بنک قائم کرنے کی اجازت دی۔ 1856 وہ زمانہ ہے جب عثمانی حکومت ابھی تک دنیائے اسلام کے بڑے حصے پر حکمران تھی اور مشرقی یورپ کے خاصے وسیع علاقوں پر اس کا کنٹرول تھا۔ لیکن وہ اندرونی طور پر سیاسی اور عسکری کمزوری

اور معاشی پسماندگی کا بری طرح شکار ہو چکی تھی۔ مزید برآں نظام تعلیم کی بے اثری اور ڈھیلے پن، قوانین کی بے تاثیری اور علمائے کرام کا چند ظواہر اور متاخرین کے فتاویٰ پر زور اور ان جیسے دوسرے متعدد اسباب نے وہاں کے رائج الوقت نظاموں کو غیر مؤثر کر ڈالا۔ انگریزوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عثمانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو خلافت اسلامیہ کے مرکز میں پہلا بنک قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ عثمانی حکومت نے اس کی اجازت دے دی۔ چند سال کے اندر اندر 1863 میں اس پہلے انگریزی بنک میں فرانسیسی بھی شامل ہو گئے۔ اور اس کا نام "البنک السلطانی العثمانی" قرار پایا۔ گویا سلطنت عثمانیہ جو خلافت کا مرکز تھی، جہاں کہا جاتا تھا کہ نظام حکومت شریعت کے مطابق قائم ہے، جہاں شیخ الاسلام اور مفتی اعظم کو انتہائی اہم مقام حاصل تھا وہاں شیخ الاسلام اور مفتی اعظم اور دوسرے علمائے کرام یہ اندازہ نہیں کر سکے کہ آج معاشیات کی دنیا میں بینکاری کے اس نئے نظام اور بین الاقوامی تجارت کی کیا اہمیت ہے۔ اور اس اہمیت کو نظر انداز کرنے کے نتائج کیا نکلیں گے۔ چنانچہ بنک سلطانی عثمانی قائم ہو گیا۔ پھر بعد میں یہی بنک ایک سرکاری فرمان کے ذریعے ترکی کا سرکاری اور مرکزی بنک قرار دے دیا گیا۔ کرنسی اور سکہ جاری کرنا اسی کا اختیار قرار پایا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک خالص مغربی سودی بنک مرکز خلافت میں قائم ہوا۔ اور جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو اسی بنک کو سلطنت عثمانیہ کے پورے مالیات نظام کو وضع کرنے، کنٹرول کرنے اور نگرانی کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔

اس طرح مغربی دنیا میں جو تصورات پچھلے ڈھائی تین سو سال سے پنپ رہے تھے، ایک ایک کر کے پختہ ہو رہے تھے، ان تصورات کی بنیاد پر جو قوانین مرتب ہو رہے تھے، جو ادارے وجود میں آ رہے تھے وہ ایک ایک کر کے دنیائے اسلام میں منتقل ہونے لگے۔ سلطنت عثمانیہ پر کبھی بھی کسی استعمار کی حکومت نہیں رہی۔ سیاسی اور فوجی استعمار کی حکومت تو ترکی میں کبھی بھی نہیں رہی، البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری، ثقافتی اور مذہبی استعمار کے اثرات وہاں خاصا پہلے ہی آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس سے قبل تنظیمات کے نام سے بہت سے خالص مغربی طور طریقے بھی ترکی میں زور شور سے اختیار کر لیے گئے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے معاشرتی اور ثقافتی طور طریقے بھی تھے جن کی کوئی انتظامی اہمیت یا معاشی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف مغرب کی ظاہری نقالی پر مبنی

تھے۔لیکن چونکہ ایک مرتبہ حکمران اور بااثر لوگوں کے ذہن میں سے یہ بات بیٹھ گئی اور حکمرانوں کو تجربے سے اس کا اندازہ ہو گیا کہ ان کے جو یہاں روایتی قوانین یا روایتی طور طریقے چلے آ رہے ہیں، جن کو علمائے کرام شریعت کا حتمی تقاضا قرار دیا کرتے تھے، وہ حکمرانوں کے خیال میں نئے تقاضوں اور نئے معاملات سے عہدہ برآں ہونے میں مؤثر ثابت نہیں ہو رہے۔ جب یہ تصور حکمرانوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا اس وقت علمائے کرام کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس تصور کا احساس کرتے، اس کا ادراک کرتے اور پہلے سے پیش بندی کرتے ہوئے احکام شریعت کی روشنی میں ایسے قوانین اور قواعد، ایسے ادارے اور اصول وضع کرتے جو نئی ضروریات کو پورا کرنے میں بھی مؤثر ثابت ہوتے اور شریعت کے احکام اور قواعد سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے۔ بہرحال یہ نہیں ہو سکا۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہ عرض کروں کہ یہ جہاں پوری امت مسلمہ کی ناکامی تھی، جہاں یہ حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی تھی وہاں سب سے بڑھ کر یہ علمائے کرام کی ناکامی بھی تھی۔ اگر علمائے کرام اس کم فہمی اور بے بصیرتی کا مظاہرہ نہ کرتے تو شاید اس انجام سے بچا جا سکتا تھا جو پوری دنیائے اسلام کو دیکھنا پڑا۔

دنیائے اسلام میں جب مغربی بینکاری کا آغاز ہوا تو اس کے نتیجے میں کچھ فقہی مسائل بھی پیدا ہوئے۔ ان فقہی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ سب سے بڑا اور اہم فقہی مسئلہ یہ تھا کہ بنک کے کھاتوں کی حیثیت کیا ہے۔ جب آپ کسی بنک میں حساب کھول کر کھاتہ قائم کرتے ہیں اور وہاں رقم رکھتے ہیں تو اس رقم کی کیا حیثیت ہے۔ بینکاری سے وابستہ بہت سے لوگوں کا ماضی میں یہ اصرار رہا ہے کہ یہ امانت ہے اور ودیعہ ہے۔ اردو میں بنک کے کھاتوں کے لیے امانتوں کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ آج بھی بینکاری کے لٹریچر میں امانت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ودیعہ اور ودائع کا اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ لیکن نہ یہ امانت ہے، نہ یہ ودیعہ ہے۔ ودیعہ اور امانت کا لفظ جان بوجھ کر خلط مبحث کے لیے اختیار کیا گیا ہے یا یہ محض اتفاق ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ودیعہ یا امانت کا لفظ استعمال کرنے سے کچھ الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ فی نفسہ ایک جائز معاملہ ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے پاس اپنی کوئی قیمتی چیز بطور امانت رکھیں تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔ انسانوں کو اس کی ضرورت بھی ہے، اس لیے کہ ہر

معقول اور ذمہ دار شخص اپنا مال اور رقم محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور اگر کوئی ایسا ادارہ ہو جو لوگوں کی رقم محفوظ رکھ سکے، اس کی حفاظت کا بندوبست اس کے پاس موجود ہو، اس کے پاس حفاظت کے لیے رقم رکھوا دینا شرعاً جائز ہے۔

لیکن بینکوں کا معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ بنک اس رقم کو محض امانت کے طور پر نہیں رکھ رہے تھے۔ بنک اس رقم کو آگے مزید قرض کے طور پر لوگوں کو دے رہے تھے۔ اس قرض پر جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لیے لوگوں کو دیا جا رہا تھا اس پر سود بھی وصول کر رہے تھے۔ اس سود کا ایک حصہ ان کھاتے داروں کو ادا کر رہے تھے۔ اگر یہ امانت تھی تو اس پر کوئی اضافہ دینا شریعت کی رو سے جائز نہیں تھا۔ اگر یہ امانت نہیں تھی تو اس کو بلاوجہ امانت اور ودیعہ کہنا درست نہیں تھا۔ اگر اس رقم کو ودیعہ کہنا درست نہیں تھا تو پھر کہ یہ کیا تھا؟

شریعت کے احکام کی رو سے یہ دین یا قرض کی ایک قسم ہے۔ دین سے مراد وہ رقم یا وہ واجب الادا چیز ہے جو کسی کو ادا کرنی ہو اور مستقبل میں کسی شخص کو ادا کی جائے۔ جس کو انگریزی میں debt کہتے ہیں۔ یہ عربی میں دَین کہلاتا ہے۔ بنک کے پاس جو رقم آپ رکھواتے ہیں۔ بنک اس کو ہر حال اور ہر صورت میں ادا کرنے کا پابند ہے۔ جب بنک اس کو ہر حال اور ہر صورت میں ادا کرنے کا پابند ہے تو یہ معاملہ امانت کی حدود سے تو نکل گیا۔ اب یہ معاملہ قرض کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس لیے اس رقم پر اضافہ شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے۔ بالفرض اگر اس معاملہ میں اس شک اور شبے کو مان بھی لیا جائے جو بعض حضرات کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو اس رقم کے سود ہونے میں تو کوئی شک نہیں جو بنک اُن تاجروں اور صنعت کاروں سے وصول کرتا ہے جو بینکوں سے قرضے لیتے ہیں۔ جو لوگ بینکوں سے قرضہ لے کر کاروبار کرتے ہیں وہ بنک کو اس رقم پر سود ادا کرتے ہیں اور اس سود کا تعین کاروبار کی کامیابی یا ناکامی کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ محض وقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اضافے کے ربا النسیئۃ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، جو بنک قرضہ لینے والوں سے وصول کرتا ہے۔

بعض حضرات کو شروع شروع میں یہ تامل تھا کہ اگر صرفی قرضوں پر اضافہ وصول کیا جائے تو وہ تو سود ہے لیکن اگر تجارتی قرضوں پر اضافہ وصول کیا جائے تو وہ سود نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہنے والے یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ آج تک کسی بنک نے کوئی ایک روپیہ کا صرفی قرض

بھی بغیر سود کے کسی کو نہیں دیا۔ بینکوں کے روایتی نظام میں یہ تصور ہی موجود نہیں ہے کہ وہ صرفی اور غیر صرفی، تجارتی اور غیر تجارتی، پیداواری اور غیر پیداواری قرضوں میں فرق کریں۔ ان کے یہاں قرضہ قرضہ ہے اور ہر قرضہ لینے والا اس پر اضافہ ادا کرنے پر مجبور ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال پتا نہیں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے کہ اگر قرض لینے والا نادار اور حاجت مند ہے، اس سے اگر سود لیا جا رہا ہے تو ناجائز ہے لیکن اگر وہ حاجت مند نہیں ہے تو پھر اس سے لیا جانے والا اضافہ سود نہیں ہے۔ حالانکہ شریعت میں کہیں بھی اس اضافے کی حرمت کو قرض لینے والے کی حاجت مندی یا بے نیازی سے وابستہ نہیں کیا گیا۔ قرض قرض ہے۔ اس میں مقترض حاجت مند ہو یا مستغنی ہو، یہ ایک غیر متعلق بحث ہے۔ بنک حاجت مند ہے یا نہیں ہے، قرضہ لینے والا قرضہ لینے کا محتاج ہے کہ نہیں ہے، یہ سرے سے ایک غیر متعلق سوال ہے۔ بنک میں جو رقوم رکھوائی جاتی ہیں ان کی حیثیت قرض کی ہے اور اس پر قرض ہی کے احکام جاری ہوں گے اور چونکہ قرض پر کوئی اضافہ وصول کرنا شریعت کی رو سے سود ہے اس لیے اس رقم کو سود ہی سمجھا جائے گا۔

یہ بحث 1855، 1856 سے دنیائے اسلام میں شروع ہوئی اور ایک طویل عرصہ تک، تقریباً 75 سال یا سو سال جاری رہی۔ بہت سے حضرات جو سودی نظام سے وابستہ تھے یا مغربی تصورات سے متأثر تھے، جن کو مغرب کی مادی ترقیات کی چکاچوند میں وہاں کی کمزوریاں یا خرابیاں محسوس نہیں ہوتی تھیں وہ بنک انٹرسٹ کو سود ماننے میں ایک طویل عرصے تک تامل کرتے رہے۔ بعض ایسے حضرات کا تعلق برصغیر سے بھی تھا، مثلاً ہمارے مشہور ادیب اور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد، ہمارے مشہور صحافی اور اخبار نویس مولانا ظفر علی خاں۔ دنیائے عرب کے مشہور صحافی اور مفتی محمد عبدہ کے دروس قرآن کریم پر مبنی تفسیر کے مرتب سید رشید رضا اور اس طرح کے بعض دوسرے حضرات کو یہ شبہ رہا کہ بنک انٹرسٹ کو ربا نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ ربا نہیں ہے۔ لیکن دنیائے اسلام کی غالب ترین اکثریت اور اہل علم کی بہت بڑی تعداد اس باب میں اپنا ذہن ہمیشہ سے واضح رکھتی چلی آ رہی ہے کہ بنک انٹرسٹ ربا ہے اور شریعت کی رو سے حرام ہے۔

یہ بات دنیائے اسلام میں اہل علم ذاتی طور پر بھی کہتے رہے ہیں کہ بنک انٹرسٹ ربا ہے۔ برصغیر کے جید ترین اہل علم کے فتاویٰ اس باب میں موجود ہیں۔ دنیائے اسلام کے اجتماعی فتویٰ دینے والے ادارے بھی اس باب میں متفق الرائے ہیں کہ بنک انٹرسٹ ربا ہے۔ سنہ

1965 میں جامع ازہر کے مجمع البحوث الاسلامیہ نے بنک انٹرسٹ کے ربا ہونے کے بارے میں واضح اور دوٹوک رائے دے دی تھی۔ اس اجتماع کے 75 شرکاء نے جو پوری دنیائے اسلام کے جید ترین اہل علم پر مشتمل تھے اتفاق رائے سے یہ قرار دیا تھا کہ بنک انٹرسٹ ربا ہے اور حرام ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجمع البحوث الاسلامیہ نے اسی اجتماع میں بینکوں کے مختلف معاملات کا جائزہ لے کر بعض معاملات کو جائز قرار دیا اور بینکوں کے بعض وظائف اور مشاغل کے بارے میں یہ قرار دیا کہ یہ شرعاً جائز ہیں اور یہ کام بینکوں یا کسی اور ادارے کے ذریعے کیے جانے چاہئیں۔

یہ بات کہ دنیائے اسلام میں اسلامی معیشت کے نفاذ کی بات جب بھی ہوئی اس کا آغاز اسلامی بینکاری سے ہوا، اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ بینکاری کا نظام آج کے دور میں اتنا اہم ہو گیا ہے اور بینکاری نظام کی حیثیت ایسی بنیادی ہو گئی ہے کہ اس کی اصلاح کیے بغیر بقیہ پہلوؤں کی اصلاح نسبتاً مشکل کام ہے۔ اس لیے دنیائے اسلام میں جہاں جہاں اسلامی بینکاری یا اسلامی معیشت پر گفتگو ہوئی تو وہاں اصلاحات کا آغاز اسلامی بینکاری سے ہوا۔ پاکستان میں، پاکستان کے علاوہ ایران، سوڈان اور متعدد مسلم ممالک میں اسلامی بینکاری پر توجہ دینے کی بڑی وجہ یہی ہے۔

پاکستان میں اسلامی بینکاری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پاکستان کی تاریخ، جیسا کہ کل یا پرسوں کی گفتگو میں عرض کیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے قائدین کا روز اول سے یہ بنیادی کمٹمنٹ تھا کہ ملکی معیشت سے ربا کو جلد سے جلد ختم کر دیا جائے گا۔ یہ بات پاکستان کے تمام دساتیر میں لکھی گئی۔ ان دساتیر میں بھی کہی گئی جو نافذ نہیں ہو سکے۔ دستوری مسودے ہی کی حیثیت تک محدود رہے۔ سنہ 1952 میں خواجہ ناظم الدین کا پیش کردہ مسودہ۔ سنہ 1954 میں چوہدری محمد علی بوگرہ کا تقریباً منظور شدہ دستور۔ سنہ 1956 کا دستور۔ 1962 کا دستور اور ہمارا موجود 1973 کا آئین۔ ان سب میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوئی ہے کہ ریاست کی ذمہ داریوں میں سود اور ربا کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ ربا کے خاتمے کی جب بھی بات ہوئی اور معاملات نسبتاً سنجیدگی سے آگے بڑھنے شروع ہوئے تو بنک انٹرسٹ کے متبادلات کی گفتگو بھی ہوئی۔ جن میں سے بعض کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

ان متبادلات میں ایک متبادل بیع مرابحہ بھی تجویز کیا گیا جو دراصل بنک انٹرسٹ کا

متبادل نہیں تھا اور نہ بیع مرابحہ کی حیثیت سرمایہ کاری کے کسی طریقے کی تھی۔ بیع مرابحہ تو خرید و فروخت کی، بیع کی ایک قسم ہے جس کو بعض اہل علم نے شاید اس لیے تجویز کیا تھا کہ ایک عبوری دور میں، ابتدائی مرحلے میں بینکوں کو اپنے معاملات کو تبدیل کر کے اسلامی رُخ پر ڈالنے میں آسانی رہے۔ بظاہر بنک انٹرسٹ اور بیع مرابحہ ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ اس ظاہری مشابہت کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ موجودہ اسلامی بینکاری محض ایک دھوکہ ہے اور چند اصطلاحات کے پردے میں وہی قدیم نظام جاری ہے۔ یہ بدگمانی درست نہیں ہے۔ اگرچہ بینکاری کے نظام کی مکمل اصلاح اور احکام شریعت کی روشنی میں نظام کی پوری تبدیلی کے لیے خاصا طویل وقت اور اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔ اور ان تبدیلیوں کا بڑا حصہ ابھی تک روبہ عمل نہیں آسکا ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ تبدیلی دنیائے اسلام میں کہیں نسبتاً تیز رفتاری سے ہوئی ہے، کہیں زیادہ سنجیدگی سے ہوئی ہے اور کہیں اس کی رفتار سست رہی ہے۔

یہ بات ہم اہل پاکستان کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ اس معاملے میں ہمارا رویہ قائدانہ ہونا چاہیے تھا اور ماضی میں قائدانہ تھا۔ دنیائے اسلام پر پاکستان کے تجربات سے استفادہ کرتی تھی۔ پاکستان میں ہونی والی پیش رفت دنیائے اسلام پر اثر انداز ہوتی تھی۔ لیکن ہمارے یہاں اہل علم کی کوتاہی، علمائے کرام کی بے توجہی، پیشہ ور مولویوں کی سیاست بازی، حکومتوں کی نا اہلی اور بعض ذمہ داروں کی غفلت کی وجہ سے اب ہماری حیثیت قائدانہ نہیں رہی۔ بلکہ شاید اب تو اس میدان میں ہماری حیثیت سنجیدہ پیروکار کی بھی نہیں رہی۔ دنیائے اسلام کے متعدد ممالک میں جو پیش رفت ہو رہی ہے وہ ہم سے بہت زیادہ ہے۔ اب دنیائے اسلام کے کئی چھوٹے چھوٹے ممالک اسلامی بینکاری اور اسلامی معیشت کی مہم میں پاکستان سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔

بہرحال بات مرابحہ کی ہو رہی تھی۔ مرابحہ دراصل بیع کی ایک قسم ہے جس کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ ''واحل اللہ البیع وحرم الربا'' ربا کا متبادل تجارت ہے اور مرابحہ تجارت کی ایک قسم ہے۔ مرابحہ میں حقیقی چیز کی بیع ہوتی ہے۔ کوئی حقیقی اثاثہ فروخت کیا جاتا ہے۔ جب کہ بنک انٹرسٹ میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک بڑا بنیادی فرق تو بنک انٹرسٹ اور مرابحہ میں یہ ہے۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ مرابحہ میں بائع اس چیز کا ضامن ہوتا ہے جو وہ فروخت کرتا ہے، اگرچہ ایک حد تک ہی ضامن ہوتا ہے لیکن بہرحال وہ ضامن ہے۔ بنک انٹرسٹ میں سرمایہ دینے والا

سرمایے کا ضمان برداشت نہیں کرتا۔ بنک انٹرسٹ میں جس نے سرمایہ دیا ہے، مثلاً بنک ہے، وہ اب سرمایے کا ضامن نہیں ہے، نفع نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے۔ نفع نقصان کا ذمہ دار صرف قرض لینے والا ہوتا ہے۔ بنک کو تو ہر صورت میں اصل سرمایہ بھی پورا کا پورا واپس ملے گا اور نفع بھی ملے گا۔ یہ چیز بیع مرابحہ سے بنک انٹرسٹ کو ممتاز کرتی ہے۔ تیسری بڑی بات یہ ہے کہ بیع مرابحہ کا جو دَین ہے وہ قابل بیع وشراء نہیں ہوتا۔ الا یہ کہ حقیقی قیمت یعنی پار ویلیو پر ہو۔ جب کہ بنک انٹرسٹ کا دَین مطلقاً قابل بیع وشراء ہے۔ جو دستاویزات آج کل قابل بیع وشراء مانی جاتی ہیں ان میں سے دَین کی دستاویزات بھی ہیں۔ بلکہ جتنا کاروبار لین دین کا دَین کی دستاویزات پر ہو رہا ہے۔ وہ اصل اثاثوں کی بنیاد پر نہیں ہو رہا۔

آج پوری دنیا میں بیشتر کاروبار کاغذی قرضوں اور دَین کی دستاویزات کا ہی ہو رہا ہے اور دور جدید کے جو معاشی بحران پے در پے پیدا ہو رہے ہیں ان کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ مغربی دنیا میں جو ہو رہا ہے، اس سے پہلے مشرق بعید میں ہوا تھا، ابھی حال ہی میں دبئی میں سامنے آیا ہے۔ ان سب تجارتی اور مالیات بحرانوں کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان سب معیشتوں کا سارا کاروبار خالص قرض کی اور کاغذی قرضوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ جس کاروبار کی بنیاد ٹھوس اثاثوں پر ہو، حقیقی تجارت پر ہو، حقیقی صنعت پر ہو تو وہ کاروبار آسانی سے نہیں بیٹھتا۔ اگر بنیاد کمزور ہو، کاغذی ہو تو تھوڑے سے ہیر پھیر سے معمولی تبدیلی کے نتیجے میں پوری عمارت بیٹھ جاتی ہے۔

اسی لیے اسلامی بینکاری کے ماہرین شروع سے یہ کہتے رہے ہیں کہ اسلامی بینکاری کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اصل ہدف مضاربہ اور مشارکہ پر عمل درآمد ہو۔ بینکاری کی ساری سرگرمیاں دراصل مضاربہ یا مشارکہ کی بنیاد پر ہونی چاہئیں جن میں بنیادی تصور نفع نقصان میں شرکت کا ہے۔ جن کا اصل مقصد اثاثے کی تشکیل اور حقیقی تجارت کا حصول ہے۔ حقیقی تجارت کی فراہمی اور فروغ۔ حقیقی صنعت کاری کا وجود۔ حقیقی ترقی کی یقین دھانی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اثاثوں یعنی assets کی تشکیل اور ترقی وتوسیع ہی مضاربہ اور مشارکہ کے لازمی نتائج ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی تک اسلامی بینکاری کم از کم پاکستان کی حد تک مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر پورے طور پر قائم نہیں ہو سکی۔ اب بھی پاکستان میں اسلامی بینکوں کے معاملات کا بڑا حصہ، کتنا حصہ، یہ کہنا دشوار ہے لیکن بہت بڑا حصہ بیع مرابحہ ہی کی بنیاد پر کاربند ہے۔

جہاں تک مضاربہ یا مشارکہ کا تعلق ہے ان کے بارے میں بینکوں کی طرف سے بعض مشکلات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ بینکوں کا کہنا یہ ہے کہ ملک میں دیانت کی کمی ہے۔ جو لوگ تجارت یا صنعت کے نام پر بینکوں سے رقوم لے کر جائیں گے اور ان رقوم سے کاروبار یا تجارت یا صنعت کا کام کرنا چاہیں گے وہ بعد میں یہ دعویٰ کریں گے کہ ان کو نقصان ہو گیا ہے، ان کی صنعت کامیاب نہیں رہی۔ اس لیے اب بنک کو اب اس نقصان میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہیے، جیسا کہ وہ نفع میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بینکوں کا سارا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ یہ خدشہ حق بجانب ہے، یہ بات بھی درست ہے۔ یہ عذر بھی اپنی جگہ وزنی ہے۔ لیکن اس عذر کو دور کرنے کی کچھ تدابیر بھی ہر دور میں اختیار کی گئی ہیں۔

ہر دور میں یہ داعیہ کچھ انسانوں میں پیدا ہوتا رہا ہے کہ وہ کسی طرح غلط بیانی کرکے دوسروں کی دولت ہتھیا لیں۔ ہیرا پھیری کرنے والے اور دوسروں کی دولت حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والے ہر دور میں رہے ہیں۔ ہر ملک میں رہے ہیں، ہر علاقے میں رہے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے کہیں بھی قانون اور نظام نے یہ کہہ کر ہتھیار نہیں ڈالے کہ چونکہ ہمارے علاقے میں دیانت کی کمی ہے اس لیے ہم فلاں قانون سے دستبردار ہوتے ہیں، یا ہم فلاں کام نہیں کر سکتے۔ اس عذر یا عذر لنگ کی وجہ سے بنک اور دوسرے ادارے مضاربہ اور مشارکہ پر عمل درآمد کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے تجارتی ادارے، صنعتیں، کمپنیاں اور بڑے تاجر حضرات دو دو حسابات رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ حقیقی حسابات اپنے لیے اور دوسرا فرضی حساب حکومت کے کارندوں کے لیے۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر مشارکہ اور مضاربہ پر اصرار کیا گیا تو ہمارے تجارتی ادارے تین تین حساب رکھنا شروع کر دیں گے۔ تیسرا کاروباری شرکاء کے لیے جن کو یہ دکھایا جائے گا کہ کاروبار میں گھاٹا ہو گیا۔

تیسری بڑی مشکل جس کا بنک اظہار کرتے ہیں وہ مختلف مہارتوں میں کمی یا عدم دستیابی ہے۔ بینکوں کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے پاس جب کوئی شخص قرض لینے کے لیے آئے گا یا کسی تجارت یا صنعت میں ہمیں شراکت کی دعوت دے گا تو ہمارے پاس اس تجارت یا صنعت کی مہارت دستیاب نہیں ہو گی اور ہمارے لیے یہ تعین کرنا ممکن نہیں ہو گا کہ جس تجارت یا صنعت کے لیے ہم سے رقم لی جا رہی ہے اس میں واقعی اتنے نفع کا امکان ہے یا نہیں ہے۔ وہ واقعی چلنے والی

تجارت ہے کہ نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے پاس یہ مہارت موجود نہیں ہے اس لیے ہم کسی ایسے کام کے لیے رقم نہیں دے سکتے جس کے انجام کا ہمیں اندازہ نہ ہو۔

یہ بات بھی بینکوں کی وزنی معلوم ہوتی ہے ۔لیکن اس مسئلے کا بھی حل موجود ہے۔ مہارتوں کے حصول کے آج دنیا میں جو ذرائع ہیں وہ پاکستان میں بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں ہر طرح کی مہارتوں کے بارے میں مشاورتی ادارے، مشاورتی کمپنیاں بلکہ بڑی بڑی تنظیمیں قائم ہیں جن کے یہاں ہر طرح کے معاملات کے ماہرین موجود ہوتے ہیں۔ اور جس شخص کو کسی اہم اور پیچیدہ فنی معاملے میں مشہور کرنا ہو وہ ان اداروں سے رجوع کرتا ہے اور ان کے ماہرین سے مشورہ کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر کاروبار کرتا ہے۔ آج دنیا میں اربوں کھربوں ڈالر کے کاروبار اسی طرح کی مشاورتوں کی بنیاد پر ہو رہے ہیں۔ ان مشیروں نے نہ کبھی دھوکہ دیا، نہ غلط مشورہ دیا، اور نہ مہارتوں کی کمی کی وجہ سے اس کاروبار میں کمی آئی۔ اگر دنیا میں یہ کام سہولت کے ساتھ ہو سکتا ہے اور ایک حد تک پاکستان میں بھی ہو رہا ہے تو اسلامی بینکاری کے معاملے میں کیوں نہیں ہو سکتا۔

چوتھا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب بینکوں سے کوئی شخص یا ادارہ قرضہ وصول کرنے کے لیے آتا ہے یا ان کو اپنے کاروبار یا صنعت میں شراکت کی دعوت دیتا ہے، کسی کاروبار یا تجارت یا صنعت میں رقم لگانے کی تجویز پیش کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ ایک مکمل رپورٹ لے کر آتا ہے جس کو فزیبلٹی رپورٹ کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ تجویز جو ہم لے کر آئے ہیں پورے طور پر فنی بنیادوں پر مرتب اور مدوّن کی گئی ہے اور فنی اعتبار سے یہ مکمل طور پر قابل عمل ہے۔ اس پر عمل درآمد کا طریق کار یہ ہوگا۔ اور اس عمل درآمد سے نتیجے میں یہ نتائج سامنے آئیں گے۔ اتنا نفع متوقع ہے۔ اس متوقع نفع میں سے اتنا ہم شرکا کو ادا کریں گے، اور اتنا خود رکھیں گے اور اتنا ہم بنک کو بطور وکیل کے یعنی ایجنٹ ادا کریں گے۔ بینکوں کو شکایت یہ ہے کہ ہمارے یہاں جب کوئی شخص بینکوں سے رقم لینے آتا ہے تو بڑی مؤثر اور متاثر کن قسم کی رپورٹ لے کر آتا ہے۔ بعد میں اس پر عمل درآمد کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو ہمارے ملک میں عام رویہ ہے۔ جو شخص رقم لے کر جاتا ہے، وہ چند سال گلچھرے اڑانے کے بعد آتا ہے، بینکوں کو درخواست دیتا ہے کہ میری صنعت تو نہیں چلی، میری تجارت میں تو گھاٹا ہو گیا۔ اس سارے عمل کی حیثیت چونکہ ایک وعدے کی ہے

اور فقہ حنفی کی رو سے کوئی وعدہ عدالتی اور قانونی طور پر واجب العمل نہیں ہوتا۔اس لیے اس فزیبلٹی رپورٹ میں کیے گئے وعدوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔

اس مسئلے کا حل بعض عرب ممالک میں اہل علم نے تجویز کیا ہے۔انھوں نے فقہ مالکی سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر کسی شخص کے وعدے کی بنیاد پر کوئی شخص کوئی ایسا کام کرے جو وہ نہ کرتا اگر اس سے یہ وعدہ نہ کیا جاتا اور وہ وعدہ بعد میں جھوٹا ثابت ہو تو وعدہ کرنے والا اس نقصان کی تلافی کا پابند ہے۔اس لیے اب عرب ملکوں میں عام طور پر رائے یہ ہے کہ فیزیبلٹی رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو حتمی کمٹمنٹ سمجھا جائے گا اور اس کی قانونی اور عدالتی پابندی لازمی ہوگی، الا یہ کہ فریق عامل، یعنی انٹرپرینئر یہ ثابت کرے کہ جن اسباب سے وہ تجارت یا صنعت کامیاب نہیں ہوئی وہ اس کے بس سے باہر تھے۔پھر یہ ایک امر واقعہ کا سوال ہوگا۔اس پر عدالتیں غور کریں گی، گواہیوں اور شواہد کی بنیاد پر معاملات طے کیے جائیں گے۔

پانچواں بڑا مسئلہ مشارکہ اور مضاربہ کے سلسلے میں بنک یہ بتاتے ہیں کہ بنک براہ راست کوئی کاروبار نہیں کرسکتا۔اگر بنک براہ راست کاروبار کرسکتے تو دوسروں کو رقم دینے کے بجائے وہ خود انڈسٹری اور صنعت لگاتے۔خود تجارت یا زراعت یا دوسرے منصوبوں میں سرمایہ کاری کرتے اور اس سے ہونے والے نفع کا ایک حصہ رب المال کو یعنی کھاتے داروں کو ادا کرتے اور ایک حصہ خود بطور مضارب رکھتے۔بنک یہ عذر بیان کرتے ہیں کہ بینکاری کے قوانین، انتظامی تجربہ اور تجارتی رویے اور طور طریقے، ان میں سے کسی چیز کی رو سے وہ براہ راست کاروبار میں حصہ نہیں لے سکتے۔دنیا کے قوانین عام طور پر بینکوں کو براہ راست تجارت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔بنک کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے کہ یہ وہ ادارہ ہے جو قرضوں اور قابل بیع و شراء دستاویزات کا کاروبار کرتا ہو۔اب چونکہ بنک کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ قرضوں کا کاروبار کرتا ہے، قرضوں میں تجارت کرتا ہے۔اس لیے وہ اثاثوں کی تجارت نہیں کرسکتا۔

یہ عذر ممکن ہے ماضی میں کوئی وزن رکھتا ہو۔آج وزن نہیں رکھتا۔اوّل تو پاکستان کے قوانین کی حد تک خاصی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے قوانین میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔کمپنیوں کے آرڈیننس میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔جن کی رو سے بینکوں کو بڑی حد تک کم از کم اسلامی بینکوں کو ان قیود سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جو روایتی بینکاری پر عائد ہیں۔اس کے علاوہ

خود مغربی دنیا میں ایسے ادارے وجود میں آنے لگے ہیں جہاں بینکاری بھی ہو رہی ہے اور تجارت بھی ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مرچنٹ بینکنگ کا تجربہ خاصا کامیاب ہے۔ ہندوستان میں بھی اس پر عمل درآمد ہوا ہے۔ جرمنی اور ہندوستان اور کئی اور دوسرے ممالک کے تجربات پر علمی کام بھی ہوا ہے، کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جس میں مرچنٹ بینکنگ کے اس پورے تجربے پر ٹھوس انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اگر مرچنٹ بینکنگ کا یہ تجربہ جرمنی جیسے ملک میں، بھارت جیسی بڑی معیشت میں کامیاب ہوسکتا ہے تو آخر اسلامی بینکنگ کے لیے اس کو اختیار کرنے میں کیا رکاوٹ ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے بینکوں کے لیے بطور holding company کے کام کرنا دشوار بتایا جاتا تھا۔ اب بنک بطور holding company کے بھی کام کر سکتے ہیں۔ اپنے ماتحت کئی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے قوانین میں بیشتر رکاوٹیں اب ختم ہوگئی ہیں۔ بالفرض اگر یہ رکاوٹیں موجود ہوں، بالفرض اگر یہ سب کام نہ ہوسکتا ہو تو بھی مغربی دنیا میں ایسے تجربات ہوئے ہیں جن سے مضاربہ اور مشارکہ کے معاملے میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مغربی دنیا میں venture capital کے نام سے تجارت اور کاروبار کی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں۔ venture capital تقریباً وہی چیز ہے جس کو ہم مضاربہ کہتے ہیں۔ venture capital میں ایک sleeping partner ہوتا ہے جو ہمارے رب المال کے قائم مقام ہے۔ ایک فریق عامل یعنی انٹر پرینیئر ہوتا ہے جو مضارب کے قائم مقام ہے۔ ان دونوں میں تعلق کی نوعیت وہی ہے جو رب المال اور مضارب میں ہوتی ہے۔ اس لیے میرا ذاتی خیال یہ ہے جس کا میں کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں کہ venture capital کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مضاربہ کے نظام کو کامیابی کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ان چند انتظامی نوعیت کے معاملات اور مشکلات کے ساتھ ساتھ کچھ فقہی اور قانونی مسائل بھی ہیں جو جدید معیشت کو پیش ہیں۔ جن کا اسلامی معیشت کے نفاذ سے پہلے حل کیا جانا اور اس حل پر اتفاق رائے حاصل کیا جانا ضروری ہے۔ ایک اہم مسئلہ تو محدود ذمہ داری اور شخصیت اعتباری کا تھا۔ اس پر تو اب تقریباً اتفاق رائے ہو گیا ہے کہ اسلامی شریعت شخصیت اعتباری کے تصور کو تسلیم کرتی ہے۔ دور جدید کے فقہاء کی بڑی تعداد کی یہی رائے ہے۔ بیسویں صدی کے بڑے مشہور فقیہ اور صف اوّل کے قانون داں استاذ مصطفیٰ احمد زرقاء کا خیال تھا کہ شخصیت اعتباری

کا تصور فقہ اسلامی میں پہلے دن سے موجود ہے۔ وہ اس کے لیے بیت المال اور وقف کی مثال دیا کرتے تھے، کہ وقف کے متولی کی ذمہ داری وقف کی ذمہ داریوں تک محدود ہوتی ہے۔ اس کی ذات تک ممتد نہیں ہوتی۔ اسی طرح بیت المال کے متولی کی ذمہ داری بیت المال کے اموال تک محدود ہے، اس کی ذات تک اس کا اثر نہیں ہوتا مثلاً یعنی اگر بیت المال کے متولی نے بیت المال کے لیے کوئی قرضہ لیا ہے اور وہ قرضہ بیت المال ادا نہیں کر سکا تو اس قرضے کی ادائیگی کے لیے قرض خواہوں کو متولی کی ذاتی جائیداد پر نظر اٹھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ یہاں متولی کی ذمہ داری بیت المال کے اموال تک محدود ہے اور اس معاملے تک محدود ہے جو اس نے بیت المال کے لیے کیا ہے۔ یہ حکم واضح طور پر شخصیت اعتباری اور محدود ذمہ داری دونوں تصورات پر مبنی ہے۔ بیت المال کی شخصیت متولی کی شخصیت سے الگ سمجھی جاتی ہے۔ آج ایک شخص متولی ہے، کل دوسرا شخص متولی ہوگا۔ لیکن بیت المال کے معاملات، بیت المال کے حقوق، بیت المال کی آمدنی، کرایہ وصول کرنا، یہ معاملات متولی انجام دیا کرتا تھا۔ اس لیے ایک سطح پر شخصیت اعتباری کا تصور بھی موجود ہے اور محدود ذمہ داری کا تصور بھی موجود ہے۔ یہ دور جدید کے فقہاء کی غالب اکثریت کی رائے ہے۔ بعض حضرات اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ چنانچہ شام کے مشہور صاحب علم اور فقیہ شیخ سعید رمضان البوطی کی رائے میں شخصیت اعتباری، اور محدود ذمہ داری کا فقہ اسلامی میں کوئی تصور نہیں۔ ان کی رائے میں یہ دونوں تصورات فقہ اسلامی کے لیے نا قابل قبول ہیں۔

تیسرا اہم مسئلہ فیوچر سیلز کا ہے۔ جس کی آج کل بہت سی صورتیں مروّج ہیں۔ ایک اعتبار سے شریعت میں فیوچر کا تصور بعض شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے۔ اگر فیوچر سیل بیع سلم یا عقد استصناع کی حدود کے اندر ہو، یعنی وہ فیوچر سیل جس میں غرر یا قمار نہ پایا جاتا ہو، وہ جائز ہے۔ جس سیل میں غرر یا قمار یا دونوں پائے جائیں گے وہ جائز نہیں ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ ایک دو جملوں سے حل ہو جائے۔ آج کل فیوچر سیل کا دائرہ اتنا پھیلا دیا گیا ہے اور فیوچر سیل کی اتنی پیچیدہ اور متنوع شکلیں ہوگئی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں الگ الگ یہ طے کرنا پڑے گا کہ یہ بیع سلم کی حدود کے اندر ہے، یہ بیع سلم کی حدود سے باہر ہے، اس میں ربا پایا جاتا ہے یا نہیں پایا جاتا، قمار پایا جاتا ہے یا نہیں پایا جاتا، اس میں مبیع پر قبضہ مشتری کا ہو گیا ہے کہ نہیں۔ یہ ''لا تبع ما لیس عندك'' کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں، یہ مسائل اتنے آسان نہیں ہیں اور

ان پر اہل علم کی توجہ کی ضرورت ہے۔

فیوچر سیل کی ایک شکل غائب سودوں کی ہے کہ سودا آپ کے پاس موجود نہیں ہے۔ غائب ہے، نہ آپ کے قبضے میں ہے نہ ملکیت میں ہے، لیکن اس کے سودے ہو رہے ہیں، ہیں خرید و فروخت بھی ہو رہی ہے۔ اس کی بیشتر صورتیں نا جائز ہوں گی۔ Open Market Operations جن امور کو کہا جاتا ہے جو بنک وسیع پیمانے پر کرتے ہیں اور ہر ملک میں کرتے ہیں، ان میں سے بعض صورتیں نا جائز ہیں۔ اس لیے کہ ان میں بلوں کی ڈسکاؤنٹنگ ہوتی ہے۔ بلوں کی ڈسکاؤنٹ کی بہت سی صورتیں وہ ہیں جو شریعت میں جائز نہیں ہیں۔

یہ وہ معاملات ہیں جو اسلامی معیشت کو آج درپیش ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ جن حضرات نے شروع شروع میں موجودہ بنک کے سودی کاروباروں کے اسلامی متبادل تجویز کیے تھے انھوں نے زیادہ زور مضاربہ، مشارکہ، بیع سلم، عقد استصناع، اجارہ، بیع مرابحہ اور بیع مؤجل پر دیا تھا۔ مزارعہ اور مساقاۃ کو بھی سود کے اسلامی متبادل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بہت تفصیل سے کام ہوا ہے اور وسیع پیمانے پر ایسا لٹریچر سامنے آ گیا ہے جو آج کل کے تقاضوں کے مطابق، آج کل کی معاشی اور تجارتی اصطلاحات میں مرتب ہوا ہے۔ اس لٹریچر میں فقہ کے احکام کو بہت تفصیل کے ساتھ مرتب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ مضاربہ، مشارکہ، سلم، اجارہ، مرابحہ وغیرہ، ان سب پر درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ یہ کام زیادہ تر تو عربی میں ہوا ہے۔ اس کے بعد کسی حد تک انگریزی میں بھی مفید کام ہوا ہے اور بہت سا علمی مواد سامنے آیا ہے۔

اردو میں ان موضوعات پر زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ قدیم فقہی کتابیں جو اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، جو حال ہی میں وسیع پیمانے پر ہوئی ہیں وہ اس ضمن میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ وہ قدیم محاورے اور قدیم انداز میں لکھی گئی تھیں۔ فقہ کی کتابوں کا انداز مختلف جزئیات کو الگ الگ بیان کرنے کا ہے۔ وہاں کلیات کے طور پر بنیادی قواعد کو بیان کر کے بطور مثال ایک دو جزئیات بیان کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتابیں تالیف ہوئی تھیں اس زمانے کے لحاظ سے فقہاء نے یہ مناسب سمجھا کہ جزئیات زیادہ سے زیادہ فرض کر کے بیان کریں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں رائج معاملات کی جزئیات سوچ سوچ کر بیان کیں۔ آج ان میں سے بہت

سی جزئیات کام نہیں آسکیں گی۔اس لیے کہ آج وہ جزئیات نہیں پائی جاتیں۔آج نئی جزئیات سامنے آگئی ہیں۔اس لیے ایک غیر فقیہ تاجر کے لیے،ایک غیر متخصص کاروباری کے لیے ان قدیم جزئیات کو دورجدید کی جزئیات پر منطبق کرنا ممکن نہیں ہے۔اس لیے وہ لٹریچر جو قدیم کتابوں کے ترجمے پر مبنی ہے یا قدیم انداز میں لکھا گیا ہے وہ فقہ کے طلبہ،علماء اور متخصصین کے لیے تو مفید ہے لیکن ایک بینکار،تاجر یا صنعت کار کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

آج کی ضروریات کے لحاظ سے اسلامی معیشت کا علم از سرنو مدون کیا جانا ضروری ہے۔آج جس کو اسلامی معیشت یا اسلامی اقتصاد کہتے ہیں وہ ایک بالکل نئی چیز بھی ہے اور قدیم بھی ہے۔نئی اس اعتبار سے ہے کہ اقتصاد اسلامی یا اسلامی معیشت کی اصطلاح فقہاء کے یہاں موجود نہیں تھی،نہ اس فن اور عنوان سے انھوں نے فقہی احکام کو مرتب کیا۔امام زید بن علی،امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے زمانے سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک اسلامی معیشت یا اقتصاد اسلامی یا اسلامک اکنامکس Islamic Economics کی اصطلاح فقہ کی کسی کتاب میں استعمال نہیں ہوئی تھی۔ان موضوعات ومباحث کے لیے فقہاء نے فقہ المعاملات کی اصطلاح استعمال کی ہے،مالیات،عقود مالیہ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے بعض دوسری اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔لیکن آج جس کو علم اقتصاد کہا جارہا ہے اس میں اور فقہ المعاملات میں مطابقت یا تطابق کی نسبت نہیں ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فقہ المعاملات سارا کا سارا علم اقتصاد اسلامی ہے یا علم اقتصاد اسلامی فقہ المعاملات سے عبارت ہے۔ان دونوں میں اگر منطق کی اصطلاح استعمال کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہونی چاہیے۔فقہ المعاملات کی بہت سی تفصیلات اقتصاد اسلامی کا حصہ ہوں گی۔اقتصاد اسلامی کے بہت سے معاملات وہ ہوں گے جو فقہ المعاملات کی حدود سے باہر ہوں گے۔آج جس کو ہم علم اقتصاد اسلامی کہہ رہے ہیں وہ فقہ المعاملات کے علاوہ تصور مال،نظریہ مال اور کسی حد تک ان مباحث پر مشتمل ہوگا جو فقہائے اسلام کی اصطلاح میں اخلاقیات کا حصہ تھے۔علم الاخلاق کا حصہ تھے،حکمت عملی کا حصہ تھے،تدبیر منزل کا حصہ تھے،سیاست مدن اور سیاست شرعیہ کا حصہ تھے۔ان تمام موضوعات سے متعلق اس پورے مواد کو جمع کر کے جو آج کے تصورات اور تقسیم مباحث کی رو سے اقتصاد سے متعلق ہو ایک نئے انداز سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

قدیم اسلامی محاورے میں علم کا لفظ knowledge، ملکہ اور کسی فن کے بنیادی مسائل سے آگاہی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔اور سیاق وسباق سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں علم کا لفظ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔مجرد knowledge کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ملکہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یا کسی فن کے بنیادی مسائل سے واقفیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے یا تجربی علوم کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔یعنی سائنس کے لیے۔

افسوس ہے کہ آج ایسا نہیں ہوتا۔اب دنیائے عرب میں علم کا لفظ صرف سائنس کے عربی ترجمے کے استعمال ہوتا ہے، جو میری ناچیز رائے میں غلط ہے۔عرب دنیا کے جن اہل علم نے آج سے شاید سو سال پہلے یا اسی سال سے پہلے یہ طے کیا کہ سائنس کا ترجمہ علم کیا جائے۔میرا خیال ہے کہ انھوں نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔اب پچھلے ستر اسی سال یا سو سال کے مسلسل استعمال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک عام عرب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ علم سے مراد صرف تجربی علم ہے۔یا وہ علم ہے جس کو مغربی دنیا میں یا اردو میں سائنس کہا جاتا ہے۔جس کا تعلق صرف مشاہدے اور لیبارٹری کے تجربے سے ہوتا ہے۔اردو میں الحمدللہ علم کا لفظ اسی قدیم اسلامی مفہوم میں استعمال ہو رہا ہے، جس مفہوم میں پہلے استعمال ہوتا تھا۔

اسلامی معیشت یا اسلام کا مالیاتی نظام از سر نو قائم کرنا ایک دو دن کا کام نہیں ہے۔اس عمل کو بہت سے مراحل سے گزرنا ہے۔پہلے مرحلہ میں بہت سے ابتدائی اقدامات ضروری ہیں، بہت کچھ تیاری ضروری ہے، ذہنوں کی تیاری، میدان کی تیاری اس سفر کا پہلا قدم ہے۔جب کھیتی بوئی جاتی ہے تو پہلے زمین کو تیار کیا جاتا ہے۔یہ سب کام کرنے کے بعد، فکری تیاری کرنے کے بعد، ذہن سازی کرنے کے بعد، ضروری علمی پیش رفت کے بعد ہی پہیے کی حرکت شروع ہوتی ہے۔جب پہیہ کی حرکت شروع ہو جائے گی تو بہت جلد ایک درمیانی مرحلہ آئے گا۔اس کے تقاضے اور ہوں گے۔درمیانی مرحلہ جب انتہاء کے قریب پہنچے گا تو پھر آخری مرحلے کی تیاری کرنی ہوگی اور اس تیاری کے بعد پھر آخری مرحلہ آئے گا۔

ان سب مراحل میں کتنا وقت لگے گا۔کتنے، کسی نوعیت کے اور کن کن وسائل کی ضرورت ہوگی۔پھر بالآخر اس ساری کاوش کے کیا نتائج ہوں گے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔لیکن ان میں سے اکثر مراحل کی کامیابی کا دارومدار اخلاص، راست فکری، راست روی، تسلسل، حوصلہ

مندی اور آزادفکری پر ہے۔ اگران چھے میں سے ایک شرط بھی کمزوررہ گئی تو پھر تجربے کی کامیابی کی ضمانت دینا مشکل ہے۔ اخلاص میں کمی ہو، عمل میں تسلسل نہ رہے، جیسا کہ پاکستان میں ہوتا رہا ہے، حوصلہ مندی میں کمی ہو، جس کا ہمارے اکثر قائدین کے یہاں فقدان ہے اور آزادفکری نہ ہو، ذہنی غلامی کا بھوت ذہن پر سوار رہے تو پھر یہ مراحل آسانی سے پورے کیے جانے مشکل ہیں۔ آزادفکری اور راست روی کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ طے کریں کہ اسلامی معیشت، اسلامی مالیات اور اسلامی بینکاری کا ہمیں ایک نیا پیراڈائم تیار کرنا ہے، ہمیں ایک نئی سوچ اپنانی ہے۔ ایک نیا ڈھنگ تجارت ومعیشت کا اختیار کرنا ہے۔ اس امر پر ہم ذہنی، فکری اور قلبی طور پر مطمئن ہوں کہ جو نیا پیراڈائم ہم اپنا رہے ہیں یہ موجودہ مغربی سیکولر فریم ورک کے اندر رہ کر اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر موجودہ مغربی سیکولر فریم ورک کے اندر رہ کر اسلام کے نئے پیراڈائم کو اختیار کیا جائے گا تو اس کی حیثیت محض ایک پیوند سے زیادہ نہیں ہوگی۔

اگر آپ مغربی معیشت میں اسلام کا پیوند لگا دیں۔ جیسا کہ بہت سے ممالک میں اور بڑی حد تک پاکستان میں لا مذہب سیکولر مغربی تعلیم میں اسلامیات کا پیوند لگا ہوا ہے تو اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہمیں کسی سابقہ ڈھانچے کو جوں کا توں اپنا لینا ہے۔ شریعت نے کسی ڈھانچے کو کوئی تقدس عطا نہیں کیا۔ نہ کسی ڈھانچے کو دوام بخشا۔ دوام صرف اور صرف قرآن مجید کی نصوص، سنت کے احکام اور ان دونوں کی بنیاد پر مدون کیے جانے والے متفق علیہ احکام کو حاصل ہے۔ ان تینوں چیزوں کی بنیاد پر یعنی قرآن کریم کی نصوص، سنت مبارکہ اور امت مسلمہ کے متفق علیہ قواعد وضوابط کی بنیاد پر مسلمانوں نے وقتاً فوقتاً مختلف انداز کے ڈھانچے اپنائے۔ تجارت کا ڈھنگ اختیار کیا۔ کاروبار کے طریقے سوچے۔ آج ان میں سے کسی بھی طریقے کو، کسی بھی ڈھنگ یا کسی بھی ڈھانچے کو سو فیصد اپنا لینا شریعت کا حکم نہیں ہے۔

آج ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک وسیع تعمیری، تجدیدی، اجتہادی بصیرت سے کام لے کر مستقبل کی واضح منصوبہ بندی کریں۔ آج پوری امت مسلمہ کو مستقبل کے اس نئے تجدیدی منصوبے کی ضرورت ہے۔ نئی سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کے تجربے کو سامنے رکھ کر ہی مستقبل کی تعمیر نو ہوسکتی ہے۔ ماضی کی تمام علمی تفصیلات کو جوں کا توں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ شریعت کے احکام اور قواعد کی مکمل پابندی کی جائے اور

شریعت کے مقاصد اور اہداف کو مکمل طور پر پیش نظر رکھا جائے۔ اس ضمن میں ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم قدیم وجدید دنیا کے عملی تجربات سے پورا استفادہ کریں۔ اور آزاد فکری کے ساتھ دور جدید کے تجربات پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے ایک نیا ڈھنگ، ایک نیا ماڈل تیار کریں۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ آسان نہیں ہے۔ لیکن جب تک یہ کام نہیں ہوگا اسلامی معیشت کی حقیقی بحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ یہ ایک نامکمل نقشہ ہوسکتا ہے، پیوند ہوسکتا ہے۔ کسی سابقہ ڈھانچے کے احیاء کی ناکام اور نیم دلانہ کوشش ہوسکتی ہے۔ لیکن ایک نئے انداز کی، عالمگیر، زندگی سے بھر پور، کامیاب، شریعت کے احکام سے مکمل طور پر ہم آہنگ معیشت کا حصول اس طرح نہیں ہوسکتا۔ اس پورے کام کے لیے جب تک دنیائے اسلام کے تمام اہل علم فکری ہم آہنگی پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک یہ کام نہیں ہوسکتا۔

آج یہ بات ممکن نہیں ہے کہ پاکستان میں اسلامی معیشت کا ڈھنگ اور ہو، ملیشیا میں اور ہو، سعودی عرب میں کوئی تیسرا رنگ ہو، مصر مین کوئی چوتھا انداز ہو۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ آج ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے ماضی میں ایسا ممکن رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تین سو سال پہلے ایسا ہوسکتا ہو۔ لیکن آج نہیں ہوسکتا۔ آج کے مسائل عالمگیر مسائل ہیں۔ آج کے مسائل دنیائے اسلام کے مشترک مسائل ہیں۔ جو حل مصر میں سوچا جائے گا وہی حل پاکستان میں بھی سوچا جانا چاہیے۔ جو تجویز ملیشیا کے علماء سوچیں اس پر مصر اور سعودی عرب کے علماء کو بھی غور کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو رکاوٹیں ہیں وہ مشترک ہیں۔ مسائل مشترک ہیں۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک معاشی طور پر پسماندہ ہیں۔ بے روزگاری دنیائے اسلام میں عام ہے۔ افراط زر کا شکار بہت سے مسلم ممالک ہیں۔ ادائیگیوں میں عدم توازن بہت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان اسباب کی بناء پر نئی مجوزہ اسلامی معیشت کے تقاضوں پر عملدرآمد کے باوجود اگر معاشی کامیابی کے فنی تقاضوں اور جدید تجربات کو نظر انداز کیا گیا تو اس کوشش کی ناکامی کا قوی امکان ہے۔ یہ ناکامی اسلامی معیشت کی ناکامی نہیں ہوگی۔ لیکن مخالفین اس کو اسلامی معیشت کے کھاتے میں ڈالیں گے۔

اگر دنیائے اسلام میں کسی ملک کی کوتاہیوں کی وجہ سے، اس کے قائدین کی نااہلی کی وجہ سے، افراط زر کی شرح ناقابل برداشت ہے اور وہاں اسلامی معیشت کی کوئی کوشش اس لیے ناکام ہوتی ہے کہ افراط زر کنٹرول میں نہیں آرہا تھا، تو وہ اسلامی معیشت کی ناکامی نہیں ہوگی۔ وہ

افراط زر کی وجہ سے اس قیادت کی ناکامی ہوگی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مسائل کو یعنی معاشی پسماندگی، بے روزگاری، افراط زر، ادائیگیوں میں عدم توازن اور وہ دوسرے مسائل جن کا میں پہلے ایک مفصل گفتگو میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ ان کو فنی اعتبار سے دور کر کے، ان کا جو بھی تجرباتی یا فنی حل آج دنیا نے سوچا ہے اس کے مطابق ان کو حل کرتے ہوئے اسلامی معیشت کی طرف بڑھنا چاہیے۔

اسلامی معاشیات کی ماضی میں عملی صورتیں ایک سے زائد رہی ہیں۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ اسلامی معاشی تعلیمات پر عمل درآمد کی جو صورت مثلاً مراکش میں آج سے پانچ سو سال پہلے تھی وہی ہندوستان میں بھی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ کس کس ملک میں کس کس طرح کے انتظامی اقدامات اور تجربات کیے گئے۔ یہ ضروری ہے کہ بڑی بڑی مسلم حکومتوں کی معاشی پالیسیوں کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ فقہائے اسلام نے مالیات و معاملات کے جو احکام مدون کیے ہیں اور جیسے جیسے ان میں وسعت ہوتی گئی ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بیع، اجارہ، مضاربہ، مشارکہ، کفالہ وغیرہ کے بارے میں مختلف ادوار میں جو فتاویٰ دیے گئے وہ کیا تھے۔ فتاویٰ تو گویا کیس لاء کی ایک صورت ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں عام دینی، اخلاقی اور معاشرتی صورتحال کیا ہے اور معاشرہ کن مسائل سے ہے۔ یہ کام بڑی حد تک ہوا بھی ہے۔ خاص طور پر عرب ممالک کے اہل علم نے ان تمام موضوعات پر بھرپور تحقیق کی ہے۔ قدیم کتابیں کنگھال کر فقہ اسلامی پر عمل درآمد کے نئے نئے پہلو دنیا کے سامنے رکھ دیے۔ آج اس پورے کام سے استفادہ آسان ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے بنیادی ذمہ داری اس باب میں اہل پاکستان کی تھی۔ لیکن اہل پاکستان نے جہاں اور بہت سے معاملات میں کوتاہیاں کی ہیں جن کے نتائج آج ہم سب بھگت رہے ہیں وہاں اہل پاکستان نے اسلامی معیشت کے باب میں بھی شدید قسم کی مجرمانہ کوتاہی کی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان سب سے پہلا ملک تھا جس نے سرکاری طور پر اور اعلیٰ ترین سطح پر اسلامی تعلیم کی روشنی میں ایک نئے معاشی نظام کی ضرورت اور اہمیت کا احساس کیا۔ پاکستان سے پہلے کسی ملک نے سرکاری طور پر اتنی اعلیٰ سطح پر اس ضرورت کا احساس نہیں کیا تھا۔

میں ایک گفتگو میں عرض کر چکا ہوں کہ قائداعظم اور علامہ اقبال 1936، 1937 میں

اپنی مراسلت میں اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ نئی وجود میں آنے والی ریاست کا معاشی نظام کیا ہونا چاہیے۔ قائد اعظم کے حکم پر آل انڈیا مسلم لیگ نے 1941 میں ایک کمیٹی قائم کی تھی جس میں بڑے بڑے ماہرین معاشیات اور علماء شامل تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہر معیشت جو بعد میں ہندوستان کے صدر ہوئے وہ بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔ اس کمیٹی کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ نئی مجوزہ مسلم ریاست کے لیے معاشی نظام کی تفصیلات تیار کرے۔ پھر قائد اعظم نے 1948 میں اپنی زندگی کی جو آخری تقریر کی وہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب تھی جو یکم جولائی 1948 کو کی گئی تھی۔ اس تقریر میں قائد اعظم نے یہ کہا تھا کہ دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں نے دنیا کو مسائل اور مشکلات کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ آج ہمیں چاہیے کہ ہم اسلامی تعلیم کی روشنی میں ایک نیا متوازن اور معتدل نظام معیشت مرتب کریں تا کہ دنیا کو ان تمام مشکلات و مسائل سے نجات دلائی جا سکے جو ان دو معاشی نظاموں نے دنیا کو دیے ہیں۔ اس تقریر میں قائد اعظم نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اپنے یہاں تحقیق کا ایک شعبہ قائم کریں جو اس موضوع پر تحقیق کا کام شروع کرے۔ ان کو اس کام سے اتنی دلچسپی تھی کہ انھوں نے کہا تھا کہ آپ جو تحقیقات کریں مجھے بھی اس سے مطلع کرتے رہیں تا کہ مجھے پتا چلے کہ آپ کیا کام کر رہے ہیں۔

پھر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خان نے 1949 میں اس ضرورت کا احساس کیا۔ پاکستان کے دساتیر کی مثال میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ اگر پاکستان میں اسلامی معاشیات کی تدوین کا کام ویسی ہی دلچسپی اور زور شور سے ہوتا جس دلچسپی سے دنیائے عرب کے اہل علم نے پچھلے پچیس تیس سال سے یہ کام شروع کیا ہے، اگر پاکستان کے اہل علم سنہ 47، 48 سے یہ کام شروع کرتے تو آج بہت جلد یہ نقشہ ہمارے سامنے آ سکتا تھا۔

ہماری اس کوتاہی اور تقصیر کے باوجود بہر حال دنیائے اسلام کے اہل علم نے اس میدان میں بہت مفید اور وقیع علمی کام کیا۔ ان اہل علم نے فقہائے اسلام کے کام اور معاشیات کے مسائل سے اعتنا کیا اور دور جدید میں معاشیات کے نام سے جو فن وجود میں آیا اس کو سامنے رکھ کر فقہائے اسلام اور مفکرین اسلام کی تحقیقات کو نئے انداز سے مرتب کر دیا ہے اور یوں اسلامی معاشیات کی تدوین کی ضرورت کا احساس جو پیدا ہوتا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام بھی وسیع پیمانہ پر شروع ہو گیا۔ یہ کام برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا اور یہ کہنے میں غالباً کوئی

مضایقہ نہیں کہ بیسویں صدی کے وسط تک اسلامی معاشیات کے نام سے ایک نئے فن کا بیج ڈال دیا گیا۔

اس کام کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کی نشاندہی کی جائے وہ نشاندہی ہوگئی۔ حرمت ربا کی حکمتوں کو بیان کیا جائے، وہ حکمتیں بیان ہوگئیں۔ اسلام کے عدل اجتماعی کے تصور اور احکام کو نمایاں کیا جائے، وہ بڑی حد تک نمایاں کر دیے گئے۔ مغرب کے معاشی نظام کے تنقیدی مطالعے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ مغربی فکر کے تنقیدی مطالعے کی ضرورت کا احساس دنیائے اسلام میں سب سے پہلے علامہ اقبال کو ہوا۔ انھوں نے خود بھی اس کام میں حصہ لیا۔ ان کا اپنا میدان، فلسفہ اور عقلیات تھا۔ اس لیے انھوں نے فلسفہ اور عقلیات تک ہی اپنی توجہ ملحوظ رکھی۔ لیکن انھوں نے بار بار اس طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ کام قانون اور معیشت کے میدان میں بھی کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے متعدد اہل علم نے یہ کام کیا اور یہ بات مجھے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان کے دو انتہائی نامور اور قابل فخر سپوتوں نے یہ کام بہت بھرپور انداز میں کیا۔ میری مراد مرحوم پروفیسر شیخ محمود احمد اور ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا کی صحت اور عمر میں برکت دے۔ ان دونوں حضرات نے مغربی معاشی فکر کے تنقیدی مطالعے پر جو کام کیا ہے وہ انتہائی فاضلانہ، عمیق اور وقیع ہے اور میری ناچیز رائے میں ان دونوں فضلاء کے کام کی وہی حیثیت اسلامی معاشی فکر کی تاریخ میں ہوگی جو اسلامی عقلیات کی تاریخ میں امام غزالی اور امام رازی کے کام کی ہے۔

اسلامی معاشیات کی تدوین کا یہ پہلا مرحلہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1901 سے شروع ہو کر 1970 تک رہا۔ یہ زمانہ اکثر و بیشتر اسلامی شریعت کی دعوت و تبلیغ کا زمانہ ہے۔ اسلامی معاشیات کی دعوت، اسلامی معاشی تعلیمات کی تبلیغ اس دور کا طرہ امتیاز رہا۔ اسلام کے معاشی نظام کا وجود تسلیم کرانا اور یہ منوانا کہ اسلام معاشیات کے باب میں بھی رہنمائی عطا کرتا ہے اس دور کا سب سے مفید کام ہے۔ یہ کوئی کم اہم کام نہیں تھا۔ دورجدید کے تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد یہ تسلیم ہی نہیں کرتی تھی کہ مذہب معیشت میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ لیکن الحمدللہ اب یہ بات پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ اسلام نے معاشیات کے باب میں بھرپور رہنمائی دی ہے۔ اس رہنمائی کو نئے انداز سے مرتب بھی کر دیا گیا ہے اور آج پوری دنیا میں، مشرق و مغرب میں، اہل

علم کی بڑی تعداد نے اس کو تسلیم کرلیا ہے کہ اسلامی معاشیات کے پاس جدید اقتصادی امراض کا مؤثر علاج موجود ہے۔ اس علاج کی سب سے اہم دوا یہ ہے کہ معاشی زندگی سے جلد از جلد سود کو ختم ہونا چاہیے۔

سود کی خرابیاں بے شمار ہیں جن پر بھرپور کام ہوا ہے۔ اسی دور میں یعنی 1901 سے 1970 تک بلاسودی بینکاری کے ابتدائی خاکے بہت سے سامنے آئے۔ جن میں پاکستان کے اہل علم نے بھرپور حصہ لیا۔ اس دور میں کمیونزم کے مقابلے میں اسلامی تعلیم کی برتری ثابت کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی گئی اور وہ کامیاب رہی۔ متعدد مسلم ممالک میں اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اس مضمون کا نوٹس لیا گیا۔ چنانچہ پاکستان، سعودی عرب اور متعدد دوسرے ممالک میں یونیورسٹیوں میں دینیات کی اعلیٰ ترین تعلیم میں اسلامی معاشیات کے مضامین شامل کیے گئے۔ جس سے اس مضمون کو مزید مرتب کرنے میں اور ان تصورات کو مزید واضح اور نمایاں کرنے میں مدد ملی۔

اس مرحلے میں یعنی 1970 تک کے مرحلے میں مغربی افکار پر تنقید نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ کوشش یہی ہوتی رہی کہ مغربی تصورات کے سیاق وسباق میں اسلامی تعلیم پر عمل درآمد کی کوشش کی جائے۔ اور جہاں جہاں اسلام کا پیوند لگ سکتا ہو لگا دیا جائے۔ میں پیوندکاری کے اس عمل کو کسی منفی انداز میں بیان نہیں کررہا۔ یہ ایک مرحلہ تھا جو نا گزیر تھا۔ اس پیوندکاری کی وجہ سے اس ضرورت کا احساس بیدار رہا۔ پیوندکاری کے معنی یہ ہیں کہ پیوند لگانے والے نے یہ محسوس کرلیا ہے کہ اس کے لباس میں کوئی کمزوری اور خامی ہے جس کو شریعت پورا کرسکتی ہے۔ یہ احساس پیدا ہونا ہی بڑی کامیابی تھی۔

اس سے قبل انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بعض علمائے کرام کے فتاویٰ میں بھی متعدد جدید معاشی مسائل کا تذکرہ ہوا۔ متعدد علماء کرام نے اپنی فہم کے مطابق ان مسائل کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ان حضرات کی فہم شریعت تو بلاشبہ قابل اعتماد تھی لیکن ان کی فہم معاشیات کسی براہ راست مطالعہ پر مبنی نہ تھی۔ جدید بینکاری وغیرہ کے مسائل و مشکلات کو جس انداز سے کسی مستفتی نے بیان کیا اس کو سامنے رکھ کر انھوں نے مسئلہ کا وقتی حل تجویز کردیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فتاویٰ ایک دفاعی کوشش کے مترادف تھے۔ ان فتاویٰ کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی مثالی یا آئیڈیل صورتحال کی بات کرتے ہیں۔ ان فتاویٰ میں جن کا

بعض حضرات آج ذکر کر کے بنک انٹرسٹ کا راستہ کھولنا چاہتے ہیں بعض جید ترین اہل علم کے فتاویٰ بھی شامل ہیں لیکن ان میں سے بہت سے فتوے آج قابل عمل اس لیے نہیں ہیں کہ انھوں نے اس دور میں کسی آئیڈیل مسلم معاشرے یا کسی آزاد مسلم ملک• کے نظام کے سیاق وسباق میں وہ فتوے نہیں دیے تھے۔ بلکہ انھوں نے ایک استعماری دور کے حالات سے عارضی طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عارضی اور وقتی حل تجویز کر دیا تھا۔لیکن آج دنیائے اسلام اس دور سے آگے جا چکی ہے۔اس لیے ایسے فتاویٰ کی بنیاد پر اسلامی معاشیات کی تشکیل کی کوشش اور اس پر عمل درآمد کرنے سے یا اس پر اصرار کرنے سے مزید مسائل پیدا ہوں گے اور پیوند کاری کا وہ رجحان پیدا ہوگا جس کو فقہائے اسلام نے تلفیق کے نام سے یاد کیا ہے۔تلفیق یعنی بے جوڑ پیوند کاری نئے مسائل اور نئی مشکلات کو جنم دیتی ہے۔اس سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

اس دور میں سب سے مؤثر آواز جو اٹھی وہ الاخوان المسلمون کی آواز تھی امر واقعہ یہ ہے کہ عرب دنیا میں جس تیزی سے مغربیت، عرب قومیت اور لامذہبیت کے بھوت نے سر اٹھایا تھا اس بھوت کا سر کچلنے میں الاخوان المسلمون کے اہل علم کا بنیادی حصہ ہے۔استاد حسن البنا شہید نے اپنی شہادت سے چند مہینے قبل ایک مشہور رسالہ تحریر کیا تھا۔اس کا عنوان تھا ''مشکلا تنا فی ضوء النظام الاسلامی''۔ یہ عرب دنیا میں دور جدید میں اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کے حق میں اٹھنے والی سب سے مؤثر آواز تھی۔اس کا انداز عملی تھا۔اسلوب داعیانہ تھا اور طریق کار عوامی تھا۔یہی وجہ ہے کہ مصر کے مسائل کے پس منظر میں اس گفتگو کا بہت اثر ہوا۔اسی زمانے میں سید قطب نے اپنی کتاب ''العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام'' لکھی۔ اگرچہ اس کتاب کے بعض مندرجات کے بارے میں بعض مخلص اہل علم کو کچھ تحفظات رہے ہیں۔لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ یہ اس دور کے ماحول میں انتہائی جرأت مندانہ اور انتہائی مجاہدانہ کام تھا جس نے مغرب زدہ ذہنوں کی متعدد الجھنوں کو صاف کرنے میں بہت مؤثر کردار ادا کیا۔

یہ پیوند کاری کی جو بات میں نے ابھی کی ہے اس سلسلے میں یہ عرض کرنا شاید بے محل نہیں ہوگا کہ ایک حد تک پیوند کاری کا مرحلہ ناگزیر ہے۔ یہ مرحلہ ہر دور اور ہر میدان میں پیش آیا ہے۔علم کلام میں بھی یہ مسئلہ پیش آیا۔فلسفہ اسلام میں بھی پیش آیا۔تصوف بھی اس سے بری نہیں رہا۔اس لیے کہ یہ ایک عارضی اور وقتی حل تھا جو متکلمین اسلام نے اختیار کیا۔فلاسفہ نے اختیار کیا۔

بعض صوفیاء نے بھی اپنایا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ مرحلہ گزر گیا۔ اور وہ پیوند کاری جو علم کلام کی بعض تحریروں میں شروع میں نظر آتی ہے یا بعض فلاسفہ کے یہاں نظر آتی ہے وہ بہت جلد ختم ہو گئی، اور متکلمین اسلام نے جلد ہی خالص اسلامی علم کلام کی داغ بیل ڈال دی۔ فلاسفہ اسلام نے فلسفہ اسلام کی داغ بیل ڈالی اور مسلمان اس پیوند کاری کے عمل سے بہت جلد گزر گئے۔ وہ دور مسلمانوں کی آزادی فکر کا دور تھا۔ وہ دور اسلامی تہذیب کی اٹھان کا دور تھا۔ اس لیے پیوند کاری کا یہ مرحلہ بھی مختصر رہا۔ آج یہ مرحلہ کب تک جاری رہتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن ایک نہ ایک دن یہ مرحلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

اسلامی معاشیات کی تدوین کا دوسرا مرحلہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1970 کے لگ بھگ شروع ہوا۔ اس مرحلے میں اسلامی معاشیات کی فنی تدوین بھی ہوئی۔ بہت سے اہل علم نے اسلامی معاشیات پر خالص فنی انداز میں قابل ذکر کام کیا۔ فقہ اسلامی کے ذخائر سے بھرپور مدد لی گئی۔ مزید مواد کی نشاندہی ہوئی۔ سب سے زیادہ اہم کام جو اس دور میں ہوا وہ یہ تھا کہ اسلام کے معاشی احکام وقواعد کا مغربی افکار سے بھرپور تقابل کیا گیا۔ مغربی افکار کی کمزوریاں واضح کی گئیں۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے اسلام کا تقابلی مطالعہ ہوا۔ مرعوبین کا گروہ وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا۔

اس دور میں ہی جدید ماہرین معاشیات کی ایک قابل ذکر تعداد سامنے آئی ہے جو معاشیات کے فنی معاملات میں اعلیٰ ترین درجے کی مہارت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشی تعلیمات سے بھی پورے طور پر واقف ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان ماہرین کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ پھر ایسے جدید ماہرین شریعت بھی بڑی تعداد میں سامنے آئے ہیں جنھوں نے شریعت کی مہارت کے ساتھ ساتھ جدید مغربی معیشت سے بھی واقفیت پیدا کی ہے۔ عرب دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں ایسے نوجوان محققین موجود ہیں جن کے تحقیقی مقالات اگرچہ شریعت اور فقہ کے میدانوں میں ہیں۔ لیکن جدید معاشیات سے ان کی واقفیت پہلے کے علمائے فقہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

ان سب کے باوجود ایسے جامع لوگوں کی کمی کا اب بھی احساس ہوتا ہے جو جدید معاشی تصورات پر گہری ناقدانہ نظر بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے تمام ذخائر سے مجتہدانہ انداز میں

واقف بھی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک یہ رجحان ہمارے یہاں موجود ہے کہ جو چیز مغرب میں چلتی ہوئی محسوس ہو اس کو بغیر سوچے سمجھے اسلام میں ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ آج وہاں ایک چیز کا چلن ہے تو اس کو ثابت کریں کہ اسلام میں بھی یہ چیز پہلے سے موجود تھی۔ کل کسی اور چیز کا چلن ہو تو اس کو ثابت کرنے کے پیچھے لگیں۔ یہ ایک منفی رجحان ہے۔ یہ رجحان اور انداز شکست خوردگی کا غماز ہے اور اس سے بہت سے نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔

اس دوسرے مرحلے میں جو سنہ 70 کے بعد سے شروع ہوا اور کم از کم ڈیڑھ دو عشرے جاری رہا عملی تیاری بھی بڑے پیمانے پر کی گئی۔ بہت سی عملی تفصیلات تیار ہوئیں۔ سرکاری اداروں اور حکومتوں کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ حکومتوں کا رویہ بھی متعدد ممالک میں ہمدردانہ رہا۔ پاکستان، سعودی عرب، مصر، ملیشیا، سوڈان اور دوسرے بہت سے ممالک میں حکومتوں کی سرپرستی اور رہنمائی یا کم از کم عدم مخالفت کی وجہ سے خاصا کام کرنے کے مواقع ملے۔ یونیورسٹیوں میں بڑے پیمانہ پر تحقیقی مقالات تیار ہوئے۔ مختلف مسلم ملکوں کے تعلیمی نصابوں میں اسلامی معاشیات کے مضامین بھرپور انداز میں شامل کیے گئے۔ کئی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں اسلامی معاشیات کے شعبے قائم کیے گئے۔ جن میں مصر کی مشہور جامعہ ازہر، جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، پاکستان کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نمایاں ہیں۔ یہ دور پاکستان کے قائدانہ کردار کا دور ہے۔ اسی دور میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ آئی جو اپنے موضوع پر ایک منفرد رپورٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومت نے اس رپورٹ میں شامل تجاویز پر عمل درآمد کا اعلان بھی کیا اور عمل درآمد شروع بھی ہوا۔ اسی دور میں بہت سے حقیقی اور ٹھوس اسلامی معاشیین بھی سامنے آئے۔ شیخ محمود احمد اور ڈاکٹر عمر چھاپرا کی مثال میں دے چکا ہوں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر انس زرقاء، منذر قحف، ڈاکٹر عبدالرحمٰن یسری اور متعدد اہل علم شامل ہیں۔ جن علماء کو اقتصاد اسلامی سے دلچسپی تھی ان میں اور ان ماہرین معاشیات میں جو شریعت سے واقفیت رکھتے تھے، روابط قائم ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان گہرا تعلق و تعاون شروع ہوا۔ اور اس ضرورت کا احساس ہوا کہ علمائے کرام کو ماہرین معاشیات کی مدد کا فراہم کیا جانا ضروری ہے۔ ماہرین معاشیات کے حلقوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ علماء کرام کی رہنمائی اور مشورہ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ چنانچہ متعدد جامعات میں ایسے شعبے قائم کیے گئے جن میں ان دونوں مہارتوں کو یکجا کیا گیا۔

یہ دوسرا مرحلہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی کے عشرے کے اواخر تک جاری رہا۔اس کے بعد تیسرا مرحلہ شروع ہوا جس میں اہل پاکستان پیچھے رہ گئے۔اور دنیائے اسلام کے دوسرے مما لک ہم سے کہیں آگے نکل گئے۔ اس دور میں جو فکری اور علمی کام ہوا وہ بہت وقیع تھا۔ اسلامی معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر مثلاً بیمہ،ربا،مضاربہ،مشارکہ،ملکیت ، زکوۃ، مال ان سب موضوعات پر الگ الگ ،ٹھوس اور گہری تحقیقات سامنے آئیں۔اور یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلامی معیشت میں ایسے امتیازی خصائص موجود ہیں جو اس کو دوسری معیشتوں سے ممتاز اور منفرد بناتے ہیں۔اس دور میں اسلامی معاشی تعلیمات کو ایک نئے مستقل بالذات نظام کے طور پر دنیا میں تسلیم کیا جانے لگا۔بہت سی مغربی یونیورسٹیوں میں اسلامی معیشت کے شعبے قائم ہو گئے۔امریکہ میں، برطانیہ میں، یورپ کے متعدد مما لک میں اسلامی معاشیات کے ماہرین سامنے آئے جو اسلامی معاشیات کے موضوعات سے فنی دلچسپی رکھتے ہیں۔خود مغربی غیر مسلم ماہرین معیشت نے اسلامی معاشیات سے واقفیت پیدا کی۔ان میں سے بعض کی تحریریں اسلامی معاشیات پر بہت ٹھوس تحریریں ہیں۔

اس دور کے مسلم ماہرین معیشت نے بالعموم اور ان حضرات نے بالخصوص جو اصلاً شریعت کے متخصص تھے۔معیشت اور اخلاق،معیشت اور عقائد،معیشت اور شریعت،ان دونوں کے درمیان ربط کو نمایاں طور پر بیان کیا۔یہ اس لیے ضروری تھا کہ مغرب نے معیشت و اخلاق کا رشتہ منقطع کر دیا ہے۔معیشت اور مذہب کے تعلق کو توڑ دیا ہے۔معیشت اور معاشرت کے گہرے روابط وہاں کمزور ہو چکے ہیں۔یہ بات مسلم ماہر معیشت نے نمایاں کی کہ اسلام کا معاشی نظام شریعت کے احکام کا ایک حصہ ہے۔احکام شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔اسلام کے عمومی مقاصد اور اہداف سے اس کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔اگر شریعت کے عمومی مقاصد اور اہداف اسلامی معیشت کے ذریعے پورے ہو رہے ہیں تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ معیشت کا جو نظام سوچا گیا ہے وہ شریعت کے احکام کے مطابق ہے۔اور اگر وہ مقاصد پورے نہیں ہو رہے تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظام جس پر گزشتہ ستر اسّی سال کے دوران غور وخوض ہوا ہے ابھی مزید نظر ثانی کا محتاج ہے۔

دور جدید کے اہم معاشی مسائل میں بیمہ اور انشورنس کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ بیمہ اور

انشورنس کا تصور تو بہت قدیم ہے، اور کئی ہزار سال سے قائم ہے۔ حمورابی کے قانون میں جو آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں عراق میں نافذ العمل تھا یہ تصور موجود تھا۔ اگر وہاں کسی کے گھر میں چوری ہو جاتی تھی تو پورا گروہ یا جماعت مل کر تعاون کرتی تھی اور جس کے یہاں چوری ہوتی تھی اس کی مدد کرتی تھی اور یوں اس کے نقصان کی تلافی ہو جایا کرتی تھی۔

بیمہ اور انشورنس کا اصل محرک شرعاً قابل اعتراض نہیں ہے۔ یہ بات کہ اگر ایک شخص کو معاشی پریشانی کا سامنا ہو یا مالی مشکلات پیش آئیں تو دوسرے لوگ مل کر اس کی مدد کریں۔ یہ تصور شریعت میں پسندیدہ ہے اور شریعت کے احکام کے عین مطابق ہے۔ ایک حد تک یہ تصور اسلام میں پہلے دن سے موجود ہے۔ عاقلہ کے احکام احادیث میں تفصیل کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ عاقلہ کے معنی یہی ہیں کہ کسی شخص پر اس کی کسی غلطی کے بغیر، کسی جرم کے بغیر، یا محض بھول چوک سے کوئی تاوان مثلاً دیت یا ضمان عائد ہو جائے تو پوری برادری یا قبیلہ یا بستی کے لوگ مل کر اس کو ادا کریں۔ یہ تصور اس میثاق مدینہ میں بھی موجود ہے جس کو اسلام کا پہلا تحریری دستور قرار دیا گیا ہے اور بعض اہل علم نے اس کو دنیا کی تاریخ کا پہلا تحریری دستور بھی قرار دیا ہے۔ اس میں یہ بات موجود ہے کہ عاقلہ کا جو نظام قریش میں پہلے سے موجود تھا وہ بدستور جاری رہے گا۔ جس جس قبیلے میں عاقلہ کا جو نظام موجود تھا وہ اسی طرح موجود رہے گا اور ہر گروہ رائج الوقت معروف طریقے اور انصاف کے مطابق اپنے مقروضوں کا قرض ادا کرتا رہے گا۔ خود قرآن مجید میں زکوٰۃ کی مدات میں ایک اہم مد غارمین کی رکھی گئی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص مقروض ہو تو اس کا قرض زکوٰۃ سے ادا کر دیا جائے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہو سکتا ہے کہ یہ تصور شریعت میں پسندیدہ ہے کہ ایک مصیبت زدہ کی مصیبت میں اس کی مدد کی جائے۔ بشرطیکہ یہ مدد شریعت کے احکام کے مطابق ہو۔ مغرب میں جو تصور بیمہ کے نام سے شروع ہوا اس سے مسلمانوں کا واسطہ اس وقت پڑا جب اہل مغرب سے سمندری تجارت وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ چونکہ مغربی دنیا میں صنعت کاری وسیع پیمانے پر ہو رہی تھی اس لیے ان کے یہاں سے وسیع پیمانے پر سامان تجارت آتا تھا۔ ان کی مصنوعات دنیائے اسلام میں آتی تھیں۔ وہاں سے جو تاجر یا صنعت کار اپنی مصنوعات بھیجتا تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ اس

کے ممکنہ نقصانات کی تلافی کا پہلے سے انتظام ہو جائے۔اس طرح مغربی تاجروں سے تجارت کے ذریعہ اس تصور سے مسلمان بھی واقف ہوئے۔

فقہائے اسلام میں سب سے پہلے جس نے اس پر توجہ دی وہ علامہ ابن عابدین ہیں جو اپنے زمانے کے غالباً سب سے بڑے حنفی فقیہ تھے۔اور متاخرین فقہائے احناف میں ان کا بہت اونچا درجہ ہے۔انھوں نے اس کے لیے سوکرہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ غالباً سکیورٹی کا معرّب ہے اس طرح کا کوئی لفظ کسی مغربی زبان میں ہوگا اس کو انھوں نے عربی میں سوکرہ کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ان کی کتاب ردالمحتار میں اس کا تذکرہ ہے اور انھوں نے اس معاملے کو غیر مشروع اور حرام قرار دیا ہے۔یعنی اس صورت کو جو ان کے زمانے میں یورپ میں رائج تھی، اس کو انھوں نے حرام قرار دیا۔

دنیائے اسلام میں جب سے بیمہ کاری کا عمل شروع ہوا اس پر اہل علم غور کرتے رہے۔ شروع میں بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ بیمہ کی تمام شکلیں جائز ہیں۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے غور وخوض ہوتا گیا، بیمہ کاری کی عملی تفصیلات واضح ہوتی گئیں، بیمہ کے رائج الوقت قوانین سے آگاہی ہوتی گئی۔ بیمہ کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر بھی واضح ہوتا گیا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ تعاونی بیمہ یعنی Cooperative Insurance جائز ہے۔ Cooperative Insurance یعنی تعاونی بیمہ کے جواز کے بارے میں رابطہ عالم اسلامی کے مجمع الفقہ نے ،قاہرہ میں علمائے اسلام کی کانفرنس نے 1965 میں اور سعودی عرب میں وہاں کے علماء کی سب سے بڑی جمعیت ھیئۃ کبار العلماء نے ،ان سب نے فیصلہ کیا کہ تعاونی بیمہ یعنی Cooperative Insurance جائز ہے۔اس لیے کہ اس میں نہ غرر پایا جاتا ہے، نہ ربا پایا جاتا ہے، نہ قمار پایا جاتا ہے۔لیکن تجارتی بیمہ کے بارے میں علمائے کرام کی غالب ترین اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ یہ ناجائز اور حرام ہے۔اس لیے کہ اس میں ربا بھی پایا جاتا ہے،قمار بھی پایا جاتا ہے اور غرر بھی پایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے 1991، 1992 میں ایک رپورٹ تیار کی تھی جس میں اتفاق رائے سے یہ قرار دیا گیا تھا کہ تجارتی بیمہ شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔اس لیے کہ اس میں ربا، قمار اور غرر تینوں خرابیاں پائی جاتی ہیں۔اس رپورٹ میں اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک متبادل نقشے کا خاکہ بھی تجویز کیا ہے۔ یہ خاکہ بہت مختصر تھا۔لیکن

عام طور پر علمائے اسلام نے اس خاکے سے اتفاق کیا۔

دنیائے اسلام کے دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں اسلامی بیمہ کاری پر غور وخوض ہوا۔ تأمین اور تکافل کے نام سے ادارے بنے۔ وہاں اسی رپورٹ سے ملتی جلتی اور اس کے قریب قریب تجاویز مرتب کی گئیں۔ چنانچہ ملیشیا میں، سوڈان میں، مصر اور ایران میں اور دوسرے متعدد ممالک میں تکافل کے نام سے متعدد ادارے وجود میں آئے ہیں۔ تکافل کے یہ ادارے بنیادی طور پر اسی تصور پر مبنی ہیں جو اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رپورٹ میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں کوشش کی گئی تھی کہ بیمہ کاری کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا نقشہ تجویز کیا جائے جس میں نہ غرر پایا جاتا ہو، نہ ربا پایا جاتا ہو، نہ قمار پایا جاتا ہو۔ یہ وہ رائے ہے جو علمائے کرام کے غالب ترین اکثریت کی ہے۔ اکا دکا اہل علم اب بھی ایسا سمجھتے ہیں کہ تجارتی بیمہ جائز ہے اور اس میں نہ غرر پایا جاتا ہے، نہ قمار پایا جاتا ہے، نہ ربا پایا جاتا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی بیمہ کاری کا کام بھی کسی حد تک شروع ہو گیا ہے اور تکافل کے قوانین اور قواعد بھی وضع کیے جا چکے ہیں۔ ان قوانین اور قواعد کو وضع کرنے میں نمایاں حصہ جسٹس میاں محبوب احمد نے لیا جو پاکستان کے صف اوّل کے قانون دانوں میں سے ہیں اور لاہور ہائی کورٹ اور وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس بھی رہے ہیں۔ ان کی نگرانی اور سربراہی میں یہ قواعد وضوابط تیار کیے گئے ہیں۔ اور ان قواعد وضوابط کی بنیاد پر حکومت پاکستان نے اجازت دی ہے اور اب تکافل کی کمپنیاں بھی وجود میں آ رہی ہیں۔

بیمہ کے ساتھ ساتھ ایک اہم مسئلہ جس کا ابھی تک قابل عمل اور شریعت کے اعتبار سے قابل قبول حل مکمل طور پر سامنے نہیں آ سکا۔ وہ Re-Insurance کا معاملہ ہے۔ ری انشورنس سے مراد یہ ہے کہ بڑی بڑی انشورنس کمپنیاں اپنے انشورنس کے معاملات کی بھی انشورنس کرواتی ہیں۔ یہ ری انشورنس یعنی بیمہ کا بیمہ کی بہت بڑی بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ ابھی تک ری انشورنس کی کوئی قابل ذکر اور بڑی کمپنی دنیائے اسلام کے کسی ملک میں موجود نہیں ہے۔ ری انشورنس کے لیے بعض جدید ماہرین نے ری تکافل کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انگریزی میں تکافل اور ری تکافل کا لفظ اب عام استعمال ہونے لگا ہے۔ عرب دنیا میں اس کو تأمین اور اعادۃ التأمین یا تکافل اور اعادۃ التکافل کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ معاملہ ابھی تک زیر غور ہے اور علمائے کرام وقتاً فوقتاً اس پر غور کرتے رہتے ہیں، تجاویز بھی دیتے ہیں۔لیکن یہ معاملہ علمائے کرام کی تجاویز سے زیادہ حکومتوں کی توجہ کا مستحق ہے۔حکومتیں جب تک توجہ نہیں دیں گی ری تکافل کے بڑے بڑے ادارے دنیائے اسلام میں وجود میں نہیں آسکیں گے۔اگر وہ بڑی بڑی مسلم حکومتیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وسائل سے نوازا ہے مل کر توجہ دیں تو ری تکافل کے چند مؤثر اور بڑے بڑے ادارے دنیائے اسلام میں آسانی کے ساتھ قائم کیے جاسکتے ہیں۔آج دنیائے اسلام اسلامی معیشت کے باب میں کہاں کھڑی ہے؟اس کا کچھ اندازہ اس گفتگو سے ہوگیا ہوگا جو آج میں نے آپ کے سامنے کی ہے۔

یہ انتہائی مختصر خلاصہ ہے اس صورتحال کا جو اس وقت اسلامی معیشت اور اسلامی بینکاری کو درپیش ہے۔ان محاضرات کے محدود وقت اور ان کے مجموعے میں دستیاب محدود صفحات میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش شاید نہیں ہے۔اس موضوع پر میں نے ایک اور گفتگو آج سے چند سال پہلے کراچی کے جامعۃ الرشید میں کی تھی۔وہ بھی مرتب ہوکر شائع ہورہی ہے۔اس گفتگو میں پاکستان میں اسلامی معیشت اور اسلامی بینکاری کے بارے میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا تھا۔اس لیے اس گفتگو میں انھی گزارشات پر اکتفا کرتا ہوں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بارھواں خطبہ

اسلامی معاشیات کا مستقبل

بارہواں خطبہ

اسلامی معاشیات کا مستقبل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین

برادرانِ محترم،

خواہرانِ مکرم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے ''اسلامی معاشیات کا مستقبل''۔ اس سلسلہ کی اس آخری گفتگو میں چند گزارشات اس موضوع پر پیش کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی مسلم ملک میں آج کے ماحول اور آج کے سیاق وسباق میں اسلام کی معاشی تعلیمات کا مکمل نفاذ کیا جائے تو اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوں گے ان کی نوعیت کیا ہوگی اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

یہ اقدامات جو اسلامی معیشت کے نفاذ کے لیے کیے جانے چاہئیں ان کو دو بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک عنوان کے بارے میں مختصر طور پر اشارہ کروں گا۔ جب کہ دوسرے عنوان پر ذرا تفصیل سے گزارشات پیش کروں گا۔

پہلا عنوان وہ انتظامی تدابیر اور تجرباتی معاملات ہیں جن کا تعلق کسی بھی ملک میں معاشی ترقی اور اقتصادی ترقی کے انتظامی اور تدبیری معاملات سے ہے۔ اقتصادی ترقی اور معاشی معاملات کا ایک بہت بڑا پہلو وہ ہے جس کا تعلق خالص انسانی تجربے سے ہے۔ دورِ جدید کے بہت سے مثبت پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس دور میں خالص معاشی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کے معاملات پر گہرے علمی انداز میں غور ہوا ہے۔ مختلف مسائل کو بحث وتمحیص اور

تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اور ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں نے طویل غور وخوض اور قوموں کے تجربات کے مطالعے کے بعد معاشیات کے فن کو اس انداز سے مرتب کر دیا ہے کہ آج اس سے استفادہ عام انسانوں کے لیے بہت آسان ہوگیا ہے۔

اس لیے سب سے پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ جن معاملات میں شریعت نے انسانوں کو آزاد چھوڑا ہے، جن معاملات کے بارے میں انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے خود صحیح نتائج تک پہنچ سکتا ہے وہاں دوسرے انسانوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ناگزیر ہے۔ اسلامی شریعت کا بنیادی اصول اور کارفرما تصور جس سے ہر مسلمان واقف ہے وہ یہ ہے کہ حکمت اور دانائی کی بات مسلمان کی گمشدہ پونجی ہے، جہاں بھی ملے مسلمان کو چاہیے کہ اس کو حاصل کر لے۔ اس لیے معاشی تجربات کے باب میں دور جدید کے تمام قدیم و جدید اور مشرقی اور مغربی تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔

فقہائے اسلام نے اسی بات کو ایک خالص قانونی اصول کی زبان میں بیان کیا ہے کہ ''الاصل فی المعاملات الاباحة'' کہ معاملات میں اصل یہ ہے کہ وہ جائز ہیں، الا یہ کہ شریعت نے کسی معاملے کو صراحتۃً یا اصولاً ناجائز قرار دیا ہو۔ اس لیے معاملات کی جتنی شکلیں آج کل رائج ہیں ان سب سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ اس عمل میں جہاں جہاں کوئی چیز شریعت سے متعارض نظر آئے وہاں اس تعارض کو دور کر دینا چاہیے اور اس تجربے سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دوسرا عنوان جس پر ذرا تفصیلی گفتگو کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات کے نام سے جو فن پچھلے سو سال کے عرصے میں وجود میں آیا ہے ابھی اس فن یا اس علم کو مزید ترقی اور وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ یہ وسعت اور ترقی ایک اعتبار سے تو خود بخود ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے اسلامی معاشیات کے تجربات ہو رہے ہیں اسی رفتار سے یہ فن بھی پھیل رہا ہے۔ اسلامی بینکاری کا کام جتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے اسلامی بینکاری پر لٹریچر بھی اسی رفتار اور وسعت سے سامنے آ رہا ہے۔ اسلامی تکافل کے جتنے ادارے بن رہے ہیں اسی حساب سے تکافل اور بیمہ کاری کے اسلامی تصورات پر تحقیق بھی ہو رہی ہے۔

اس خودکار علمی کاوش کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم اپنے کو اس کے

لیے وقف کریں اور کچھ تحقیقی ادارے اور تعلیم و تدریس کے مراکز اس کا اہتمام کریں کہ اسلامی معاشیات کے ان پہلوؤں کو بھی خصوصی توجہ اور تحقیق کا موضوع قرار دیا جائے، جن کی سر دست بازار میں یا تجارت میں مانگ نہیں ہے۔ جس چیز کی مانگ ہو اس کی رسد تو خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ ابھی ان کی عملی طلب نہیں ہے۔ لیکن نظری، فکری اور عملی اعتبار سے مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ایسے معاملات پر بھی شریعت کا موقف، فقہائے اسلام کی تحقیقات اور ائمہ اسلام کے اجتہادات کو آج کی زبان میں، معاشیات کے اسلوب اور معاشیات کی اصطلاحات میں بیان کیا جائے۔ اسلامی معاشیات کو جب بھی اس نئے فنی انداز میں مرتب کیا جائے گا تو اس میں ان خصائص اور امتیازی اوصاف کو سامنے رکھنا اور نمایاں کرنا پڑے گا جو اسلامی معاشیات کو دوسرے معاشی نظاموں سے ممیز کرتے ہیں۔ اگر نئی مرتب شدہ اسلامی معیشت میں وہ خصائص نہیں پائے جاتے اور اس کے وہ نتائج نہیں نکل رہے جن میں سے کچھ کا ذکر ان گزارشات میں آ چکا ہے اور کچھ کا میں اس گفتگو کے آخر میں ذکر کروں گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی معاشیات کی تدوین یا تنفیذ صحیح خطوط پر نہیں ہو رہی۔ اسلامی معاشیات کی تدوین و تنفیذ کے لیے جہاں آج کل کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے وہاں ان نظری معیارات، تہذیبی مظاہر اور ثقافتی اور ملّی شعائر سے وابستہ رہنا بھی ناگزیر ہے جن کی حدود قرآن کریم، سنت رسول، اور ائمہ اسلام کے اجتہادات اور فقہاء کی آراء نے وضع کی ہیں۔

اسلامی معیشت کی ان خصوصیات میں چند باتیں انتہائی اہم اور قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر ایک دینی اور مذہبی نظام ہے۔ یہ ایک ربانی طرز فکر ہے جس کی اٹھان خالص اخلاقی قواعد اور روحانی اصولوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ لہٰذا پہلے قدم پر یہ بات صاف کر دینی چاہیے کہ یہ وہ معاشیات ہے جو اخلاق سے لاتعلق نہیں ہے، جو مذہبی زندگی کے بارے میں لاپروا نہیں ہے، جو معاشرے کے اخلاقی تقاضوں اور ضروریات سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ جس کی گہری اساس اور بنیاد خالص دینی تصورات اور روحانی اقدار پر ہے۔ یہ نظام ایک لمحے کے لیے بھی اپنے خالص دینی تصورات اور مذہبی اساسات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی مرحلے پر کوئی چیز دینی اقدار اور اخلاقی اور محرکات سے الگ ہو رہی ہے تو وہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔ وہاں اس تعلق کو دوبارہ بحال کرنے کی ضرورت ہے جو کمزور پڑتا نظر آ رہا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلامی معیشت واقتصاد ایک وسیع، جامع اور بھرپور نظام کا ایک حصہ ہے، معاشیات اور معاشرتی زندگی اسلام کی رو سے زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے الگ منفرد اور مستقل بالذات کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اسلام کے اس تصور حیات اور طرز زندگی سے ہے جس کو بعض جدید مفکرین اسلام نے مکمل ضابطہ حیات کی پرمغز اور بلیغ اصطلاح سے یاد کیا ہے۔ لہٰذا اسلامی معیشت کے قواعد کو جب بھی مرتب کیا جائے گا تو اس انداز سے مرتب کیا جائے گا کہ جہاں وہ معاشیات کے تقاضے اور ضروریات کو پورا کریں وہاں وہ مسلمانوں کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں اس طرح لاتعلق نہ ہوں جس طرح سیکولر معاشیات لاتعلق ہوتی ہے۔ اس معیشت کا تعلق اسلامی معاشرتی زندگی سے بھی ہوگا۔ اس کا تعلق مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات سے بھی ہوگا۔ اس کا تعلق مسلمانوں کی سیاست، مسلمانوں کی دینیات، مسلمانوں کی خالص مذہبی زندگی سے بھی ہوگا۔

مسلمانوں کی خالص مذہبی زندگی مین متعدد احکام ایسے ہیں جن کا گہرا اثر مسلم معاشرہ پر پڑتا ہے۔ کفارات، زکوٰۃ، صدقات واجبہ وغیرہ جیسے احکام اس کی مثال ہیں۔ ان سب کے واضح اور نمایاں معاشی نتائج نکلتے ہیں۔ وقف ایک طرف عبادت ہے، دوسری طرف ایک معاشرتی اور معاشی ادارہ بھی ہے۔ یہاں تک کہ اسلامی قوانین میں بعض ایسے احکام بھی پائے جاتے ہیں کہ ان پر عملدرآمد کے نتیجہ میں خالص فوجداری معاملات کے بھی جہاں معاشی اثرات نکلتے ہیں، وہاں ان کی مذہبی جہتیں بھی ہیں۔ چنانچہ دیت، قتل عمد کا کفارہ وغیرہ اگرچہ خالص فوجداری معاملات ہیں لیکن کفارہ جب ادا کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ غریبوں کو ادا کیا جائے گا۔ اس کے قواعد وضوابط ہوں گے، ان قواعد وضوابط کا گہرا تعلق اسلام کے فوجداری قانون سے بھی ہوگا۔ اسلام کے عبادات کے احکام سے بھی ہوگا۔ اور ان احکام کی معاشی جہت بھی ہوگی۔ اس لیے اسلامی معاشیات کو ان تمام معاملات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

اس سے اسلامی معیشت کی تیسری خصوصیت بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے یہ ایک متناسق اقتصاد ہے۔ جس کے تمام پہلو ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے۔ اسلامی معیشت میں کسی سوال کا کوئی ایسا جواب نہیں دیا جا سکتا جو اسلام کی دینی تعلیمات سے ہم آہنگ نہ ہو، جو اسلامی معاشرت کے

تقاضوں سے متعارض ہو، جو اسلام کی ثقافت اور تہذیبی اقدار سے تناقض رکھتا ہو۔ اس لیے یہ اقتصاد خود اپنی ذات میں بھی متناسق اور متکامل ہے اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بھی مکمل ہم آہنگی کا حامل اور متقاضی ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظام معیشت ایک تصور حیات پر مبنی ہے۔ ایک نظریے پر مبنی ہے۔ یہ اس طرح کا خودرو نظام نہیں ہے جس طرح کے خودرو نظام مغرب میں پیدا ہوئے ہیں، جن کے محرکات محض وقتی معاشی مفادات ہوں۔ یہاں ایسا نہیں ہوا کہ کسی علاقہ میں وقتی معاشی مفادات کے حصول کے لیے مختلف اقدامات کیے جا رہے ہوں جو کئی سو سال کے تجربہ کے بعد آگے چل کر ایک نظام کی شکل اختیار کر لیں۔ یہاں یہ کیفیت نہیں ہے۔ یہاں پہلے دن سے ہی ایک بنیادی نظریہ پیش نظر ہے جس کی بنیاد پر کچھ قواعد اور بنیادی اصول وجود میں آتے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے سارے پہلو مرتب ہو رہے ہیں۔ جن میں سے معاشیات بھی ہے۔ اس لیے یہ ایک اخلاقی اقتصادی نظام بھی ہے۔ آج اخلاقیات اور اقتصادیات کا رشتہ مغرب نے ختم کر دیا ہے۔ ختم نہیں کیا تو کمزور تو یقیناً کر دیا ہے، اور اس کمزوری کے بہت سے منفی نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ آج ان نتائج کا احساس بھی بعض حساس اہل مغرب کو ہو رہا ہے اور ایسی آوازیں اٹھنے لگی ہیں، وقتاً فوقتاً مغرب میں سننے میں آتی ہیں۔ ایسی تحریریں شائع ہونے لگی ہیں جن میں اخلاق کی دہائی سنائی دیتی ہے۔ آج دو سو تین سو سال کے تجربے کے بعد مغرب جس چیز کی دہائی دے رہا ہے وہ پہلے دن سے اسلام میں موجود ہے۔

لہٰذا اسلامی شریعت کی یہ پانچویں خصوصیت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ ایک اخلاقی نظام ہے۔ جس کی بنیاد اخلاقی تصورات پر ہے۔ پھر یہ کوئی خالص مادی تصورات اور دنیاوی مفادات پر مبنی نظام نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا، اس میں ایک اہم پہلو عبادات کا بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام میں عبادات اور معیشت دونوں ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ یہ بات اس گفتگو میں کئی بار آئی ہے کہ جائز روزی کا حصول عبادت سے کم نہیں ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے کئی بار اس بات کو بیان کر چکا ہوں کہ عبادت اور تجارت، عبادت اور معیشت، عبادت اور صنعت، عبادت اور زراعت کے درمیان ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ اگر اقتصادی

سرگرمی اللہ کی شریعت کے مطابق جائز روزی کے حصول کے لیے کی جائے اور مقصد یہ ہو کہ اس دنیا میں دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے جن مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ پیدا کرنا مقصود ہے تو پھر ساری معاشی سرگرمی عبادت قرار پا جاتی ہے۔ اس روح کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسلامی معیشت میں عبادت کی روح برقرار رہنی چاہیے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلام کا نظام معیشت کوئی تصوراتی یا خالص آئیڈیل یوٹوپیا قسم کا نظام ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے برعکس اسلام کا معاشی نظام ایک خالص عملی نظام ہے۔ گزشتہ گیارہ گفتگوؤں میں آپ نے مختلف احکام کے بارے میں گفتگو سنی اور پڑھی، اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام کی معاشی تعلیم میں کوئی ایک پہلو بھی ناقابل عمل یا خالص نظری اور تصوراتی قسم کا نہیں ہے۔ ہر حکم نظری اور مثالی ہے۔ لیکن وہ بیک وقت عملی بھی ہے، عملیت اور مثالیت، دونوں کے درمیان توازن کا نام ہی اسلام ہے۔ شریعت بیک وقت نظریت اور مثالیت، اور عملیت اور حقیقت پسندی پر مشتمل احکام کے مجموعے کا نام ہے۔

مزید برآں اسلامی نظام معیشت ایک خالص انسانی نظام ہے۔ انسانوں کی ضروریات کے لیے دیا گیا ہے۔ انسانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کی خاطر ہی یہ احکام وضع کیے گئے ہیں۔ انسان بطور انسان ان احکام سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ احکام کسی ایک نسل یا دوسری نسل کے فائدے کے لیے نہیں دیے گئے۔ اس نظام میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی قوم کے مفاد کی خاطر دوسری قوم کے مفاد کو نقصان پہنچایا جائے۔ کسی فرد کی مصلحت کی خاطر دوسرے فرد کی مصلحت کو قربان کر دیا جائے۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ نظام واقعیت پسند نظام ہے۔ عملی بھی ہے اور واقعیت پسند بھی۔ دنیا میں جو کچھ عملاً ہو رہا ہے، انسانوں کے جس جس طرح کے مزاج ہیں، انسانوں کی جو جو کمزوریاں ہیں، ان کا مکمل احساس اس نظام کو پہلے دن سے ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا انسانوں کی کمزوریاں بھی بتائی گئی ہیں اور انسانوں کی خوبیاں بھی بتائی گئی ہیں۔ یہ اس لیے بتائی گئی ہیں کہ یہ جتلا دیا جائے کہ جس خالق کائنات نے یہ نظام دیا ہے، قرآن کریم کی یہ ہدایات عطا فرمائی ہیں، وہ انسانوں کی کمزوریوں سے بھی پورے طور پر آگاہ ہے اور خوبیوں سے بھی پورے طور پر واقف ہے۔ اس لیے اس کے نظام میں مکمل حقیقت پسندانہ اور واقعیت پسندانہ انداز پایا جاتا ہے۔

اس واقعیت پسندی کے ساتھ ساتھ اسلام میں اعلیٰ ترین اور بلند ترین مقاصد پیش نظر

رکھے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے مقاصد ہمیشہ بلند اور اونچے ہونے چاہئیں۔ ایک آئیڈیل مسلمان کے بارے میں علامہ نے فرمایا تھا اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل۔ لہٰذا مسلمان کی ذاتی خواہشات تو محدود ہونی چاہئیں اور ہمیشہ مخلص انسانوں کی ذاتی خواہشات بہت محدود رہی ہیں۔ لیکن ان کے کلی مقاصد، قومی اہداف اور اجتماعی تصورات ہمیشہ بہت بلند رہے ہیں۔ یہی اسلامی اقتصادی نظام کا بھی خاصہ ہے۔ جہاں ایک طرف کوشش کی گئی کہ فرد کو قناعت پسند بنایا جائے، دوسری طرف یہ احکام بھی دیے گئے کہ معاشرے اور معیشت کی بہتری کے لیے جو کر سکتے ہو وہ کرو۔ اپنے فائدے کے لیے نہیں، دوسرے کے فائدے کے لیے ہر وہ کام جو تمہارے بس میں ہو اس کو کر گزرو۔ حتی کہ اگر درخت کا پودا لگانے کے لیے بیٹھے ہو اور قیامت کا صور پُھنک جائے تو پہلے پودے کو لگا دو، زمین میں گاڑ دو، پانی دے دو، اس کے بعد دیکھو کہ صور پُھنک رہا ہے تو اب کیا کرنا ہے۔ اس سے زیادہ واقعیت پسندی اور مقاصد کی بلندی کیا ہوگی۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام کا نظام ایک متوازن نظام ہے۔ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے مابین مکمل توازن پایا جاتا ہے۔ کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر بے جا برتری حاصل نہیں ہے۔ جس پہلو کو جتنا وزن ملنا چاہیے اتنا ہی وزن شریعت کی رو سے اس پہلو کو دیا گیا ہے۔

اسلام کے اس معاشی نظام کی تدوین وتشکیل اور تعمیل وتنفیذ کی کچھ لازمی شرائط ہیں۔ جب تک وہ پوری نہیں ہونگی یہ نظام وجود میں نہیں آئے گا۔ سب سے پہلی شرط فکری آزادی کی ہے۔ جب تک مسلمان قوم بالعموم اور مسلمان اقوام کے قائدین بالخصوص فکری طور پر آزاد نہیں ہوں گے، مغرب کی بے جا فکری غلامی اور تہذیبی مرعوبیت سے نجات حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسلام کے احکام کی بنیاد پر معیشت کی تشکیلِ نو کے لیے تیار ہوں گے۔ اس فکری آزادی کو حاصل کرنے اور پھر برقرار رکھنے کے لیے نظام تعلیم کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ جب تک نظام تعلیم کی تشکیل نو نہیں ہوگی، جب تک ایسا نظام وجود میں نہیں آئے گا جس میں اساس اور بنیاد کی حیثیت اسلام کی اقدار اور تعلیم کو حاصل ہو اور تمام معاشرتی اور انسانی علوم وفنون کی تشکیل نو اس انداز سے کی گئی ہو کہ وہ شریعت کے احکام کے مطابق مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنے اس وقت تک یہ آزادی یا تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر حاصل ہو جائے تو برقرار نہیں رہ سکتی۔

نظام تعلیم کی تشکیل نو کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشیات کے لیے مطلوبہ ماہرین کی تیاری ناگزیر ہے۔ ماہرین کی تیاری کے لیے طویل المیعاد منصوبہ بندی بھی درکار ہے جو نظام تعلیم کی تشکیل نو ہی کا ایک حصہ ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختصر دورانیے کے ایسے پروگرام بھی ناگزیر ہیں جو فوری ضرورت کی تکمیل کے لیے شروع کیے جائیں۔ ان پروگراموں میں اسلامی بینکاری کے لیے افرادکار، تکافل کے اداروں کو چلانے کے لیے افرادی قوت، اسلامی معاشیات کی تعلیم کے لیے ماہرین معیشت کی تیاری جیسے فوری اور اہم مقاصد کا حصول پیش نظر ہوگا، جو اس پورے عمل کی کامیابی کی ناگزیر شرط ہے۔ ان سب کاموں کے لیے مختصر دورانیے کے مختلف پروگرام شروع کیے جانے چاہئیں۔ ان میں یونیورسٹیوں اور جامعات کو بھی حصہ لینا چاہیے۔ اور پرائیویٹ دینی تعلیم کے اداروں کو بھی بھرپور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ جب تک ان دونوں کے درمیان مکمل اور بھرپور تعاون اور ہم آہنگی نہیں ہوگی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی معاشیات اور بینکاری کے مکمل نفاذ کا عمل ایک طویل عمل ہے۔ اس کی تکمیل میں کتنا وقت لگے گا یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن اس عمل کو مختلف مدارج اور مراحل سے گزرنا ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ جو جزوی طور پر انجام بھی پا چکا ہے، لیکن جس کا خاصا حصہ ابھی باقی ہے وہ یہ ہے کہ اصحاب معیشت اور ارباب تجارت کو قائل اور مائل کیا جائے کہ وہ اسلام کے معاشی احکام پر عمل درآمد شروع کریں۔ یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اگر آج پاکستان کے سارے تاجر اور تمام اصحاب معیشت یہ طے کرلیں کہ وہ شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے تو اسلامی معیشت و تجارت کا پہلا مرحلہ ایک ہی دن میں پورا ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ کام جتنی جلدی کیا جاسکے اتنا ہی اس پہلے مرحلے کو طے کرنے میں آسانی رہے گی۔

پہلے مرحلے میں جو کام کرنے ضروری ہے ان میں یہ بھی ہے کہ رائج الوقت معاملات اور اسالیب تجارت کے اسلامی متبادلات یا اسلامی متقاربات پیش کیے جائیں۔ ضروری نہیں کہ ہر چیز کا اسلامی متبادل فوری طور پر موجود ہو۔ لیکن اسلامی متقارب ضرور موجود ہوسکتا ہے۔ یعنی اگر ایک مقصد جو جائز مقصد ہے تو لامحالہ اس جائز مقصد کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ بھی شریعت کی حدود کے اندر دستیاب ہونا چاہیے۔ چاہے وہ مکمل طور پر موجودہ طریقے کے مطابق نہ ہو، مکمل طور پر متشابہ نہ ہو، لیکن اس کے قریب قریب ضرور ہوسکتا ہے۔ اس لیے متبادلات اور جہاں متبادلات

ممکن نہ ہوں تو متقاربات پیش کیے جانے چاہئیں۔

ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام کوششوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے جو ملک میں اسلامی معیشت کے سلسلے میں کی جارہی ہیں۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان ایسے بہت سے کام کررہا ہے۔ سکیورٹی اور ایکسچینج کمیشن میں کچھ کام ہورہا ہے۔ بہت سے کام پرائیویٹ ادارے کررہے ہیں۔ افراد کررہے ہیں۔ تعلیمی ادارے کررہے ہیں۔ ان سب کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے۔ اور اس ہم آہنگی کی ضرورت کا احساس بھی بہت سے لوگوں کو نہیں ہے۔ اس لیے اگر ان ساری کوششوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو جائے، رابطے کی شکل وجود میں آجائے تو ان کے ثمرات اور نتائج پہلے سے بہت بڑھ سکتے ہیں۔ ریاست اس کام کو اسی وقت کرسکتی ہے جب ریاست کے ذمہ داروں کی ذہنی اور فکری جہت میں تبدیلی آئے۔

علامہ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مستقبل کی تشکیل کے لیے تعمیر فکر ضروری ہے اور تعمیر فکر کے لیے تطہیر فکر ضروری ہے۔ لہٰذا ریاست کے ذمہ داروں کی تطہیر فکر اور تطہیر ذہن فوری طور پر درکار ہے۔ تاکہ جب ایک مرتبہ یہ تطہیر ہو جائے تو اس کے بعد تعمیر آسانی سے کی جاسکے۔ جس زمین میں جھاڑ جھنکاڑ اور زہریلے پودے جگہ پکڑے ہوئے ہوں وہاں گل وگلزار آسانی سے آباد نہیں کیے جاسکتے۔ وہاں پہلے زمین کی تطہیر کرنی پڑتی ہے اور ان تمام جھاڑ جھنکاڑوں کو، زہریلے پودوں کو کھود کر پھینک دینا پڑتا ہے، نکال کر الگ کردینا پڑتا ہے جو وہاں پہلے سے موجود ہوں۔ اس کے بعد ہی کہیں جا کر اس صاف شدہ زمین میں نیا بیج ڈالا جاتا ہے۔ اس بیج کے لیے کھاد فراہم ہوتی ہے۔ اس کی پرورش کی جاتی ہے، اس کی آبیاری کی جاتی ہے۔ جب جاکر نئے گل وگلزار پیدا ہوتے ہیں۔ یہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ مشکل اور محنت طلب، بلکہ جاں گسل معاملہ افکار اور نظریات کی تعمیر کا بھی ہے۔

یہ کام اس وقت ہوسکتا ہے جب اسلامی معیشت کے حق میں رائے عامہ پورے طور پر بیدار ہو۔ اس وقت امر واقعہ یہ ہے کہ حلال وحرام کے بارے میں عام طور پر وہ شعور موجود نہیں ہے جو مسلم معاشرے کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے۔ یہ کام جہاں ذرائع ابلاغ، اصحاب صحافت اور تعلیمی اداروں کا ہے، وہاں یہ کام علمائے کرام کا بھی ہے۔ بلکہ علمائے کرام کی ذمہ داری اس بارے میں بہت زیادہ ہے کہ وہ عوام میں حلال وحرام کے بارے میں عمومی شعور پیدا کریں اور جن چیزوں کو

شریعت نے حرام قرار دیا ہے، خاص طور پر ربا، قمار اور غرر، ان کی خرابیوں، برائیوں اور شناعت کو پورے طور پر بیان کریں۔ جب تک محرمات کی برائی اور خرابی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوگی اس وقت تک ان سے بچنے کا داعیہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

یہ بات کہ کچھ لوگ اپنی پوری زندگی حکومتوں سے یہ مطالبے کرنے میں گزار دیں کہ حکومت ربا اور قمار کو ممنوع قرار دے دے اور خود زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی ربا اور قمار سے بچنے کا جذبہ پیدا نہ ہو، یہ اسلامی رویہ نہیں ہے۔ اسلامی رویہ یہ ہے کہ فرد خود ربا اور قمار اور دوسرے محرمات سے جتنا بچ سکتا ہے بچے اور جہاں اس لیے انفرادی طور پر بچنا مشکل ہو، وہاں ریاست سے توقع رکھے کہ ریاست اپنا فرض ادا کرے گی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص پوری زندگی نماز نہ پڑھے اور عذر یہ پیش کرے کہ ریاست نے اقامت صلاۃ کا نظام قائم نہیں کیا تھا اس لیے میں فریضۂ نماز کی ادائیگی نہیں کرسکا۔ کوئی شخص پوری زندگی اپنے مال کی زکوۃ ادا نہ کرے اور عذر یہ پیش کرے کہ ریاست نے نظام زکوۃ قائم نہیں کیا تھا۔ جس طرح یہ عذر نا قابل قبول ہے اسی طرح معیشت کے بہت سے اسلامی احکام پر عمل درآمد نہ کرنے کا عذر بھی عذر لنگ اور نا قابل قبول ہے۔

اسلامی معیشت و تجارت کے نفاذ کا یہ مرحلہ ناگزیر ہے۔ اس پہلے مرحلے سے گزرے بغیر دوسرے مرحلے میں داخلہ ممکن نہیں ہے۔ نہ پہلے مرحلے کی مدت کا قطعی تعین ممکن ہے اور نہ دوسرے مرحلے کا۔ مختلف مسلم ممالک میں یہ مدت مختلف ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ملک میں حکومت، تاجر، صنعت کار، عدلیہ اور علمائے کرام مل کر اس مدت کو بہت کم کر دیں تو یہ مرحلہ بہت تھوڑی مدت میں طے ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر حکومت کے ذمے دار حضرات، بینکار، تاجر، صنعت کار، علمائے کرام اور عدلیہ دلچسپی نہ لیں تو یہ مرحلہ بہت طویل بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے ان سب کے درمیان تعاون اور فکری ہم آہنگی ناگزیر ہے۔ جب تک یہ سب لوگ ان مقاصد کے بارے میں اتفاق رائے نہ رکھتے ہوں۔ یعنی حکومت، بینکار، تاجر، صنعت کار، ماہرین معیشت، علمائے کرام اور قانون سے وابستہ حضرات، جن میں جج صاحبان اور وکلاء دونوں شامل ہیں۔ اس وقت تک یہ مرحلہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

اس مرحلے کی لازمی شرط یہ بھی ہے کہ جہاں جہاں اسلامی معاشیات کا مطالعہ ہو رہا ہے، وہ کسی تعلیمی ادارے میں ہو رہا ہو، کسی تحقیق کی صورت میں کیا جا رہا ہو، کسی لیکچر اور تقریر میں

ہو رہا ہو، وہاں ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ ایک زندہ اور متحرک نظام کی حیثیت سے کیا جائے۔ کسی ماضی کے تجربے یا کسی ورثے کے طور پر نہ کیا جائے۔ ماضی کے ورثے کے طور پر تو اسلامی تعلیم کا مطالعہ پچھلے تین سو سال سے ہو رہا ہے۔ استعمار کے پورے دور میں ہوتا رہا۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس ورثے سے تعلق برقرار رہے۔ یہ ورثہ بالکل ضائع نہ ہو، یہ مقصد پورا ہو گیا۔ وہ پورا ورثہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کو سمجھنے والے بھی ہیں، اس کو جاننے والے بھی ہیں، اس کو پڑھنے اور پڑھانے والے بھی موجود ہیں۔

اب ہم ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب آزادی اور خود مختاری کا دور ہے۔ اب اسلامی معاشرے اور اسلامی تہذیب کی تشکیل کا دور ہے۔ ایک زندہ تہذیب اور زندہ معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی قوانین، اس کے تصورات، اور اس کے پیراڈائم کو ایک زندہ اور متحرک نظام کی حیثیت سے مرتب کیا جائے۔ جدید معاشی حقائق اور وسائل سے جب تک اسلامی معیشت کے احکام کو وابستہ نہیں کیا جائے گا، یعنی relate نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اسلامی معیشت کو ایک زندہ اور متحرک نظام کے طور پر پیش کیا جانا مشکل ہو گا۔

ابھی تک دنیائے اسلام میں بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہے کہ اسلامی معیشت اس دور میں قابل عمل نہیں ہے۔ یہ اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ ثابت کر کے دکھائیں اور بعض معاملات میں اہل علم نے یہ بات ثابت کی ہے اور دنیا کے بہت سے ملکوں نے تسلیم کی ہے کہ اسلامی معیشت کے احکام قابل قبول ہیں، قابل عمل ہیں۔ یہ کام پورے نظام معیشت اور اسلامی قوانین کے سلسلے میں کیا جانا چاہیے۔ ابھی تک ہمارے یہاں ایسے حضرات موجود ہیں جو دنیائے اسلام کے مختلف ملکوں میں مؤثر حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے ذہن اس معاملے میں صاف نہیں ہیں کہ اسلامی شریعت کے تمام احکام اس دور میں بھی قابل عمل ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں فوجداری احکام نا قابل عمل ہیں۔ کسی کے خیال میں شخصی قوانین نا قابل عمل ہیں۔ کسی کے خیال میں دستوری اور آئینی ہدایات نا قابل عمل ہیں۔ کسی کے خیال میں جہاد اور جنگ کے احکام نا قابل عمل ہیں۔ یہی کیفیت معیشت کے احکام کے بارے میں بھی ہے۔ اس لیے اس غلط فہمی کی تردید اور متعلقہ لوگوں کی ذہن سازی ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہو گا اس وقت تک مغرب کے مستعمرانہ استحصالی اور ظالمانہ نظام سے نجات ممکن نہیں ہے۔ آج جو نظام دنیائے اسلام میں رائج ہے۔ یہ مغرب کے

مستعمرانہ اوراستحصالی نظام کی باقیات ہیں، جن کے وہی نتائج نکل رہے ہیں جو ماضی میں پچھلے دو سو سال سے نکلتے چلے آرہے ہیں۔

اسلامی معیشت کے عملی نفاذ کے لیے جن معاملات کا خصوصی مطالعہ ضروری ہے جن کی فنی تدوین اور علمی تشکیل ناگزیر ہے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ تو بینکاری اور تکافل کا ہے۔ اس کے بارے میں خاصا علمی کام ہوا ہے۔ لیکن جن موضوعات پر ابھی کام ہونا باقی ہے ان میں غیر سودی نظام معیشت کے اب تک کے تجربہ کا ناقدانہ علمی مطالعہ، مضاربہ پر عمل درآمد کی کیفیت اور زکوٰۃ اور اوقاف کے نظام کی معاشی اہمیت کے تجربی مطالعہ جیسے معاملات شامل ہیں۔ ان موضوعات پر ابھی تک اس طرح فنی انداز میں کام نہیں ہوا۔ جو دور جدید میں ان اداروں کو فعال اور مؤثر بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔ اگرچہ اسلامی معیشت کی تشکیل وتدوین کا کام پچھلے سو سال سے ہو رہا ہے اور اس باب میں انتہائی اہم اور قابل رشک پیش رفت ہوئی ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اور جو کچھ کرنا باقی ہے وہ بہت آسان کام نہیں ہے۔ وہ خاصا مشکل کام ہے جس کے لیے سنجیدہ اور اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔

مغرب کا اقتصادی نظام کئی سو برس کی مسلسل علمی اور فکری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کوششوں میں یورپ اور شمالی امریکہ کے تمام حکمرانوں نے، بڑی بڑی حکومتوں نے، بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے اور تعلیمی اور تحقیقی اداروں نے حصہ لیا ہے۔ ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں معاشی اداروں نے جو تجربات پچھلے چار سو سال میں کیے ہیں ان سب کا گہرا فنی مطالعہ کیا گیا۔ ان سے نتائج مستنبط کیے گئے، ان نتائج کو مرتب کیا گیا۔ پھر ان نتائج کو دوبارہ عملی تجربات پر منطبق کر کے دیکھا گیا۔ ان سب لگاتار کاوشوں کے نتیجے میں جدید مغربی معیشت مرتب ہوئی ہے۔

اسلامی معیشت کی مکمل تشکیل اور تدوین کے لیے اور اس کے خودمختار وجود کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی معیشت کے اپنے ایسے وسائل اور آلات ہوں یعنی tools ہوں جن سے کام لے کر اسلامی معاشیات کے احکام کی تطبیق بھی کی جاسکے۔ جن کی مدد سے اس تطبیق ' نتائج کا تجزیہ بھی کیا جاسکے۔ اور مزید حقائق اور نتائج معلوم کرنے کے لیے نئے نئے اسالیب بھی جن کی بنیاد پر وضع کیے جاسکیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا اس وقت تک وہ علمی نظریات یا قواعد مرتب نہیں ہوسکتے، جن کی بنیاد تجرباتی حقائق پر ہو۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی

معیشت میں بیک وقت دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس کے نظریاتی اور معیاراتی یعنی normative پہلو کا تعلق ہے وہ تو متفق علیہ ہے، طے شدہ ہے، قرآن کریم اور سنت میں اور فقہائے اسلام کے وسیع لٹریچر میں موجود ہے۔لیکن جہاں تک اس کے عملی اور تجربی یعنی emprical نتائج کا تعلق ہے اس کے لیے آج کل کے قواعد استدلال، آج کل کے اسالیب، اور آج کل کے وسائل کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تجربہ اتنا وجود میں آجائے، اتنا وسیع تجربہ سامنے آجائے جس کی بنیاد پر کوئی تجرباتی تحقیق ممکن ہو۔ یہ تجرباتی تحقیق زکوۃ کے بارے میں بھی ہوسکتی ہے، اوقاف کے بارے میں بھی ہوسکتی ہے، حج کے بڑے آپریشن کے بارے میں بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً تبونگ حاجی ملیشیا کا مشہور ادارہ ہے جس پر کچھ کام ہوا ہے۔ اس کام سے کچھ نتائج بھی نکلے ہوں گے۔ ان نتائج سے دوسرے ممالک میں کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ دوسرے ممالک کس انداز سے اپنا نظام تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کا تعلق خالص تجربی حقائق اور معلومات سے ہے۔

یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایسے اہل علم موجود ہوں جو اس پورے کام کی اہلیت رکھتے ہوں۔ میں پھر یاد دلاؤں گا، نظام تعلیم کی تشکیل نو کی اہم اور بنیادی بات، جو اس پورے عمل کے لیے پہلے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب تک ایسے لوگ موجود نہیں ہوں گے جو فقہ اسلامی کے ذخائر پر مجتہدانہ نظر رکھتے ہوں اور مغرب کے معاشی تصورات سے ناقدانہ طور پر واقف ہوں۔ اس وقت تک یہ سارا کام منتظر تکمیل رہے گا۔ جب ایسے اہل علم وجود میں آجائیں گے تو ضرورت ہوگی کہ ایک ایسا ماحول اور فضا پیدا کی جائے جو ثقافتی، اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے اس کام کی حوصلہ افزائی کرے اور جزوی اور کلی دونوں قسم کی اقتصادیات پر عمل درآمد بھی کرائے اور عمل درآمد کے بعد اس کا مطالعہ کرکے ان سے مزید نتائج برآمد کرنے کے وسائل واسباب بھی فراہم کرے۔

اسلامی معیشت کا یہ پہلا مرحلہ جس سے ہم گزر رہے ہیں یہ ایک اضطرار کا سا مرحلہ ہے۔ ہم ایک اضطرار کی سی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ اس اضطرار کی کیفیت میں بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑیں گے جو بظاہر حیلہ معلوم ہوں گے، لیکن ان سے گزرے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ اس مرحلے میں بعض ایسے طریقوں کو بھی برداشت کرنا پڑے گا جن کا اسلامی متبادل سردست موجود نہیں ہے، اور جن سے فوری طور پر صرف نظر کرنا بھی اہل تجارت ومعیشت کے لیے ممکن نہیں

ہے۔ اس لیے اس مرحلے میں ان طریقوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کل کی گفتگو میں میں ری انشورنس کی مثال دے چکا ہوں کہ ری انشورنس بڑی حد تک غیر مسلم ممالک کے زیر اثر اور ان کے کنٹرول میں ہے۔ اس کے بہت سے معاملات شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن بدرجہ مجبوری اس کو برداشت کرنا پڑے گا۔

بہت سے مسلم ممالک کی بیرونی تجارت کا بڑا حصہ غیر مسلموں کے ساتھ ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کی بین الاقوامی تجارت کا صرف آٹھ فیصد حصہ ہے جو مسلم ممالک میں آپس میں ہو رہا ہے۔ 92 فیصد حصہ وہ ہے جو مسلم ممالک کا غیر مسلم ممالک کے ساتھ ہے۔ بہت سے مسلم ملکوں نے دوسرے ممالک اور ان کے زیرِ اثر قائم بین الاقوامی اداروں سے بڑے بڑے قرضے لیے ہوئے ہیں۔ ان قرضوں کے عوض اپنی قیمتی جائیدادیں اور اثاثے رہن رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کام پاکستان کے حکمرانوں نے بہت کثرت سے کیا ہے۔ پاکستان کے بہت قیمتی اثاثے بڑے پیمانے پر غیر مسلم ممالک کے ہاتھوں رہن رکھ دیے گئے ہیں۔ اب بیک جنبش قلم ان تمام معاہدوں کو منسوخ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان قرضوں کی مقدار اتنی بڑی ہے کہ پاکستان کے پورے اثاثے فروخت کر کے بھی شاید ان کو ادا نہ کیا جا سکے۔ اس لیے اضطرار کے اصول کے تحت اس صورتحال کو برداشت کرنا پڑے گا۔ شریعت نے اضطرار کے احکام اسی طرح کی صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دیے ہیں۔

اس مرحلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ فقہ مالیات اور فقہ معاملات کی نئے انداز سے تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ یہ آغاز یونیورسٹیوں میں بھی کیا جائے، دینی تعلیم کے اداورں میں بھی کیا جائے، بلکہ یہ کام ہر اس تعلیمی مرکز میں کیا جانا چاہیے جہاں کسی نہ کسی اعتبار سے فقہ یا معاشیات کی تعلیم ہو رہی ہو۔ جہاں دینی تعلیم کے اداروں اور شعبوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فقہ مالیات اور فقہ معاملات کی نئے انداز سے تعلیم کا انتظام کریں، وہاں بینکاری، معاشیات، تجارت اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے شعبوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان مضامین کی اس انداز سے تعلیم دیں کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات شریعت کے موقف سے مکمل طور پر آگاہ بھی ہوں اور اس موقف کو اپنے تخصصات کے شعبوں میں جاری بھی کر سکیں اور اپنی ماہرانہ واقفیت کو شریعت کے احکام سے ہم آہنگ بھی کر سکیں۔

ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اسلامی معیشت وتجارت کو جب عصر حاضر میں نافذ کیا جائے تو پوری دنیائے اسلام کے لیے ایک ہی طرح کا نقشہ اور ایک ہی طرح کا خاکہ بنایا جائے۔ یہ اس لیے ضروری نہیں ہے کہ مختلف مسلم ممالک کے معاشی حالات مختلف ہیں۔ تعلیمی حالات بھی مختلف ہیں۔ معاشرتی اور اجتماعی حالات بھی مختلف ہیں۔ اس لیے کلیات اور اساسات تو یکساں اور متفق علیہ ہوں گے، لیکن تفصیلی نقشے اور عملی خاکے ہر بڑے مسلم ملک میں الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر پاکستان میں اسلامی معیشت کے نظام اور نفاذ کے لیے جو خاکہ یا نقشہ بنایا جائے ضروری نہیں کہ وہ خاکہ اور نقشہ اپنی تمام جزوی تفصیلات میں بھی مکمل طور پر سعودی عرب کے نقشے اور خاکے سے متفق ہو۔ صرف کلیات اور اساسات پر متفق ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات پر متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس اعتبار سے ہم مسلم ممالک کو تین بڑے بڑے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کچھ مسلم ممالک تو وہ ہیں جو نفاذ اسلام کے علمبردار ہیں یا کم از کم اس کے دعویدار ہیں۔ جیسے پاکستان ایک زمانے میں علمبردار تھا، پھر محض دعویدار ہو گیا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ علمبردار ہے، نہ دعویدار ہے۔ لیکن نظری اعتبار سے، دستوری اعتبار سے، تحریک پاکستان کی نوعیت اور قائدین پاکستان کی کمٹمنٹ کے اعتبار سے پاکستان کو نفاذ اسلام کا علمبردار ہونا چاہیے، اور کم از نظری اور آئینی اعتبار سے وہ اب بھی نفاذ اسلام کا علمبردار ہے۔ اس لیے پہلے زمرے میں جو ممالک شامل ہیں ان میں پاکستان کا نام صف اوّل میں آنا چاہیے۔ دوسرا زمرہ ان ممالک کا ہے کہ جو نظام اسلام کے علمبردار یا نفاذ شریعت کے دعویدار تو نہیں ہیں لیکن اسلامی معیشت وتجارت کے مخالف بھی نہیں ہیں۔ وہاں حکومتیں اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ اگر کچھ لوگ اسلامی معیشت وتجارت کی بنیادوں پر کام کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک اسی نوعیت کے ہیں۔ تیسرا زمرہ ان ممالک کا ہے جو سیکولرازم سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ نظری اعتبار سے سیکولرازم ہی کو اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں اور سیکولرازم سے انحراف کرنے والی کسی پالیسی کو قبول کرنے میں تامل محسوس کرتے ہی۔

ان تینوں قسم کے ممالک میں اسلامی معیشت کی بحالی کے تقاضے الگ الگ ہیں اور

مستقبل کی اسلامی معیشت یا مستقبل میں اسلام کا کام کرنے کے نقشے ان تینوں قسم کے ممالک میں الگ الگ ہوں گے۔ جو ممالک نفاذ اسلام کے داعی ہیں یا مدعی ہیں وہاں ریاست کی ایک اہم اور شاید سب سے اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایک ترغیبی مہم شروع کرے جس کے نتیجے میں لوگوں کو راغب کیا جائے، اہل تجارت کو قائل کیا جائے، کاروباری حلقے کو مائل کیا جائے کہ وہ اسلام کے احکام پر عمل کریں۔ اسلام کے احکام سے واقفیت حاصل کریں۔ ترغیبی مہم کے ساتھ ساتھ اسلامی اداروں کو مزید قوی بنانا بھی ضروری ہے۔ آج کل امپاورمنٹ empowerment کا لفظ بہت چلتا ہے۔ ہر چیز کی empowerment کی بات ہو رہی ہے۔ اس لیے اسلامی اداروں کی بھی empowerment ہونی چاہیے۔ یہ کام اس پہلے مرحلے کی تکمیل کے لیے بنیادی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعلیم کی اسلامی تشکیل کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔

زندگی کے بقیہ شعبوں میں بہتری اور اصلاح کی جائے، فنی اعتبار سے بھی اور اسلامی نقطہ نظر سے بھی۔ بعض حضرات فنی بہتری کے پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف اخلاقیات کے وعظ کو کافی سمجھتے ہیں۔ اخلاقیات کا وعظ ہو رہا ہو، دینی ترغیب کی مہم جاری ہو لیکن کسی کام کو کرنے کے جو فنی اور عملی تقاضے ہیں ان پر عمل نہ ہو تو ایسی خالی خولی ترغیبی مہم چنداں نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ آپ پورے معاشرہ میں نماز کے لیے ترغیبی مہم چلائیں، نماز کے فضائل بیان کریں، لیکن وہاں مسجد قائم نہ کریں، امام کا تقرر نہ کریں، وقت پر اذان کا انتظام نہ ہو تو پھر ترغیبی مہم کے نتائج بہت محدود ہوں گے۔ اس لیے ترغیبی مہم کے ساتھ ساتھ کسی کام کو کرنے کے جو عملی اور فنی تقاضے ہیں ان پر بھی مؤثر اور مکمل طریقہ سے عمل درآمد ہونا چاہیے۔ غیر اسلامی محرکات کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ معاشرے میں ان تمام قوتوں کے درمیان ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ فکری یکسانیت ہونی چاہیے جو نفاذ اسلام کے اس مشترک ایجنڈے سے اتفاق کرتی ہوں۔ نفاذ اسلام کا ایک کم از کم ایجنڈا پورے ملک میں متفق علیہ ہونا چاہیے، جو الحمدللہ پاکستان میں ہے۔ پاکستان میں دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973 میں نفاذ اسلام کا جتنا ایجنڈا موجود ہے اس کے بارے میں یہ بات اطمینان اور یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ملک کے تمام قابل ذکر طبقے اس ایجنڈے پر متفق ہیں اور دستور پر اتفاق رائے رکھنے کی وجہ سے اس ایجنڈے پر کام

کرنے پر بھی متفق ہیں۔ اس لیے اس بارے میں کم از کم ملک میں کوئی اختلاف یا کشاکش نہیں ہونی چاہیے۔

اسلامی معیشت وتجارت کے قیام کے لیے ضروری یہ ہے کہ ایک ایسا اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کیا جائے جیسا سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں قائم کیا گیا تھا۔ ایسا کمیشن ایک مستقل کمیشن ہو جو حکومت کے ذمہ دار حضرات پر مشتمل ہو، جس میں معیشت اور قانون کے اعلیٰ ترین ماہرین بھی شامل ہوں اور جید ترین؛ ماہرین شریعت اور علمائے کرام بھی شامل ہوں۔ یہ کمیشن اس بات کا مجاز ہو، اس بات کا مکلف اور پابند ہو کہ وطن عزیز میں اسلامی معیشت کی طرف پیش رفت کے عمل کا جائزہ لیتا رہے، وقتاً فوقتاً ہدایات جاری کرتا رہے اور جہاں جہاں مشکلات پیدا ہوں ان کا حل تجویز کر کے حکومت کو توجہ دلاتا رہے۔ اس کمیشن میں ماہرین اقتصادیات اور جید فقہائے اسلام بھی شامل ہونے چاہئیں۔ ماہرین قانون اور مالیات بھی شامل ہونے چاہئیں۔ یہ کمیشن ایک ایسا ٹائم ٹیبل وضع کرے جو قابل عمل بھی ہو اور حکومت کی مشاورت کے بعد وضع کیا گیا ہو۔ اس کمیشن اور حکومت کے درمیان کوئی کشاکش کی کیفیت نہ ہو۔ یہ کمیشن حکومت کے ایک جزو کے طور پر کام کرے۔ حکومت کے کسی مخالف کے طور پر کام نہ کرے۔ اس کی حیثیت کسی حزب اختلاف کی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی حیثیت حکومت ہی کے ایک ادارے کی ہونی چاہیے۔ حکومت کی سرپرستی میں یہ ادارہ ایک Watch Dog کا کام کرے۔ یہ دیکھے کہ مختلف قوانین پر عدالتوں کے فیصلوں، اسٹیٹ بنک کے احکام پر اور خود اس کمیشن کی ہدایات پر کتنا عمل ہو رہا ہے۔

پاکستان کے قانون نفاذ شریعت ایکٹ 1991 میں ایک ایسے کمیشن کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن یہ کمیشن مؤثر طور پر کام نہیں کر پایا۔ یا تو اس کے سربراہی سیاسی کارکنوں کے ہاتھ میں رہی جو اپنی حکومتوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ یا ان کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے کوئی تجویز پیش کی تو حکومت اس کو قبول نہیں کرے گی۔ حکومت قبول نہیں کرے گی تو عامۃ الناس کی نظر میں خود ان کو اور حکومت کو سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے ہم اپنی حکومت کو سبکی کا نشانہ کیوں نہ بنائیں۔ اس لیے انھوں نے کوئی فعال کردار ادا نہیں کیا۔ یا اس میں ایسے حضرات رکھے گئے جو خود غیر فعال تھے، ان کی سستی کی وجہ سے ادارہ بھی غیر فعال ہو گیا۔ اب یا تو اسی کمیشن کو فعال بنایا

جائے یا کوئی نیا ادارہ قائم کیا جائے، جو واقعی فعال ادارہ ہو، جو اسلامی معاشیات کی تعلیم کی تجاویز بھی وضع کرے۔ معاشیات میں اسلامی تحقیق کے ادارے بھی قائم کرے۔ ٹیکسوں کے مکمل نظام پر مکمل نظر ثانی کی تجاویز بھی دے۔ یہ کمیشن خود بھی تجاویز دے سکتا ہے اور ایسی کمیٹیاں بھی قائم کر سکتا ہے جو قابل عمل تجاویز پیش کریں۔

جب تک ہمارے ملک میں ٹیکسوں کے نظام پر مکمل نظر ثانی نہیں ہوگی بہت سی اصلاحات پر عمل درآمد کا کام رکا رہے گا۔ نہ زکوٰۃ پر مکمل عمل درآمد ہو سکے گا، نہ مضاربہ پر ہو سکے گا، نہ مشارکہ پر مکمل عمل درآمد ہو سکے گا اور بہت سی اصلاحات اس وقت تک شرمندہ تکمیل رہیں گی جب تک موجودہ ٹیکسوں اور ٹیکسوں کے نظام پر بھرپور نظر ثانی نہیں کی جائے گی۔

ہمارے یہاں کارپوریٹ کاروبار کی نگرانی کا معاملہ بہت ڈھیلا ہے۔ دنیا کے ممالک میں یہ ادارے بہت قوی، بہت کھرے اور بہت کڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ ادارے نہ کھرے ہیں، نہ کڑے ہیں اور نہ تکڑے ہیں۔ نگرانی اور کنٹرول کے لیے جب تک کوئی مضبوط، کھرا اور کڑا ادارہ نہیں ہوگا اس وقت تک کارپوریٹ کاروبار کا نظام مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکے گا۔ ایک اہم تجویز یہ بھی ضروری محسوس ہوتی ہے کہ اقتصادی امور سے نپٹنے کے لیے فوری عدالتیں الگ ہونی چاہئیں۔ عدالتوں کے پاس کا کام انبار بہت زیادہ ہے۔ کسی جج کے لیے، وہ اعلیٰ عدالت کا جج ہو یا ماتحت عدالت کا جج ہو، اس پورے کام سے بطریق احسن نمٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جو اس کو درپیش ہوتا ہے۔ مقدمات کی کثرت کی وجہ سے ان کو جمع شدہ مقدمات کو نپٹانے کے کام میں تاخیر ہوتی ہے اور تاخیر کے نتیجے میں وہ صورتحال پیدا ہوتی ہے جس کے بارے میں میں نے ایک بار کہا تھا کہ پاکستان کی عدالتوں سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے صبر ایوبؑ، عمر نوحؑ اور دولت قارون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا ایک جزوی حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہائی کورٹ کی نگرانی میں مختلف معاملات کی الگ الگ عدالتیں قائم کر دی جائیں۔ اقتصادی امور کی عدالتیں الگ ہوں، بینکاری کی عدالتیں الگ ہوں۔ اگر ایسا ہو جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ جن اسباب کی بنا پر کاروباری طبقہ پیش رفت کرنے سے گھبراتا ہے ان رکاوٹوں کو جزوی حد تک ہی سہی دور کیا جا سکے گا۔

بینکاری کی تربیت کا فوری نظام قائم کیا جانا چاہیے۔ اس وقت ہمارے ملک میں

بینکاری کی تربیت کا نظام انتہائی ناکافی ہے۔ بینکوں میں کام کرنے والے حضرات کی بڑی تعداد وہ ہے جن کو پہلے سے اس فنی کام کا سرے سے کوئی تجربہ نہیں ہوتا، نہ کوئی تربیت ہوتی ہے۔ اسلامی بینکاری کا معاملہ اور بھی نازک اور کمزور ہے۔ تربیت نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے۔ روایتی بینکاری کی تربیت تو ماحول میں خود بخود ہو جاتی ہے اور جب آدمی ملازمت شروع کرتا ہے تو پہلے دن سے اس کی فنی تربیت کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ نظام چار سو برس سے چل رہا ہے اس لیے کسی نئے ناتجربہ کار اور نوآموز کی آمد سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ جلد ہی وہاں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ لیکن اسلامی معیشت تو اپنے آغاز میں ہے۔ اگر آغاز ہی غیر تربیت یافتہ اور نوآموز لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا تو ابتداء ہی میں گڑ بڑ پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے تربیت کی جتنی ضرورت اسلامی بینکاری کے معاملات میں ہے اتنی شاید روایتی بینکاری میں نہیں ہے۔

ملک کی اقتصادی ترجیحات کا تعین بھی اسلامی معیشت کے لیے بہت اہم ہے۔ اقتصادی ترجیحات کا تعین ایک مرتبہ ہو جائے تو ان اقتصادی ترجیحات کو سامنے رکھ کر سود کے اسلامی متبادلات اور متقاربات تیار کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ بیرونی ممالک کے اثر سے آزادی اس پہلے مرحلے میں ناگزیر ہے۔ نہ صرف اس مرحلے کی تکمیل کے لیے، بلکہ خود کفالتی کے حصول کے لیے بھی معاشی خودمختاری اور خودکفالتی کا حصول ناگزیر ہے۔ خودکفالتی کا حصول جب تک بطور پالیسی کے بنیادی اصول کے لیے سختی سے نہیں اپنایا جائے گا اس وقت تک خودکفالتی کا ہدف حاصل نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی بینکاری کے Watch Dog کی ذمہ داری اسٹیٹ بنک یا کسی اور ادارے جس کو بھی دی جائے وہاں اس کام کے لیے ضروری افرادِ کار اور وسائل کی فراہمی ناگزیر ہے۔ مناسب یہ ہے کہ یہ ذمہ داری اسٹیٹ بنک ہی کی ہو۔ بشرطیکہ کام فعال انداز میں کیا جائے اور اسٹیٹ بنک میں اس کام کے لیے مؤثر اور خودمختار شعبہ قائم کیا جائے۔

پاکستان میں چھوٹی صنعتوں پر زور دینے سے اسلامی معیشت کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹا صنعت کار اور چھوٹا تاجر اسلام کے احکام پر آسانی سے عمل کر سکتا ہے اور اس کو جلد قائل اور مائل کیا جا سکتا ہے۔ گاؤں اور دیہاتوں پر اگر توجہ دی جائے اور چھوٹے

چھوٹے منصوبوں میں سرمایہ داری کی جائے تو جہاں بنگلہ دیش کا گرامین بنک کا تجربہ کام دے گا وہاں اسلامی احکام پر عمل درآمد بھی آسان ہوگا۔ گاؤں اور دیہات میں ذہنی طور پر لوگ پہلے ہی اس بات کے لیے آمادہ رہتے ہیں کہ اسلام کے احکام پر عمل کریں اور جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کی کوشش کریں۔

ان کاموں کے ساتھ ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے عام تاجروں کے لیے ایسے چھوٹے چھوٹے تربیتی اور توجیہی پروگرام شروع کیے جائیں جن کے ذریعے ان کو اسلام کے احکام اور قوانین سے واقف کرایا جائے۔ شریعت کے احکام ان کو بتائے جائیں۔ ربا، قمار اور غرر کی حرمت سے ان کو آگاہ کیا جائے۔ یہ طبقہ جب ان احکام سے آگاہ ہو جائے گا تو بہت آسانی کے ساتھ ان پر عمل درآمد کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔ اگر چھوٹے چھوٹے تاجروں کا طبقہ اسلام کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے تو پھر آسانی کے ساتھ اسلامی معیشت کے اونچے اہداف کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ تاجروں کے تربیتی پروگرام علمائے کرام بھی کر سکتے ہیں دینی تعلیم کے ادارے بھی کر سکتے ہیں اور خود تاجروں کی تنظیمیں بھی آپس میں مل کر سکتی ہیں۔ تعلیمی نصابات میں اسلامی معیشت کا مواد یوں تو پاکستان میں کسی حد تک شامل ہے۔ لیکن اگر معاشیات کے اساتذہ مل کر یہ طے کر لیں کہ وہ معاشیات کی روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی معیشت کے احکام بھی طلبہ کو پڑھائیں گے تو یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اسلامی معیشت پر اردو اور انگریزی میں اتنا مواد دستیاب ہے کہ وہ اساتذہ اور طلبہ کی عام ضروریات کو کما حقہ پورا کر سکتا ہے۔

اردو اور انگریزی میں اسلامی معیشت پر زیادہ سے زیادہ مواد کی فراہمی ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ یہ بات انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ عربی زبان میں عرب دنیا میں اسلامی معیشت، تجارت اور تکافل پر بہت کام ہوا ہے۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں کتابیں اور اس سے بھی زیادہ مقالات پچھلے چالیس پچاس سال میں لکھے گئے ہیں۔ اگر اس پورے ذخیرے سے اچھی کتابوں کا انتخاب کر کے، ہر سال سو کتابیں بھی اردو اور انگریزی میں شائع ہو جایا کریں تو چند سال کے اندر اندر ہم اردو زبان کو اور کسی حد تک انگریزی زبان کو اسلامی معاشیات کے ادب سے مالا مال کر سکتے ہیں۔ اگر پاکستان کا ہر بڑا دینی مدرسہ اور تمام یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا ہر شعبہ یہ طے کر لے کہ ہر سال اپنے طلبہ سے کم از کم دو کتابوں کا اردو اور ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ کرائے گا تو چند

سال کے اندر اندر یہ کمی پوری ہو سکتی ہے۔

یہاں ایک بات میں بہت اہتمام سے عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اسلامی معیشت کے لیے کیے جانے والے اس سارے کام کو ملکی سیاست کے اثرات سے دور رکھا جائے۔ سیاسی کشاکش نے ہمارے ملک میں اسلام کو فائدہ کم پہنچایا ہے، نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ اگر اسلامی معیشت کے نفاذ کے ایک مشترکہ پروگرام پر اتفاق رائے ہو جائے جو آسانی کے ساتھ پیدا کیا جا سکتا ہے، تو پھر اس عمل کو سیاسی مصلحتوں اور سیاسی مفادات کے اثرات سے دور رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو ملک وملّت کے مشترک اہداف ہیں، پاکستان کا دفاع مشترک ہدف ہے۔ پاکستان کی ترقی مشترک ہدف ہے۔ پاکستان کی خوشحالی اور امن وامان مشترک ہدف ہے۔ اسی طرح پاکستان کی اسلامی تشکیل بھی مشترک ہدف ہونی چاہیے۔ اس ہدف کو کسی سیاسی مفاد پر قربان نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اسلامی رائے عامہ کی بیداری اور تقویت کسی سیاسی مصلحت کے تحت نہیں، اسلام کی خاطر اور اللہ کے دین کی خاطر یہ کام کیا جانا چاہیے۔ جس میں ریاست کے تمام شعبوں، گروہوں اور تنظیموں کو حصہ لینا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ ریاستی قوانین میں جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں تبدیلی کر کے اسلامی متبادلات کے لیے گنجائش پیدا کی جائے۔ پاکستان میں قوانین میں کچھ تبدیلیاں اسّی کی دہائی میں ہوئی تھیں۔ کچھ تبدیلیوں کی مزید ضرورت ہے۔ ان تبدیلیوں کے لیے کچھ کام ہوا بھی ہے۔ کچھ قوانین کے مسودے تیار بھی ہوئے ہیں۔ جن میں سے بعض مسودات کی ترتیب میں میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ اگر یہ کام اتفاق رائے سے ہو جائے، حکومت اور دوسرے تمام بااثر حضرات اس سے اتفاق کریں تو بالتدریج اس کام کو کیا جا سکتا ہے اور پاکستان اپنے اس مقام کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے جو اس کو پچاس کی دہائی میں حاصل تھا، جب وہ دنیائے اسلام کے لیے نمونے اور قائد کی حیثیت رکھتا تھا۔

اسلامی معیشت کا نفاذ پاکستان میں جب بھی ہوگا اس میں لازمی چیز یہ ہوگی کہ ربا کی ہر صورت کا مکمل خاتمہ ہو۔ ٹیکسوں کے موجودہ نظام اور مغربی تصور پر نظر ثانی ہو۔ ہر قسم کی اجارہ داری مکمل طور پر ختم ہو۔ ارتکاز دولت کو کم سے کم کیا گیا ہو۔ ملک میں عدل اجتماعی یعنی distributive جسٹس اور سوشل جسٹس مکمل طور پر موجود ہوں۔ اور خاص طور پر جو بے گھر یا بے

زمین کسان ہیں ان کو رہائش اور کاشت کے لیے زمین میسر ہو۔

شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے جو متعدد احادیث میں بیان ہوا ہے۔''من احیا ارضا میتة فھی لہ جو شخص کسی غیر آباد اور غیر مملوکہ زمین کو آباد کرے وہ اس کی ہے۔ اگر حکومت پاکستان اس اصول کو بطور پالیسی کے اختیار کر لے اور اس کے لیے ایک ایسا ادارہ بنا دے جو ایک پانچ سالہ، دس سالہ، پندرہ سالہ، بیس سالہ منصوبے کے ذریعے پاکستان کی غیر آباد سرکاری زمینوں کو مفت ضرورت مند کسانوں میں تقسیم کر دے۔ پانی فراہم کرنے میں حکومت مدد دے۔ جہاں ضروری ہو وہاں قرضہ دے۔ جہاں حکومت قرضہ نہ دے سکے وہاں زکوٰۃ کی رقم سے وسائل عطا کیے جائیں تو بہت جلد پاکستان میں زرعی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ نئی بستیاں آباد کی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی زمینداریوں میں جو غیر آباد زمین پڑی ہے وہ واپس لے لی جائے۔

بنک ایک منصوبے کے طور پر مزارعت اور مساقاۃ کے اسلامی اصولوں پر سرمایہ کاری کریں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ترجیح دیں، جو فنی بنیادوں پر زمینیں آباد کریں۔ اگر ایک میٹرک پاس نوجوان کو یا ایف اے (F.A) پاس نوجوان کو ایک سال کا، تین مہینے یا چار مہینے کا مختصر زراعتی کورس کرایا جائے اور احیائے موات کے لیے اس کو تیار کیا جائے، اگر وہ مستحق ہو تو زکوٰۃ فنڈ سے اس کو ضروری رقم دی جائے۔ مستحق نہ ہو تو بینکوں سے قرضے دیے جائیں تو روزگار کے مسئلے کے حل میں بھی مدد مل سکتی ہے اور زمینیں بھی بڑے پیمانے پر آباد کی جا سکتی ہیں۔

دنیائے اسلام میں آپس میں تجارت بڑھانے کا بھی اسلامی اقتصادیات کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ اگر وہ ممالک جو اسلامی معیشت کے سلسلے میں پیش قدمی کر رہے ہیں یا کرنا چاہے ہیں، یا کرنے کے علمبردار ہیں، اگر ان کی آپس میں تجارت اتنی بڑھ جائے کہ وہ ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل کر سکیں تو اس سے اسلامی وحدت میں بھی مدد ملے گی۔ اسلامی معیشت کے کام میں بھی پیش رفت ہوگی اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں بھی آسانی ہوگی۔

اسلامی معیشت و تجارت کی پیش قدمی کے معیارات کیا ہیں؟ یعنی پیش قدمی کے indicators کیا ہیں؟ اشاریے کیا ہیں۔ میرے خیال میں وہ یہ درج ذیل دس چیزیں ہیں۔

۱۔ دولت کی وسیع تر تقسیم

۲۔ چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا زیادہ سے زیادہ فروغ

۳۔ مشارکہ اور مضاربہ اور ان کے تصور پر مبنی نئے طریقوں کا زیادہ سے زیادہ رواج

۴۔ بیع مرابحہ اور تورق جیسے طریقوں کا کم سے کم استعمال

۵۔ تجارت میں توسیع

۶۔ صنعتی ترقی میں نمایاں اضافہ اور مسلسل اضافہ

۷۔ معاشرے کے نادار طبقات کو استفادے کے مواقع کی زیادہ سے زیادہ فراہمی

۸۔ سودی معیشت میں لگی ہوئی رقم کی نسبت میں کمی کا واضح رجحان

۹۔ اسلامی معیشت میں لگائے جانے والے سرمایہ میں نمایاں اضافہ کا رجحان

۱۰۔ ارتکاز دولت میں کمی کا نمایاں رجحان

یعنی ملک میں سودی کاروبار میں جتنی مجموعی رقم لگی ہو اس میں ایک سال میں اگر دس فیصد کمی ہوئی ہے، اگلے سال بیس فیصد کمی ہوئی ہے، اس سے اگلے سال تیس فیصد کمی ہوئی ہے، تو یہ کامیابی کا ایک نشان یا معیار سمجھی جائے گی۔ اسی طرح اسلامی معیشت میں لگی ہوئی رقم میں ہر سال نمایاں اضافہ ہونا چاہیے۔ اگر ملک کی کل پیداوار کا جتنا فیصد غیر سودی اسلامی معیشت میں لگا ہے، اس میں اضافہ ہو رہا ہے اور جتنا سرمایہ سودی معیشت میں لگا ہے اس میں کمی آ رہی ہے اور اضافے اور کمی کا یہ رجحان مسلسل جاری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی معیشت کے نفاذ میں کامیابی ہو رہی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہو رہا تو پھر سمجھا جائے گا کہ یا تو کامیابی نہیں ہو رہی یا کامیابی کا عمل بہت سست اور نہ ہونے کے برابر ہے۔

اسلامی معیشت کی طرف پیش رفت ایک اعتبار سے تو سست رہے گی۔ اس لیے کہ مختلف مدارج سے گزرنے کے بعد ہی اصل کامیابی تک پہنچنا ممکن ہوگا۔ پہلے مرحلے میں کھلے کھلے محرمات سے نجات حاصل کرنی ہوگی۔ بعض مکروہات کو گوارا کرنا پڑے گا۔ اگلے مرحلے میں بڑے مکروہات کو ختم کر کے چھوٹے مکروہات کو گوارا کرنا پڑے گا۔ اس سے اگلے مرحلے میں مباحات میں نسبتاً غیر افضل مباحات کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس طرح آگے چل کر درجہ بدرجہ کامیابیوں کے ذریعے خالص اسلامی معیار کا حصول ممکن ہو سکے گا۔

اسلامی معیشت اور تجارت کے مستقبل کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک

عالمگیر فقہ کی ضرورت ہے۔ اس کو ہم globalized فقہ یا cosmoplitan فقہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ اسلامی معیشت وتجارت کے لیے ناگزیر ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معیشت و تجارت کا مستقبل ایک فقہ عولمی یا فقہ کوکبی سے وابستہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم معلوم ہوتے ہیں۔

اسلامی معیشت وتجارت کے لیے جہاں اداروں، سرمایہ کاروں اور کاروباری حضرات کے لیے تربیتی اور توجیہی پروگرام درکار ہیں وہاں نوجوان علمائے کرام کے لیے بھی بینکاری کے خصوصی کورسز جاری ہونے چاہئیں۔ یہ یونیورسٹیوں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں کئی سال سے ہورہے ہیں۔ دوسری یونیورسٹیوں کو بھی ایسے کورسز کرانے چاہئیں۔ یہ کورسز دینی مدارس میں بھی ہوسکتے ہیں۔ ان کورسز کا دورانیہ دو سے تین سال تک ہونا چاہیے۔ ان میں انگریزی سے لازمی واقفیت، ریاضی، معاشیات اور بزنس ایڈمنسٹریشن کے مضامین کے ساتھ ساتھ اسلامی بینکاری پر مبنی نئی فقہ ''الفقہ المصر فی'' معاییر شرعیہ، الفقہ المالی اوراق تجاریہ، قوانین تجارت وغیرہ جیسے مضامین ناگزیر ہیں۔

وہ علمائے کرام جو فقہ میں گہری بصیرت رکھتے ہوں، فقہ میں تخصص کر چکے ہوں وہ اسلامی بینکاری کا یہ خصوصی کورس کرلیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ نئے اداروں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ تربیتی پروگراموں کا تعلق صرف علمائے کرام اور بینکاروں یا ماہرین معیشت سے نہیں ہے، بلکہ ایک اعتبار سے پورے معاشرے کی تربیت اور تیاری کے لیے مسلسل تربیتی اور ترغیبی مہم ہونی چاہیے۔ مسلمان صارف کا رویہ غیر مسلم صارف سے مختلف بنانے کے لیے تربیت درکار ہے۔ آج کل کی پوری معیشت صارفین کے رویے کے مطالعے پر مبنی ہوتی ہے۔ بہت سی معاشی پالیسیاں صارفین کے رویوں کے مطالعے کی بنیاد پر تشکیل دی جاتی ہیں۔ اگر مسلمان صارف کا رویہ غیر مسلم صارف سے مختلف نہیں ہے تو پھر اسلامی معیشت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسلامی معیشت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان صارفین کا رویہ غیر مسلم صارفین کے رویہ سے مختلف ہو۔ مسلمان صارف وہ ہے جو حرام اشیاء کی خریداری نہیں کرتا۔ مسلمان صارف وہ ہے جو اسراف اور تبذیر کا ارتکاب نہیں کرتا۔ مسلمان صارف وہ ہے جو مثلاً فحش رسائل اور کتابیں نہیں خریدتا۔ مسلمان صارف کی ضروریات زندگی نسبتاً محدود ہونگی۔ مسلمان صارف

دھوکہ دہی نہیں کرے گا۔ یہ وہ چند مثالیں ہیں جن کے ذریعے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمان صارف کا رویہ غیر مسلم صارفین کے رویہ سے کیسے مختلف ہوگا۔

اسلامی معیشت کا ایک بہت اہم indicator جس کی طرف میں اشارہ کر کے گفتگو ختم کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں متعلقہ مسلم ریاست کے ہر شہری کو کفاف کی سطح کے وسائل میسر ہو جانے چاہئیں۔ فقہائے اسلام نے کفاف کی اصلاح استعمال کی ہے۔ جو قرآن کریم کی بعض آیات اور احادیث پر مبنی ہے۔ جس کی رو سے ریاست اور معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہر شخص کو زندگی کے کم از کم لازمی تقاضے پورے کرنے میں مدد دی جائے۔ یعنی ہر شہری کے پاس سر چھپانے کو جگہ ہو۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا ہو۔ بقدر ضرورت پیٹ بھرنے کے لیے روزی میسر ہو۔ یہ اور اس طرح کی ناگزیر ضروریات جن میں سے بعض کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں، یہ ریاست کو فراہم کرنی چاہئیں۔

کفاف کا تصور مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔ شریعت نے کفاف کی کہیں تعریف نہیں کی کہ کفاف یہ ہے۔ بلکہ کفاف سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ معیشت اور تہذیب کی جس سطح پر ہو اس سطح کے لحاظ سے معاشرے میں جو کم از کم معاشی تقاضے ہیں وہ پورے ہونے چاہئیں۔ وہ کم از کم معاشی تقاضے کیا ہیں؟ اس کا تعین معاشرے کے حساب سے کیا جائے گا، ہر معاشرہ خود ان کم از کم تقاضوں کا تعین کرے گا۔ ان تقاضوں کو کیسے پورا کیا جائے؟ یہ ریاست اپنے وسائل کے لحاظ سے پورا کرے گی۔ اس کی تفصیل ایک اضافی انداز کی چیز ہے۔

قرآن کریم نے ایک عمومی اصول دیا ہے جس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔ "**علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ متاعا بالمعروف حقا علی المحسنین**" دولت مند پر اس کی صلاحیت اور استطاعت کے اعتبار سے، نادار پر اس کی صلاحیت اور استطاعت کے اعتبار سے، معروف طریقے کے مطابق اخراجات دینا ضروری ہے۔ اس آیت مبارکہ سے یہ اصول نکلتا ہے کہ اس طرح کی ذمہ داریاں قطعیت کے ساتھ طے نہیں کی جا سکتیں۔ یہ اضافی چیزیں ہیں جن کا تعلق ہر دور کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ آئیڈیل رویہ یہی ہے کہ ہر شخص ذاتی طور پر اپنی انفرادی زندگی میں قناعت کا اصول اپنائے۔ لیکن یہ ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی قانع بنائے۔ یہ کام ارباب وعظ و تبلیغ کا ہے کہ لوگوں کو قناعت کے رویے کی تلقین

کریں۔ ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے معاشی معیار اور ضروریات کے لحاظ سے کفاف کی مقدار اور سطح کا تعین کر کے اس کی فراہمی کو اپنے وسائل کے مطابق یقینی بنائے۔

علمائے کرام جب عامتہ الناس کی تربیت کریں تو ان کو اسراف سے بچنے کی تعلیم بھی دیں۔ اسراف صرف سرمایہ زیادہ خرچ کرنے کا نام نہیں ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بہت زیادہ سرمایہ صرف کر کے ہی اسراف کیا جا سکتا ہے۔ وقت کے ضیاع کو بھی اسراف کہتے ہیں۔ غیر ضروری اشیاء کے جمع کرنے کو بھی اسراف کہتے ہیں۔ غرض جس چیز کی معاشرے کو مثبت طور پر ضرورت نہیں ہے، جو سرگرمی معاشرے میں کسی تہذیبی، معاشی، دینی، ثقافتی، تعلیمی اور اخلاقی تعمیر کا ذریعہ نہیں بن رہی وہ اسراف کے دائرے میں شامل ہے اور عامتہ الناس کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے رہنا، علمائے کرام کی ذمہ داری ہے۔ اسراف کو ایک منفی رویے کے طور پر عامتہ الناس کے ذہن نشین کرنا، یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

آج پاکستان میں جتنے وسائل ضائع ہو رہے ہیں ان میں سے بہت سے وہ ہیں جن کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ جو وسائل ضائع ہونے سے بچائے جا سکتے ہیں وہ ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں کام دے سکتے ہیں جن کی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ یہ بھی صارف کے رویے کا ایک اہم پہلو ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں بہت مختصر لیکن جامع انداز میں اسراف کے اس رویے کو بتایا گیا ہے۔ اہل ایمان کے خصائص کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل کرتے ہیں۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان بیچ کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اسراف کو جدید معاشیات کے سیاق وسباق میں س طرح بیان کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے معاشی رویے کا حصہ بن سکے۔

ایک اہم کام جو اسلامی معیشت کے سلسلے میں کرنا ضروری ہے جس کا آغاز بڑی حد تک ہو چکا ہے اور بعض اہل علم نے عربی، انگریزی اور دوسری مسلم زبانوں میں اس موضوع پر کام بھی کیا ہے۔ وہ مجتہدین اسلام اور قدیم معاشی مفکرین کے افکار کی ایک نئے انداز سے تدوین جدید ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ معاشی مسائل پر سوچنا سمجھنا صرف مغرب میں شروع ہوا ہے۔ نہ مسلمان اہل علم نے معاشی مسائل سے بحث کی، نہ انھوں نے معاشیات اور مالیات کے مسائل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو کسی سنجیدہ گفتگو کا

موضوع بنایا جائے۔ یہ تاثر اس لیے بیٹھ گیا ہے کہ ائمہ اسلام کی تحریریں عربی زبان میں ہیں۔ان کا اسلوب قدیم ہے۔ان کے دلائل مخصوص انداز کے ہیں۔ان کا طرز استدلال آج بہت سے لوگوں کو نامانوس معلوم ہوتا ہے۔اس لیے ان کی تحقیقات سے بہت سے حضرات ناواقف رہتے ہیں۔

یہ بات کہ نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ غالباً انسانیت کی تاریخ میں مالیات عامہ یعنی Public Finance پر پہلی کتاب امام ابو یوسف نے لکھی۔ بہت سے لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔امام ابو یوسف جو دوسری صدی ہجری کے نامور ترین فقہائے اسلام میں سے ہیں ان کی کتاب الخراج اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مالیات کے احکام بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مالی اور معاشی اصلاحات کی تجاویز بھی دی ہیں۔معاشی ترقی اور عوامی بہبود کے بارے میں بہت سے نئے تصورات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب چونکہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے نام ایک یادداشت کے طور پر مرتب کی گئی تھی اس لیے اس دور میں ہونے والی بعض ایسی باتوں کی نشاندہی بھی اس کتاب میں کی گئی ہے جو امام ابو یوسف کے نزدیک نہیں ہونی چاہئیں۔ ان کے خیال میں جہاں کہیں زیادتیاں ہورہی تھیں ان کی نشاندہی کی ہے،ان کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔اور یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ مالیات کے امور سے متعلق جتنے کارندے مقرر کیے جائیں وہ سب اہل علم، اہل دین، اہل رائے اور باکردار لوگوں پر مشتمل ہوں۔امام ابو یوسف کی اس کتاب میں ریاست کے ذرائع آمدنی، ریاست کی ذمہ داریاں، ریاست کے اخراجات اور اسلامی مالیاتی نظام کے اخلاقی پہلوؤں پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

جس زمانے میں امام ابو یوسف نے یہ کتاب تحریر فرما رہے تھے اسی زمانے میں دوسرے متعدد حضرات نے بھی مختلف مالیاتی موضوعات پر کتابیں لکھیں۔امام یوسف کی کتاب کا تو اردو اور انگریزی میں ترجمہ موجود ہے۔اس لیے بہت سے حضرات اس سے واقف ہیں۔لیکن کتاب الاموال کے نام سے اور بھی بہت سی کتابیں دوسری اور تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں جن میں سے امام ابوعبید کی کتاب الاموال کا ترجمہ بھی موجود ہے۔انگریزی میں بھی ہے،اردو میں بھی ہے۔امام ابوعبید کے شاگرد حمید بن زنجویہ کی کتاب الاموال بھی تین جلدوں میں ہے، جو ابھی چند سال پہلے ریاض میں شائع ہوئی ہے۔اس کتاب میں امام حمید بن زنجویہ نے اپنے استاد ابوعبید کے کام سے پورا استفادہ بھی کیا ہے اور اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ابوعبید کی

کتاب الاموال اور ان کے شاگرد کی مرتب کردہ کتاب الاموال، یہ اپنے موضوع پر بہترین کتابیں سمجھی گئیں۔ یہاں تک کہ علم حدیث کے صف اوّل کے امام شیخ الاسلام علامہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابوعبید کی کتاب الاموال مالیاتی فقہ کے بارے میں لکھی جانے والی بہترین کتاب ہے۔

مالیات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مشہور صوفی بزرگ ابوبکر بن ابی الدنیا، جن کا تصوف اور زہد واستغناء مشہور ہے وہ بھی مالیات کے امور سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ امام ابوعبید کے شاگردوں میں سے تھے اور انھوں نے ایک ''کتاب اصلاح المال'' کے نام لکھی تھی جو مالیات سے متعلق شریعت کی اخلاقی ہدایات سے بحث کرتی ہے۔ گویا ان کے استاد ابوعبید نے مالیات کے قانونی اور فقہی پہلوؤں پر لکھا اور ان کے شاگرد ابوبکر ابی الدنیا نے مالیات کے اخلاقی پہلوؤں پر لکھا۔ یوں یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

فقہاء کے علاوہ ادیبوں نے بھی مالیات اور تجارت، معاشیات اور ریاست کے موضوع کو نظر انداز نہیں کیا۔ مشہور ادیب جاحظ کی کتاب تجارت کے بارے میں مشہور ہے جو تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے جس سے اس دور کے تجارتی طور طریقوں کا خاصا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ چند مثالیں تو میں نے متقدمین کی خاص طور پر دی ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بہت سی تصانیف مرتب کی ہیں۔

جہاں تک عمومی اقتصادی اور مالیاتی مسائل اور معاشی افکار کا تعلق ہے تو ہر بڑے فقیہ نے ان سے بحث کی ہے۔ خاص طور پر امام سرخسی جو اپنے زمانے کے صف اوّل کے فقہاء میں سے تھے۔ علامہ ابوالحسن ماوردی جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے شافعی فقیہ تھے۔ ان کے علاوہ امام غزالی، علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم، امام شاطبی، ان سب حضرات نے مالیات اور معاشیات کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ مؤرخین میں سے علامہ ابن خلدون اور مقریزی کے معاشی تصورات بہت مشہور ہیں جن پر اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی کچھ نہ کچھ مواد دستیاب ہے۔ معلمین اخلاق میں سے علامہ جلال الدین دوانی اور مولانا روم اور شاہ ولی اللّٰہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان حضرات نے تفصیل سے معاشی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔

شاہ ولی اللّٰہ محدث دہلوی کے معاشی افکار پر کئی کتابیں اردو اور دوسری زبانوں میں موجود ہیں۔ شاہ صاحب نے معاشیات کے نظری مسائل سے بھی بحث کی ہے، معاشیات کے

اخلاقی پہلوؤں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور اپنے زمانے کے معاشی مسائل اور حقائق پر پوری توجہ سے غور کر کے کچھ اصلاحات بھی تجویز کی ہیں۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں ہے اور شاہ صاحب کا ہر طالب علم اس بات کو جانتا ہے کہ شاہ صاحب کے تعلقات اپنے زمانے کے حکمرانوں سے مختلف سطح پر ہمیشہ قائم رہے۔ وہ خود بھی اپنے معاصر حکمرانوں کو اور سیاسی قائدین کو مشورے دیتے رہے اور ان کے زمانے کے حکمران بھی ان سے رہنمائی لینے میں جھجک اور عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ مغل فرمانروا محمد شاہ اور احمد شاہ خود کئی بار ان کے درِ دولت پر حاضر ہوئے اور مختلف معاملات پر ان سے رہنمائی لی۔

یہ چند مثالیں جن میں بہت اضافہ کیا جا سکتا ہے یہ بات واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مسلم ماہرین معیشت یا فقہائے اسلام کے معاشی خیالات پر ابھی تک اس انداز سے کام نہیں ہوا کہ آج ان سے استفادہ کرنا ماہرین معیشت کے لیے آسان ہو جائے۔ معاشیات کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جو ان ماہرین معیشت کی تحریروں اور مباحث سے استفادے کے نتیجے میں حل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر خرچ کا نظریہ یعنی consumption کا نظریہ جیسا کہ مغرب میں ہے اس پر مسلم اقتصادی مفکرین کو شدید اعتراضات ہیں۔ جس چیز کو صارف کی عقلیت یعنی consumer's rationalism کہا جاتا ہے اس پر بعض معاصر مسلم علماء نے سنجیدہ اعتراضات کیے ہیں۔ خود صارف کا رویہ یا consumer's behaviour کوئی نئی بات نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے بھی اس سے بحث کی ہے۔ چونکہ ان کے یہاں اصطلاحات اور عنوان مختلف ہیں۔ اس لیے بادیٔ النظر میں یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مبحث میں وہ مسائل بھی شامل ہیں جو آج معاشیات کے بڑے مسائل ہیں۔ جس چیز کو آج کل utility map کہا جاتا ہے اس کی بڑی اہمیت ہے اور صارف کے رویے کی تعین میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اہل مغرب نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ صارف کا رویہ ایک بنیادی طور پر اخلاقی اور ثقافتی مسئلہ ہے۔ یہ خالص معاشی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا معاشی پہلو بہت محدود اور معمولی ہے۔ ائمہ اسلام نے ان مسائل پر مفید بحثیں کی ہیں۔ امام غزالی کے یہاں یہ بحثیں ملتی ہیں۔ دوسرے حضرات کے یہاں ملتی ہیں۔ یہ بحثیں اگر آج کل کی زبان میں مرتب کی جائیں تو اسلامی

اقتصادی افکار کے نئے نمونے سامنے آئیں گے۔

پھر جس کو معاشی کامیابی کہا جاتا ہے (economic success) وہ کیا ہے؟ مغرب میں اس کا تصور اور ہے۔ اسلامی شریعت کی رو سے اس کا تصور اور ہے۔ انسان کی غایۃ الغایات کیا ہے؟ کیا اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ کمانے والی مشین بن کر رہ جائے یا اس کی غایۃ الغایات کسی اور چیز کا حصول ہے اور مادی وسائل اس کے لیے محض وسیلے اور ذریعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کی نظر میں کسب مال فی نفسہ یعنی اپنی ذات میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ وسائل کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور یہ وسائل کسی اور بڑے بالاتر اخلاقی، انسانی اور روحانی مقصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ یہی کیفیت کامیابی اور ترقی کے تصورات کی ہے۔ دولت، ترقی، معاشی کامیابی، ان سب عنوانات کے تحت جب اسلامی مندرجات شامل کیے جائیں گے تو ان سب اصطلاحات کا ایک نیا مفہوم متعین ہوگا اور اس نئے مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلامی معیشت کو ایک نئے انداز سے مرتب کرنے میں مدد اور رہنمائی ملے گی۔

یہ سارے کام ناگزیر ہیں اور ایک نئے اسلامی معاشی رویے کی تشکیل کے لیے ان سب کوششوں کو بیک وقت شروع کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو بالعموم اور اہل پاکستان کو بالخصوص یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس وعدے کی تکمیل کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے بھی کیا تھا، انسانیت سے بھی کیا تھا، مسلمانوں سے بھی کیا تھا، تاریخ سے بھی کیا تھا اور خود اپنے آپ سے بھی کیا تھا۔ ابھی تک ہم ان سب وعدوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ جب تک ہم ان اجتماعی وعدوں کو پورا کرنے کے لیے من حیث القوم آگے نہیں بڑھیں گے اس وقت تک پاکستان انھی مسائل اور مشکلات کا شکار رہے گا جن سے وہ آج دوچار رہے۔

پاکستان میں اسلامی معیشت پر سب سے پہلے کام شروع ہوا تھا۔ برصغیر کے اہل علم نے سب سے پہلے اسلامی معاشیات کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا تھا۔ پھر پاکستان بننے کے بعد پاکستان کا رویہ اس باب میں قائدانہ رہا۔ دنیا کے مختلف ممالک کے اہل علم نے پاکستان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا۔ پاکستان کے اہل علم کی تحریروں کی مانگ دنیا بھر میں ہوئی۔ اس کے بعد اہل پاکستان سست پڑ گئے۔ دنیا آگے نکل گئی، ہم پیچھے رہ گئے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم

اس کوتاہی کا تدارک کریں اور یہ غفلت جو ہم سے نصف صدی کے قریب ہوئی ہے اس کے نتیجے میں جو نقصان ہوا ہے اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ایک لمحے کی غفلت سے سو سال کی منزل کھوٹی ہو سکتی ہے۔ ہم سے تو پچاس سال غفلت ہوتی رہی۔ اللہ کرے یہ پچاس سالہ غفلت پچاس ہزار سالہ پسماندگی کو جنم نہ دے اور ہمیں اس غفلت کا تدارک کرنے کی اللہ تعالیٰ جلد از جلد توفیق عطا فرمائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

